بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اساتذہ واکابر کا تذکرہ

"تذکارِ رفتگاں" کے عنوان سے ماہنامہ الشریعہ کی
خصوصی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۷ء کا ایک باب
اضافات کے ساتھ

حضرت
مولانا
ابو عمار زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : اساتذہ واکابر کا تذکرہ

تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

مجموعہ : مئی ۲۰۲۴ء

ناشر :

اشاعت :

فہرست

☆ پیش لفظ.......... 7
☆ حضرت مولانا عبدالعزیز سہالویؒ.......... 9
☆ حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ.......... 12
☆ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ.......... 15
☆ حضرت مولانا عبدالغنیؒ.......... 17
☆ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ.......... 18
☆ حضرت مولانا رسول خانؒ.......... 21
☆ حضرت مولانا لال حسین اخترؒ.......... 22
☆ حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ.......... 24
☆ حضرت مولانا محمد یوسف الحسینیؒ.......... 25
☆ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ.......... 28
☆ الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم.......... 30
☆ حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ.......... 38
☆ حضرت مولانا محمد حیاتؒ.......... 40
☆ حضرت مولانا مفتی محمودؒ.......... 46
☆ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ.......... 106
☆ حضرت مولانا محمد زکریاؒ.......... 112
☆ حضرت مولانا مفتی عبدالمتینؒ.......... 114
☆ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ.......... 116

☆ حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ.......................... 120
☆ حضرت مولانا سید نورالحسن شاہ بخاریؒ.................. 135
☆ حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ............................... 137
☆ حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ..................... 145
☆ مولانا حافظ جی حضورؒ.................................. 149
☆ والدہ ماجدہ مرحومہ...................................... 151
☆ حضرت مولانا عبدالحقؒ (اکوڑہ خٹک)....................... 151
☆ حضرت حافظ غلام حبیب نقشبندیؒ......................... 157
☆ حضرت مولانا عزیز گلؒ.................................. 159
☆ حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ...................... 165
☆ حضرت مولانا جمیل احمد میواتی دہلویؒ.................... 170
☆ حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ.......................... 172
☆ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ..................... 173
☆ حضرت مولانا انعام الحسنؒ................................ 193
☆ حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ........................... 195
☆ الاستاذ عبدالفتاح ابوغدۃؒ.................................. 201
☆ حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ.......................... 204
☆ حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوریؒ.................. 211
☆ حضرت مولانا محمد طاسینؒ................................ 213
☆ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ................ 216
☆ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ........................ 221
☆ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ.................... 223
☆ حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ.............................. 226

☆ حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ 230
☆ حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ 233
☆ حضرت مولانا نذیر احمدؒ 239
☆ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ 240
☆ حضرت مولانا حافظ نذیر احمدؒ 244
☆ حضرت مولانا مفتی عبد الستارؒ 248
☆ الشیخ عبداللہ بن احمد الناخبیؒ 250
☆ حضرت مولانا حسن جانؒ شہید 254
☆ حضرت مولانا سید انور حسین نفیس الحسینیؒ 255
☆ حضرت مولانا محمد نعیمؒ 259
☆ ڈاکٹر محمد دین مرحوم 260
☆ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ 263
☆ حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ 280
☆ حضرت مولانا عبد الحقؒ (ظفروال، نارووال) 284
☆ حاجی جمال دینؒ 285
☆ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ 286
☆ قاری عبد الحلیمؒ 343
☆ حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقبؒ 346
☆ حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ 347
☆ حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ 353
☆ حضرت مولانا محمد یوسف خانؒ 358
☆ حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ 372
☆ حضرت مولانا سید محمد محسن شاہ شہید 375

☆ حضرت مولانا عبدالستار تونسویؒ 377
☆ حضرت مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ 379
☆ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اخترؒ 382
☆ حضرت مولانا علاء الدینؒ 383
☆ حضرت مولانا محمد نافعؒ 384
☆ حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ 385
☆ حضرت مولانا قاضی عبدالکریم کلاچویؒ 387
☆ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ 391
☆ حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانیؒ 393
☆ حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ 397
☆ حضرت قاری محمد انورؒ 399
☆ بگھار شریف اور گولڑہ شریف کے بزرگ 408
☆ حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ 409
☆ حضرت حاجی عبدالوہابؒ 412
☆ حضرت مولانا حمد اللہؒ 414
☆ حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستیؒ 415
☆ علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ 417
☆ حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ 420
☆ اہلیہ عمِ مکرم حضرت صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ 422
☆ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ 422

پیش لفظ

(خصوصی اشاعت ماہنامہ الشریعہ بعنوان ''تذکارِ رفتگاں'' اکتوبر ۲۰۱۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بحمد اللہ تعالیٰ مجھے دینی و ملی مسائل پر اخبارات و جرائد میں لکھتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے اور اس سلسلہ میں کم و بیش ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحابِ علم و دانش نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے جو یقیناً میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ اور اعزاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دوران دینی و قومی حوالہ سے بہت سی سرکردہ شخصیات کے بارے میں لکھنے کا موقع ملا اور زندگی میں جن دوستوں اور بزرگوں سے تعلق رہا ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے بارے میں تعزیتی کالم اور شذرات بھی موقع محل کی مناسبت سے قلمبند ہوئے جو رسائل و جرائد کے متنوع اور وسیع ذخائر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ حافظ ناصر الدین خان عامر نے انتہائی محنت اور توجہ کے ساتھ ان تعزیتی مضامین و شذرات کو جمع کر کے زیرِ نظر مجموعہ کی صورت میں کمپوز کیا ہے جو اس کی محنت و کاوش کے ساتھ ساتھ حسن ذوق کی بھی علامت ہے، جناب شبیر احمد خان میواتی نے پرانے مجلات میں سے مواد کی تلاش اور فراہمی میں معاونت کی ہے، جبکہ پروفیسر عمار خان ناصر نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین اور اسے ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت کے طور پر سامنے لانے کے لیے قابل قدر محنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی و کاوش کو قبولیت سے نوازیں، آمین۔ ابھی بہت سے بزرگوں اور دوستوں کے بارے میں اس نوعیت کے مضامین و شذرات اخبارات و جرائد کی فائلوں میں دبے پڑے ہیں جن کی تلاش جاری ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ جو میسر آجائیں انہیں اس کتاب کی اگلی اشاعت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

متعدّد قومی و ملی اور علمی و فکری عنوانات پر میرے مضامین کے ایک درجن کے لگ بھگ مجموعے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام طبع ہو چکے ہیں، جبکہ فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر نے پرانے اخبارات و جرائد کی چھان بین کر کے اب تک بارہ سو سے زائد مضامین ویب سائٹ

zahidrashdi.org پر شائع کیے ہیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں شامل مضامین ان بزرگوں اور احباب کے حوالہ سے محض جذبات اور تأثرات کا مختصر اظہار ہیں جو بہت سے پہلوؤں سے تشنہ محسوس ہوں گے اس لیے انہیں ایک عقیدت مند، رفیق کار اور کارکن کے احساسات کے طور پر ہی پڑھا جائے اور اس دعا کا اہتمام کیا جائے کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
یکم اگست ۲۰۱۷ء

حضرت مولانا عبدالعزیز سہالویؒ

محدث پنجاب مولانا عبدالعزیز سہالویؒ ۱۸۸۴ء میں تھانہ چونترہ ضلع راولپنڈی کی بستی سہال میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم مولانا غلام رسول مرحوم بھی عالم دین تھے۔ مولانا عبدالعزیزؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اور اردگرد نواح کے روایتی درسوں میں حاصل کی، اس کے بعد انّہی شریف کی معروف درسگاہ میں برصغیر کے نامور استاد حضرت مولانا غلام رسولؒ المعروف بابا انّہی والے سے کافی عرصہ تعلیم حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور دورۂ حدیث شریف شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ سے پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے پھر انجمن حمایت اسلام لاہور کے مدرسہ حمیدیہ میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے ہیڈ ماسٹر مولانا ضیاء الدین فاضل دیوبند مرحوم کی مساعی سے بطور استاد اسلامیہ ہائی سکول آگئے۔ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب ان دنوں مولانا نذیر حسین مرحوم تھے جن کی علمی وجاہت اور عوامی اثر ورسوخ کی وجہ سے فرنگی حکومت نے انہیں آنریری مجسٹریٹ کا منصب عطا کر رکھا تھا لیکن جب ملک کے دوسرے حصوں کی طرح گوجرانوالہ میں بھی فرنگی استعمار کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑکے تو گوجرانوالہ کے عوام نے روایتی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، جیل ریلوے اسٹیشن اور دیگر سرکاری عمارات نذرِ آتش کر دی گئیں، مارشل لاء لگا اور فرنگی استعمار کے خلاف اس جوش و خروش اور نفرت کی فضا میں شہر کے لوگوں نے مولانا نذیر حسین مرحوم سے تقاضا کیا کہ وہ آنریری مجسٹریٹ کے منصب سے دستبردار ہو جائیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور جامع مسجد کی خطابت سے دستبرداری کو ترجیح دی جس کے بعد معززین شہر بالخصوص ملک لال خان مرحوم کی کوشش سے مولانا عبدالعزیزؒ کو جامع مسجد کی خطابت قبول کرنے پر آمادہ کیا گیا اور انہوں نے یہ فرائض ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ سنبھالے۔

مولانا عبدالعزیزؒ خالصتاً علمی ذوق کے بزرگ تھے، علم حدیث کے ساتھ گہرا شغف تھا اور اسی بنا پر انہیں محدث پنجاب کہا جاتا تھا۔ اپنے وقت کے معروف محدث حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اکثر اپنے تلامذہ اور متعلقین کو مولانا عبدالعزیزؒ سے استفادہ کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالعزیزؒ کا یہ علمی ذوق اور شغف ہی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مدرسہ انوار العلوم کے قیام کا باعث بنا جو غالباً گوجرانوالہ میں درس نظامی کا پہلا باقاعدہ مدرسہ تھا۔ یہ مدرسہ ۱۹۲۶ء میں قائم ہوا اور اب تک پورے اہتمام و تسلسل کے

ساتھ دینی علوم کی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ آج کل اس مدرسہ کے مہتمم مولانا عبدالعزیزؒ کے بھتیجے اور جانشین مولانا مفتی عبدالواحد ہیں جبکہ مولانا قاضی حمید اللہ، راقم الحروف، مولانا سید عبدالمالک شاہ اور قاری محمد شفیق تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں (یہ مضمون مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی زندگی میں لکھا گیا تھا)۔ موقوف علیہ تک درس نظامی کی تعلیم ہوتی ہے اور کم و بیش ساٹھ بیرونی طلبہ مدرسہ کے دارالاقامہ میں مقیم رہتے ہیں جن کے اخراجات کی کفالت مدرسہ کرتا ہے۔ مولانا عبدالعزیزؒ کے قائم کردہ اس قدیمی مدرسہ میں مختلف اوقات میں حضرت مولانا حسین علیؒ آف واں بھچراں، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا غلام رسولؒ انّہی والے، حضرت مولانا حبیب الرحمانؒ عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور دیگر چوٹی کے اکابر تشریف لاتے رہے ہیں اور یہ سب بزرگ مولانا مرحوم کے علم و فضل اور دینی خدمات کے معترف و مداح تھے۔

مولانا مرحوم نے تصنیف و تالیف کے محاذ پر بھی کام کیا جو بظاہر مختصر ہے مگر در حقیقت بہت زیادہ وقیع ہے۔ صحیح بخاری پر انہوں نے "النبراس الساری علی اطراف البخاری" کے نام سے کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر واحد کتاب سمجھی جاتی ہے۔ حدیث کی مشہور کتاب طحاوی شریف پر مولانا مرحوم کا قلمی حاشیہ بھی معرکے کی چیز ہے اور اب مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی مساعی سے زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث ہی کی ایک اور کتاب "نصب الرایہ علی احادیث البدایہ" کا جو متداول نسخہ حیدر آباد دکن سے طبع ہو کر اس وقت اہل علم کے کتب خانوں کی زینت ہے اس پر حواشی مولانا عبدالعزیزؒ مرحوم ہی کے تحریر فرمودہ ہیں اور اس کی تصحیح بھی انہوں نے کی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالعزیزؒ نے گوجرانوالہ سے ہفت روزہ العدل کے نام سے ایک علمی جریدہ کی اشاعت کا آغاز بھی کیا جو سالہا سال تک شائع ہوتا رہا اور اس میں مذہب اہل سنت والجماعت اور مسلک حنفی کی ترجمانی اور دفاع کے محاذ پر نمایاں کام ہوا۔

مولانا عبدالعزیزؒ جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ اور اس کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے، جمعیۃ نے جو وفد حجاز میں سعودی حکمرانوں کے پاس اسلامیانِ ہند کے جذبات سے انہیں آگاہ کرنے کے لیے بھیجا تھا اس میں مولانا عبدالعزیزؒ کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا عبدالعزیزؒ ان علماء میں سے تھے جو صدیوں کے بعد جنم لیتے ہیں، وہ فی الواقع اس شہر کی دینی، علمی اور فکری آبرو تھے۔ انہوں نے ایک عہد کو سنوارا، نکھارا اور سوزِ دل سے فکر و نظر کے چراغ جلائے۔ اور ان کی یاد آج بھی زبانوں کی حلاوت، نگاہوں کی جلا اور تذکروں کا سرمایہ ہے

سالہا زمزمہ پروازِ جہاں خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گرداں زدہ است

جہاں تک مولانا کی علمی وجاہت اور ثقاہت کا تعلق ہے ان کا اعتراف ایک دنیا کو تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی ''معارف'' مئی ۱۹۴۸ء کے شمارے میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی وفات حسرتِ آیات کا ماتم کرتے ہوئے ایک تاریخی یاد کو یوں تازہ کررہے ہیں:

''مرحوم (مولانا ثناء اللہ امرتسری) کو ایک دفعہ مجھ سے شکایت بھی پیدا ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ دس پندرہ برس ہوئے مرحوم اور ان کے حنفی حریف مولانا عبد العزیز صاحب خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری کے درمیان حدیث "واذا قرء الامام فانصتوا" کے صحیح مسلم میں موجود ہونے یا نہ ہونے پر اخبارات میں تحریری مناظرہ ہورہا تھا۔ فریقین نے اس باب میں مجھے حکم مانا، میں نے مولانا مرحوم سے کچھ پوچھے بغیر صرف دونوں کی تحریروں کو دیکھ کر فیصلہ مرحوم کے خلاف اور مولانا عبد العزیز صاحب کے موافق کیا''۔

اور معارف دسمبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں ان کی وفات پر مولانا سلیمان ندوی نے انہیں یوں خراج تحسین پیش کیا تھا:

''دو ماہ ہوئے کہ مولانا عبد العزیز صاحب خطیب و امام جامع مسجد گوجرانوالہ نے، جو دیوبند کے عالم اور وقت کے بڑے محدث تھے، وفات پائی۔ انہوں نے صحاح و مسانید کی مختلف کتابوں کی فہرستیں بطور اطراف بڑی محنت سے لکھی تھیں جن میں صرف بخاری کی فہرست ''النبراس الساری فی اطراف البخاری'' کے نام سے چھپی ہے۔ مرحوم نے مجھے لکھا تھا کہ مسند ابن حنبل کی بھی ایک فہرست بنائی ہے اور وہ اس کے چھپوانے کی فکر میں تھے۔ کیا اچھا ہو اگر ان کی یادگار میں ان کی یہ کتاب گوجرانوالہ کے قدردان چھپوا سکیں یا وہ اس نسخہ کو کسی قدرشناس کے سپرد کریں کہ اس کو چھپوا کر اس فیض کو عام کرے''۔

مولانا عبد العزیزؒ ۱۹۳۶ء میں بیمار ہوگئے اور خطابت و اہتمام کے فرائض کی ادائیگی سے معذوری کے بعد اپنے گاؤں چلے گئے جہاں ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا عبد العزیزؒ کے بعد ان کے بھتیجے اور داماد مولانا مفتی عبد الواحدؒ فاضل ڈابھیل نے جامع مسجد کی خطابت اور مدرسہ انوار العلوم کے اہتمام کے فرائض سنبھال لیے جو اب تک سرانجام دے رہے ہیں۔ البتہ جامع مسجد کی خطابت میں

۱۹۶۹ء سے راقم الحروف نے ان کے نائب کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں اور مولانا عبدالواحدؒ پر فالج کے حملے کے بعد سے مستقل خطیب کے طور پر فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔

(ادبی مجلہ مہک ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء)

حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ

مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ (تاریخ وفات: ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ اور برصغیر کی تحریک آزادی کی جدوجہد میں ایک بڑا نام ہے جبکہ اپنے خاندانی پس منظر میں اس نام کی بڑائی اور زیادہ نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔ مولانا لدھیانویؒ کا تعلق علماء لدھیانہ کے اس خاندان سے ہے جسے تاریخ میں اپنے امتیازات کا ادراک و احساس بھی ہے اور اس پر بجا طور پر فخر بھی ہے جس کا اظہار مختلف حوالوں سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

- بتایا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد کا فتویٰ سب سے پہلے اسی خاندان کے بزرگ مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ نے دیا تھا۔ اور صرف فتویٰ ہی نہیں دیا بلکہ اپنے بیٹوں اور رفقاء سمیت اس جنگ میں عملاً حصہ بھی لیا تھا۔
- یہ بات بھی تاریخ کے ریکارڈ میں ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جب اپنی خودساختہ نبوت کے لیے پر پرزے نکالنے شروع کیے تو اس کے کفر کا فتویٰ بھی سب سے پہلے اسی خاندان کے بزرگ مولانا محمد لدھیانویؒ نے صادر کیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب برصغیر کے بعض اکابر علماء کرام کو مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگانے میں اپنی تحقیق کی بنیاد میں ابھی تردد تھا اور لدھیانوی علماء سے ان کے اس سلسلے میں مباحثے بھی ہوئے تھے۔
- پھر یہ خاندان اس بات کو بھی اپنے تاریخی امتیاز اور اعزاز کے طور پر بیان کرتا ہے کہ برصغیر کی آزادی کی جدوجہد میں غیر مسلم ہم وطنوں، بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل پر بہت سے دینی وعلمی حلقوں میں تحفظات پائے جاتے تھے اور غیر مسلموں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک چلانے کو عام طور پر شرعی حوالوں سے درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت و شرکت کے جواز کا فتویٰ بھی اسی خاندان نے سب سے پہلے دیا تھا جس کی پاسداری اس خاندان کے علماء نے قیام پاکستان تک پورے حوصلے کے ساتھ کی۔
- مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ کی قیادت میں جب تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا تو یہ

برصغیر کی پہلی سیاسی تحریک تھی جو آئندہ چل کر نصف درجن کے لگ بھگ سیاسی تحریکوں کی نرسری ثابت ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ اس کے اہم رہنماؤں میں سے تھے اور پنجاب خلافت کمیٹی کے سربراہ تھے۔ جب تحریک خلافت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد پنجاب میں تحریک خلافت کے رہنماؤں نے ''مجلس احرار اسلام'' کے نام سے نئی مورچہ بندی کی تو مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ اس کے پہلے سربراہ چنے گئے اور انہوں نے سالہا سال تک اس حیثیت سے آل انڈیا مجلس احرار اسلام کی قیادت کی۔

تحریکی وسیاسی تگ و تاز کے دوران اپنے معاصرین کے ساتھ ان کی ملاقاتیں بھی رہیں اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ان میں علماء کرام بھی ہیں، سیاستدان بھی ہیں، دانشور و مفکرین بھی ہیں اور سماجی رہنما بھی ہیں۔ ان معاصرین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ، مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، مولانا شبیر احمدؒ عثمانی، علامہ محمد اقبالؒ، قائداعظم محمد علی جناحؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، پنڈت جواہر لال نہرو، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور لیاقت علی خانؒ جیسی اہم شخصیات شامل ہیں۔ ان اکابر کے ساتھ مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کی خط وکتابت کو دو طرفہ بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے اور ان کے جوابی خطوط بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط جہاں مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے فکر و نظر کے مختلف زاویوں، جہد و عمل کے اہداف و مقاصد، حکمت و تدبر کے متنوع پہلوؤں، اور حوصلے و استقامت کی بلندیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، وہاں برصغیر کی سیاسی تاریخ کے بہت سے عقدوں کی گرہ کشائی بھی کرتے ہیں۔ جبکہ بعض مواقع پر نئی گرہیں اور عقدے بھی ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں جو کسی بھی غیر جانبدار مؤرخ کے لیے ایک امتحان سے کم نہیں ہیں۔

مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کا شمار تحریک پاکستان کے سرکردہ مخالفین میں ہوتا ہے، حتیٰ کہ تقسیم ہند کے موقع پر وہ مشرقی پنجاب کی ہنگامہ خیز صورتحال کے باعث وقتی طور پر پاکستان آئے اور انہیں حکومت پاکستان کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے یہاں قیام کی پیشکش بھی ہوئی لیکن انہوں نے اس پر معذرت کرتے ہوئے صرف یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی بھجوا دیا جائے جو پوری کر دی گئی۔ اس کے بعد وہ مشرقی پنجاب کے لٹے پٹے مسلمانوں کی بحالی اور دلجوئی میں مصروف ہو گئے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی بتدریج بحالی اور ان کی مساجد و مزارات کی واگزاری کی جانگسل محنت کے علاوہ ان کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی شمار ہوتا ہے کہ پاکستان آنے والے مہاجرین کی جو خواتین اور لڑکیاں سکھوں اور

دیگر غیر مسلموں نے زبردستی روک لی تھیں، انہیں تلاش کرکے ان کے خاندانوں تک پہنچانے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں انہوں نے پاکستان میں ممتاز مسلم لیگی خاتون رہنما صاحبزادی محمودہ بیگم کے ساتھ مل کر ایک نیٹ ورک قائم کیا۔ وہ مشرقی پنجاب میں ایسی لڑکیوں کو تلاش کرکے صاحبزادی محمودہ بیگم کے پاس پہنچاتے تھے جبکہ محمودہ بیگم مرحومہ ان کے خاندانوں کو تلاش کرکے انہیں ان کے سپرد کردیتی تھیں یا بے سہارا ہونے کی صورت میں ان کی کفالت کا انتظام کرتی تھیں۔

مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ تحریک پاکستان کے ان مخالفین میں سے تھے جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنے موقف کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہے۔ ان کے موقف اور رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے جو ہر صاحب نظر کا حق ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا موقف خود ان کی زبان سے پڑھ لیا جائے جو زیر نظر مجموعے میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں ان کے ایک خطاب کے حوالے سے یوں مذکور ہے:

”انگریز ہندوستان سے جارہا ہے مگر اس طور پر کہ ہندوستان کے ٹکڑے اور مسلمان قوم کو تقسیم کرکے۔ تمہیں معلوم ہے کیوں؟ میں تم کو بتاتا ہوں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمان قوم کا سب سے زیادہ حصہ ہے، سب سے زیادہ مشکلات مسلمان قوم نے اٹھائیں، سب سے زیادہ مار مسلمان قوم نے کھائی، سب سے زیادہ نقصان مسلمان قوم کا ہوا۔ وہ اس لیے کہ انگریز نے اقتدار مسلمان قوم سے چھینا تھا۔ قدرتی طور پر شدید ردعمل مسلمان قوم ہی کی طرف سے ہوا۔ ہندو تو ایک ہزار سال سے مسلمانوں کا محکوم تھا، اگر وہ مسلمانوں کی حکمرانی سے نکل کر انگریز کی حکمرانی میں آگیا تھا تو اس پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ محکوموں پر حاکم بدل جانے سے کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ حاکم قومیں غلامی کی ذلت برداشت نہیں کرسکتیں۔ مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ انگریز کو ڈر ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم کہیں پھر سے مجتمع ہو کر قوت نہ بن جائیں اس لیے مسلمانوں کو تین جگہ پر تقسیم کیا جارہا ہے۔

دوسری بات یہ ذہن میں رہے کہ پاکستان انگریز کے چنگل سے نکل کر امریکہ کے چنگل میں چلا جائے گا، اس کے فیصلے امریکہ میں ہوا کریں گے۔ پاکستان انگریز اور امریکہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی سرحدیں افغانستان کے ذریعے روس سے ملتی ہیں۔ روس میں سوشلسٹوں کی حکمرانی ہے۔ نیز روس بذات خود ایک عالمی طاقت کی شکل میں ابھر رہا ہے۔

کانگریس میں جواہر لال نہرو سمیت کئی لیڈر سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ امریکہ کو خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو ہندوستان کی سوشلسٹ حکومت روس کے ساتھ مل کر ایک زبردست بلاک بنالے گی جس کی وجہ سے ایشیا میں امریکہ کا ناطقہ بند ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہندوستان اور روس کے درمیان ایک ایسی ریاست قائم کر دی جائے جس کی وجہ سے یہ دونوں ملک آپس میں مل کر کوئی مضبوط محاذ نہ بنا سکیں۔ پاکستان کی ضرورت صرف اتنی سی ہے۔ جب تک پاکستان امریکہ کی یہ ضرورت پوری کرتا رہے گا قائم رہے گا۔ پاکستان کی بقاء کا مدار مادی طور پر صرف امریکہ کی خوشنودی پر ہے۔

میرے خاندان نے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک انگریز سے آزادی کی جنگ لڑی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انگریز ہندوستان کو تقسیم کر کے جا رہا ہے۔ پاکستان کے لوگوں کو میں صرف اتنا کہوں گا کہ امریکہ کی مخالفت میں اتنا نہ جائیں کہ پھر واپسی ممکن نہ ہو سکے۔ امریکہ کی مخالفت کرو گے تو وہ بھی اپنا مطلب نکل جانے کے بعد پاکستان کے ٹکڑے کر دے گا۔ یاد رکھو! پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہے، اگر اس پناہ گاہ کو کچھ ہوا تو برصغیر کے مسلمانوں کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۳ستمبر ۲۰۱۲ء)

حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ

جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ (تاریخ وفات: یکم جون ۱۹۶۱ء) کا شمار برصغیر کے ان نامور علماء کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے پاکستان بنانے میں حصہ لیا اور قیام پاکستان کے بعد اسے ایک اسلامی جمہوریہ بنانے میں بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ ایک بلند پایہ عالم دین اور نامور صوفی تھے۔ انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی صحبت میں فیض حاصل کیا اور پھر اس فیض کو زندگی بھر بانٹتے رہے۔ ان سے ایک دنیا نے سلوک واحسان کی تربیت حاصل کی اور اس بھٹی سے کندن بننے والوں نے لاکھوں افراد کو رشد وہدایت کا راستہ دکھایا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کا تعلق علاقہ چھچھ سے تھا، زندگی کا بیشتر حصہ امرتسر میں گزر گیا، علوم کی تکمیل دیوبند اور سلوک کی تکمیل تھانہ بھون میں کی، اور رہتی دنیا تک فیض کا باعث بننے والا صدقہ جاریہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں قائم کیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے اکابر کی روایات کے امین تھے، ایک بلند پایہ مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے خلافت کا اعزاز پانے والے عظیم المرتبت صوفی بھی تھے، لیکن اس کے علاوہ ایک ملی اور سیاسی راہنما بھی تھے۔ ان کا حصہ تحریک پاکستان میں بھی نمایاں ہے اور پاکستان بن جانے کے بعد اسے ایک اسلامی ریاست بنانے میں بھی ان کا کردار روشن ہے۔ وہ ان علماء کرام میں سے تھے جنہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہدایت پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمدؒ عثمانی کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام قائم کر کے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا اور اسے کامیابی تک پہنچانے میں سرگرم کردار ادا کیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد اسے سیکولر ریاست بننے سے روکنا اور ایک نظریاتی اسلامی ریاست کی شکل دینا تحریک پاکستان سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ تھا اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کی وفات کے بعد اس درجہ کی قیادت کے خلا نے اس مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دیا تھا۔ اس مرحلہ میں جن شخصیات نے جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم کو متحرک رکھنے کی کوشش کی اور پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کی شکل دینے میں علماء کرام کے کردار کو زندہ رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا، ان میں حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کا نام بہت نمایاں ہے اور ان کا کردار ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے ساتھ اس محاذ پر حضرت مولانا ظفر احمدؒ عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد انصاریؒ، حضرت مولانا اطہر علیؒ، حضرت مولانا محمد متین خطیبؒ اور دوسرے بزرگ بھی سرگرم تھے، اور حضرت مفتی صاحب کو اس قافلہ کے سرپرست اعلیٰ اور بزرگ رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ نے نیلا گنبد میں جامعہ اشرفیہ قائم کیا تو انہیں حضرت مولانا رسول خانؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی رفاقت میسر آگئی جو علم و فضل کی دنیا کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان میں سے ایک اپنے دور میں معقولات کے امام کہلاتے تھے اور دوسرے بزرگ منقولات کے امام کا تعارف رکھتے تھے۔ دونوں اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کرام کے استاذ تھے اور اپنے عظیم اسلاف کی شاندار روایات کے امین ہونے کی وجہ سے ملک بھر کے علماء و طلبہ کی عقیدت و الفت کا مرکز تھے۔ یہ ان تین بزرگوں کی علمی وجاہت اور کردار کی کشش تھی جس نے جامعہ اشرفیہ کو بہت جلد ملک کے بڑے مدارس کی صف میں کھڑا کر دیا اور اب اسے صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ایک جامعہ کا مقام حاصل ہے۔

میں حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کی زیارت نہیں کر سکا البتہ کبھی کبھی ان کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد عبید اللہ المفتی دامت فیوضہم کی ڈرتے ڈرتے اور تعارف کرائے بغیر زیارت کر کے محرومی کو کم کرنے

کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔

(روزنامہ اسلام، ۲۹ اپریل ۲۰۰۷ء۔ روزنامہ پاکستان، ۲۹ اپریل ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا عبد الغنیؒ

مولانا عبد الغنیؒ (سن وفات: ۱۹۶۷ء) دار العلوم دیوبند کے فضلاء میں سے تھے، آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں بیس بگلہ کے ساتھ ''جھڑ'' نامی جگہ کے رہنے والے تھے جسے اب غنی آباد کا نام دے دیا گیا ہے۔ وہ تحریک آزادی کشمیر کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے، ۱۹۴۷ء میں انہوں نے ڈوگرہ شاہی سے آزادی کے لیے نہ صرف خود عملاً جہاد میں حصہ لیا بلکہ علاقہ کے سینکڑوں لوگوں کو اس کے لیے تیار کیا، ان کی عسکری ٹریننگ کا اہتمام کیا اور میدان جہاد میں ان کے شانہ بشانہ شریک جنگ رہے۔

مولانا عبد الغنی ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر سے بھی انہوں نے کچھ عرصہ پڑھا ہے۔....

جس زمانہ میں مولانا عبد الغنیؒ اور ان جیسے سینکڑوں علماء کرام نے مختلف مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی، وہ آج کی طرح کا سہولتوں اور آسائشوں کا نہیں بلکہ جفاکشی اور قناعت کا دور تھا جس کا آج کے طلبہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت والد صاحب اکثر بیان کیا کرتے ہیں کہ جس دور میں وہ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے تھے، یہ ۱۹۴۱ء کے عرصہ کی بات ہے، اس زمانہ میں مدرسہ کے کمروں میں رات کو روشنی کا انتظام نہیں ہوتا تھا اور ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ اپنے لیے تیل کے دیے کا انتظام کر سکیں۔ ادھر اسباق کا مطالعہ بھی ضروری ہوتا تھا۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوبند کی میونسپلٹی راستوں اور گلیوں میں رات کو لیمپ جلایا کرتی تھی تاکہ آنے جانے والوں کو دقت نہ ہو اور ہم سردیوں کی راتوں میں گلی میں کھڑے ہو کر ان لیمپوں کی روشنی میں اپنے اسباق کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

میں نے مولانا عبد الغنی مرحوم کو نہیں دیکھا البتہ بیس بگلہ کئی بار گیا ہوں اور جھڑ میں بھی حاضری دی ہے۔ بیس بگلہ میں ان کا قائم کردہ مدرسہ فیض القرآن آزاد کشمیر کے اہم دینی مدارس میں شمار ہوتا ہے اور اس کے سالانہ اجتماعات میں کبھی کبھی شرکت کا موقع مل جاتا ہے۔ لندن کے علاقہ ساؤتھال میں میرے میزبان حاجی محمد اشرف خان اور حاجی محمد حنیف خان بھی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح اس علاقہ کے علماء کرام کے ساتھ میرے کئی حوالوں سے تعلقات اور مناسبت ہے۔ آزاد کشمیر کے علماء کرام کے ساتھ میرے تعلقات و مراسم تین نسلوں پر محیط ہیں۔ ان میں سے وہ بزرگ بھی ہیں جو حضرت والد

صاحب کے ساتھیوں میں سے ہیں جنہوں نے دار العلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں اکٹھے تعلیم پائی ہے۔ ان میں حضرت مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، حضرت مولانا عبد العزیز تھوراڑوی، حضرت مولانا عبد الحمید قاسمی اور حضرت مولانا مفتی عبد المتین آف تھب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد حضرت والد صاحب کے شاگردوں کی ایک بڑی کھیپ ہے جن میں بہت سے میرے ہم سبق ہیں۔ پھر تیسری کھیپ خود میرے شاگردوں کی بھی ہے جس میں بیسیوں نوجوان علماء مختلف مقامات پر دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لیے آزاد کشمیر کے بہت سے علمی گھرانوں کے ساتھ ہمارے مراسم ایسے ہیں جیسے ایک ہی کنبہ کے افراد ہوں۔

پروفیسر محمد یعقوب شاہق نے "فیض الغنی" میں مولانا عبد الغنیؒ کے ساتھ ساتھ اس دور کے ان ممتاز کشمیری علماء کرام کے حالات کا بھی سرسری تذکرہ کیا ہے جو ڈوگرہ شاہی کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہے ہیں، جنہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں آزاد کشمیر کے اس خطہ میں دینی تعلیم کی شمع روشن کی ہے اور دینی مدارس کا جال بچھا کر نئی نسل تک اسلامی تعلیمات پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۴ اپریل ۲۰۰۱ء)

حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ

(تاریخ وفات: ۲۱/اپریل ۱۹۷۱ء)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بیان کردہ یادداشتیں)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج جس شخصیت کے حوالے سے گفتگو کرنے لگا ہوں وہ صرف ہمارے پاکستان نہیں بلکہ برصغیر کی بڑی علمی اور تحریکی شخصیات میں سے ہیں۔ حضرت مولانا محمد علیؒ جالندھر کے رہنے والے تھے۔ جامعہ خیر المدارس ملتان پہلے جالندھر میں تھا۔ مولانا خیر محمد جالندھریؒ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بڑے خلفاء میں سے تھے، انہوں نے جالندھر میں جامعہ خیر المدارس بنایا تھا۔ مولانا محمد علی جالندھریؒ ان کے خلفاء میں سے تھے اور خیر المدارس میں پڑھاتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جامعہ خیر المدارس ملتان میں منتقل ہوا تو یہاں بھی مولانا محمد علی جالندھریؒ کا جامعہ سے تعلیمی اور مشاورتی تعلق رہا۔ آپؒ تعلیمی طور پر جامعہ خیر المدارس کے اور سیاسی طور پر مجلس احرار اسلام کے آدمی تھے۔ مجلس احرار اسلام ۱۹۲۹ء میں بنی تھی اور اس کے بڑے رہنماؤں میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، شیخ حسام الدین مرحوم، چوہدری افضل حق مرحوم اور بڑے اکابر علماء تھے۔

انہوں نے برصغیر میں اور خاص طور پر پنجاب میں تحریک آزادی کو بیدار اور منظم کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا۔ مولانا محمد علی جالندھریؒ مجلس احرار اسلام میں تھے پاکستان بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے دست راست شمار ہوتے تھے، تحریک آزادی میں بھی اور تحریک ختم نبوت میں بھی۔

مجلس احرار کے دو بڑے مورچے تھے۔ ایک مورچہ آزادی کی جنگ کا تھا جس میں امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ پنجاب کو انگریز کے خلاف بیدار کیا، ان آزادی کے متوالوں نے قربانیاں دیں اور جیلیں کاٹیں۔ شاہ جیؒ نے سات سال جیل کاٹی اور ان کے رفقاء میں سے بھی کسی نے پانچ، کسی نے سات اور کسی نے دس سال جیل کاٹی۔ اور انگریزوں کی جیلوں میں جلوس نکالے، ہنگامے برپا کیے۔ احرار کا طرزِ خطابت ایک مستقل طرزِ خطابت ہے جس میں تین بڑے خطیب اس زمانے میں شمار ہوتے تھے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا گل شیر شہید میانوالویؒ اور مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ۔ ان کے علاوہ ماسٹر تاج الدین مرحوم، شیخ حسام الدین مرحوم اور آغا شورش کاشمیری مرحوم اپنی اپنی طرز کے بڑے خطیب تھے۔ یہ ان کا مورچہ تھا جس پر انہوں نے انگریز کے خلاف وطن کی آزادی کے لیے بڑی جنگ لڑی۔

اور دوسرا بڑا مورچہ تھا لوگوں کو قادیانیت کے خلاف تیار کرنا، پاکستان بننے سے پہلے بھی اور پاکستان بننے کے بعد بھی۔ مولانا محمد علی جالندھریؒ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساتھیوں میں سے تھے، دونوں محاذوں پر تحریک آزادی میں بھی اور تحریک ختم نبوت میں بھی۔ بڑے زیرک، معاملہ فہم اور ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ مجلس احرار میں باقی سارے گرم بندے تھے، دو بندے بہت ٹھنڈے تھے اور سب سے زیادہ مؤثر تھے۔ دھیمی دھیمی، ٹھنڈی ٹھنڈی بات کرنا اور ایسی بات کرنا کہ کمال ہوجائے۔ ٹھنڈے بندوں کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ہمارے استاد مکرم فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیاتؒ دھیمے اور ٹھنڈے مناظر تھے۔ اور ماسٹر تاج الدین انصاری بھی بڑے ٹھنڈے اور دھیمے بندے تھے اور ان کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدمی اگر ریت کی دیوار کھڑی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

مولانا محمد علی جالندھریؒ مدبر، مسلسل متحرک، معاملہ فہم اور ذہین آدمی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۳ء تحریک ختم نبوت میں جن لوگوں نے عملاً کردار ادا کیا ان میں صف اول میں مولانا جالندھریؒ ہیں جنہوں نے ایک ایک آدمی کے گھر جا کر، ایک ایک عالم کا دروازہ کھٹکا کر، تمام مکاتب فکر کو ختم نبوت کے محاذ پر جمع کیا۔

ایک بات درمیان میں یہ عرض کردوں کہ مجلس احرار اسلام نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے اور سارا ملک اکٹھے رہنا چاہیے۔ تحریک پاکستان میں شکست ہوگئی، مسلم لیگ کو کامیابی مل گئی۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس سلسلے میں مجلس احرار اسلام نے دو کام کیے۔

1. امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لاہور میں ایک بہت بڑے جلسے میں اعلان عام کیا کہ چونکہ ہماری رائے قوم نے قبول نہیں کی لہٰذا ہم شکست قبول کرتے ہیں۔ اب پاکستان ہمارا وطن ہے، ہم اس کا دفاع کریں گے اور اس کی حفاظت کریں گے، لیکن اب ہم سیاست میں کام نہیں کریں گے بلکہ دینی محاذ پر کام کریں گے۔ یعنی انہوں نے مجلس احرار کے انتخابی اور سیاسی کردار کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

2. اور دوسرا یہ کہا کہ اب ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد قادیانیت کا تعاقب ہوگا۔ اس کے لیے الگ جماعت "مجلس تحفظ ختم نبوّت" کے نام سے قائم ہوئی جس کے امیر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور اس کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے۔ پھر اس اللہ کے بندے نے قریہ قریہ، بستی بستی گھوم کر جماعت منظم کی۔ ہر بڑے شہر میں مراکز اور دفاتر قائم ہوئے اور مبلغین کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ سب مولانا جالندھریؒ کی محنت ہے کہ انہوں نے ایک زمانے میں مشرقی پاکستان میں بھی مجلس قائم کی، ان کے ساتھ مولانا احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا محمد حیات، مولانا عبد الرحیم اشعرؒ، یہ سب حضرات تھے۔ لیکن ان کو منظم کرنے کے لیے محنت مولانا محمد علی جالندھریؒ نے کی۔ آپؒ مجلس تحفظِ ختم نبوّت کے بانی بھی تھے اور سب سے زیادہ منظم و متحرک بھی۔ مجھے بھی مولانا جالندھریؒ سے نیاز مندی حاصل رہی ہے۔ میں نے جماعتی، تحریکی اور فکری زندگی میں جن لوگوں سے سب سے زیادہ سیکھا ہے ان میں مولانا جالندھریؒ سرِفہرست ہیں۔ کام شروع کیسے کرنا ہے، کس طریقے سے محنت کرنی ہے اور کام سمیٹنا کیسے ہے، ان معاملات میں سب سے زیادہ استفادہ انہیں سے کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا جالندھریؒ کو ایسا مزاج دیا تھا کہ ان کا کوئی پروٹوکول نہیں ہوتا تھا۔ پیدل چل رہے ہوں، تانگے پر بیٹھے ہوں، کار یا بس پر سوار ہوں، جہاز پر سفر کر رہے ہوں، انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، بس اپنے مشن اور پروگرام کی فکر ہوتی تھی کہ اس میں کوئی کمی نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(۱۰ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا رسول خانؒ

(تاریخ وفات: ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

جامعہ اشرفیہ کا آغاز قیام پاکستان کے بعد نیلا گنبد لاہور کی مسجد سے ہوا اور مسجد کے قریب ایک عمارت میں دینی علوم و فیوض کا یہ مرکز قائم کیا گیا۔ میں پہلی بار اس تعلیمی و روحانی تربیت گاہ میں حاضر ہوا تو میرا طالب علمی کا دور تھا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے ہمراہ جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسے کی ایک نشست میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، سن یاد نہیں مگر گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کی بات ہے، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ انتقال فرما چکے تھے، حضرت والد صاحب نے اس نشست سے خطاب کرنا تھا، وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو ایک سادہ سے بزرگ لوگوں سے مخاطب تھے اور سب لوگ، جن میں علماء و طلباء کی اکثریت تھی، مؤدب بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ والد صاحب بھی سامنے ایک طرف بیٹھ گئے اور میں اس بزرگ کی باتیں سننے لگا۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا، چند لمحے خاموشی سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب دیکھا کہ ساری باتیں ہی سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں تو والد صاحب کو توجہ دلا کر پوچھا کہ یہ بزرگ کیا کہہ رہے ہیں؟ والد صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں خاموشی سے بیٹھو اور مجھے تقریر سننے دو۔ میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد والد صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی، انہوں نے مختصر بیان کیا اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ بعد میں والد صاحب نے بتایا کہ یہ حضرت مولانا رسول خان صاحب تھے جو خطاب فرما رہے تھے۔ حضرت مولانا رسول خان کا نام سن رکھا تھا اور ان کی عظمت کا کچھ نقشہ بھی ذہن میں تھا کہ اس دور کے کامل علماء کرام کے استاذ اور معقولات کے امام ہیں، اس لیے ان کی باتیں سمجھ میں نہ آسکنے کی وجہ بھی ذہن میں آ گئی۔

ہمارے ہاں دینی مدارس میں یونانی منطق و فلسفہ کو معقولات کا درجہ حاصل ہے اور اس میں مہارت پر معقولی ہونے کا خطاب ملتا ہے۔ مجھے اس سے کبھی مناسبت نہیں رہی اور اس حوالے سے اپنے حلقوں میں ہمیشہ "نامعقول" سمجھا جاتا رہا ہوں۔ حتیٰ کہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد عبید اللہ المفتی دامت برکاتہم ایک سال سالانہ امتحان کے لیے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تشریف لائے تو میری کلاس کا قطبی کا امتحان ان کے سپرد کر دیا گیا جو یونانی منطق کی زیر درس کتابوں میں سب سے مشکل سمجھی جاتی ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ کا شمار اس فن کے ائمہ میں ہوتا ہے جبکہ امتحان دینے والا میں تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ صفر کی شکل میں ہی ہونا تھا۔ چنانچہ وہ زیرو اب تک ذہن میں تازہ ہے اور مجھے اپنی نالائقی

کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ خیر، بات حضرت مولانا رسول خان کی ہو رہی تھی۔ میں نے جامعہ اشرفیہ میں اپنی پہلی حاضری کے موقع پر سب سے پہلے ان کی زیارت کی اور ان کے ارشادات سے سماع کی حد تک مستفید ہوا، اس لیے وہ منظر اب تک ذہن کی سکرین پر موجود ہے اور اس کو سامنے لا کر کبھی کبھی حظ اٹھاتا ہوں۔ حضرت مولانا رسول خانؒ صاحب ہمارے ہم وطن تھے، وہ ضلع مانسہرہ میں اچھڑیاں نامی بستی کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی قبر ہے۔ ہمارا گاؤں بھی وہی ہے اور ہماری برادری اچھڑیاں میں اور اس کے ارد گرد اب بھی آباد ہے۔ اس کے بعد ان کی خدمت میں کئی بار حاضری ہوئی اور مشفقانہ دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔

(روزنامہ پاکستان۔ ۲۹ اپریل ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا لال حسین اخترؒ

۱۱ جون کو صبح ابھی اسباق سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ لاہور دفتر سے فون پر یہ روح فرسا خبر ملی کہ شہنشاہِ اقلیمِ مناظرہ اور مجاہدِ جلیل حضرت مولانا لال حسین اختر صاحب امیر مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان جہانِ فانی سے رخصت ہو کر رب حقیقی سے جا ملے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا۔ جنازہ کے بارہ میں اطلاع ملی کہ صبح ۹ بجے دہلی دروازہ لاہور میں ادا ہوگا۔ اطلاع اور جنازہ کے درمیان بس اتنا ہی وقفہ تھا کہ بمشکل گوجرانوالہ سے لاہور پہنچا جا سکتا تھا، مگر احباب کو مطلع کرتے کرتے تاخیر ہوگئی اور جب ہم دہلی دروازہ لاہور پہنچے تو حضرت مرحوم کے ہزاروں مداح حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کر چکے تھے۔

جس مرد مجاہد نے اسلام کی حقانیت کے اظہار کے لیے زندگی وقف کر رکھی تھی، جس نے یورپ افریقہ اور ایشیا کے بت کدوں میں اذانیں دی تھیں اور جس کے نام سے بڑے بڑے غیر مسلم، ملحد، زندیق اور مرتد لرزتے تھے آج دہلی دروازہ میں سوگواروں کے درمیان ابدی نیند سو رہا تھا اور ہزاروں اشکبار آنکھیں اپنے مرحوم قائد کو آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھیں۔ سوگواروں میں ایک طرف مرشدی و مولائی حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب، حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحب اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی معیت میں مولانا مرحوم کی خدمات کا تذکرہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف حضرت مولانا سید انور حسین صاحب نفیس رقم، خلیفہ مجاز حضرت رائے پوریؒ کی زندگی کے آخری ایام میں شرف خدمت حاصل کرنے کا ذکر بڑے فخر سے کر رہے تھے۔ اور واقعی یہ

جامعہ مدنیہ کے مہتمم حضرت مولانا حامد میاں صاحب مدظلہ اور حضرت نفیس شاہ صاحب کی خوش بختی ہے کہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مناظر کی زندگی کے آخری ایام ان کے ہاں گزرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خدمت کی سعادت بخشی۔

جمعیۃ علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام اور دیگر دینی جماعتوں کے کارکن بھی جمع تھے جن میں بہت سے حضرات ہماری طرح اطلاع دیر سے ملنے کی وجہ سے جنازہ کے وقت تک نہ پہنچ سکے تھے۔ مرشدی حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب مدظلہ کی امامت میں ہم لوگوں نے دوبارہ نماز جنازہ ادا کی اور پھر حضرت مرحوم کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ علوم وفنون کا ایک تلاطم خیز طوفان ساکن ہو چکا ہے اور رب قدیر کی قدرت کہ دنیا بھر کے مذاہب کے مناظروں کو پانچ منٹ میں چپ کرا دینے والا اسلام کا بے باک مبلغ آج اللہ رب العزت کی تقدیر کے سامنے خاموش لیٹا ہوا تھا۔

حضرت مرحوم کی مجاہدانہ زندگی کے نقوش ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے اور زندگی کے جو چند خوش نصیب لمحات مناظر اسلام مرحوم کی معیت وصحبت میں گزرے تھے اور مختلف اوقات میں مرحوم کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہونے کا جو موقع ملا تھا ایک ایک کر کے سارے لمحات یاد آتے گئے۔ ان کا استدلال، طرز تکلم، حوالہ جات کی بھرمار اور مخالف مناظر پر دلائل سے مسلح یلغار، سادگی، اکابر کے ساتھ بے پناہ عشق، امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساتھ والہانہ عقیدت، ساتھیوں پر شفقت، اسلام کی تبلیغ کی خاطر دور دراز کے سفر، کفر وارتداد کے مقابلہ میں نمایاں کامیابیاں، اور الحاد وزندقہ پر بے پناہ رعب۔ یہ کیسی کیسی خوش بختیاں تھیں جو مناظر اسلام مرحوم کے حصہ میں آئی تھیں۔ جس مرد قلندر کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی خصوصی توجہات کے قابل سمجھا اور جس درویش کو قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے مولانا مودودی کے ساتھ ان کے متنازعہ عقائد پر بحث ومناظرہ کے لیے اپنا معتمد علیہ قرار دے کر ان کی شکست کو اپنی شکست اور ان کی فتح کو اپنی فتح قرار دیا، اور جس مرد حر کے لیے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ نے خصوصی دعائیں فرمائیں۔ اس کی خوش نصیبی اور خوش بختی کے کیا کہنے۔

آج وہ درویش مسکرا رہا تھا کہ اسے اپنے محبوب اکابر واسلاف کی معیت نصیب ہونے والی تھی اور وہ آج پھر حضرت تھانویؒ، امیر شریعت، مولانا قاضی احسان احمدؒ، شیخ حسام الدینؒ، حضرت لاہوریؒ، حضرت رائے پوریؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، اور پھر سب سے بڑھ کر شیخ العرب والعجم حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی مبارک مجلس کے مزے لوٹنے جا رہا تھا۔ مگر اس مرد حق آگاہ کے خدام چارپائی کے

گرد گھیرا ڈالے سوچ رہے تھے کہ اب کون ہزاروں لاکھوں کے اجتماع میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ چیلنج دیا کرے گا کہ

"کسی ماں نے ایسا لال نہیں جنا جو اسلام کے سوا کسی اور مذہب کی صداقت پر میرے سامنے پانچ منٹ بھی گفتگو کر سکے"۔

آج یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی، حق مغفرت فرمائے عجب آزاد مرد تھا۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۲ جون ۱۹۷۳ء)

حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ

مناظر اسلام حضرت مولانا لال حسین اخترؒ اور خورشید المشائخ حضرت مولانا پیر خورشید احمدؒ کے وصال کے کچھ وقفہ بعد ہی شیر سرحد، مجاہد ملت اور بطل حریت حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ بھی داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ اس قافلۂ حریت کی باقیات صالحات میں سے تھے جس نے لہو کے چراغ جلا کر اس ملک میں آزادی اور مذہب کے متوالوں کو شعور کی روشنی بخشی اور اپنا سب کچھ لٹا کر قوم کی متاع مذہب و حریت کو لٹنے سے بچایا۔

مفتیٔ اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعیدؒ اور مجاہد اعظم حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی قیادت و معیت میں حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ نے استخلاص وطن کی مقدس تحریک میں جو عظیم کردار ادا کیا اور پھر آزادیٔ وطن کے بعد قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مفتی اعظم مولانا مفتی محمود، بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور بطل حریت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کی معیت میں اسلامی نظام و آئین کی جدوجہد کو جس پامردی اور جرأت کے ساتھ پروان چڑھایا وہ سید صاحبؒ ہی کا حصہ ہے۔

آج کا مصلحت پرست پریس سید صاحبؒ اور ان کے قافلہ کے عظیم کردار کو مخفی رکھنے اور مسخ کرنے میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے کے باوجود مستقبل کے مؤرخ کو حقیقت بیان کرنے سے روک نہیں سکے گا۔ اور جب بھی مؤرخ نے برصغیر میں استخلاص وطن اور پاکستان میں اسلامی آئین کی جدوجہد کو عدل و انصاف کے ساتھ سپرد قلم کرنا چاہا اسے مولانا سید گل بادشاہؒ کی عظیم خدمات اور بے مثال قربانیوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اور اس کا قلم، اگر مصلحت بینی کا شکار نہ ہوا تو، یہ لکھنے پر مجبور ہو گا کہ یہ وہ قافلۂ عزم و ہمت تھا جس کے اخلاص و بے سروسامانی نے فرنگی سامراج کو شکست سے دوچار کیا اور یہی وہ گروہ تھا جسے ہر بیرونی واندرونی

باطل نے اپنی راہ میں ناقابل شکست چٹان پایا۔

آج مولانا سید گل بادشاہؒ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی مجاہدانہ زندگی ایک کھلی کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ زندگی دعوت وعزیمت کی تابندہ مثال اور جرأت واستقلال کا درخشندہ مظہر ہے۔ یہ زندگی اخلاص، ایثار، جرأت اور عمل پیہم کا حسین امتزاج اور ایک مرد مومن کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مرد مومن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم کارکنوں کو ان کی زندگی سے سبق حاصل کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء)

حضرت مولانا محمد یوسف الحسینیؒ

ختم نبوت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چنیوٹ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ لائل پور سے فون پر یہ روح فرسا خبر ملی کہ جمعیۃ علماء اسلام ضلع لائل پور کے امیر اور بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد یوسف الحسینیؒ عالم فانی سے رحلت فرما گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ کا جو وقت بتایا گیا اس پر گوجرانوالہ سے لائل پور پہنچنا مشکل تھا اس لیے سیدھا چنیوٹ پہنچ گیا اور قائد محترم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ کے خطاب سے بہرہ ور ہو کر دوسرے روز ظہر کے وقت برادرم مولانا سعید الرحمان علوی اور برادرم مولانا عزیز الرحمان خورشید مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت کی معیت میں جامع مسجد لائل پور حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادگان سے تعزیت کے لیے حاضری دی۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد زبیر الحسینی جو خود بھی اچھا لکھنے والے اور سماجی کارکن ہیں اور حافظ محمد زہیر الحسینی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر تک حضرت مرحوم کے ذکر خیر کی یہ محفل جمی رہی اور پھر دعائے مغفرت پر اختتام پذیر ہوئی۔ چونکہ مجھے مفتی صاحب مرحوم کے فیوضات سے براہ راست بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں مل سکا اس لیے اسی محفل کے تاثرات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مولانا محمد یوسف الحسینیؒ کم وبیش ۷۳ سال قبل ضلع جالندھر کے مشہور شہر نکودر میں پیدا ہوئے، ان کے والد میاں امام الدین صاحب زمیندار تھے۔ مولانا محمد یوسفؒ کو ابتداء سے ہی علم دین کا شوق تھا، مولانا محمد عبد اللہ لدھیانوی حال گوجرانوالہ کی ایک تقریر سے یہ شوق جذبہ کی صورت اختیار کر گیا انہی کے مشورہ سے گھر بار چھوڑ کر کسی کو بتائے بغیر دیوبند چلے گئے۔ تین چار سال تک گھر والوں کو کچھ پتہ نہ چلا، ایک دفعہ بیمار ہوئے تو ساتھیوں اور اساتذہ نے پتہ پوچھ کر گھر اطلاع کر دی تب گھر والوں کو علم ہوا کہ محمد یوسف دارالعلوم

میں علم دین حاصل کر رہا ہے۔ ان کے تایا دیوبند سے انہیں واپس لے جانے کے لیے آئے مگر انہوں نے انکار کر دیا، گھر سے خطوط آتے مگر آپ انہیں پڑھے بغیر محفوظ کر دیتے، دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تمام خطوں کو پڑھا اور اس طویل عرصہ کے دوران کے گھریلو حالات سے آگاہی حاصل کی۔

مولانا مرحوم نے دورۂ حدیث خاتم المحدثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سے کیا، فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کیا اور ٹیچر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے جموں میں اور اس کے بعد بنگلہ ضلع جالندھر میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی سے بیعت ہوئے۔ حضرت مدنی کا معمول یہ تھا کہ رمضان شریف آسام میں گزارتے تھے۔ مولانا محمد یوسفؒ نے بھی یہ مبارک مہینہ اپنے شیخ کی خدمت میں گزارنے کا معمول بنالیا اور حضرت شیخؒ کے ساتھ اکثر اسفار میں شامل رہتے۔ سرکاری تعطیلات کا اکثر حصہ بھی حضرت شیخ مدنی کی خدمت میں گزرتا، اس طرح مفتی صاحبؒ نے جی بھر کر اپنے یگانہ روزگار شیخ کے فیوضات سے استفادہ کیا۔

سرکاری ملازمت کے دوران بنگلہ میں قادیانیت کے خلاف تبلیغی محاذ قائم کیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے شبانہ روز جدوجہد کی۔ اسی دوران ایک قادیانی گھرانہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا جو ان دنوں جڑانوالہ میں آباد ہے۔ قادیانیت کے خلاف سرگرم جدوجہد پر سرکار کی طرف سے بار بار جواب طلبی اور پھر معطلی کا نوٹس ملا۔ حضرت شیخ مدنی نے اپنے مکتوب میں فرمایا کہ

"اسے مشیت ایزدی سمجھیں اور مشن کو نہ چھوڑیں"۔

چنانچہ آپ نے شیخ کے ارشاد کے مطابق ملازمت کو مشن پر قربان کر کے ایمانی غیرت و حمیت کی لازوال مثال قائم فرمائی۔ مولانا محمد یوسفؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کے دوران ایک سکھ نے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر آپ ہی سے دین کا علم حاصل کیا۔ یہ مولانا ہدایت اللہ نومسلم تھے جو حضرت مدنی سے بیعت ہوئے اور اسلام کے پرجوش مبلغ بنے، گزشتہ سال ان کا انتقال ہو گیا۔ قادیانی خلیفہ حکیم نور الدین کے نواسے اور قرآنی مضامین کے بارے میں شاندار کتاب "تسہیل الفرقان" کے مصنف مولانا ابوالبشیر محمد حسین پالوا کراچی نے بھی آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ الغرض آپ کی تبلیغی خدمات مثبت اور دور رس تھیں۔

مولانا محمد یوسف الحسینیؒ کی شادی بھی عجیب انداز سے ہوئی۔ حضرت مدنی کے قریبی ساتھی حکیم مشتاق احمد سہارنپوری نے بیٹی کے لیے حضرت مدنی سے رشتہ کی تلاش کا ذکر کیا۔ شیخؒ نے فرمایا میری نظر میں ایک مناسب رشتہ ہے، حکیم صاحبؒ فرمانے لگے بس حضرت فیصلہ ہو گیا۔ حضرت مدنی نے مولانا محمد یوسفؒ کو

بلایا اور ایک مبارک تقریب میں شادی کی سنت انجام پائی۔ اس تقریب میں امیر التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ بھی شریک تھے۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا محمد یوسفؒ اپنے شاگرد مولانا ہدایت اللہؒ تومسلم کی دعوت پر میاں چنوں گئے اور ایک صاحب کے ساتھ اشتراک کر کے کاروبار شروع کر دیا مگر یہ کاروبار انہیں راس نہ آیا اور اس کے خسارے میں گھر کا سامان تک بیچنا پڑ گیا۔ کاروبار کی لائن چھوڑنے کے بعد مولانا غلام حیدر (مبلغ تحفظ ختم نبوت اسلام آباد) کے مشورہ سے لائل پور آ گئے اور ایم سی ہائی سکول، پھر سٹی مسلم ہائی سکول میں ملازمت اختیار کر لی جس کا سلسلہ وفات سے سات سال قبل تک جاری رہا۔

۱۹۵۲ء میں مرکزی جامع مسجد میں نائب خطیب کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا، صبح کا درس، فجر اور مغرب کی نماز اور خطیب کی عدم موجودگی میں خطبہ جمعہ آپ کے ذمہ تھا۔ مرض الوفات تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا۔ دوسرے مقامات سے لوگوں نے زیادہ تنخواہ اور سہولتوں کی پیشکشیں کیں مگر آپ نے آخر دم تک کوئی پیشکش قبول نہ کی اور اسی مسجد کے جیسے تیسے رہائشی مکان میں زندگی گزار دی۔

اکابر کے ساتھ محبت وعشق تو مولانا مرحوم کو شروع سے تھا اسی جذبہ کے ساتھ اکابر واسلاف کی یادگار جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ وابستہ رہے۔ لائل پور میں جمعیۃ کی تنظیم نو میں آپ کے فرزند حافظ محمد زہیر الحسینی پیش پیش تھے۔ جمعیۃ کی تنظیم مکمل ہوئی تو مولانا محمد یوسفؒ کو امیر ضلع منتخب کیا گیا اور آخر دم تک آپ امیر ضلع کی حیثیت سے جماعتی کارکنوں کی سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا محمد یوسفؒ کی زندگی سادگی، علم دوستی، وضعداری، مشن کے ساتھ لگاؤ، اکابر سے والہانہ محبت اور دین وملت کی بے لوث خدمات کا جیتا جاگتا مظہر تھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ اور سانچہ میں ڈھالنے کی سعی فرمائی۔ مولانا صاحب مرحوم کے چار لڑکے ہیں۔ محمد زبیر الحسینی، محمد زہیر الحسینی، محمد عمیر الحسینی اور حسین احمد۔ اول الذکر دونوں حافظ القرآن ہیں اور زہیر الحسینی صاحب ایک سماجی کارکن اور اچھا لکھنے والے کے طور پر لائل پور کے سماجی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں متعارف ہیں۔ مولانا محمد عمیر الحسینی نے جامعہ مدنیہ لاہور سے دورۂ حدیث کیا، ان کے علاوہ ایک صاحبزادی بھی ہیں جو شادی شدہ ہیں۔

الغرض مولانا محمد یوسفؒ نے ساری زندگی اکابر کی پیروی اور حق وصداقت کی آبیاری میں گزار دی اور اس راہ میں مشکلات ومصائب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس حالت میں خالق حقیقی سے جا ملے کہ زمانہ اپنی تمام ترفتنہ سامانیوں کے باوجود مرتے دم تک آپ سے اکابر کا دامن اور قافلۂ حق کی رفاقت نہ چھڑا سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں خصوصی رحمتوں اور برکتوں سے نوازیں اور ان کے چاروں بیٹوں کو اور ہم سب کو ان کے نقش

قدم پر چلتے ہوئے دین حق کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۸ فروری ۱۹۷۴ء)

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

(۱)

ملک کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے سابق مدرس حضرت مولانا الحاج محمد ادریس کاندھلویؒ ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء بروز اتوار صبح ۵ بجے انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم ایک عظیم مدرس، یگانہ روز خطیب، قابل صد فخر محدث و مفسر اور ایک مایہ ناز مصنف تھے۔ زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں گزارا اور ایک عرصہ سے جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کے روحانی فرزند پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی علمی تصانیف بڑے شوق اور ذوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ تصانیف میں حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کی ضخیم شرح آپ کا علمی شاہکار ہے جبکہ ختم نبوت، حیات مسیحؑ وغیرہ اہم مباحث پر آپ کی گراں قدر تصانیف علمی دنیا کا عظیم سرمایہ ہیں۔ مولانا مرحوم حضرت العلام السید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے ایک تھے جبکہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے روحانی نسبت حاصل تھی اور قومی و ملکی مسائل میں حضرت حکیم الامتؒ کا ہی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

کچھ دنوں سے حضرت مرحوم کی صحت بتدریج کمزور ہوتی جا رہی تھی اور بڑھاپے، بیماری اور دماغی محنت نے آپ کو تھکا دیا تھا، حتیٰ کہ وہ وقت موعود آ گیا جس سے کسی صورت مفر نہیں۔ مولانا کی وفات پر لاہور اور بیرون لاہور ہر جگہ غم و افسوس کا اظہار کیا گیا اور لوگ مختلف مقامات سے جنازہ میں شرکت کے لیے آئے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی اور صوبائی رہنماؤں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، مولانا مفتی محمود، مولانا عبید اللہ انور اور مولانا سید نیاز احمد گیلانی نے حضرت کاندھلویؒ کی وفات پر سوگوار خاندان سے تعزیت کرتے ہوئے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور دعا کی ہے کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ نماز جنازہ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد مالک صدیقی نے پڑھائی اور اس کے بعد ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲ اگست ۱۹۷۴ء)

(۲)

میں حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کی زیارت نہیں کر سکا لیکن کبھی کبھی ان کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد عبید اللہ المفتی دامت فیوضھم کی ڈرتے ڈرتے اور تعارف کرائے بغیر زیارت کر کے محرومی کو کم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ البتہ ان کے بعد جامعہ اشرفیہ میں شیخین کا درجہ حاصل کرنے والے دونوں بڑے بزرگوں امام المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ اور امام المنقولات حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی زیارت اور ان کی باتوں سے خوشبو حاصل کرنے کا کئی بار موقع ملا ہے۔ حضرت مولانا رسول خاںؒ کے ایک پوتے مولانا قاری عبد الرشید رحمانی میرے قریبی دوستوں میں سے ہیں جو برطانیہ میں کراولی کی جامع مسجد میں کئی سالوں سے خطابت و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، میں جب بھی برطانیہ جاتا ہوں ان کی میزبانی سے فیض یاب ہوتا ہوں۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی زیارت پہلی بار جامع مسجد نیلا گنبد لاہور میں ہوئی جہاں مجھے میرے ایک دوست جمعہ پڑھنے کے لیے لے گئے، یہ گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کی بات ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ خطاب فرما رہے تھے اور معجزات پر ان کا بیان ہو رہا تھا۔ ان کا انداز بیان ایسا دل نشیں تھا کہ ایک ایک لفظ دل میں اتر رہا تھا چنانچہ وہ منظر بھی اب تک یاد ہے۔ حضرت مولانا کاندھلویؒ ایک بار ہمارے ہاں گکھڑ بھی تشریف لائے اور مرکزی جامع مسجد میں بیان فرمایا۔ اس موقع پر والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے بتایا کہ مولانا کاندھلویؒ ان کے استاذ ہیں اور انہوں نے غالباً مؤطا امام مالک مولانا کاندھلویؒ سے پڑھی تھی۔ اپنی سادگی، قناعت اور زہد و تقویٰ کے حوالے سے فی الواقع وہ اس دور کے بزرگ نہیں لگتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پچھلی صدی کے کوئی بزرگ ہمیں اس دور کا نمونہ دکھانے کے لیے ہمارے پاس بھیج دیے گئے ہیں۔

مولانا کاندھلویؒ کی خدمت میں ایک حاضری اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ یاد ہے۔ میں اپنے ایک دوست اور جامعہ اشرفیہ کے فاضل مولانا قاری یوسف عثمانی کے ہمراہ ان کے در دولت پر حاضر ہوا۔ میرا معمول ہے کہ بزرگوں کی خدمت میں حاضری ہوتی ہے تو اپنا تعارف کرا کے خواہ مخواہ تکلف کا ماحول پیدا کرنے سے گریز کرتا ہوں اور خاموشی کے ساتھ استفادے کو ترجیح دیتا ہوں۔ انہوں نے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے عثمانی صاحب کو تعارف کرانے سے روک دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ان دنوں جمعیۃ علماء اسلام کے ذمہ دار حضرات میں سے تھا اور یہ تعارف حضرت مولانا کاندھلویؒ کے ہاں کوئی مثبت تعارف شمار نہیں ہوتا تھا۔ میں نے خود ہی گول مول سا تعارف کرایا کہ ایک مدرسے میں پڑھاتا ہوں۔

پوچھا کہ کون سی کتابیں پڑھاتے ہو؟ میں نے بتایا تو بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ اس بات پر ان کی خوشی قابل دید تھی ایک نوجوان مولوی مدرسے میں پڑھاتا ہے اور اس کے زیر درس یہ کتابیں ہیں، اس خوشی میں انہوں نے زمزم پلایا کھجوریں کھلائیں اور اپنی تصنیف سیرۃ المصطفیٰ کی ایک جلد ہدیہ کے طور پر عطا فرمائی۔ پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! مجھے خوشی ہوئی کہ تم پڑھاتے ہو، اس لیے کہ آج پڑھانے کا ذوق کم ہو گیا ہے اور نوجوان علماء پڑھانے کی بجائے خطابت اور دیگر مشاغل پر زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ پھر انہوں نے چند نصیحتیں بھی فرمائیں اور دعا کے ساتھ رخصت کیا۔

(روزنامہ پاکستان۔ ۲۹ اپریل ۲۰۰۷ء)

الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم

(سن وفات: ۱۹۷۷ء)

(۱)

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ مرحوم نے مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں مولانا سراج الدین احمدؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ گکھڑ کے قریب بستی جلال کے رہنے والے تھے۔ اسی زمانہ میں گکھڑ کے قریب دو بستیوں ترگڑی اور تلونڈی کھجور والی کے دو اور غیر مسلم بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک شیخ عبد الرحیم جو ضلع گوجرانوالہ کے معروف صنعت کار الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم (گتہ مل والے) کے والد محترم تھے، وہ ترگڑی کے رہنے والے تھے اور ہندو تھے۔ جبکہ دوسرے باوا جی شیخ عبد الحق جو ہندو پنڈت تھے اور تلونڈی کھجور والی میں ایک دھرم شالہ چلاتے تھے۔ یہ گرو اور چیلہ دونوں اکٹھے مسلمان ہوئے اور ان دونوں نے بھی گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں مولانا سراج احمدؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ باوا جی عبد الحقؒ تو مسجد ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ قرآن کریم پڑھا، دینی تعلیم حاصل کی اور مرکزی جامع مسجد کے امام مقرر ہو گئے جہاں وہ تقریباً نصف صدی تک نماز پڑھاتے رہے۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم اسی جامع مسجد میں باوا جی عبد الحق سے حاصل کی۔ باوا جی مرحوم مستجاب الدعوات بزرگ تھے اور لوگ دور دور سے ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آیا کرتے تھے۔

باوا جی عبد الحقؒ خود تو جامع مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے لیکن اپنے شاگردوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور شیخ عبد الرحیم مرحوم کو انہوں نے قرآن کریم اس انداز سے

پڑھایا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ ان کا ایسا رشتہ جوڑا کہ دونوں بزرگ اس خطہ میں بلکہ بہت وسیع دائرہ میں قرآن کریم کی تعلیم واشاعت کی عظیم جدوجہد کی علامت بن گئے۔

پنجاب میں عمومی سطح پر قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر عام لوگوں کو سنانے اور پڑھانے کا اس دور میں ذوق نہیں تھا اور اس کا آغاز حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے اس دور میں کیا جب انہیں آزادیٔ ہند کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ساتھ کام کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور لاہور میں لا کر اس شرط کا پابند کیا گیا کہ وہ لاہور کی حدود سے باہر نہیں نکلیں گے اور اپنی نقل و حرکت سے حکومت کو باخبر رکھیں گے۔ انہوں نے اپنے عظیم استاذ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت باوا جی عبد الحقؒ کے حکم کی تعمیل میں قرآن کریم کے عمومی درس اور ترجمہ و تفسیر کا آغاز کیا اور آج پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، وسطی ایشیا اور بہت سے ممالک میں ان کے ہزاروں شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔

جبکہ شیخ عبد الرحیم نے ایک نئی مہم کا آغاز کیا، انہیں قدرت کی طرف سے یہ ذوق ودیعت ہوا تھا کہ عام مسلمانوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کے لیے انہیں تیار کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کریم کی تلاوت، قراءت اور حفظ کی حوصلہ افزائی شروع کی اور اپنے محدود وسائل کے ساتھ وہ قرآن کریم پڑھنے والوں کو وظیفہ اور انعامات دیتے رہے۔ اس مشن کو ان کے بیٹے سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے آگے بڑھایا۔ وہ کاروباری لحاظ سے بھی بہت آگے نکل چکے تھے اور راہوالی کی گتہ فیکٹری کے مالک تھے جو ایک زمانہ میں ضلع گوجرانوالہ کی بڑی ملوں میں شمار ہوتی تھی۔ سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس مہم پر صرف کرنا شروع کیا کہ مسجدوں میں قرآن کریم پڑھانے کے لیے مستند قاری رکھے جائیں اور صحیح تلفظ اور تجوید کے ساتھ بچوں کو قرآن کریم پڑھایا جائے۔ اس کے لیے وہ قاری صاحب کی تنخواہ کا نصف تہائی یا چوتھائی حصہ، جو بھی مسجد کی انتظامیہ کے ساتھ طے پاجاتا، اپنی طرف سے ادا کرتے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ تعلیم القرآن ٹرسٹ قائم کیا جس کے تحت ۱۹۷۰ء تک پاکستان کے مختلف شہروں میں چار سو سے زائد مدارس ایسے تھے جن میں قرآن کریم کی تعلیم دینے والے قراء اور حفاظ کی تنخواہوں کا کم و بیش ایک تہائی حصہ اس ٹرسٹ کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے ریکارڈ کے مطابق تعلیم القرآن ٹرسٹ کے تعاون سے چلنے والے تعلیم القرآن کے چار سو سے زائد مدارس میں اس وقت ساڑھے سات سو سے زیادہ قاری بطور استاذ کام کر رہے تھے اور تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد ا۷ ہزار سے زائد تھی، جبکہ حفظ قرآن کریم کے بعد تجوید و قراءت اور قراء کی تیاری کے لیے تعلیم

القرآن ٹرسٹ کے تحت مانسہرہ میں معہد القرآن الکریم کے نام سے مستقل ادارہ قائم کیا گیا جو ۱۹۶۲ء سے مسلسل کام کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ تعلیم القرآن ٹرسٹ نے اسکولوں میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مہیا کرنے کی اسکیم شروع کی جس کے تحت جو اسکول اس تعاون کو قبول کرتے، انہیں ٹرسٹ کی طرف سے قاری مہیا کر دیا جاتا۔ اس پروگرام میں ۱۹۷۰ء تک ایک سو سے زائد اسکولوں میں ایک سو بائیس قاری مہیا کیے جا چکے تھے۔ مگر اس سے کہیں زیادہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سعودی عرب بلکہ حرمین شریفین میں بھی حفظ قرآن کریم کے مکاتب کا آغاز سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کی تحریک سے ہوا، ورنہ اب سے چالیس برس قبل تک سعودی عرب میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے باقاعدہ مدارس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سیٹھی صاحب مرحوم ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے کراچی کے ایک دینی مدرسہ میں مکہ مکرمہ کے دو طلبہ کو قرآن کریم حفظ کرتے دیکھا تو بے حد تعجب ہوا۔ معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ سرزمین حجاز میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے باقاعدہ طور پر کوئی نظام نہیں ہے۔ عمرہ کے ارادے سے سعودیہ چلے گئے، دہران میں ان بچوں کے والدین سے ملے اور صورت حال معلوم کر کے حرمین شریفین میں تعلیم القرآن کے مکاتب قائم کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

ابتدا میں بہت دشواری پیش آئی اور سعودی حکام کو اعتماد میں لینے کے لیے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا، لیکن آہستہ آہستہ برف پگھلنے لگی اور انہیں سعودی حکومت کا اس حد تک اعتماد میسر آ گیا کہ مکہ مکرمہ اور دیگر شہروں میں تحفیظ القرآن الکریم کے نام سے مکاتب قائم کرنے کی اجازت مل گئی اور سیٹھی محمد یوسف مرحوم اپنی وفات (۱۹۷۷ء) تک سعودی عرب کے مختلف شہروں میں ایک سو سولہ مدارس قائم کر چکے تھے جن میں ڈیڑھ سو اساتذہ پانچ ہزار سے زائد طلبہ کو قرآن کریم کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس کار خیر میں سعودی حکومت اور وہاں کے شیوخ نے بھی ان سے تعاون کیا جن میں سے عرب مجاہد اسامہ بن لادن کے والد محترم محمد بن لادن کا بطور خاص سیٹھی صاحب مرحوم نے تذکرہ کیا ہے۔ وہ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ

"تعمیر حرمین کے ٹھیکیدار محمد بن لادن مکہ مکرمہ کے بہت متمول اور معروف ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ میں نے پانچ منٹ مانگے، آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے میری مختصر باتیں خاموشی سے سنیں، بات ختم ہوئی تو ریسیور اٹھایا اور اپنے مینیجر کو فون پر کہا کہ شیخ محمد یوسف سیٹھی جو کہتے ہیں سنو اور جو مانگتے ہیں دے دو۔ میں نے تین ہزار ریال ماہانہ کا مطالبہ کیا جو منظور ہو گیا اور یہ رقم انہوں نے تاحیات دینے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں یہ رقم پانچ

ہزار ریال ماہانہ ہوگئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے سعادت مند بیٹے نے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھا ہے۔“

۱۹۷۷ء میں سیٹھی محمد یوسف مرحوم کی وفات کے بعد تحفیظ القرآن الکریم کے ان مدارس کا نظام سعودی حکومت نے سنبھال لیا اور اب یہ مدارس سعودی حکومت کے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

قارئین کی خدمت میں یہ داستان پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اشاعت و تعلیم کے لیے خود اسباب پیدا کرتے ہیں اور اگر مسلمانوں میں ذوق نہ رہے تو کافر گھرانوں سے افراد چن کر انہیں اس کام پر لگا دیا کرتے ہیں۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بارے میں سنا ہے کہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کبھی موج میں آتے تو حضرت لاہوریؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے تھے کہ

”لاہوریو! دیکھ لو۔ اگر تم قرآن سے منہ پھیر لو گے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہوگی۔ وہ ایک سکھ کے پوتے (مولانا احمد علی لاہوری) کو لاہور میں بٹھا کر اس سے قرآن کریم کی خدمت لینے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔“

(روزنامہ اوصاف، ۱۷ مارچ ۲۰۰۲ء)

(۲)

غالباً ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء کا واقعہ ہے میں گکھڑ کے پرائمری سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک روز جمعہ کے موقع پر ایک بزرگ تشریف لائے، ان کے ساتھ ایک قاری صاحب تھے۔ حضرت والد محترم مدظلہ نے ان صاحب کو جمعہ کے اجتماع میں کچھ کہنے کا موقع دیا، انہوں نے قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے اور حفظ قرآن کریم کی اہمیت مختصر لفظوں میں بیان کی۔ ان کے ساتھی قاری صاحب نے قرآن کریم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور ان صاحب نے مسجد کے نمازیوں سے کہا کہ اگر آپ حضرات اس مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم کا مدرسہ قائم کرنے پر آمادہ ہوں تو قاری صاحب کی آدھی تنخواہ ہم دے دیا کریں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ گکھڑ سے تین میل دور جی ٹی روڈ پر واقع گتہ مل کے مالک سیٹھی محمد یوسف صاحب ہیں اور ان کے ساتھ قاری صاحب گتہ مل کالونی کی مسجد کے خطیب مولانا قاری عبد الحفیظ ہیں جن کا تعلق شیدو شریف اکوڑہ خٹک سے ہے۔

سیٹھی محمد یوسف صاحب کی ترغیب پر گکھڑ میں مدرسہ تجوید القرآن کے نام سے حفظ قرآن کریم کی درسگاہ قائم ہوئی اور قاری اعزاز الحق امروہویؒ بطور استاذ تشریف لائے۔ اس مدرسہ کے ابتدائی طلبہ میں ایک میں بھی تھا جسے سکول سے اٹھا کر حضرت والد صاحب مدظلہ نے قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے اس

مدرسہ میں داخل کرا دیا تھا۔ سیٹھی صاحب مرحوم نے قرآن کریم کے مدارس کے قیام کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا تھا۔ اس مقصد کے لیے تعلیم القرآن ٹرسٹ قائم تھا اور اس کے ذریعہ انہوں نے پاکستان کے مختلف حصوں میں مذکورہ بالا ترغیب کے ساتھ حفظ قرآن کریم کے مدارس کے قیام کی مہم چلائی۔ بعد میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں آنے سے قبل مجھے گتہ مل کالونی کی مسجد میں کم و بیش ڈیڑھ دو سال خطابت کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا تو اس کام سے زیادہ واقفیت حاصل ہوئی اور معلوم ہوا کہ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے تحت ملک بھر میں کم و بیش گیارہ سو مدارس کی امداد کی جاتی ہے۔ یہ مدارس آہستہ آہستہ خود کفیل ہوتے گئے اور ٹرسٹ کی مدد بھی کم ہوتے ہوئے چند مدارس تک محدود رہ گئی۔ مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان میں حفظ قرآن کریم اور تجوید کے ہزاروں مدارس کے قیام کے پیچھے الحاج سیٹھی محمد یوسف مرحوم کی اس محنت کو بنیادی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔

سیٹھی صاحب ایک نومسلم باپ کے فرزند تھے۔ ان کے والد سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ پر واقع بستی ترگڑی کے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے جو مسلمان ہوئے اور خدمت قرآن کو نہ صرف اپنا مشن بنایا بلکہ اپنے بیٹے کو مستقل طور پر اس کام پر لگا دیا۔ آخر عمر میں سیٹھی صاحب مرحوم کی توجہ سعودی عرب میں حفظ قرآن کریم کے مدارس قائم کرنے پر مبذول ہوگئی تھی اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں اس وقت قرآن کریم کے حفظ اور قراءت کا جو ذوق پورے عالم اسلام کے لیے قابل فخر اور لائق تقلید مقام حاصل کر چکا ہے اس کی شروعات بھی سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی تفصیل اعظم گڑھ انڈیا کے معروف علمی جریدہ "معارف" کے مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک مکتوب میں ملاحظہ کریں جو جناب عبد الملک جامی نے "مکتوب مدینہ منورہ" کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر اہل لاہور سے خطاب کے دوران شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمتِ قرآن کریم اور اس کے عالمگیر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ لاہوریو! اگر تم قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے پر آمادہ نہ ہوگے تو دیکھ لو اللہ تعالیٰ نے ایک سکھ گھرانے میں مولانا احمد علی کو پیدا کر کے انہیں قرآن کریم کے علوم کی اشاعت کے کام پر لگا دیا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم بھی نومسلم تھے اور سکھ سے مسلمان ہوئے تھے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ ان کے گاؤں "جلال" اور سیٹھی محمد یوسف مرحوم کے والد کے گاؤں "ترگڑی" میں چند میل کا فاصلہ ہے اور دونوں کے مسلمان ہونے کا زمانہ بھی ایک ہے۔ جناب عبد الملک جامی کا مکتوب ملاحظہ کیجئے اور قرآن کریم کے اعجاز کی آج کے دور میں ایک زندہ شہادت پڑھ کر ایمان تازہ کیجئے۔

”۱۶/۱۷رمضان المبارک چہار شنبہ (یوم الاربعاء)

محب گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی!

وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ابھی حرم شریف سے آرہا ہوں، وہاں آج ہمارا حفلہ سنویہ (سالانہ جلسہ) تھا۔ جلسہ یہاں دارالقضاء کی اصطلاح ہے، ہمارے ہاں کہتے ہیں آج ”پیشی“ ہے، یہاں کہتے ہیں آج ”جلسہ“ ہے۔

”ہمارا“ کی تشریح یہ ہے کہ یہ عاجز پچیس برس جس کام میں مشغول رہا وہ جماعۃ تحفیظ القرآن کا کام تھا۔ آج جو تقریر (رپورٹ) سنائی گئی اسی میں بتایا گیا کہ اس وقت ہمارے ۱۳۵ مدرسے ہیں للبنین (ذکور)، لڑکیوں کے اس کے علاوہ ہیں۔ لڑکوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اور لڑکیوں کی چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ جن لڑکوں نے اس سال پورا قرآن حفظ کرنے میں کامیابی حاصل کی ان کی تعداد ۴۵ ہے۔ دس پاروں میں پاس ہونے والے تین سو ہیں اور پانچ پاروں میں کامیاب ہونے والے پانچ سو۔ یہ صرف مدینہ منورہ کے مدارس کے اعداد و شمار ہیں۔ پچھلے دنوں جدہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ طلبہ کی تعداد ۱۸ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اور اس وقت یہ مدارس سعودی عرب میں اقصیٰ جنوب سے اقصیٰ شمال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ طلبہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہوگی۔ ہمارے ملک فہد صاحب جواب ”خادم الحرمین الشریفین“ کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں، یعنی رسمی و سرکاری طور پر ان کا یہی خطاب ہے، اس شخص کو بھی حفظِ قرآن سے بہت دلچسپی ہے۔ کئی سال سے اعلان فرمادیا ہے کہ قید خانوں میں جو قیدی قرآن مجید حفظ کرلے گا اس کی آدھی مدت معاف کردی جائے گی۔ اس طرح قید خانوں میں لوگ حفظ کرنے پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہاں یہ مدارس نائٹ اسکول کے طور پر ہیں، دن میں بچے اپنے اسکولوں میں جاتے ہیں، عصر سے مغرب تک ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بعض مدرسے عشاء تک بھی ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو سارا دن جاری رہتے ہیں۔

جو بات اصل کہنے کی ہے وہ ہے کہ ان مدارس کی بنیاد ایک پاکستانی تاجر نے رکھی، وہ بھی ایک لاعلمی کی بنا پر۔ رمضان کے مہینہ میں (پچیس برس پہلے) وہ مکہ مکرمہ آئے ہوئے

تھے، وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کچھ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر نماز (نوافل) کی امامت کرا رہے ہیں۔ شوافع کے یہاں چونکہ یہ جائز ہے وہ اس میں مضائقہ نہیں سمجھتے، اور انسان کی طبعی سہولت پسندی کے اسی جواز نے ان کے ہاں حفظِ قرآن تقریبًا ختم کر دیا۔ یہ سارے علاقے، شافعی علاقے جو میں نے جنوبی ہند (مدراس) سے لے کر ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا، تھائی لینڈ تک دیکھے وہاں یہی عالم پایا۔ وجہ شافعی مسلک جو ان ملکوں میں عام ہے۔ انڈونیشیا میں قراءت کا زور ہے، عورتیں بھی خوب قاری ہوئی ہیں مگر حافظوں کا کال ہے۔ ہاں یہ پاکستانی تاجر جن کے دفترِ حساب میں لاکھوں کا اجر و ثواب لکھا جارہا ہے خود ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے۔ ان کا نام محمد یوسف سیٹھی تھا اور ان کے والد جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے ان کا نام عبدالرحیم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت یہ ان کے والد ہی کی وصیت تھی جس کی تعمیل میں انہوں نے پاکستان میں قرآن مجید کے مدرسے کھلوانے شروع کیے تاآنکہ وہاں بھی طلبہ کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ سیٹھی صاحب مرحوم کا مقصود صرف حفظِ قرآن نہیں تھا بلکہ قرآن فہمی اور اس پر عمل بھی ان کی اسکیم میں داخل تھا۔

خیال فرمائیں کہ جب میں نے آغاز کار میں بعض مدارس طلبہ کی قلت مدرسین کی عدم قابلیت، اہل محلہ کی غفلت و بے اعتنائی کی بنا پر بند کر دیے تو مرحوم سیٹھی صاحب نے فرمایا:

"بھائی میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر ایک بچے نے مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھ لی تو میرا تو پیسہ وصول ہو گیا"۔

قرآن فہمی کے ضمن میں مدارس میں برابر مذاکرات اور محاضرات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے حرم شریف کے علاوہ کہیں کسی مسجد میں تراویح نہیں ہوتی تھی، اب یہ ہے کہ ۱۳۵ مسجدوں میں تو مدینہ منورہ میں تراویح ہو رہی ہے اور اسی طرح دوسرے شہروں میں۔ یہ ہمارے ہی بچے ہیں جو ان مساجد میں جاکر تراویح پڑھاتے ہیں۔ اس سال مسجد قبا، مسجد میقات، مسجد الشہداء (امیر حمزہ) جو شہر کی سب سے شاندار وسیع و عریض مساجد ہیں، ہمارے ہی طالب امامت کرا رہے ہیں۔ بلکہ خود حرم شریف میں بھی ہمارا تعلیم و تربیت یافتہ طالب تراویح پڑھا رہا ہے اور وہ ایسے والہانہ انداز میں پڑھتا ہے کہ لوگ اس کے عاشق ہو گئے ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ تراویح (حرم شریف) کے لیے کسی ہندی یا پاکستانی الاصل بلکہ غیر عربی کو منتخب کیا گیا ہو۔ اس مقری کا نام

محمد ایوب ہے اور ان کے باپ جو برما سے ہجرت کر کے آئے تھے ابھی حیات ہیں، برما کی بجائے ان کا پاسپورٹ پاکستانی تھا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر مرحوم و مغفور الشیخ محمد صالح قزاز صاحب کا ذکر نہ کروں جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے امین العام ہوگئے تھے، یوسف سیٹھی اگر بانی اول ہیں تو یہ بانی ثانی ہیں۔ سیٹھی صاحب نے جب اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی تو اس کے عاشق ہوگئے اور تن من دھن ہر طرح سے اس پر قربان۔ انہی کا دم تھا، ان ہی کا اثر ورسوخ کہ سیٹھی صاحب کو سارے ملک میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ صالح قزاز صاحب جن کا ابھی اسی سال انتقال ہوا مرتے دم تک اسی کام میں منہمک رہے۔ سیٹھی صاحب کے انتقال کو شاید سات سال ہوئے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم فرماتے تھے کہ سیٹھی صاحب کا جس کمرہ (کراچی) میں انتقال ہوا وہ بوقت وفات قدرتی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ نومسلمین میں ایمان کی تازگی ہوتی ہے جوش و خروش ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا جوش و خروش اور قوت عملی دنیا کو معلوم ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد بھی نومسلم تھے، کتنا انہوں نے کام کیا۔ مولانا علی میاں بھی ان کے شاگرد ہیں اور عند اللہ قبولیت کی یہ نشانی کہ چھ ماہ تک ان کی قبر سے خوشبو آتی رہی۔ تبلیغی جماعت جو اس وقت دنیا میں مشہور ہے، مولانا الیاسؒ کے بعد اس کے دوسرے بانی حاجی عبد الرحمان ایک بنیے کے بیٹے تھے، خود مسلمان ہوئے اور پھر چودہ سو آدمیوں کو مسلمان کیا۔ پھر مسلمان کر کے چھوڑ نہیں دیا، شادی بیاہ، کام کاج، روزگار سے لگانا، تعلیم لانا سب کام کرتے تھے۔ اور ہاں ہمارے علامہ شبلیؒ بھی تو بالآخر ایک نومسلم خاندان سے تھے اور یوں تو علامہ اقبالؒ بھی۔

یہ بات خیال میں رہے کہ اب ہر شہر کی جماعت خود کفیل ہے اور جب سے جامعہ محمد بن سعود (ریاض) نے ان جماعتوں کو اپنی تنظیم میں لے لیا ہے آدھا خرچہ وہ دیتی ہے۔ اس سال ہمارا بجٹ ۴۵ لاکھ (سعودی ریال) کا تھا۔ ایک غیر متعلق بات ہے محض معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس سال پاکستان سے (رمضان میں) عمرہ کے لیے ۵۵ ہزار آدمی آئے ہیں، ۲۲ لاکھ کی درخواست تھی حکومت انتظام نہیں کر سکی، فال نیک ہے۔ اس تعداد کی رسمی یعنی سرکاری تصدیق ابھی نہیں ہوسکی ورنہ یوں افواہ تو ستر ہزار تک ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

عبدالملک جامی"

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱ نومبر ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ

مولانا غلام اللہ خانؒ شیخ العلماء حضرت مولانا حسین علیؒ اور خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے جنہوں نے تمام عمر توحید کے پرچار میں صرف کر دی۔ انتہائی جری، بے باک اور معاملہ فہم راہنما تھے، قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، مجلس احرارِ اسلام کے پلیٹ فارم پر تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، تحریک ختم نبوت کے دونوں ادوار میں سرگرم کردار ادا کیا، اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد اور تحریک نظام مصطفیٰؐ میں بھی علماء وعوام کی جرأت مندانہ رہنمائی کی، اور جب بھی کسی قومی یا دینی محاذ پر ان کی ضرورت محسوس ہوئی پاکستان کے عوام نے انہیں پہلی صف میں پایا۔ شرک وبدعات کا رد اور عقیدۂ توحید کا اپنے مخصوص انداز میں پرچار ان کی زندگی کا مشن رہا اور اس مشن پر آخر دم تک پورے استقلال اور وقار کے ساتھ کاربند رہے۔

مولانا غلام اللہ خانؒ پر قاتلانہ حملے ہوئے، قید وبند اور نظر بندی کی صعوبتیں پیش آئیں، مقدمات سے ہر دور میں واسطہ رہا مگر کوئی مشکل انہیں اپنے مشن سے ہٹا نہ سکی۔ جس بات پر ڈٹ گئے بس ڈٹ گئے، حتیٰ کہ اپنوں سے بھی اختلاف کیا اور بہت سے مسائل میں کیا۔ مگر اختلاف کی شدت کے دور میں بھی اپنے موقف کے اظہار کے باوجود اپنے بعض دیگر رفقاء کی طرح غلو اور فتویٰ بازی کا راستہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی یہ اختلاف ضرورت کے مواقع پر انہیں اپنوں کے ساتھ ملنے سے روک سکا۔ جب بھی اشتراکِ عمل کی ضرورت محسوس ہوئی شیخ القرآنؒ کشادہ دلی کے ساتھ سامنے آگئے حتیٰ کہ قومی و دینی تحریکات کے دور میں اپنے شدید ترین مخالفین کے ساتھ بھی اشتراکِ عمل سے گریز نہ کیا۔ وہ اپنے مشن اور مسلک کے لیے انتہائی سخت تھے لیکن قومی اور اجتماعی تقاضوں کا احساس بھی ان کے دل میں ہمیشہ موجود رہا اور اسی حسین توازن نے قوم کے ہر طبقہ کے دل میں ان کے لیے احترام اور عقیدت کے در وا کر دیے۔

راقم الحروف کو کئی بار شیخ القرآن سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، جب بھی ملے انتہائی تپاک سے ملے، شفقت کا اظہار فرمایا، والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کی خیریت دریافت کی۔ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان، حضرت مولانا سید محمد اسعد مدنی مدظلہ کے مکان پر قیام پذیر تھے جبکہ والد محترم مولانا محمد سرفراز خان

صفدر مع عم مکرم مولانا عبد الحمید سواتی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی نے بتایا کہ مولانا غلام اللہ خان کی طبیعت اچانک علیل ہوگئی ہے، دونوں حضرات طبع پرسی کے لیے مولانا کی قیام گاہ پر گئے، راقم الحروف بھی ہمراہ تھا، جس محبت کے ساتھ آپس میں ملے اس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں کے سامنے ہے، اس وقت عملی طور پر دیکھا کہ اہلِ علم کے درمیان اختلاف کا دائرہ کیا ہوتا ہے۔

حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم نے دیوبندی مسلک کی مختلف جماعتوں کے درمیان اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کرنے کے لیے مدرسہ مخزن العلوم والفیوض کے سالانہ جلسہ تقسیمِ اسناد کے موقع پر تمام دیوبندی جماعتوں کو بلایا، جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے مولانا غلام اللہ خان بھی شریک ہوئے اور اشتراکِ عمل کی خواہش کو تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خانپور کے اجتماع کے بعد گوجرانوالہ تشریف لائے، یہ شیخ القرآنؒ کا آخری دورۂ گوجرانوالہ تھا، پرانے مسافرخانہ کی جامع مسجد میں ظہر کی نماز کے بعد سورۃ الکوثر کا درس دیا جو گوجرانوالہ میں ان کا آخری خطاب تھا۔ راقم الحروف بھی حاضر تھا، اس کے بعد ملاقات ہوئی، حسبِ معمول شفقت و محبت کا اظہار فرمایا۔ جامع مسجد شیرانوالہ باغ تشریف لے چلنے کی استدعا کی تو فرمایا ضرور چلتا مگر واپسی میں عجلت کی وجہ سے اب وقت نہیں ہے۔ کافی دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے گاڑی کے پاس کھڑے رہے اور خانپور کے اجتماع پر مسرت کا اظہار فرماتے رہے۔ یہ مسرت بے ساختہ ان کی زبان پر اظہار سے مشرف ہوتی رہی اور پھر دوبارہ گوجرانوالہ آمد پر جامع مسجد شیرانوالہ باغ تشریف آوری کا وعدہ فرما کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مگر کسے خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے اور اب اس کے بعد گوجرانوالہ تشریف آوری مقدر میں نہیں ہوگی۔

مولانا غلام اللہ خانؒ جرأت و استقلال اور اپنے مشن پر پختگی کے ساتھ توازن کی حسین روایات چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے اور اب ان روایات کی پاسداری ان کے جانشین مولانا قاضی احسان الحق اور دوسرے فرزندوں مولانا حسین علی اور مولانا اشرف علی کے ذمہ آپڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے خاندان کے دیگر افراد سمیت عظیم باپ کی جدائی کے صدمہ سے صبر و حوصلہ کے ساتھ عہدہ برآ ہونے اور ان کی جدوجہد، وضعداری اور روایات کو زندہ رکھنے کی توفیق دیں اور مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۰ جون ۱۹۸۰ء)

حضرت مولانا محمد حیاتؒ

(۱)

گزشتہ دنوں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے سابق امیر حضرت مولانا محمد حیاتؒ انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا محمد حیاتؒ کا نام آج کی نسل کے لیے شاید متعارف نہ ہو کہ وہ تعارف و مقبولیت کے مروجہ معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ نہ آواز میں کرارہ پن، نہ لباس میں کروفر، نہ بود و باش اور خورد و نوش میں بڑائی کی کوئی علامت۔ زندگی کے ہر پہلو میں سادگی، خلوص اور ایثار کا خوگر بھلا آج کے دور میں تعارف و مقبولیت کا زینہ کیسے طے کر سکتا ہے؟ لیکن جن لوگوں نے مولانا محمد حیاتؒ کو ریاضت و مجاہدہ کے اس دور میں دیکھا ہے جب وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر قادیان میں کفر و ارتداد کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھے تھے، یا جن لوگوں نے قادیانی مناظرین کو مولانا محمد حیاتؒ کے بنے ہوئے دلائل کے جال میں بے بسی کے ساتھ تڑپتے پھڑکتے دیکھا ہے، یا جن لوگوں کو مولانا محمد حیاتؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے اور ان سے قادیانی دلائل کے تار و پود سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا ہے ان سے مولانا مرحوم کی عظمت اور ان کا مقام و مرتبہ مخفی نہیں ہے۔

مولانا محمد حیاتؒ ایک اولوالعزم انسان تھے جنہوں نے علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی پیروی میں علمی محاذ پر قادیانیت کے تعاقب کو اپنا مشن بنایا اور پھر اپنا تمام تر علم و فضل، قوت و توانائی اور صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دیں۔ احرار کی قیادت نے انہیں قادیان میں اپنے مشن کے لیے بھیجا تو ان کی جرأت و استقامت نے "فاتح قادیان" کے خطاب کو ہمیشہ کے لیے ان کے سینے کا تمغہ بنا دیا۔ دیکھنے میں ایک بھولا سا جاٹ مگر عزم و ہمت کا پیکر یہ مرد درویش اپنے وقت کا عظیم مناظر تھا۔ ایسا مناظر کہ اس کا نام سن کر مخالف مناظرین کی روح کانپ جایا کرتی تھی۔ وہ ایسا استاذ تھا جس کی سادہ سی باتیں اور منطقی طرز کی گفتگو اپنے تلامذہ کے دلوں میں اعتماد و حوصلہ کا دریا موجزن کر دیتی تھی۔ جو اپنے شاگردوں کو دل کی گہرائی سے ابھرنے والی دعاؤں سے بھی نوازتا تھا اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اعزاز و اکرام سے بھی بہرہ ور کرتا تھا۔

حضرت مولانا محمد حیاتؒ آج ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن ان کی یاد دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ان کی شفقت و مروت کے مناظر مجھ جیسے تلامذہ کی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ گھومتے رہیں گے اور ان کی جرأت و استقامت کی روایات دعوت و عزیمت کی تاریخ میں ایک روشن باب کے طور پر محفوظ رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، ان کی لغزشوں پر قلم عفو پھیر دے اور ہم ناکاروں کو ان کی سادگی، خلوص اور ایثار کے عظیم ورثہ کا حقدار بنائے، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۹ اگست ۱۹۸۰ء)

(۲)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بیان کردہ یادداشتیں)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ہماری آج کی گفتگو کا موضوع فاتحِ قادیان استاذ المناظرین حضرت مولانا محمد حیاتؒ ہیں۔ مولانا محمد حیاتؒ شکرگڑھ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور درویش صفت عالمِ دین تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو علم و تکلم، تقویٰ و عمل کی بڑی خصوصیات سے نوازا تھا۔ مولانا کی ڈاڑھی قدرتی طور پر نہیں تھی اور ان کا طرزِ زندگی بہت سادہ تھا، جس طرح زمیندار اور کاشتکار ہوتے ہیں کہ سادہ وضع قطع اور سادہ طور طریقے۔ اس لیے کوئی آدمی بظاہر انہیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ عالم دین اور دینی بزرگ ہیں۔ دیکھنے میں سادہ سے دیہاتی لگتے تھے لیکن اپنے دور میں مناظرین کے استاد تھے اور قادیانیت کے محاذ پر سب سے مضبوط مناظر تھے کہ انہیں فاتحِ قادیان کہا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد حیاتؒ میرے استادِ محترم ہیں، میں نے قادیانیت ان سے باضابطہ سبقًا سبقًا پڑھی ہے۔ ۱۹۶۴ء کی بات ہے، یہ میرا کافیہ کا سال تھا۔ حضرتؒ مجلس تحفظ ختم نبوت گوجرانوالہ کے دفتر میں تشریف لائے اور انہوں نے مسئلہ ختمِ نبوتؐ، صدق و کذبِ مرزا، حیاتِ عیسیٰؑ، نزولِ عیسیٰؑ وغیرہ موضوعات پر ہمیں پندرہ دن کا کورس پڑھایا۔ مجھے حضرتؒ سے استفادے کا اور ان کی خدمت کا موقع ملا، وہ میرے انتہائی شفیق استاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خصوصیت دی تھی کہ بڑی خوبصورت گفتگو کرتے تھے، بڑی دھیمی اور ٹھنڈی لیکن بڑی مضبوط۔ الفاظ میں سختی نہیں ہوتی تھی، لہجہ ملائم ہوتا تھا لیکن گرفت ایسی مضبوط ہوتی تھی کہ بڑے بڑے مناظر بھی سامنے آنے سے ڈرتے تھے۔

پہلی دفعہ حضرت مولانا حیاتؒ کی زیارت اس طرح ہوئی کہ مجھے پتہ چلا حضرتؒ دفتر ختم نبوت گوجرانوالہ میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مولانا محمد خان صاحب ختم نبوت کے بزرگ مبلغ تھے، انہوں نے بتایا کہ استاد آئے ہوئے ہیں۔ اگلے دن شاید جمعہ تھا، سردیوں کا موسم تھا، میں زیارت کے لیے گیا تو مولانا محمد خان صاحب دفتر کی سیڑھیاں اتر کر ناشتہ وغیرہ لینے جا رہے تھے جبکہ مولانا محمد حیاتؒ لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ باہر تھا، باقی سارا جسم لحاف کے اندر تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ان کی داڑھی نہیں ہے،

میں نے جب دروازہ کھول کر اندر دیکھا تو سمجھا کہ کوئی خاتون لیٹی ہوئی ہیں اور سوچا کہ شاید مولانا محمد خان صاحب کے گھر کی کوئی خاتون ہیں۔ میں دروازہ بند کر کے باہر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا محمد خان صاحب تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا کہ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ میں نے کہا اندر تو کوئی خاتون لیٹی ہوئی ہے۔ فرمانے لگے خاتون نہیں ہے وہ مولانا محمد حیات صاحب ہیں۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی، بہرحال اندر گیا تو انہوں نے مولاناؒ سے میرا تعارف کرایا۔ حضرت والد صاحبؒ کے حوالے سے سارے بزرگ علماء ہی شفقت فرماتے تھے، اس وقت میرا اپنا تعارف کچھ بھی نہیں تھا، پھر اس کے بعد مجھے ان کی خدمت میں مسلسل حاضری کا موقع ملتا رہا۔

حضرت مولانا محمد حیاتؒ کا اسلوب یہ تھا کہ وہ پہلے بتاتے کہ مخالف کے دلائل یہ ہیں اور ہمارا جواب یہ ہے، ان کا موقف یہ ہے اور ہمارا یہ ہے، ان کا اعتراض یہ ہے اور ہمارا جواب یہ ہے۔ پھر وہ ہم سے تقریر کرواتے کہ اٹھو اور ابھی جو پڑھا ہے اس پر تقریر کرو۔ ایک دن حیات ونزولِ عیسیٰؑ کے مسئلے پر انہوں نے ہمیں تقریباً دو گھنٹے تک دلائل سمجھائے، پھر مجھ سے کہا کہ اٹھ کر تقریر کرو۔ میں بالکل نوعمر لڑکا تھا، میں نے تقریر میں یہ کہہ دیا کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے اور مرزا یوں بھونکتا ہے۔ اس پر مولانا نے مجھے ٹوک دیا کہ نہیں بیٹا یوں نہیں کہتے، وہ بھی ایک قوم کا لیڈر رہا ہے، یہ غلط بات ہے۔ یوں کہو کہ مرزا صاحب یوں کہتے ہیں اور مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم سبق ہے جو مولانا محمد حیاتؒ نے مجھے سکھایا۔ حضرتؒ قادیانیت کے محاذ پر سب سے بڑے مناظر تھے، وہ مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی کے بھی استاذ ہیں، مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا عبد الرحیم اشعر کے بھی استاذ ہیں اور اس ساری کھیپ کے استاذ ہیں۔

اور حضرتؒ کی ہمت، حوصلہ اور جرأت کی داد دیجیے کہ ۱۹۳۱ء / ۱۹۳۲ء میں مجلس احرار اسلام نے قادیان میں دفتر کھولا تھا جب قادیان میں داخلہ ہی بڑا مسئلہ ہوتا تھا۔ یہ احرار کی ہمت ہے کہ انہوں نے قادیان میں احرار کانفرنس کی جس میں حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وغیرہ اکابر تشریف لائے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ قادیان میں قادیانیوں کے علاوہ کسی نے جلسہ کیا تھا۔ پھر جب احرار نے دفتر بنایا تو اب سوال یہ پیدا ہوا کہ دفتر میں بیٹھے گا کون؟ یہ بڑا مسئلہ تھا کیونکہ قادیان میں مسلمانوں کے دفتر میں بیٹھنا تو موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ دو آدمی وہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوئے۔ ایک مولانا عنایت اللہ چشتی مرحوم جو میانوالی کے تھے، اور دوسرے مولانا محمد حیاتؒ تھے۔ یہ دونوجوان حضرات تیار ہوئے کہ ہم بیٹھیں گے اور جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مولانا عنایت اللہ چشتی مرحوم تو اس لیے بیٹھے کہ یہ ہمارا مورچہ ہے، جبکہ حضرت مولانا محمد حیاتؒ مناظر اور عالم تھے، وہ وہاں چھیڑ چھاڑ

کرتے بھی تھے اور ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہوتی بھی تھی۔ قادیانی ان کے ہاں آتے، ان سے مناظرہ کرتے، گفتگو کرتے لیکن ان کی گرفت سے کوئی نہیں بچتا تھا۔اور حضرتؒ خود کسی کی گرفت میں نہیں آتے تھے۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے ایک عرصہ کام کیا اور قادیانی بڑی کوشش کے باوجود نہ انہیں وہاں سے ہٹا سکے اور نہ ان انہیں کسی بات پر لاجواب کر سکے۔ اس پر حضرتؒ کو فاتحِ قادیان کا خطاب ملا اور یہ آپ کا مخصوص لقب ہے۔

پاکستان بننے کے بعد عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت تشکیل پائی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دیں حضرت امیرِ شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا محمد علی جالندھریؒ کو، انہوں نے ایک مستقل مورچہ قائم کردیا کہ یہ جماعت اسی کام کے لیے وقف ہے۔ مولانا محمد حیاتؒ نے مجلس کے مبلغ کے طور پر اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مبلغین کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں میں جاکر درس دیتے ہیں اور جہاں قادیانیت ہو وہاں اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ اب بھی مجلس یہ کام کررہی ہے۔ مولانا حیاتؒ کا شمار مجلس کے مرکزی مبلغین میں ہوتا تھا، سال کے مختلف حصوں میں مختلف شہروں میں دس دن، پندرہ دن، ایک مہینے کا کورس کراتے تھے۔ اور ملتان میں شعبان ورمضان میں باقاعدہ سالانہ کلاس لگتی جس میں مولانا محمد حیاتؒ اور مولانا لال حسین اخترؒ اس محاذ پر علماء کے استاذ ہوتے تھے۔ اب تو قادیانیوں نے مناظرے چھوڑ دیے ہیں اور طے کر لیا ہے کہ مناظرہ نہیں کریں گے۔ اس زمانے میں قادیانیوں کے مناظر بھی بڑے مضبوط مناظر ہوتے تھے۔ ابو العطا جالندھری، مولوی اللہ دتہ اور قاضی نذیر ان کے بڑے زبردست اور پہلی صف کے مناظرین تھے۔ عام مولوی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ ان کی چالوں کو یہی حضرات سمجھتے تھے جن میں سب سے پہلا نام مولانا محمد حیاتؒ کا ہوتا تھا۔ ان کے بعد دوسرا نام تھا رئیس المناظرین مولانا لال حسین اخترؒ کا جو پہلے قادیانی رہے ہیں، قادیانیوں کے پاس ہی پڑھا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے فضل مسلمان ہوئے اور قادیانیوں کے خلاف بڑے مناظر بنے۔ سنا ہے کہ ایک مناظرے میں قاضی نذیر نے مولانا لال حسین اخترؒ پر گرفت کی کہ آپ نے تو قرآن کی آیت صحیح نہیں پڑھی۔ مولانا نے جواب دیا ہاں جیسی آپ نے پڑھائی تھی میں نے ویسے ہی پڑھ لی، میں نے تو قرآن آپ سے ہی پڑھا ہے۔

مولانا محمد حیاتؒ نے مرکز اور تعلیم وتربیت کا سارا نظام سنبھال لیا۔ وہ مولانا لال حسین اخترؒ کے ساتھ مل کر علماء کی تربیت کرتے اور انہیں مناظرہ سکھاتے۔ حضرت علامہ خالد محمود صاحب مدظلہ بھی اسی صف کے مناظر تھے۔ پھر ان کے ساتھ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور مولانا عبدالرحیم اشعر بھی شامل ہوگئے۔

میں مولانا محمد حیاتؒ کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہا ہوں۔ ان کی سادگی کی حالت دیکھیے کہ ایک

دفعہ گکھڑ تشریف لائے، مسجد میں بیان تھا اور ہمارے گھر کھانا تھا۔ میں خدمت پر مامور تھا، کھانا بیٹھک میں لے کر آیا تو دو قسم کا سالن تھا۔ غالباً ایک دال کا سالن تھا اور دوسرا گوشت کا۔ دیکھ کر فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! اتنی فضول خرچی، دو سالن مولوی کے دستر خوان پر۔ ایک اٹھالو ورنہ میں اٹھادوں گا۔ میں نے جلدی سے دال اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ حضرت استاد العلماء تھے اور قادیانیت کے محاذ پر شاید ہی کوئی عالم ایسا ہو جو ان کا شاگرد نہ ہو لیکن ان کی سادگی دیکھیں۔ اب ایسے بزرگ نہیں رہے اور فی الواقع نہیں رہے۔ جبکہ ہم جو کچھ بھی ہیں ان بزرگوں کی ہی کمائی ہیں۔ پچھلے دنوں تبلیغی سہ روزہ کے سلسلہ میں ہماری تشکیل سرگودھا میں تھی۔ سرگودھا کے قریب چوکیرہ میں ہمارے ایک بزرگ ہیں مولانا عبد الجبار دامت برکاتہم، درویش آدمی ہیں اور سادگی ان کا شعار ہے۔ میں ان کے سامنے کارکن کی حیثیت سے تھا اور بعض ساتھی حیران ہو رہے تھے کہ ان کا اس قدر اکرام کیسے کر رہا ہوں۔ بھئی ہم جو کچھ بھی ہیں ان بزرگوں کی قربانیوں اور ایثار کی وجہ سے ہیں۔

مولانا محمد حیاتؒ کے مزاج اور ذوق کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔ مولانا محمد علی جالندھریؒ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ وہ مبلغین کو تنخواہ بھی دیتے تھے، نگرانی بھی کرتے تھے اور رسید بک بھی تھما دیتے تھے کہ آپ نے چندہ بھی کرنا ہے۔ مبلغ کا ایک کام چندہ اکٹھا کرنا بھی ہوتا ہے۔ مولانا محمد حیاتؒ ایک دفعہ مجھ سے ٹھیٹھ پنجابی میں فرمانے لگے کہ مولانا محمد علی کا کام دیکھو مجھے رسید بک پکڑا دی ہے، میں کہاں سے چندہ مانگوں گا۔ خالی رسید بک واپس دیتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگتا اور چندہ مجھ سے ہوتا نہیں۔ میں نے کہا حضرت! رسید بک مجھے دے دیں۔ فرمایا تم کیا کرو گے۔ میں نے کہا دیں تو سہی۔ میں نے وہ رسید بک لی اور ساتھیوں سے کہہ کر اکیس یا بائیس روپے اکٹھے کر لیے، یہ اس زمانے میں مناسب رقم ہوتی تھی۔ میں نے لا کر پیش کیے تو حضرتؒ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا تم نے تو کمال کر دیا، اب میں بھی محمد علی کو کہوں گا کہ میں چندہ کر کے لے آیا ہوں۔ یہ ان کی سادہ مزاجی تھی لیکن علم میں وہ انتہاء پر تھے۔

ہر بزرگ کا اپنا ذوق ہوتا ہے، حضرت والد صاحبؒ بہت بڑے محقق اور مصنف تھے لیکن مناظر نہیں تھے اور مناظرہ سے حتی الوسع بچتے تھے۔ فرماتے کہ میرا کام قلم سے لکھنا ہے، مناظرہ ایک فن ہے اور یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء سے پہلے کی بات ہے والد صاحبؒ نے خود ہمیں یہ قصہ سنایا کہ قادیانیوں سے چک چٹھہ کے علاقے میں مناظرہ طے ہو گیا۔ وہاں کے لوگ چاہتے تھے کہ مناظرہ ہو لیکن اگر مولانا محمد حیات صاحب کو لائے تو قادیانی مناظر بھاگ جائے گا کہ عموماً ایسا ہوتا تھا۔ قادیانی کہتے تھے کہ مولوی حیات سے مناظرہ ہم نہیں کرتے۔ حضرتؒ کا مناظرے میں عجیب طرز ہوتا تھا، اور وہ طرز پھر میں

نے مولانا امین صفدرؒ او کاڑوی میں دیکھا ہے۔ مولانا محمد حیاتؒ ٹھنڈی ٹھنڈی باتوں میں مکڑی کے جالے کی طرح ایسا جالا تنتے تھے کہ مخالف پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا اور اسے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا کہ کیا کروں۔ جبکہ مولانا لال حسین اخترؒ گرم مناظر تھے، بازو چڑھا لیتے اور پھر ٹھیک ٹھاک چڑھائی کرتے تھے اور مخالف مناظر بے چارہ ششدر رہ جاتا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ مولانا محمد حیاتؒ ٹھنڈی ٹھنڈی باتوں میں مناظرہ کرتے کہ مولانا ایسے نہیں ایسے، یہ جو بات آپ کر رہے ہیں ایسے نہیں ہے بات اس طرح ہے۔ یہ انداز تھا ان کا۔

چک چٹھہ کے لوگ حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئے کہ مناظرہ آپ نے کرنا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں مناظرہ کرتا ہی نہیں ہوں، یہ میرا میدان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا نہیں حضرت اب تو مجبوری ہے، ہم وعدہ کر آئے ہیں، اب تو آپ کو جانا ہوگا ورنہ ہماری شکست ہوگی اور بڑی بے عزتی ہوگی۔ وہ لوگ والد صاحبؒ کو مجبور کر کے لے گئے۔ والد صاحبؒ پریشان تھے کہ یہ میرا فن نہیں ہے کیا بنے گا اور سامنے قاضی نذیر بیٹھا ہوا تھا جو قادیانیوں کا چوٹی کا مناظر تھا۔ والد صاحبؒ کو قاضی صاحب کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ بات کروں گا، یہ کہوں گا۔ فرماتے ہیں جونہی مخالف مناظر نے بات ختم کی اور میری باری آئی تو سٹیج کے نیچے سے مولانا محمد حیات صاحبؒ نکلے اور آکر سامنے سٹیج پر بیٹھ گئے۔ فرمایا اچھا مولوی صاحب! کیا کہا ہے آپ نے؟ یہ پہلے سے پلاننگ تھی جس کے بارے میں والد صاحبؒ کو پہلے نہیں بتایا گیا تھا۔ والد صاحبؒ کہتے ہیں کہ پہلے جو میرا حال تھا اب وہ مخالف مناظر کا ہوگیا کہ یہ مولوی حیاتؒ کدھر سے آگئے۔

مولانا محمد حیاتؒ نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا قادیان دفتر سے اور مناظروں سے۔ پھر ایک وقت آیا کہ آپ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی امیر بنے۔ بعد میں مولانا لال حسین اخترؒ اور مولانا احسان احمد شجاع آبادیؒ بھی امیر رہے ہیں۔ سچی بات ہے کہ آج سے باون سال پہلے کی حضرتؒ کی باتیں اب بھی مجھے یاد ہیں۔ ایک دن یوں ہوا کہ مولانا محمد حیاتؒ ختم نبوت کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، اردگرد قادیانیوں کی کتابیں حوالوں کے لیے رکھی تھیں۔ یہ کام ویسے ہی نہیں ہو جاتا، محنت کرنا پڑتی ہے، جگر مارنا پڑتا ہے، پتہ مارنا پڑتا ہے تب جا کر دلائل اور جواب تیار ہوتے ہیں۔ اب تو پورے کیمپ میں اس طرز کا کوئی آدمی نہیں رہا سوائے مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہ کے، اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھیں۔ میں حضرتؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرا مزاج ہلکی پھلکی دل لگی کرنے کا ہے۔ میں نے کہا، استاد جی! آپ بھی عجیب عالم ہیں، باقی علماء کو ہم دیکھتے ہیں کوئی رات کو سونے سے پہلے آیۃ الکرسی پڑھتا ہے کوئی درود شریف پڑھتا ہے، صبح اٹھ کر

تلاوت کرتے ہیں، یٰسین پڑھتے ہیں۔ آپ رات کو مرزا کی کتاب پڑھتے پڑھتے سوجاتے ہیں اور صبح اٹھ کر پھر مرزا کی کتاب ہاتھ میں لے لیتے ہیں، یہ کیا بات ہوئی؟ فرمانے لگے بیٹا! مجھے مرزا کی کتابیں پڑھنے پر بھی اتنا ہی ثواب ہوتا ہے جتنا تجھے ہدایہ پڑھنے پر ہوتا ہے۔ العبرۃ للمقاصد کہ اعتبار مقصد کا ہوتا ہے۔ سچی بات ہے کہ ہماری زندگی کا رخ اور لہجہ متعیّن کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ ہے ان میں ایک بڑا نام مولانا محمد حیاتؒ کا بھی ہے۔ یہ بتانا کہ بات نرمی سے کی جائے، ادب و شرافت سے کی جائے، بداخلاقی سے گریز کیا جائے، مخالف کا بھی اس درجے میں احترام کیا جائے۔ یہ ان کا پڑھایا ہوا میرا پہلا سبق ہے، ورنہ ہم تو مرزا کو نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں۔

آج حضرت مولانا محمد حیاتؒ بہت یاد آتے ہیں، ان کی مجلسیں یاد آتی ہیں اور ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔ اللہ رب العزت ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ان کا گلشن ختم نبوت کی مجلس اور محاذ آباد رکھے اور ہمیں بھی اس میں کچھ نہ کچھ حصہ ڈالتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(۴ نومبر ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا مفتی محمودؒ

(۱)

دل زخمی ہے، جگر فگار اور ذہن حیرت کی وسعتوں میں گم کہ خدایا یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ موت ایک ناگزیر حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، جو شخص دنیا میں آیا ہے اس نے جانا ہے۔ جب انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات جیسی ذوات مقدسہ کو دنیا کی زندگی میں دوام نہ مل سکا تو اور کون ہے جسے موت سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔ مولانا مفتی محمودؒ بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے انسان تھے، ان کی ذات لافانی نہ تھی، انہوں نے بھی دنیا سے جانا تھا اور وہ اپنا وقت پورا کر کے خالق و مالک کی بارگاہ میں سرخرو چلے گئے۔ لیکن ان کا دنیا سے جانا ایسے وقت میں ہوا جب وطن عزیز اندرونی و بیرونی طور پر الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہے اور ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کے رموز و اسرار اور تہہ منظر و پس منظر پر نظر رکھنے والے ارباب دانش مولانا مفتی محمودؒ کے تدبر، حب الوطنی، حوصلہ، جرأت اور ایثار کی ضرورت کو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔

خالق موت و حیات کی حکمتیں سب سے بالا ہیں، وہ حکیم مطلق ہے، اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں اور اس کے ہر فیصلہ کو صدق دل کے ساتھ حکیمانہ سمجھ کر صبر و رضا کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم

ختم کر دینا ہی بندگی ہے۔ مگر انسان اپنی ہمت اور ضرورت کے دائرہ میں رہ کر سوچتا ہے کہ

ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یہی وجہ ہے کہ اسلام، قوم اور ملک سے محبت رکھنے والوں نے مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کی اچانک خبر کو اس تیر کی طرح دلوں میں پیوست ہوتے محسوس کیا ہے جو بے خبری اور غفلت کے عالم میں سنسناتا ہوا آئے اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات پر قومی حلقوں میں وسیع پیمانے پر جس غم و صدمہ کا اظہار ہوا اور جس محبت و عقیدت کے ساتھ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا وہ دراصل دین، قوم اور ملک کے لیے مفتی صاحبؒ کی وسیع تر خدمات اور جدوجہد کا عملی اعتراف ہے، اور اس امر کا ثبوت ہے کہ مرحوم پر قوم نے قیادت کی ذمہ داریوں کے ضمن میں جو اعتماد کیا تھا وہ اس سلسلہ میں قوم کے سامنے سرخرو رہے ہیں۔

1. مولانا مفتی محمودؒ کون تھے؟
2. انہوں نے اعتماد و مقبولیت کے ساتھ قومی قیادت کا مقام کیسے اور کن مراحل سے گزر کر حاصل کیا؟
3. ان کی زندگی اور جدوجہد نے معاشرہ کو کن تبدیلیوں سے دوچار کیا؟
4. اور ان کی وفات کے بعد ان کے مشن، جدوجہد اور کردار کو معاشرہ میں کارفرما رکھنے کی کیا صورت ہوگی؟

ان میں سے اول الذکر تین سوال تو تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ بن کر مؤرخ کی میز پر جا چکے ہیں، جبکہ آخری سوال نہ صرف مفتی صاحبؒ کے مشن سے تعلق رکھنے والے کارکنوں بلکہ اس مشن کو معاشرہ کی بنیادی ضرورت سمجھنے والے محب وطن عناصر کے ذہنوں میں بھی کھلبلی مچائے ہوئے ہے۔

مجھے نہ تو مؤرخ ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی ایسی فراست کا کہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکوں۔ لیکن تحریک ولی اللٰہی کے ایک شعوری کارکن اور مولانا مفتی محمودؒ کے ایک رفیق کار کی حیثیت سے ان سوالات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ بہت سی غلط فہمیاں جو مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے حلقہ فکر و عمل کے مزاج، اجزاء ترکیبی اور قوتِ کار سے ناواقفیت کی بنا پر بہت سے ذہنوں میں جنم لے رہی ہیں، یقین کی منزل کی طرف پیش رفت نہ کر سکیں۔

مفتی محمودؒ بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے جنہوں نے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گاؤں عبدل خیل میں ایک غریب مگر دین دار گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد نے اپنے دینی مزاج اور علاقہ کی خوشگوار

روایت کے باعث اپنے بچے کو سکول کی ضروری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ دوران تعلیم انہیں دیوبند، مراد آباد، دہلی اور دیگر علمی مراکز میں وقت کے چوٹی کے علماء سے تعلیم حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ذہانت وفراست کی دولت اللہ تعالیٰ نے وافر دے رکھی تھی۔ حضرت السید مولانا حسین احمدؒ مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور حضرت مولانا سید محمد میاںؒ جیسے مجاہد اہل علم کی صحبت نے اس فراست کو جلا بخشی اور ملک وقوم کی پسماندگی اور درماندگی کو دیکھ کر دل میں بیدار ہونے والے درد نے اس ذہانت وفراست کا رخ قومی خدمت کی طرف موڑ دیا۔

مفتی صاحبؒ کو جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا یا دورانِ تعلیم جن کی صحبت سے فیض یاب ہوئے وہ اپنے وقت کے سرکردہ علماء ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سرگرم مجاہد اور شب زندہ دار اہل اللہ بھی تھے۔ ولی اللٰہی خاندان اور اس سے فیض یاب ہونے والے علماء کے قافلہ کی، جس نے بعد میں دیوبندی مکتب فکر کی شکل اختیار کرلی، امتیازی خصوصیت یہی تھی کہ اس کاروان کے افراد علم میں یکتا، عمل میں محکم اور جہاد کے جذبہ میں منفرد تھے۔ آپ امام ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے تمام فرزندوں، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور اس کاروانِ صدق وصفا کے دیگر سرخیلوں کو دیکھیں، وہ محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عابد وزاہد ولی اور دین وقوم کے لیے ہر وقت سربکف مجاہد بھی تھے۔ علم وعمل اور جہاد کے اس حسین امتزاج نے ہی کاروان ولی اللٰہی کو نہ صرف برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش میں بلکہ پورے عالم اسلام میں امتیازی حیثیت عطا کی ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ کی تعلیم وتربیت کے جملہ مراحل اسی ماحول میں طے ہوئے اور یہ وہ وقت تھا جب تحریکِ آزادی پورے شباب پر تھی۔ برطانوی استعمار کے خلاف باشندگانِ دین انتہائی جوش وجذبہ کے ساتھ برسرِپیکار تھے اور مدارس کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن وحدیث کا درس دینے والے طلبہ کے کانوں میں قال اللہ وقال الرسول کی پرسوز صداؤں کے ساتھ زنجیروں کی جھنکار اور آزادی کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔ ان سب عوامل نے مل کر مفتی محمودؒ کے دل میں قومی درد کی چنگاری کو ہوا دی اور اس چنگاری نے دھیمے دھیمے بھڑکنے والے اس شعلہ کی شکل اختیار کرلی جس کی حرارت اور چمک نے ایک عرصہ تک لاکھوں دلوں کو دینی وقومی درد کی تپش سے گرمایا اور انہیں جدوجہد پر ابھار کر منزل کی طرف ان کی راہنمائی کی۔

اپنے اسلاف کی طرح مفتی محمودؒ بھی علم، عمل اور جذبۂ جہاد کا حسین مرقع تھے۔ وہ اپنے وقت کے

بڑے محدثین میں شمار ہوتے تھے، مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے ان کا حسین تعلیمی دور حدیث کے طلبہ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ حدیث اور اس کے متعلقات پر مفتی صاحبؒ کی پر مغز گفتگو بالخصوص عصری مسائل پر ان کی مضبوط گرفت انہیں اپنے معاصر محدثین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ فقیہ النفس مفتی تھے، ان کے تفقہ وادراک، نظر کی وقت و وسعت، اور تجزیہ و تحقیق کی صلاحیت پر معاصرین ان کی زندگی میں خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔ اور معاصرین کے اعتراف و تحسین سے بڑھ کر کسی کے کمال پر اور کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ وہ معقولات کے استاذ تھے، ایسے استاذ کہ جنہیں استاذ کہتے ہوئے ارباب فن بھی فخر محسوس کرتے تھے۔ درس نظامی سے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اس دور میں معقولات کا اچھا استاذ ہونا ہی کمال کی معراج سمجھا جاتا ہے اور مفتی محمودؒ عروج کے اس زینہ میں بھی آخری سیڑھی پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اس ہمہ پہلو علم نے مفتی محمودؒ کو علم اور بڑائی کے نشہ سے دوچار نہیں کیا اور علم کا سہ آتشہ جام پینے کے باوجود وہ آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ عمل و کردار کا آئینہ بھی علم و فضل کی طرح انہیں بام عروج سے ہمکنار دکھاتا ہے۔ مرحوم کے قریبی رفقاء شاہد ہیں کہ شرعی احکام کی پابندی، فرائض کی بجاآوری اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے معاملہ میں ان کی خلوت و جلوت میں کوئی فرق نہ تھا۔ سفر، تکان اور علالت کی شدت کے دور میں بھی وہ شرعی احکام و فرائض کی اسی جذبہ و رفتار کے ساتھ پابندی کرتے دکھائی دیتے تھے جیسے عام حالات میں معمول تھا۔

روحانی طور پر وہ اپنے آبائی پیر خانہ یاسین زئی شریف سے آخر دم تک وابستہ رہے۔ اس وابستگی پر انہیں فخر تھا اور اپنی روحانی تربیت گاہ کے ساتھ ان کا قلبی لگاؤ ان کے خلوص اور دل کی صفائی کا غماز ہے۔

عمل کا ایک اور پہلو جو سب سے زیادہ روشن اور چمکدار ہے وہ مرحوم کا قابل رشک کردار ہے۔ کردار کا ایک رخ یہ ہے کہ مفتی صاحبؒ نے مدرسہ قاسم العلوم کے شیخ الحدیث، قومی اسمبلی کے ممبر، ایک سرگرم سیاسی جماعت کے قائد، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ، قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر اور تحریک نظام مصطفیٰؐ جیسی تحریک کے قائد کے طور پر زندگی کے مختلف ادوار دیکھے۔ ان کے سامنے طلبہ نے زانوئے تلمذ تہہ کیے، ان کی صدارت میں پارلیمانی پارٹی کے اجلاس ہوئے، ان کے قلم سے سینکڑوں احکامات اور درجنوں قوانین کا اجراء ہوا، اور ان کے گرد لاکھوں افراد کے ہجوم نے زندہ باد اور مرحبا کے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات ان کے اپنے مزاج، گھر کے ماحول، طرزِ معاشرت اور سوچ کے انداز میں تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ زمانہ انہیں متاثر کرنے کے لیے ہر انداز میں سامنے آیا لیکن انہوں نے اپنے کردار اور عمل

سے ثابت کر دیا کہ وہ متاثر ہونے کے لیے نہیں بلکہ متاثر کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک اور رخ کردار کا یہ بھی ہے کہ اقتدار، جس کی چوکھٹ پر لاکھوں جبینیں ہر وقت جھکی رہتی ہیں، مفتی محمودؒ نے اس پر بے نیازی کی ایسی ضرب لگائی کہ اقتدار کے سکہ پر کی گئی ملمع سازی کی چمک دمک ماند پڑ کر رہ گئی اور اس مرد درویش نے وقت کے ترازو پر اپنی بے نیازی کو اقتدار سے کہیں زیادہ وزنی ثابت کر دکھایا۔ وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ کے بعد استعفیٰ کی واپسی پر اصرار سے لے کر وفاقی وزارت کی پیشکش اور پھر اس کے بعد موت کے دن تک وزارتوں کی پیشکش کا تسلسل اور پھر ان پیشکشوں کے جواب میں اصولوں کے حوالے سے مفتی صاحبؒ کا انکار ملک کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہے جس سے اہل عزم و ہمت صدیوں تک راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق سیاست سے اگرچہ طالب علمی کے دور میں ہی قائم ہو گیا تھا اور انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر آزادیٔ وطن کی تحریک میں عملی حصہ بھی لیا۔ مگر سیاست میں ان کی باقاعدہ آمد ۱۹۵۷ء میں ہوئی جب خود ان کی تحریک اور امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی دعوت پر ملتان میں مغربی پاکستان کے سرکردہ علماء کے کنونشن میں جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء کے بعد ۱۹۵۶ء کے دستور پر مفتی صاحبؒ کی تنقیدات و ترامیم منظر عام پر آئیں۔ ارباب فہم وادراک نے ان ترامیم و تنقیدات کے پس منظر میں کارفرما عزائم و محرکات کو بھانپ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ملتان کے ایک دینی مدرسہ کا یہ شیخ الحدیث ملک کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والا ہے۔

۱۹۶۲ء میں مفتی صاحبؒ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے خداداد صلاحیتوں اور محنت کے ساتھ قومی بحثوں میں حصہ لے کر خود کو ایک اچھے پارلیمنٹیرین کے طور پر متعارف کرا لیا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء کے بعد سے مفتی صاحبؒ اس کے نائب امیر چلے آرہے تھے کہ ۱۹۶۸ء میں مشرقی پاکستان میں جمعیۃ علماء اسلام کے قیام کے بعد مرکزی جمعیۃ کے قیام کا مرحلہ پیش آیا تو انہیں مرکزی ناظم عمومی (جنرل سیکرٹری) منتخب کر لیا گیا اور آخر دم تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ ایوب خان مرحوم کی گول میز کانفرنس میں جمہوری مجلس عمل کی طرف سے مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفیق کار حضرت مولانا پیر محسن الدین احمدؒ بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر مفتی صاحبؒ نے علماء کے ۲۲ نکات کو دستور کی بنیاد بنانے اور مسلمان کی تعریف کو آئین میں شامل کرنے کا مطالبہ کر کے پورے ملک کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیا۔ اس وقت تو اس مطالبہ کو دیوانے کا ایک خواب سمجھا گیا مگر صرف چھ سال کے بعد ملک کی پارلیمنٹ نے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ گول میز کانفرنس میں مفتی محمودؒ کا مطالبہ نہ صرف صحیح بلکہ قوم کی

ایک اہم ضرورت تھا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل ملک میں جو سیاسی خلفشار رونما ہوا یا پیدا کیا گیا، مفتی صاحبؒ اور ان کی جماعت نے اس خلفشار کو خانہ جنگیؒ تک پہنچنے سے بچانے کے لیے توازن، اعتدال اور جرأت کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنایا۔ انہوں نے سیاست اور ووٹ کی لڑائی کو اسلام اور کفر کا معرکہ نہ بننے دیا اور محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقوں کے مسائل و مشکلات کو اسلام کے حوالے سے موضوعِ سیاست بنا کر اس تاثر کو عملاً دور کر دیا کہ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے خلاف محنت کشوں کی معرکہ آرائی میں اسلام سرمایہ داری اور جاگیرداری کا حلیف ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم کی راہ روکنے کا یہی ایک فطری راستہ تھا جو ۱۹۷۰ء میں مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں علماء حق نے اختیار کیا۔ اور آج بھی جبکہ کمیونزم اور سوشلزم کے اندرونی و بیرونی محرکات پورے نظم و وسائل کے ساتھ متحرک ہیں، سوشلزم کی راہ روکنے کا منطقی راستہ مروجہ معاشی و اقتصادی نظام کا دفاع نہیں ہے، بلکہ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مروجہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف محنت کشوں کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کیا جائے اور انہیں خلوص دل کے ساتھ خلافت راشدہ کے غیر طبقاتی معاشرہ کی برکات و فیوض سے آگاہ کر کے ان کے لیے سوشلسٹ لیڈر شپ کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔

پاکستان کا محنت کش مسلمان ہے۔ معاشرہ میں خوشحال لوگوں کی فیشن ایبل بستیوں اور کچی آبادیوں کے درمیان معیارِ زندگی کے ہوشربا تفاوت نے مروجہ نظام کے خلاف محنت کشوں کے اضطراب اور بے چینی کو جواز کی ناقابل تنسیخ سند فراہم کر دی ہے۔ لیکن اگر آج بھی محنت کشوں کو عمل اور کردار سے یہ یقین دلا دیا جائے کہ مروجہ نوآبادیاتی اور غیر اسلامی نظام کے خلاف ان کے اضطراب میں اسلام ان کا حریف نہیں حلیف ہے تو پاکستان کا غریب مگر دیندار محنت کش سوشلسٹ قیادت کا جوا گلے سے اتارنے میں شاید چوبیس گھنٹے کی تاخیر بھی گوارا نہ کرے۔ مگر علماء کو آپس کی لڑائیوں اور بے مقصد بحثوں سے فرصت ہو تو وہ وقت کے اس سب سے بڑے چیلنج کی طرف توجہ کریں۔ بہرحال وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر علماء نے اتحاد و اشتراک اور تدبر و فراست کے ساتھ وقت کے اس چیلنج کا سامنا نہ کیا تو خاکم بدہن، بخارا و تاشقند کی تاریخ دنیا کے سامنے ایک بار پھر دہرائی جائے گی۔ اور تکلف برطرف! جہد و عمل سے خالی دعائیں اور اتحاد و یگانگت سے معرا بیانات و تقاریر اس سیلاب کا راستہ نہ روک سکیں گی۔

جذبات کی رو میں دور تک بہہ گیا، ذکر مولانا مفتی محمودؒ کی ۱۹۷۰ء کی حکمت عملی کا ہو رہا تھا، اس حکمت عملی نے ملک کے سیاسی حلقوں میں مفتی صاحبؒ اور ان کی جماعت کے لیے اعتماد اور دلچسپی کے در وا کیے،

اور اسی فضا میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سامنے آئے۔ جمعیۃ علماء اسلام نے قومی اسمبلی میں سات نشستیں حاصل کی تھیں اور سرحد و بلوچستان کی صوبائی اسمبلیوں میں توازن کی قوت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح مولانا مفتی محمودؒ کی مدبرانہ قیادت میں علماء حق کی جماعت ملکی سیاست کا ایک ناگزیر حصہ بن کر ابھری۔

۱۹۴۷ء تک کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کو قیام پاکستان کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے اور انہیں بھی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی سیاسی زندگی کے حوالہ سے معذرت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے دوران مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی جماعت کی سطح پر اور چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں کی لاہور کانفرنس کے حوالے سے ملکی سالمیت کے تحفظ کے لیے جو پرخلوص اور جرأت مندانہ کردار ادا کیا، وہ حب الوطنی کے بہت سے اجارہ داروں کے لیے بھی قابل رشک ہے۔ مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی کے ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ کر کے ''اُدھر تم اِدھر ہم'' کے نعروں کی گونج میں ڈھاکہ جانے والے ارکان اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دینے کا جو چیلنج دیا، اس کا جواب سب سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان کی نشست سے مسٹر بھٹو کو شکست فاش دینے والے اسی مرد قلندر نے ڈھاکہ سیشن میں شرکت کا دوٹوک اعلان کر کے دیا۔

- ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے سقوط ڈھاکہ کے المناک سانحہ تک مولانا مفتی محمودؒ کا سیاسی کردار جس طویل تذکرہ کا متقاضی ہے یہ صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں، لیکن اتنی بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ
- جمعیۃ علماء اسلام کے ارکان اسمبلی کی طرف سے ڈھاکہ سیشن میں شرکت کا اعلان،
- مولانا مفتی محمودؒ کی طرف سے طلب کردہ چھوٹے پارلیمانی گروپوں کی لاہور کانفرنس کے فیصلے،
- اور یحییٰ خان کی طرف سے قومی اسمبلی کے مشرقی پاکستان کے ارکان کو نااہل قرار دے کر ان کی جگہ نام نہاد انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام کا حصہ نہ لینے کا اعلان

سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کے ایسے شاہکار ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے سیاسی جغادریوں کے حب الوطنی کے چراغ ماند پڑ گئے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان میں مارشل لاء کے خاتمہ کی جدوجہد بھی مفتی صاحبؒ کے قومی کردار کا ایک تابناک باب ہے۔ مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد میں کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے تعاون سے وزیر اعلیٰ بنے۔ سرحد و بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ کی مخلوط وزارتوں کا سیاسی پس منظر اور قومی سیاست پر ان کے اثرات ایک مستقل مقالہ کا

تقاضہ کرتے ہیں، مگر یہاں صرف تین پہلوؤں پر مختصراً گزارش کرنا چاہوں گا۔

1. مفتی صاحب نے اردو کو صوبہ سرحد کی سرکاری زبان کا درجہ دے کر سرحد کی سیاسی عظمت کو دوبالا کر دیا،

2. شراب پر پابندی اور دیگر اسلامی قوانین کے اجراء سے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں پائی جانے والی جھجک اور گومگو کو ختم کر دیا،

3. اور وفاتی وزراء کے مخالفانہ دوروں اور تقاریر کے باوجود دفعہ ۱۴۴، لاٹھی، گولی اور کسی بھی قسم کے امتناعی قوانین کے بغیر دس ماہ تک کامیابی کے ساتھ صوبہ کا نظام چلا کر یہ ثابت کر دیا کہ ملا اگر صحیح معنوں میں ''ملا'' ہو تو وہ حکومت اور سیاست کے نظام کو دوسروں سے کہیں زیادہ بہتری اور کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہے۔

اصولوں کی خاطر صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ اور اس کے بعد قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کے طور پر آئین سازی میں مفتی صاحبؒ کی مسلسل جدوجہد کے مناظر ابھی تک پاکستانی عوام کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ جبکہ تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کی قیادت کا مرحلہ تو ابھی تازہ ہے، انہوں نے جس تدبر اور صلاحیت کے ساتھ تحریک کی قیادت کی اور پھر مذاکرات کے طویل اور جانگسل مرحلہ کو نمٹایا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔

مفتی صاحبؒ سیاست کا کاروبار معطل ہونے کے بعد بھی نہ تو کسی دوسرے ملک میں جا کر بیٹھ گئے اور نہ ہی اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہوئے بلکہ ایک عالم دین ہونے کے حوالے سے ''نظام العلماء پاکستان'' کے نام سے مذہبی اور دینی پلیٹ فارم قائم کر کے آخر دم تک قوم کی دینی راہ نمائی اور عوام کے حقوق و مسائل کے سلسلہ میں جدوجہد کرتے رہے۔

آج مفتی صاحبؒ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن ان کی جدوجہد اور کارنامے زندہ ہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علماء حق کی سیاست کو مسجد، مدرسہ، خانقاہ اور جلسہ و جلوس کے دائرہ سے نکال کر ان ایوانوں تک پہنچایا جہاں قوم کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ انہوں نے جلسہ، جلوس، ایوان اور میز پر علماء کو سیاستدانوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر کے اس اعتماد اور حوصلہ سے سرشار کیا کہ وہ اگر اپنے اسلاف کی جرأت، بے نیازی اور خلوص کو وطیرہ بنا لیں تو سیاست کے ہر شعبہ میں وہ قوم کی قیادت کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس سوال پر کچھ عرض کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ مفتی صاحبؒ کے بعد کیا ہو گا؟ اس لیے

کہ بہت سے حلقوں اور افراد کے ذہنوں میں یہ غلط فہمی جنم لے رہی ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کے بعد شاید اس علماء حق کے کیمپ میں سناٹا طاری ہو جائے گا اور یہ قافلہ معاشرہ میں جو کردار ادا کرتا آرہا ہے، اس کا باب بند ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ جس حلقہ کی نمائندگی مولانا مفتی محمودؒ کرتے رہے ہیں اس کی نوعیت شخصی نہیں نظریاتی ہے۔ اور نظریاتی حلقے اشخاص کے سہارے نہیں بلکہ نظریۂ خلوص اور کارکنوں کے جذبہ وعمل کے سہارے زندہ رہتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی صاحبؒ جیسی قد آور شخصیت کی موت اس حلقہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان اور ایک مدت تک نہ بھلایا جانے والا صدمہ ہے، لیکن اس سے قبل یہ حلقہ فکر وعمل شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، شیخ الاسلام مولانا علامہ شبیر احمدؒ عثمانی، قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسی عظیم شخصیات کی جدائی کا صدمہ برداشت کر چکا ہے۔ اس لیے اگرچہ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کا صدمہ تازگی کی بنا پر کیفیت وکمیت کے لحاظ سے ان صدموں سے منفرد محسوس ہوتا ہے لیکن جیسے ان مذکورہ بالا اکابر کی جدائی ولی اللّٰہی تحریک کے کارکنوں کے جذبہ وعمل اور قوت کار پر اثر انداز نہیں ہوئی اسی طرح مولانا مفتی محمودؒ کی موت بھی یقیناً منفی اثرات ونتائج کی حامل نہیں ثابت ہوگی۔

مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی مدبرانہ قیادت کے دور میں کاروانِ ولی اللّٰہی کو

- اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد،
- ملکی سالمیت کی ہر قیمت پر حفاظت،
- اور عوامی حقوق ومسائل کے لیے بے لوث اور جرأت مندانہ کردار

کی جس شاہراہ پر گامزن کیا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قافلہ اسی شاہراہ پر گامزن رہے گا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ کے درجات بلند فرمائے، ان کی قبر کو منور کرے اور ہمیں توفیق مرحمت فرمائے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین، ملک اور قوم کی مخلصانہ خدمات سرانجام دیتے رہیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۷ نومبر ۱۹۸۰ء)

(۲)

ماہِ رواں کی چودہ تاریخ کو قائد مرحوم حضرت مولانا مفتی محمود قدس سرہ العزیز کو ہم سے رخصت ہوئے

ایک سال کا عرصہ ہو جائے گا۔ جماعتیں ایسے مواقع پر اپنے مرحوم قائدین کے دن مناتی ہیں اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کرتی ہیں۔ ہم اپنے مسلک کے حوالہ سے یوم وفات اور اس قسم کے دن منانے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ اسلامی تعلیمات و احکام اس قسم کی رسوم سے بہت بالا ہیں لیکن مرحوم قائدین بالخصوص حق و صداقت کی سربلندی کے لیے زندگیاں تج دینے والے عظیم مجاہدین کی یاد کو تازہ رکھنا جہاں ان مرحومین کا حق ہے وہاں جہد و عمل کی شاہراہ پر اپنی رفتار کو تیز کرنے اور جذبہ وجوش کو جلا دینے کا بھی ذریعہ ہے۔ اس لیے ہم ملک بھر میں جماعتی احباب سے گزارش کریں گے کہ وہ رسم و بدعت کی عام روایت سے ہٹ کر قائد مرحوم کی یاد میں اجتماعات کا اہتمام کریں، ایصال ثواب کی مجالس منعقد کریں، مرحوم کی قومی و دینی خدمات کا تذکرہ کریں اور ان کے مشن اور جدوجہد کے ساتھ وفاداری کے عہد کی تجدید کریں۔

ہمارے خیال میں مرحوم قائد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے مؤثر اور صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم جماعتی خلفشار کو ختم کر کے یک جہتی اور وحدت کے قیام کے لیے مخلصانہ مساعی کا راستہ اختیار کریں، اور یہ اس وقت ہو گا جب ہم سب انا، وقار اور خارجی امور سے قطع نظر کرتے ہوئے جماعت کے داخلی استحکام کو اولیت دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا کرنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

(۳)

مولانا مفتی محمودؒ کو ہم سے جدا ہوئے ایک برس ہو چکا ہے۔ مفتی محمودؒ بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے لیکن ان کی صلاحیتیں اور خوبیاں اس قدر متنوع تھیں کہ ان کے باعث موافق اور مخالف سب حلقوں میں ان کا دلی احترام پایا جاتا تھا اور ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کے علم، تدبر اور حوصلہ کا معترف تھا۔ مرحوم کا نمایاں وصف ٹھوس اور ہمہ گیر علم تھا جو انہوں نے اپنے وقت کے جید علماء اور اساتذہ کی صحبت میں حاصل کیا اور پھر اسے افتاء و تدریس کی برس ہا برس کی علمی و تجرباتی زندگی میں پختہ کیا۔ انہیں حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ معقولات اور عربی ادب پر بھی دسترس حاصل تھی۔ مسلسل سیاسی مشاغل، مصروفیات، علالت اور ذہنی پریشانیوں کے باوجود مختلف علوم کی جزئیات تک ان کو مستحضر تھیں۔ کوئی بھی مسئلہ چھیڑ دیں مرحوم اس پر دلائل کے انبار لگاتے چلے جاتے۔

مولانا مفتی محمودؒ اپنے دورہ حدیث کے سبق میں جدید سیاسی و معاشی مسائل پر کھل کر بحث کرتے، طلبہ کو ان کی اہمیت سے آگاہ کرتے، جمہوریت اور اسلام، سرمایہ داری اور کمیونزم، سود اور بینکاری اور ان جیسے

دیگر مسائل ان کا خصوصی موضوع بحث ہوتے۔ بلکہ وفاق المدارس العربیہ کے سالانہ امتحانات میں جو پرچے وہ خود مرتب کرتے ان میں ان مسائل سے متعلق سوالات بھی شامل کرتے تاکہ طلبہ میں ان مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق وذوق پیدا ہو۔

مفتی صاحبؒ جب اسلامی اصولوں کا جدید تقاضوں سے تقابل کرتے تو ان کا موقف دفاعی نہیں ہوتا تھا، اسلامی اصول واحکام کا مقدمہ جدید منطق کی زبان میں بڑی کامیابی سے پیش کرتے۔ مولانا مرحوم کی ایک خصوصیت ان کی دینی حمیت تھی، وہ دین اور دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف کوئی بات کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ انکارِ حدیث، انکارِ ختم نبوت، عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور ڈاکٹر فضل الرحمان کی تحریفات کے خلاف جدوجہد میں مفتی صاحبؒ کا سرگرم کردار ان کی دینی حمیت کا آئینہ دار ہے۔

مفتی محمود مرحوم کی ایک امتیازی خصوصیت ان کا حلم اور بردباری تھی۔ وہ مخالفین کی کڑوی کسیلی باتوں سے اشتعال میں نہیں آتے تھے بلکہ انتہائی تحمل اور بردباری کے ساتھ صرف قابلِ جواب باتوں کا جواب دیتے اور نامناسب باتوں پر خاموشی اختیار کر لیتے۔ ہمارے ہاں کردار کشی قومی سیاست کا لازمی عنصر شمار ہوتی ہے اور سابقہ دورِ حکومت میں اس ضمن کی باقاعدہ سرکاری طور پر سرپرستی کی جاتی رہی مگر سرکاری ذرائع ابلاغ سے مسلسل کردار کشی کے باوجود مفتی صاحبؒ اپنے اختلافات کا اظہار صرف دلائل اور اصولوں کے حوالے سے کرتے اور سیاسی مخالفین کے بارے میں کوئی نامناسب بات ان کی زبان پر نہ آتی۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے وہ بے پایاں جذبہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم کہا کرتے تھے کہ مجھے اسلامی نظام چاہیے جن ہاتھوں سے بھی آئے، اگر صحیح اسلام ہوا تو میں اسے بخوشی قبول کروں گا۔ جن دنوں ”پاکستان قومی اتحاد“ کے نمائندے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی کابینہ میں شامل تھے، کچھ آزاد خیال دوستوں کی طرف سے اس پر اعتراض ہوا کہ جمہوریت کے علمبردار غیر نمائندہ حکومت میں کس طرح شامل ہو گئے۔ مفتی صاحبؒ اس کے جواب میں فرمایا کرتے تھے کہ نظریاتی تحریکوں کے لیے جمہوریت مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اب یہاں کمیونسٹ بھی جمہوریت کی بات کرتے ہیں اور ہم بھی جمہوریت کی بات کرتے ہیں، لیکن جمہوریت نہ ان کا مقصود ہے نہ ہمارا۔ وہ جمہوریت کے ذریعہ کمیونزم لانا چاہتے ہیں اور ہم جمہوری عمل کو اسلامی نظام کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کمیونسٹوں کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے جمہوریت کے سوا کوئی اور سہل ذریعہ مل جائے تو وہ اسے اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتے، اس لیے ہم اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے غیر نمائندہ حکومت میں شمولیت کا تجربہ کر

رہے ہیں تو یہ ہمارے مقصد کے خلاف نہیں ہے۔ اور پھر جب چند اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان ہوا تو مفتی صاحبؒ جلسوں میں اسے حکومت میں اپنی شمولیت کے ثمرہ کے طور پر بڑے فخر سے ذکر کرتے اور فرماتے کہ باقی لوگ کنارے پر کھڑے نمائندہ و غیر نمائندہ کے چکر میں الجھے رہے لیکن ہم سمندر میں کود کر یہ موتی نکال لائے ہیں۔ مگر صد افسوس کہ یہ خوشی اور مسرت زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکتی اور جن قوانین کے نفاذ کا مرحوم انتہائی فخر سے اعلان کیا کرتے تھے ان پر عملدرآمد کی منفی صورتحال پر ان کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید تھا۔

مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی قومی جدوجہد کا دوسرا نکتہ ان کی عوام دوستی تھی۔ عوامی حقوق کے بارے میں وہ کسی لچک کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ کے دور میں بھی عوامی حقوق کی پاسداری کو قائم رکھا۔ ان کے خلاف مظاہرے ہوئے، ٹرسٹ کے اخبارات نے نازیبا رویہ اختیار کیا حتیٰ کہ وفاقی وزراء ان کے خلاف ان کے صوبہ میں تقریریں کرتے رہے لیکن کیا انہوں نے ایک لمحہ کے لیے دفعہ ۱۴۴ یا کسی امتناعی قانون کا سہارا لیا؟ بلکہ وہ چیلنج دیا کرتے تھے کہ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ ان کے دورِ حکومت میں ایک دن کے لیے بھی دفعہ ۱۴۴ لگی ہے یا پولیس نے کسی پر لاٹھی چارج کیا ہے تو وہ سیاست سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عوام کو یہ حقوق اسلام نے دیے ہیں اور اسلام کے عطا کردہ حقوق کی تنسیخ یا تعطیل کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

مولانا مرحوم کی قومی جدوجہد کا تیسرا نکتہ ان کی اصول پرستی تھی۔ انہوں نے اصولوں کی خاطر واضح اکثریت رکھتے ہوئے بھی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ جس بات کو صحیح سمجھا اس پر ڈٹ گئے، اپنے موقف کی خاطر بعض رفقاء سے ہاتھ دھونے پڑے مگر اسکی پرواہ نہ کی۔

مفتی صاحبؒ کی سیاسی جدوجہد کا چوتھا پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ وہ اگرچہ تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے بلکہ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر انہوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ہر دور میں پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جدوجہد میں انہوں نے شاندار کردار ادا کیا۔

افغانستان میں روسی جارحیت کی پرزور مذمت اور افغان عوام کی جدوجہد کی غیر مشروط حمایت کے پیچھے جہاں اسلامی و انسانی ہمدردی کے جذبات کارفرما تھے وہاں مفتی صاحب مرحوم کا یہ احساس بھی اس معاملہ میں کافی حد تک دخیل تھا کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے سامنے سپر انداز ہونے کا مطلب خود پاکستان کی سالمیت سے ہاتھ دھونا ہے۔ اس لیے وہ کہا کرتے تھے کہ افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

(۴)

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو ہم سے جدا ہوئے دو عشرے ہونے کو ہیں لیکن ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ وہ نہ صرف ہمارے درمیان موجود تھے بلکہ اہل حق کی دینی و سیاسی راہنمائی کے لیے پوری طرح متحرک اور سرگرم عمل بھی تھے۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ ہماری کمزوریاں جانے والوں کی خوبیاں ہمارے سامنے زیادہ نمایاں کرتی ہیں اور ان کا شدت کے ساتھ احساس دلاتی ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی اپنے جانے والے بزرگوں کے حوالہ سے یہی معاملہ ہو رہا ہے۔ آج امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور پاکستانی قوم کو درپیش بحران کے تناظر میں ہماری مصلحت کوشیاں اور حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کا طرز عمل ہمیں ان بزرگوں کی شدت کے ساتھ یاد دلا رہا ہے جو قومی ضروریات، ملی مفادات اور دینی تقاضوں کو ہر مصلحت پر مقدم سمجھتے تھے اور ان کے لیے ہر وقت قربانی اور ایثار کا مظاہرہ کرنے کو تیار رہتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ بھی انہی بزرگوں میں سے تھے اور میں ان کے ایک رفیق کار اور ٹیم کے ایک رکن کی حیثیت سے اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ دینی تقاضے اور ملی ضروریات کے حوالہ سے مصلحت اور مفاد کا کوئی کانٹا بھی ان کے دامن سے الجھنے کا حوصلہ نہیں کر پاتا تھا۔ بلوچستان کا مسئلہ ان کے دور میں بھی تھا اور اس حساس صوبے میں فوجی آپریشنز نے وہاں کے عوام کے دلوں میں احساس محرومی اور احساس تنہائی کا جو بیج بویا تھا، مولانا مفتی محمودؒ نے اس وقت بلوچستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے نہ صرف یہ کہ صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کو ٹھوکر مار دی تھی بلکہ متحدہ جمہوری محاذ کے پلیٹ فارم پر لاہور، ملتان اور دیگر مقامات پر سینکڑوں جماعتی کارکنوں کی گرفتاریاں پیش کر کے بلوچ عوام کے زخمی دلوں پر مرہم رکھی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب متحدہ جمہوری محاذ نے پنجاب کے مختلف شہروں میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا تو جمعیۃ علماء اسلام کے ایک اجلاس میں مولانا مفتی محمودؒ سے سوال کیا گیا تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تو ہماری سیاسی زندگی کے معمولات میں سے ہے جس سے ہمیں وقتاً فوقتاً سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا اس قدر سختی کے ساتھ نوٹس لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر مفتی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ بات دفعہ ۱۴۴ کی نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم ان گرفتاریوں کے ذریعہ بلوچستان کے عوام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم حکمرانوں کے ساتھ نہیں بلکہ تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے کیمپ میں ہیں۔

ایک سیاسی کارکن کے طور پر میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ اگر اس موقع پر پنجاب میں گرفتاریاں پیش نہ کی

جاتیں، مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ نہ دیتے، چودھری ظہور الٰہی شہید مچھ جیل میں بند نہ کیے جاتے اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر مولوی سید شمس الدینؒ جو اس وقت جمعیۃ علماء اسلام بلوچستان کے صوبائی امیر تھے جام شہادت نوش نہ کرتے تو بلوچستان کے عوام کو یہ یقین دلانا مشکل ہو گیا تھا کہ ان کے خلاف کی جانے والی فوجی کارروائی میں پنجاب کے عوام بالخصوص اور ملک بھر کے عوام بالعموم شریک نہیں ہیں۔ سچی بات ہے کہ آج بلوچستان کی صورتحال دیکھ کر مجھے مولانا مفتی محمودؒ، چودھری ظہور الٰہی مرحوم اور مولوی سید شمس الدین شہیدؒ شدت کے ساتھ یاد آ رہے ہیں اور میری آنکھیں تلاش کر رہی ہیں کہ بلوچستان کے مظلوم عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے اور ان کے غم میں عملی طور پر شریک ہو کر اسے کم کرنے کے لیے آج کون مفتی محمودؒ بنتا ہے، کون چودھری ظہور الٰہیؒ کے راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوتا ہے اور کون مولوی سید شمس الدین شہیدؒ کے کردار کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے علمبردار تھے اور انہوں نے ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامائزیشن کے عملی اقدامات کے لیے جو تاریخی کردار ادا کیا وہ اسلامائزیشن کی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ یہ درست ہے کہ اس مہم میں وہ اکیلے نہیں تھے اور ان کے ساتھ مختلف مکاتب فکر اور مختلف دینی جماعتوں کے قائدین کی ایک پوری کھیپ تھی لیکن اس کھیپ کی فکری قیادت انہوں نے ہی کی تھی اور اس ساری مہم کا ''ماسٹر مائینڈ'' وہی تھے۔ انہوں نے جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا مسلسل ساتھ دینے کے بعد صرف اس لیے اپنی راہیں ان سے الگ کر لی تھیں کہ ان کے خیال میں نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں جنرل ضیاء الحق مرحوم کی رفتار سست تھی اور ان کی ترجیحات میں سنجیدگی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا مفتی محمودؒ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے سب سے بڑے نقاد تھے، وہ اپنے عوامی خطابات میں ان پر سخت سے سخت الزامات عائد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور ان کی زندگی کے آخری ایام جنرل ضیاء الحق مرحوم کے خلاف وسیع تر سیاسی محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں بسر ہوئے۔ مجھے ان کا جمعہ کے اجتماع سے وہ خطاب یاد ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں فرمایا تھا۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے خلاف ان کے لہجے کی گھن گرج آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے، وہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے مدمقابل صرف اس لیے آ رہے تھے کہ ان کے خیال میں نفاذِ اسلام کے لیے جنرل صاحب کے اقدامات میں سنجیدگی کا عنصر کم ہوتا جا رہا تھا۔

مگر آج تو نفاذِ اسلام کی ساری بساط ہی خاکم بدہن لپیٹی جا رہی ہے۔ دستور پاکستان کی جن دفعات کی بنیاد

پر اسلامائزیشن کی بات ہوتی ہے سرے سے وہ دفعات ہی مجوزہ ترامیم کی زد میں ہیں۔ اور بتایا جاتا ہے کہ قرار دادِ مقاصد اور اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دینے والی دفعات کو ختم کرنے یا کم از کم غیر موثر بنا دینے کی تجاویز اعلیٰ حلقوں میں گردش کر رہی ہیں۔ ملک کو اس کے اسلامی تشخص سے محروم کرنے کے لیے سیکولر سائیڈ کے سارے کردار متحرک ہیں، چوکس ہیں اور فعال ہیں۔ مگر مولانا مفتی محمودؒ کے کردار کا خانہ خالی نظر آرہا ہے اور مولانا شاہ احمد نورانی کے کردار کے خانے میں بھی کسی نمایاں چہرے کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی۔

افغانستان میں سوویت یونین کی فوجیں اتریں تو مولانا مفتی محمودؒ اکیلے نہیں بلکہ ان کی ساری جماعت میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ انہوں نے اس کے خلاف افغان عوام کی مسلح مزاحمت کو نہ صرف افغانستان کی آزادی کی جنگ اور شرعی جہاد کہا بلکہ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کی جنگ بھی قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوویت یونین کی نظریں اصل میں پاکستان کے ساحل پر ہیں اور افغانستان اس کا صرف راستہ ہے، اور یہ کہہ کر پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں کود پڑے تھے۔ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری آج بھی زد میں ہے، اسے آج بھی افغانستان ہی کی جانب سے خطرات لاحق ہیں اور صورتحال جوں کی توں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب سوویت یونین کی افواج تھیں اور اب ان کی جگہ امریکی اتحاد کی فوجوں نے لے لی ہے۔ میدان جنگ وہی ہے، جنگ کے اہداف بھی وہی ہیں، مرنے والے افغان بھی وہی ہیں اور پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو درپیش خطرات کا لیول بھی وہی ہے۔ مگر آج کوئی مفتی محمودؒ نظر نہیں آرہا جو قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کا پرچم اٹھا کر میدان میں آئے اور قوم کو دعوت دے کہ اگر اپنا وطن عزیز ہے اور اس کی وحدت و سالمیت عزیز ہے تو غیر ملکی فوجوں کا راستہ افغانستان میں ہی روک دو، انہیں آگے نہ بڑھنے دو اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے پشتیبان بنو کہ وہ تمہاری ہی جنگ لڑ رہے ہیں اور پاکستان کی وحدت و سالمیت کے لیے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کی خوبیاں ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں اور پاکستان کی قومی سیاست میں ان کا روشن کردار آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے جس جرأت، حوصلہ، تدبر، عزیمت اور حکمت کے ساتھ قومی سیاست میں اہل دین کی قیادت کی اور دینی جدوجہد کے میدان میں پیش رفت کی ہمارے لیے موجودہ بحرانی حالات میں یقیناً وہ راہنمائی اور حوصلہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں اور مولانا مفتی محمودؒ کی طرح ملی مقاصد اور دینی تقاضوں کی خاطر وقتی مفادات اور خود ساختہ مصلحتوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور)

(۵)

وقت اتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اور حالات اس طرح بھی بدل جاتے ہیں، اس کے بارے میں سن تو بہت کچھ رکھا تھا مگر رفتار زمانہ نے عمل و تجربہ کی دنیا میں احساس دلایا تو اس کا صحیح اندازہ ہوا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ قومی سیاست میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی شب و روز سرگرمیاں اور ان کی حکمت و تدبر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، بلکہ ان کے ساتھ شریک کار تھے۔ مگر آج جب وقت کا حساب لگایا ہے تو زمانے کی بے رحم رفتار نے بتایا کہ ۱۴ اکتوبر کو انہیں ہم سے رخصت ہوئے پینتیس برس ہو جائیں گے۔

میری حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ عملی رفاقت کم و بیش دس بارہ سال رہی ہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء تک جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی اور صوبائی سطح کے عہدہ دار کی حیثیت سے اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور ان کے رفیق کار خادم کے طور پر ان کی دینی و سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ وہ میرے باقاعدہ استاذ نہیں تھے لیکن میں نے ہمیشہ انہیں اپنے اساتذہ کی صف میں ہی سمجھا ہے، بلکہ جب یہ دیکھتا ہوں کہ میں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے بغیر ان سے کیا کچھ سیکھا ہے تو ''شاگرد'' کا لفظ بہت ہلکا دکھائی دینے لگتا ہے۔

آج سے چھ عشرے پہلے کی طرف دیکھتا ہوں تو قومی سیاست میں دینی قیادت کی مسلسل پیش رفت اور نفاذ اسلام کی جدوجہد میں آگے بڑھنے کا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور مولانا مفتی محمودؒ اس پیش قدمی کی قیادت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب ۱۹۵۶ء کے دستور میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا تھا، اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا، اور ملک میں نفاذ اسلام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود جمعیۃ علماء اسلام اس پر مطمئن نہیں تھی اور ان دستوری اقدامات کو ناکافی سمجھ رہی تھی۔ ۱۹۵۶ء کے دستور پر جمعیۃ علماء اسلام کی قائم کردہ کمیٹی جو مولانا شمس الحق افغانیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، شیخ حسام الدین مرحوم اور علامہ ڈاکٹر خالد محمود پر مشتمل تھی، اس نے دستور پر باقاعدہ تنقیدات مرتب کی تھیں جو جمعیۃ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں، اگر ان تنقیدات کے مطبوعہ رسالے کو کہیں سے تلاش کر کے ایک بار پھر قومی پریس کی زینت بنایا جا سکے تو صحیح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کی ٹیم نفاذ اسلام کے حوالہ سے کیا اہداف رکھتی تھی۔ اور یہ کہ ہماری آج کی قناعت پسندی کا ان اہداف کے ساتھ فاصلہ کتنی تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔

۱۹۶۲ء کے دستور میں ملک کے نام سے ''اسلامی'' کا لفظ حذف کر کے اس کے لیے ''جمہوریہ

پاکستان ‘‘کا نام تجویز ہوا تو مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا سید گل بادشاہؒ، اور مولانا عبید اللہ انورؒ کے قافلے کے اضطراب اور بے چینی کا عالم کیا تھا۔ جب تک حکمرانوں کو یہ تبدیلی واپس لینے اور دوبارہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شناخت واپس کرنے پر مجبور نہیں کر دیا گیا یہ بے چینی اور اضطراب ملک بھر کی سڑکوں اور مساجد و مدارس میں مرغ بسمل کی طرح تڑپتا دکھائی دیتا رہا۔ مگر آج ملک کی اسلامی شناخت کو دھیرے دھیرے مدھم کرتے چلے جانے پر یہ اضطراب سڑکوں اور مساجد تو کجا زبانوں بلکہ دلوں میں بھی تلاش کرنا پڑ رہا ہے۔

۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت اسمبلیاں اور حکومتیں وجود میں آئیں تو یہ عشرہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، اور پیر محسن الدین احمدؒ کی مسلسل صدا اور للکار کا دور تھا اور وہ پورے دور میں حالات کے جبر کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی بجائے اس کے سامنے کھڑے نفاذ اسلام کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے میں مصروف رہے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں نئے دستور کی بات ہوئی تو اب دستور سازی کے محاذ پر مولانا مفتی محمودؒ پھر قائدانہ حیثیت سے کھڑے تھے۔ انہیں مولانا عبد الحق آف اکوڑہ خٹک، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، پروفیسر غفور احمدؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ کی رفاقت حاصل تھی۔ مگر انہوں نے جس تدبر و جرأت کے ساتھ دستور سازی کا رخ لبرل ازم اور سوشلزم سے اسلامی جمہوریہ پاکستان اور قرارداد مقاصد کی طرف موڑا وہ بلاشبہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا کرشمہ تھا۔ آج دستور کا رخ پھر سے لبرل ازم کی طرف پھیرا جا رہا ہے مگر ان بزرگوں میں سے کوئی بھی وہاں دکھائی نہیں دے رہا۔

مولانا مفتی محمودؒ نے نفاذ اسلام میں پیش رفت کے لیے جمہوری اسمبلیوں کی طرح جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ کے مارشل لاء کو ذریعہ بنانے سے بھی گریز نہیں کیا جس کے نتیجے میں قرارداد مقاصد دستور کا باقاعدہ حصہ بنی، وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی، اسلامی نظریاتی کونسل فعال ہوئی، اور حدود آرڈیننس کا نفاذ عمل میں آیا۔ مگر آج یہ ساری چیزیں نظر ثانی کی زد میں ہیں، کچھ ان اس کی نذر ہو چکی ہیں اور باقی امور اپنی اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

یہ حالات کی تیز رفتار تبدیلی کا کرشمہ ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کے دور میں آج سے چار عشرے قبل نفاذ اسلام کے اقدامات کے حوالہ سے ہم پیش رفت کی پوزیشن میں تھے اور مسلسل پیش قدمی کرتے جا رہے تھے، مگر اب ہم صرف دفاع پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر کچھ دوست ناراض نہ ہوں تو یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم سے یہ دفاع بھی نہیں ہو پا رہا۔ مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد ہماری اس پوزیشن میں تبدیلی

کیسے آئی ہے اور ہم کہاں کہاں پیش قدمی کی بجائے پسپائی پر مجبور ہوئے ہیں، اس کا حساب لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کے اسباب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کی تلافی کے راستے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کل سامنا ہونے پر مولانا مفتی محمودؒ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ ''چھوڑو یار! تم سے تو ہماری کمائی کی حفاظت بھی نہ ہو سکی۔''

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۵ء)

(۶)

جمعیۃ علماء اسلام کا قیام سب سے پہلے ۱۹۴۵ء میں اس وقت عمل میں آیا جب متحدہ ہندوستان میں علماء کی سب سے بڑی تنظیم جمعیۃ العلماء ہند نے تحریک آزادی میں تقسیم وطن اور قیام پاکستان کے سوال پر مسلم لیگ کی بجائے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، اور قیام پاکستان کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کا اعلان کیا۔ اس فیصلہ سے اختلاف رکھنے والے علماء نے، جن میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سرفہرست تھے، جمعیۃ علماء ہند سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں مسلم لیگ کے شانہ بشانہ حصہ لیا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو جمعیۃ علماء اسلام کا پہلا سربراہ منتخب کیا گیا جبکہ ان کے ساتھ مولانا راغب احسنؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا غلام مرشدؒ، مولانا محمد شفیعؒ اور مولانا اطہر علیؒ آف ڈھاکہ جیسے سرکردہ علماء کرام اس میں شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب صوبہ سرحد اور سلہٹ کے علاقہ کو پاکستان میں شامل کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر ریفرنڈم کا فیصلہ کیا گیا تو سرحد میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور پیر صاحبؒ آف مانکی شریف، جبکہ سلہٹ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے عوامی رابطہ کی منظم مہم چلا کر علماء اور عوام کو پاکستان کی حمایت کے لیے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں دونوں جگہ مسلم لیگ نے ریفرنڈم جیت لیا۔ اور انہی خدمات کے اعتراف کے طور پر قائد اعظم مرحوم نے کراچی میں قیام پاکستان کے موقع پر پہلا پرچم لہرانے کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا انتخاب کیا۔

قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی کے رکن کے طور پر جمعیۃ علماء اسلام کے امیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اسلامی دستور کی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں وہ قرارداد مقاصد منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اقرار اور قرآن و سنت کی دستوری و قانونی عملداری کے اس عہد کے ساتھ پاکستان دستوری طور پر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا۔ علامہ

شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام ایک فعال جماعت کے طور پر متحرک نہ رہی۔ البتہ حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا اطہر علیؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا متین خطیبؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ جیسے اکابر علماء نے وقتاً فوقتاً اس پلیٹ فارم سے دستور اسلامی کے نفاذ اور دیگر دینی مقاصد کے لیے سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

۱۹۵۶ء میں ملک کے پہلے دستور کے نفاذ کے بعد اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ جمعیۃ علماء اسلام کو از سر نو منظم و فعال بنایا جائے اور عوامی سطح پر اس کی تنظیم نو کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں ملتان میں مغربی پاکستان کی سطح پر علماء کرام کا ایک قومی کنونشن طلب کر کے ''جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان'' کی تنظیم نو کا فیصلہ کیا گیا اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو امیر منتخب کیا گیا جن کے ساتھ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ نائب امیر چنے گئے، جبکہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس نئی ٹیم نے ملک بھر میں از سر نو رابطے اور دورے کر کے ہر سطح پر جمعیۃ علماء اسلام کے حلقے اور شاخیں قائم کر دیں اور علماء کرام کو ملک کے ہر خطہ میں عملی سیاست میں سرگرم حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد صدر محمد ایوب خان مرحوم نے ۱۹۶۲ء میں پہلے عام انتخابات کرائے تو حضرت مولانا مفتی محمودؒ ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے مانسہرہ سے مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت کا الیکشن جیتا۔ اس طرح ان دو ایوانوں میں جمعیۃ علماء اسلام کی موثر نمائندگی کے باعث عوامی حلقوں میں جمعیۃ علماء اسلام مسلسل اپنے اثر ورسوخ اور تعارف میں اضافہ کرتی گئی۔ قومی اسمبلی کے ڈھاکہ میں ہونے والے اجلاسوں میں شرکت کے دور میں مولانا مفتی محمودؒ کا مشرقی پاکستان کے علماء سے رابطہ قائم ہوا، اس کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی جمعیۃ علماء اسلام قائم ہو گئی جس کا امیر پیر صاحب مرحوم کو چنا گیا۔ جبکہ دونوں صوبوں کو ملا کر مرکزی سطح پر جمعیۃ علماء اسلام قائم کی گئی جس کے امیر حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا مفتی محمودؒ چنے گئے۔ مغربی پاکستان میں جمعیۃ کا امیر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو منتخب کیا گیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام نے بھرپور حصہ لیا جس کے نتیجے میں قومی اسمبلی میں ۷، سرحد اسمبلی میں ۶، بلوچستان میں ۳ نشستیں جمعیۃ کے پاس تھیں۔ سرحد میں جمعیۃ نے نیشنل عوامی پارٹی کے تعاون سے صوبائی وزارت قائم کی جس کے سربراہ مولانا مفتی محمودؒ تھے جنہوں نے صوبائی وزیر اعلیٰ کی

حیثیت سے دس ماہ تک حکومت کی۔ بلوچستان میں بھی جمعیۃ سردار عطاء اللہ مینگل کی وزارت میں شریک تھی۔ جبکہ قومی اسمبلی میں جمعیۃ علماء اسلام نے اپوزیشن میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا جس کا سربراہ خان عبدالولی خان مرحوم کو منتخب کیا گیا تھا۔ مگر بھٹو حکومت کے دور میں خان عبدالولی خان کی گرفتاری اور ان کی پارٹی کو کالعدم قرار دینے پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا اور انہیں قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کا قائد چن لیا گیا۔

اس مرحلہ پر حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اختلافات کی بناء پر جمعیۃ کا الگ دھڑا قائم کر لیا جو ان کی وفات تک موجود و متحرک رہا۔ جبکہ قومی اسمبلی میں جمعیۃ کے دونوں دھڑوں کے ارکان نے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے دوسری جماعتوں کے علماء کے ہمراہ سرگرم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں دستور میں اسلامی دفعات شامل ہوئیں اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خلاف حزب اختلاف کی جماعتوں نے ''پاکستان قومی اتحاد'' کے نام سے ایک متحدہ محاذ قائم کیا تو اس کا سربراہ مولانا مفتی محمودؒ کو منتخب کیا گیا جنہوں نے انتخابی مہم اور اس کے بعد احتجاجی تحریک کی قیادت کی اور ملکی و عالمی سطح پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ یہ احتجاجی تحریک بعد میں ''تحریک نظام مصطفیٰ'' کا عنوان اختیار کر گئی تھی۔

تحریک نظام مصطفیٰ کے نتیجے میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے مارشل لاء نافذ کر کے اسلام کا نظام ملک میں رائج کرنے کا اعلان کیا تو مولانا مفتی محمودؒ نے تمام سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور ملک بھر میں نفاذ اسلام کے اقدامات کی حمایت میں دورے کر کے جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بتایا کہ عوام اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا مفتی محمودؒ نے ضیاء الحق کابینہ میں شمولیت بھی اختیار کر لی اور جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے میر صادق کھوسہ، حاجی محمد زمان خان اچکزئی اور حاجی فقیر احمد خان جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ لیکن جب اتنی بھرپور حمایت و تعاون کے باوجود مولانا مفتی محمودؒ جنرل ضیاء الحق کو ملک میں عملاً نفاذ اسلام کے لیے تیار نہ کر سکے اور بات زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھی تو مفتی صاحبؒ نے حکومت سے علیحدگی اختیار کر کے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے خلاف عوامی جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ اس کی ابتدائی تیاریوں میں تھے کہ اجل کا بلاوا آگیا اور وہ حج کے لیے جاتے ہوئے کراچی میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۰ اپریل ۲۰۰۱ء)

(۷)

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان اپنی تشکیل نو کے بعد ملک کی پارلیمانی سیاست کے دھارے میں ۱۹۶۲ء کے الیکشن کے دوران شامل ہوئی تھی جب مولانا مفتی محمودؒ قومی اسمبلی میں اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ مغربی پاکستان اسمبلی میں علماء کی آواز بنے تھے جبکہ بعد میں مشرقی پاکستان سے منتخب ہوکر قومی اسمبلی میں آنے والے بزرگ پیر محسن الدین احمدؒ بھی اس قافلہ کا حصہ بن گئے تھے۔ پارلیمانی سیاست میں جمعیۃ کا یہ دور صدر محمد ایوب خان مرحوم کی طلب کردہ گول میز کانفرنس پر مکمل ہوگیا تھا جب مولانا مفتی محمودؒ اور پیر محسن الدین احمدؒ نے کانفرنس میں شریک ہوکر مسلمان کی دستوری تعریف طے کرنے اور علماء کرام کے 22 نکات کو دستور کا حصہ بنانے کے مطالبات کو کانفرنس کے ریکارڈ کا حصہ بنا دیا تھا۔ دوسرا دور ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد شروع ہوا جس میں جمعیۃ کی پوزیشن اور پیش رفت کا تناسب کچھ اس طرح تھا:

- قومی اسمبلی میں جمعیۃ کے سات ارکان تھے جو کہ بعد میں جماعتی دھڑے بندی کے باعث مولانا مفتی محمودؒ کے گروپ میں صرف چار رہ گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود مولانا مفتی محمودؒ حزب اختلاف کے قائد منتخب ہوئے اور سالہا سال تک اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے فرائض سر انجام دیتے رہے۔
- سرحد اسمبلی میں چالیس ارکان کا ایوان تھا، ان میں جمعیۃ کے صرف چھ ارکان تھے جن کی بنیاد پر مولانا مفتی محمودؒ صوبہ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔
- بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کا ایوان بیس ارکان پر مشتمل تھا جن میں جمعیۃ کے تین رکن تھے، ان میں سے ایک صوبائی وزیر اور دوسرا ڈپٹی اسپیکر بنا۔ ڈپٹی اسپیکر ژوب کے مولانا شمس الدین شہیدؒ تھے جو میرے ساتھی تھے، دورہ حدیث میرے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کیا تھا اور علاقہ کے سب سے بڑے نواب کو الیکشن میں شکست دے کر اسمبلی میں پہنچے تھے۔
- ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں بھٹو حکومت کے خلاف ملک کی نو سیاسی جماعتوں نے ”پاکستان قومی اتحاد“ کے نام سے متحدہ محاذ بنایا تو تنظیمی یا عددی لحاظ سے جمعیۃ کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں تھی مگر اس کے باوجود مولانا مفتی محمودؒ اس کے سربراہ منتخب ہوئے اور ان کے ایک رفیق کار یعنی راقم الحروف کو پنجاب کے صوبائی سیکرٹری جنرل کے طور پر خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔
- ۱۹۷۳ء کے دستور کی تشکیل میں اسلامی دفعات کی شمولیت کا مرحلہ بہت دشوار تھا اور دستور ساز

اسمبلی میں مولانا مفتی محمودؒ کا اپنا جماعتی گروپ صرف چار ارکان پر مشتمل تھا، اس کے باوجود انہوں نے اہم اسلامی دفعات کو دستور کا حصہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۸ مارچ ۲۰۱۵ء)

(۸)

قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمودؒ کی ایک یادگار تحریر کا ایک حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے موقع پر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے انتخابی منشور کی تمہید کے طور پر تحریر فرمائی تھی۔ اس سے جمعیۃ علماء اسلام کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ اس کی جدوجہد کے اہداف و مقاصد کی بھی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس ''قند مکرر'' کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے اور امید ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام کے کارکن اس میں کوتاہی نہیں کریں گے:

''قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کا مقصد تخلیق یہ بیان کیا ہے کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کہ جن وانس کو میں نے (اللہ نے) بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان کا مقصدِ تخلیق، اللہ تعالیٰ کی بندگی کا نظام قائم کرنا ہے۔ چنانچہ اس مقصدِ تخلیق کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں انسان کے لیے مندرجہ ذیل جامع ومانع منشور کا ذکر کیا ہے:

والعصر O ان الانسان لفی خسر O الا الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر O زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ انسان ہر اعتبار سے خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عملی اختیار کی اور جو باہم ایک دوسرے کو حق اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے اور جو آپس میں ایک دوسرے کو صبر پر قائم رہنے کی وصیت کرتے رہے۔

قرآن حکیم کا یہ چار نکاتی پروگرام پوری نوع انسانی کی نجات و فلاح کا ضامن ہے اور اس پروگرام میں انسان کے لیے قیامت تک کے واسطے سامان ہدایت جمع کر دیا گیا ہے۔

اسلام انسانوں میں اسی پروگرام کے مطابق انقلاب لانا چاہتا ہے۔ اور چونکہ مملکت پاکستان کا قیام ہی اسلام کے نام پر عمل میں آیا ہے اس لیے سب سے پہلے ذمہ داری پاکستان کی ہے کہ وہ اپنی حدود میں مکمل اسلامی نظام قائم کر کے پوری دنیا میں قرآن کے فرمودہ انسانی منشور کے قیام کی راہ ہموار کرے۔

چنانچہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان اس دینی ذمہ داری کی تکمیل کی غرض سے ہی ابتداء سے جدوجہد کرتی چلی آرہی ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام تاریخی حقائق کی روشنی میں علماء حق کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا آغاز حضرت مجدد الف ثانیؒ کی مساعی سے ہوا۔ جس نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار و نظریات سے نشوونما پائی۔ جس کی جہادی تنظیم کی سرپرستی شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد شہیدؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے اکابر نے کی۔ جس کی انقلابی جدوجہد کا وسیع ترین نظام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ نے قائم کیا۔ اور جس کی علمی، تبلیغی، اصلاحی، تربیتی، تحریکی و اخلاقی طاقت کو شیخ الہند کے عظیم ترین تلامذہ امام العصر حضرت (حسین احمد) مدنیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا (عبدالقادر) رائے پوریؒ، حضرت (حماد اللہ) ہالیجیؒ وغیرہم اکابر وقت نے برصغیر پاک وہند اور عرب وایشیا میں پھیلا دیا تھا۔

چنانچہ ان بزرگوں کی عظیم جدوجہد وقربانیوں کی بدولت ملک وملت کو برطانوی استعمار کے جابرانہ غلبہ سے نجات ملی اور خطۂ پاکستان میں مسلمانوں کی آزاد مملکت وحکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کی خاطر نئے سرے سے پاکستان کے تمام علماء حق کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی جدوجہد فرمائی۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا جس کے امیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ منتخب ہوئے اور ناظم (اعلیٰ) مولانا احتشام الحق تھانویؒ چنے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی پہلی اور اہم ترین دینی تحریک ''تحفظ ختم نبوت'' شروع ہوئی جس میں مسلمانوں نے بیش بہا جانی و مالی قربانیاں دے کر لادینی ذہنیت کو شکست فاش دی اور ختم نبوت کے عقیدہ کے تحفظ کا مستقل موقف قائم کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں دوبارہ انتخاب عمل میں آیا، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ خلیفہ حضرت تھانویؒ امیر منتخب ہوئے۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب بوجہ علالت و معذوری امارت کے فرائض انجام دینے سے قاصر تھے، آپ نے عارضی طور پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو قائم مقام امیر مقرر فرمایا۔ اور ۱۹۵۶ء میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ کی

معرفت ایک تحریری پیغام کے ذریعے نئے انتخابات کرانے کی ہدایت فرمائی۔
اسی دوران غلام محمد گورنر جنرل کی قائم کردہ دستور ساز اسمبلی نے ایک دستور وضع کر کے پاس کیا اور سکندر مرزا گورنر جنرل کے حکم سے وہ ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ اس دستور میں اگرچہ تمہید میں تو پاکستان کو اسلامی مملکت اور قانون سازی کے لیے اسلام کو رہنمائی کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اصل دستور میں ایسی دفعات رکھ دی گئی تھیں جن کی وجہ سے ارتداد اور اسلام سے انحراف کا راستہ کھلا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جس دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، اس دفعہ کی تصریح نمبر ۴ میں دستور کی دوسری دفعات کو تحفظ دینے کے لیے یہ کہہ دیا گیا کہ اس دفعہ سے دستور کی بقیہ دفعات متاثر نہیں ہوں گی۔ اس سے نفاذ دین میں جو مستقل رکاوٹ کھڑی کر دی گئی تھی اور تحریف کا جو راستہ کھول دیا گیا تھا اس کے ازالہ کے بغیر دستور کا نفاذ زبردست گمراہی کا موجب ثابت ہو سکتا تھا۔

چنانچہ اس صورتحال پر غور کرنے کے لیے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے حکم پر پاکستان کے جید علماء کا کنونشن ملتان میں طلب کیا گیا اور اس موقع پر جمعیۃ کا نیا انتخاب بھی عمل میں آگیا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ امیر اور حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی ناظم عمومی منتخب ہوئے۔ دستور کی مخالف اسلام دفعات کو تبدیل کرانے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا جس نے ۱۹۵۶ء میں دستوری ترامیم کی تجاویز پر مشتمل سفارشات مرتب کر کے شائع کیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگا دیا گیا، اس دوران دینی اقدار کے تحفظ کے لیے نظام العلماء کے نام سے ایک تنظیم قائم کر دی گئی اور جب ایوب خان نے مارشل لا ریگولیشن کے ذریعہ عائلی قوانین نافذ کر کے مداخلت فی الدین کا رسوا کن اقدام کیا تو نظام العلماء سے منسلک علماء نے مساجد اور جلسہ ہائے عام میں اس کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت کی دارو گیر کا ہدف بنتے رہے۔

اس دوران شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا وصال ہو گیا اور ان کی جگہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب درخواستی مدظلہ امیر جماعت منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں مارشل لا ختم کیا گیا، سیاسی جماعتیں بحال ہونے لگیں، میں (حضرت مولانا مفتی محمود صاحب) نے بحیثیت قائم مقام امیر کے جمعیۃ کے احیاء کا اعلان کیا اور پھر جمعیۃ کا انتخاب نو عمل میں

آیا۔ حضرت درخواستی مدظلہ امیر اور حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی ناظم (عمومی) مقرر ہوئے۔“

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ مارچ ۲۰۱۷ء)

(۹)

یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن چکا تھا اور باقی ماندہ پاکستان پر جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم ملک کے صدر کی حیثیت سے کاروبار حکومت چلا رہے تھے۔ صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیۃ کی کولیشن کو اکثریت حاصل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا۔ ارباب سکندر خان خلیل مرحوم صوبہ سرحد کے گورنر تھے اور دونوں درویش صفت سیاست دانوں کا جوڑ صوبائی منظر پر عجیب سی بہار دکھا رہا تھا۔ مفتی صاحبؒ نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور سب سے پہلا اعلان یہ کیا کہ صوبہ سرحد میں شراب بنانے، بیچنے اور پینے پلانے پر پابندی ہوگی اور یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہوگا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے شراب پر مکمل پابندی کے اعلان کے ساتھ صوبہ سرحد میں اپنی حکومتی ذمہ داریوں کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دینے، تقاوی قرضوں پر سود کی معافی اور اسکولوں میں دینیات کے استاذ مقرر کرنے سمیت متعدّد دیگر اصلاحات بھی کیں، مگر شراب پر پابندی کا اعلان ملک بھر میں موضوع بحث بن گیا۔ جدید حلقوں میں اسے ”دقیانوسیت“ سے تعبیر کیا گیا، ترقی اور تہذیب کے منافی قرار دیا گیا اور ماضی کی طرف واپس جانے کے طعنے دیے گئے۔ بعض زیادہ من چلوں نے اسے طنز و تشنیع اور تمسخر واستہزاء کا نشانہ بھی بنایا اور مختلف محافل میں شراب کی بوتلوں کو ”چھوٹا مفتی“ اور ”بڑا مفتی“ کا نام دے کر اسلام مخالف عناصر نے دل کی بھڑاس نکالنے کا راستہ اختیار کیا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بات وہ خط وکتابت تھی جو وفاق نے اس مسئلہ پر صوبائی حکومت کے ساتھ کی اور جس کی تفصیل حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے خود ایک موقع پر جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ہمیں سنائی۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مفتی صاحبؒ نے صوبہ سرحد میں شراب بنانے، بیچنے، پینے اور پلانے کو قانوناً ممنوع قرار دیا تو وفاقی حکومت نے، جو جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سربراہی میں کام کر رہی تھی، صوبائی حکومت کو خط لکھا کہ ”شراب پر پابندی کی وجہ سے صوبائی حکومت کو شراب کی مد سے جو آمدنی ٹیکس وغیرہ کی صورت میں ہوتی تھی وہ رک جائے گی اور صوبائی بجٹ میں خسارہ ہوگا جسے پورا کرنے کے لیے وفاقی حکومت، صوبائی حکومت کی کوئی مدد نہیں کرے گی“۔ صوبائی حکومت نے اس کا جواب دیا کہ ”کوئی

بات نہیں، ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے یہ خسارہ پورا کر لیں گے"۔

اس کے بعد وفاقی حکومت کا خط آیا کہ "شراب مسلمانوں کے لیے حرام ہے مگر غیر مسلم شراب پیتے ہیں اس لیے صوبائی حکومت کو چاہیے کہ وہ صوبہ سرحد میں رہنے والے غیر مسلموں کے لیے شراب کی تیاری اور فروخت کا اہتمام کرے"۔ مفتی صاحب کی حکومت نے اس خط کا جواب دیا کہ "غیر مسلموں کو اگر وہ شراب کو جائز سمجھتے ہیں تو پینے کا حق ہے اور انہیں اس پر سزا نہیں دی جائے گی، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لیے ہم غیر مسلموں کے نام پر شراب کی کوئی دکان کھولنے کی اجازت نہیں دیں گے"۔

اس کے بعد وفاقی حکومت کا تیسرا خط آگیا کہ "بعض بیماریوں میں شراب بطور علاج استعمال ہوتی ہے اس لیے صوبائی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہسپتالوں میں شراب مہیا کرنے کا انتظام کرے"۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے فرمایا کہ اس پر انہوں نے صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں سینئر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ قائم کر دیا جو ایسی بیماریوں کی نشان دہی کرے جو مہلک ہوں اور شراب کے علاوہ ان کا کوئی اور علاج نہ ہو۔ مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ اضطرار کی حالت میں شریعت نے حرام کے استعمال کی اجازت دی ہے لیکن اضطرار کی صورت تب بنتی ہے جب جان کا خطرہ ہو اور اسے بچانے کے لیے اس حرام کا اور کوئی متبادل موجود نہ ہو۔ اس لیے وہ اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر واقعتاً ایسی کوئی بیماری ہو جو جان لیوا ہو اور مریض کی جان بچانے کے لیے شراب کے علاوہ کوئی متبادل چیز نہ ہو تو وہ اس مقصد کے لیے شراب کے استعمال کی اجازت دے دیں گے، مگر ڈاکٹروں کی رپورٹ تھی کہ سرے سے ایسی کوئی بیماری ہی نہیں ہے جو مہلک ہو اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی اور علاج نہ ہو۔

شراب کے مسئلے پر وفاق اور صوبے کی یہ "کاغذی جنگ" ابھی اس مرحلے تک پہنچی تھی کہ بھٹو صاحب مرحوم نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیۃ کی مشترکہ حکومت کو، جو سردار عطاء اللہ خان مینگل کی سربراہی میں کام کر رہی تھی، اچانک برطرف کر دیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل مرحوم اور وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ نے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح تقریباً دس ماہ تک کام کرنے کے بعد سرحد اور بلوچستان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیۃ کی مشترکہ حکومتیں ختم ہو گئیں۔

(روزنامہ اسلام، ۲ فروری ۲۰۰۶ء و ۲۳ جولائی ۲۰۰۳ء)

(۱۰)

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے بعد حکومت اور اپوزیشن کے درمیان جو مذاکرات ہوئے، ان میں

حکومتی ٹیم وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا کوثر نیازی مرحوم، اور جناب عبد الحفیظ پیرزادہ پر مشتمل تھی۔ جبکہ اپوزیشن یعنی پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمودؒ، نواب زادہ نصر اللہ خانؒ اور پروفیسر عبد الغفورؒ مذاکرات کی میز پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے پیرزادہ صاحب کے علاوہ سب وفات پا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائیں اور پیرزادہ صاحب محترم کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔ انتخابی دھاندلیوں کو تسلیم کرتے ہوئے انتخابات کے دوبارہ انعقاد پر اتفاق رائے ہو چکا تھا مگر اس نکتہ پر بات پھنس گئی تھی کہ پاکستان قومی اتحاد کی قیادت وزیر اعظم بھٹو مرحوم سے یہ کہہ کر استعفیٰ کا مطالبہ کر رہی تھی کہ ان کے وزیر اعظم رہتے ہوئے دوبارہ انتخابات کے شفاف ہونے پر اطمینان نہیں ہے۔ وزیر اعظم سے استعفیٰ دینے کے اس مطالبہ پر مذاکرات ڈیڈلاک کا شکار ہو گئے تھے اور اس وقت کے آرمی چیف نے ایک مرحلہ پر مذاکرات میں شرکت کر کے یقین دلایا تھا کہ وہ آئین اور دستوری حکومت کا تحفظ کریں گے، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قوم کے سامنے ہے۔

میں ان مذاکرات کا براہ راست حصہ تو نہیں تھا لیکن پاکستان قومی اتحاد کے صوبائی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کا سرگرم کردار تھا اور مذاکرات کے سلسلہ میں ہونے والی باہمی مشاورت کے نظام میں بھی شریک تھا۔ اس لیے اب جو کچھ ہو رہا ہے اس میں میرے لیے کوئی بات نئی نہیں ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے یا جس کی کچھ عرصہ کے بعد توقع کی جا سکتی ہے وہ بھی میرے لیے کوئی حیران کن بات نہیں ہوگی۔ بات کو اس سے زیادہ آگے بڑھانے کی بجائے سردست قارئین کے منہ کا ذائقہ دو تین لطیفوں کے ذریعہ کچھ نہ کچھ تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا جو ان مذاکرات کے دوران رونما ہوئے تھے اور مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے راہ نماؤں کے ایک اجلاس میں سنائے تھے۔

مفتی صاحبؒ نے بتایا کہ جب مذاکرات میں انتخابی دھاندلیوں کو تسلیم کر لیا گیا اور دوبارہ الیکشن پر بھی اتفاق ہو گیا تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ مفتی صاحب! میں نے آپ کے دونوں مطالبات مان لیے ہیں اس لیے آپ استعفیٰ کے مطالبہ پر اصرار نہ کریں اور کوئی بات تو میری بھی مان لیں۔ کیونکہ مذاکرات "کچھ لو کچھ دو" کے اصول پر ہوتے ہیں اور مجھے بھی اپنی پارٹی کو مطمئن کرنا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ بھٹو صاحب آپ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ میں مولوی ہوں اور مولوی صرف لینا جانتا ہے، دینا اس کی لغت میں ہی نہیں ہے۔ اس پر مفتی صاحبؒ نے بھٹو مرحوم کو ایک لطیفہ بھی سنایا کہ ایک مولوی صاحب کسی گاؤں کے قریب ایک کنویں میں گر گئے جہاں سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ شور مچایا تو قریب سے ایک دو نوجوان آ گئے اور ایک نوجوان نے اپنا ہاتھ آگے کر کے کہا کہ مولوی صاحب اپنا ہاتھ مجھے دو تا کہ میں آپ کو

کھینچ کر باہر نکالوں۔ مولوی صاحب نے ہاتھ دینے سے انکار کر دیا جس سے عجیب صورت حال پیدا ہوگئی کہ نوجوان اس مولوی صاحب سے ہاتھ پکڑانے کا تقاضہ کر رہا ہے اور مولوی صاحب اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اتنے میں کچھ اور لوگ اکٹھے ہوگئے اور ایک پرانے تجربہ کار بزرگ نے منظر دیکھ کر اس نوجوان سے کہا کہ بیٹا مولوی صاحب سے یہ نہ کہو کہ اپنا ہاتھ دو، وہ کبھی نہیں دیں گے، بلکہ ان سے یہ کہو کہ میرا ہاتھ لو۔ نوجوان نے جونہی کہا کہ مولوی صاحب میرا ہاتھ پکڑو تو انہوں نے فوراً پکڑ لیا اور انہیں کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔

دوسرا لطیفہ بھی ان مذاکرات کے حوالہ سے مفتی صاحبؒ نے سنایا کہ گفتگو کے دوران ایک دفعہ بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے پوچھا کہ یہ پچاس نمازوں کا کیا معاملہ ہے کہ پہلے پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مداخلت سے پانچ رہ گئیں۔ مفتی صاحبؒ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کا واقعہ بیان کیا کہ نمازیں پچاس ہی فرض ہوئی تھیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام راستہ سے آنحضرتؐ کو بار بار عرش الٰہی کی طرف واپس بھیجتے رہے کہ اتنی نمازیں آپ کی امت نہیں پڑھ سکے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ سے ان کی تعداد کم کرنے کی درخواست کریں۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ کی بار بار درخواست پر یہ نمازیں پانچ رہ گئیں۔ اس پر بھٹو صاحب مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تکلف کیوں فرمایا، نمازیں پچاس ہی رہتیں تو بہتر تھا، آپ مولوی لوگ شب و روز نمازوں میں مصروف رہتے اور ہم آرام سے حکومت کرتے۔

لطیفوں کی بات چلی ہے تو میرا خیال ہے کہ مفتی صاحب مرحوم کا بتایا ہوا ایک اور لطیفہ بھی بیان کر دیا جائے جو جنرل ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ ان کے دور صدارت میں ہونے والے مذاکرات کے ایک مرحلہ میں مفتی صاحبؒ نے شرکاء محفل کو سنایا۔ ان باتوں سے قارئین کو اتنا اندازہ تو ہوگیا ہوگا کہ مفتی صاحب مرحوم خشک مزاج مولوی نہیں تھے بلکہ بذلہ سنج اور خوش ذوق بزرگ تھے اور بہت سی ناگفتنی باتوں کو لطیفوں کے ذریعہ گفتنی بنا دینے کے فن سے آشنا تھے۔ انہوں نے لطیفہ یہ بیان کیا کہ سرجری نے اس قدر ترقی کر لی کہ دماغوں کی تبدیلی بھی اس کے دائرہ میں آگئی اور مرنے والوں یا حادثہ کا شکار ہونے والوں کے دماغ محفوظ کر کے سرجری کے ذریعے انہیں دوسروں کے سروں میں منتقل کرنے کی صلاحیت میڈیکل سائنس نے حاصل کر لی۔ اس حوالہ سے ایک شوروم میں مختلف دماغ سجے ہوئے تھے اور ان پر قیمتیں درج تھیں۔ مولوی کا دماغ آٹھ ڈالر، سیاستدان کا دماغ دس ڈالر، وکیل کا دماغ بارہ ڈالر، تاجر کا دماغ پندرہ ڈالر وغیرہ۔ لیکن سب سے مہنگا دماغ جنرل کا تھا جس کی قیمت سو ڈالر درج تھی۔ ایک گاہک نے یہ دیکھ کر

کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے پوچھا کہ جرنیل کا دماغ سب سے مہنگا کیوں ہے؟ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ”اوریجنل ہے، استعمال نہیں ہوا۔“

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۰ اگست ۲۰۱۴ء غالباً)

(۱۱)

قائدِ محترم حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی علمی، دینی اور سیاسی جدوجہد پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی جو امتیازی خصوصیات اور نمایاں پہلو دکھائی دیتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مرحوم نے قومی سیاست کے دھارے میں شامل ہو کر خود کو اس میں جذب نہیں کر دیا بلکہ وہ اس دھارے کو اپنے عزائم اور مقاصد کی طرف موڑنے میں کامیاب بھی رہے۔ اور اگر آپ آج سے پچیس سال قبل کی قومی سیاست کا آج کی قومی سیاست سے موازنہ کریں گے تو ان نمایاں تبدیلیوں کے پس منظر میں مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد جھلکتی نظر آئے گی۔

مفتی صاحب مرحوم کی جدوجہد کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی سوچ سمجھ کر قائم کی اور پھر اس پر نہ صرف پوری استقامت کے ساتھ پختہ رہے بلکہ بالآخر اسے منوا کر دم لیا۔ مثلاً ۱۹۵۶ء کے آئین اور ۱۹۷۳ء کے آئین پر ایک نظر ڈالیے، دونوں کے درمیان جہاں جہاں فرق ہے اس پر نشان لگائیے اور پھر حقائق و واقعات کے حوالے سے اس امر کی چھان بین کیجیے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو ۱۹۷۳ء کے قالب میں ڈھالنے میں سب سے زیادہ کس کی کوششوں کا دخل ہے۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جب نافذ ہوا تو اسلام کے بعض علمبرداروں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ یہ آئین بالکل اسلام کے مطابق ہے اور اسلام کا مستقبل اب اس آئین کے ساتھ ہی وابستہ ہو گیا ہے۔ مگر مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے رفقاء شیخ حسام الدین اور علامہ خالد محمود کی معیت میں اس آئین پر نظر ڈالی اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں ترامیم پیش کیں اور اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس آئین کی متعدّد دفعات قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم اور ان کی جماعت و رفقاء اپنے اس موقف پر قائم رہے جبکہ اسلام کا نام لینے والے کئی گروپوں نے ۱۹۷۱ء تک مسلسل ۱۹۵۶ء کے آئین کا راگ الاپا اور اسلام کو اس کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دینے پر مصر رہے۔

مفتی صاحب مرحوم نے آئین میں مسلمان کی تعریف، صدر اور وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط، اور قرآن و سنت سے متصادم قوانین نہ بننے کی ضمانت کو ضروری قرار دیا۔ اور وہ رائے عامہ کے محاذ پر مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر ان امور کو ۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل کرانے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ اسلامی نظام کے دیگر علمبرداروں کو نہ صرف یہ کہ ان مطالبات پر آواز اٹھانے میں جھجک رہی بلکہ جب مولانا

مفتی محمود مرحوم نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں مسلمان کی تعریف کو آئین میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا تو ان حضرات کو زبانی تائید کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ آئین میں ان امور کو شامل کراتے وقت اگرچہ مفتی صاحب مرحوم کو سب اسلامی طبقات کی حمایت حاصل ہوگئی تھی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان امور کو ایک مطالبہ کی صورت میں پیش کرنے اور رائے عامہ کو اس کے حق میں مسلسل ہموار کرنے کی جدوجہد کی سعادت صرف حضرت مفتی صاحب مرحوم، ان کی جماعت اور رفقاء کو حاصل ہوئی۔

مفتی صاحب مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آئین میں جن امور کی شمولیت کے مطالبہ کو ۱۹۵۷ء میں محض مجذوب کی بڑ سمجھا جاتا تھا اور ۱۹۶۹ء تک بڑے بڑے اسلام پسندوں کو ان مطالبات کی حمایت کی توفیق نہ ہوئی، وہی مطالبات ۱۹۷۳ء کے آئین میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس آئین کی سب سے امتیازی خصوصیت بنے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے اس بحران پر نظر ڈالیے جس کے نتیجہ میں ملک دولخت ہوا۔ انتخابات کے بعد پنجاب اور سندھ سے اکثریت حاصل ہونے کے باعث مسٹر بھٹو مرحوم نے نعرہ لگایا کہ ملک میں صرف تین سیاسی قوتیں موجود ہیں: (۱) فوج (۲) عوامی لیگ، اور (۳) پیپلز پارٹی۔ مفتی صاحب مرحوم نے اس دعوے کو چیلنج کیا اور کہا کہ ملک میں ایک چوتھی قوت بھی موجود ہے اور وہ سرحد و بلوچستان میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعتیں ہیں۔ اور پھر مفتی صاحب مرحوم نے لاہور میں اقلیتی پارلیمانی گروپوں کا کنونشن کر کے اس قوت کے وجود کا احساس دلایا اور اس سیاسی قوت کو اس طریقہ سے منظم کیا کہ خود مسٹر بھٹو کو نہ صرف اس طاقت کا وجود تسلیم کرنا پڑا بلکہ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ سہ فریقی معاہدہ تک بات پہنچی اور دو صوبوں میں حکومتیں بھی اس سیاسی قوت کے حوالہ کرنا پڑیں۔

الغرض مولانا مفتی محمودؒ کی یہ امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے موقف پر سختی کے ساتھ قائم رہتے تھے اور اس کے حق میں دلائل و براہین کا انبار لگانے کے ساتھ ساتھ حالات اور جدوجہد کو اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ مخالف کو اس موقف کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہتا۔

مفتی صاحب مرحوم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کی سیاست میں، جو ایک عرصہ سے سادگی، اصول پرستی، شرافت اور دیانت سے ناآشنا ہو چکی تھی، انہی سنہری اصولوں کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا اور پھر ان کو اس وضع سے نبھایا کہ حق پرستی کی روایات ایک بار پھر نئے وجود سے مشرف ہو کر تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنیں۔

- یہ مفتی صاحبؒ کی سادگی تھی کہ قومی اسمبلی کے ممبر سے لے کر وزیر اعلیٰ اور قائدِ حزبِ اختلاف

تک کئی مناصب پر فائز ہوئے لیکن اپنا اور گھر کا معیار زندگی وہی رکھا جو ابتداء سے چلا آرہا تھا۔ کیا مجال ان مناصب میں کوئی منصب مفتی صاحب مرحوم کے گھر کے ماحول، ان کے رہن سہن، ان کے بچوں کے لباس اور خورد و نوش کے معیار اور طرز میں کوئی تبدیلی لا سکے ہوں۔ اقتدار اور لیڈری کا نشہ نہ ان پر طاری ہوا اور نہ انہوں نے اسے اپنے بچوں کے قریب آنے دیا۔

- مفتی صاحبؒ جب سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو اس وقت قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ کہنے لگے کہ بیک وقت دو تنخواہیں لینا ٹھیک نہیں ہے، بحیثیت ایم این اے تنخواہ وصول کرتے رہے مگر وزیر اعلیٰ کی تنخواہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔
- وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کے لیے الگ بنگلہ کا اہتمام کیا جانے لگا تو انکار کر دیا اور سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ہی وزارت اعلیٰ کا دور مکمل کیا۔
- مفتی صاحب مرحوم جب خان عبد الولی خان کی جگہ حزب اختلاف کے قائد چنے گئے تو اس حیثیت سے ملنے والے تمام الاؤنسز خود جناب ولی خان کے گھر جا کر ان کی بیگم کو پیش کر دیا کہ وہ جیل میں ہیں، میں ان کا قائم مقام ہوں، یہ الاؤنسز ان کے ہیں۔
- جماعتی زندگی کا عالم یہ تھا کہ وہ جماعت کے قائد تھے اور تمام تر سرگرمیاں جماعت ہی کے لیے تھیں۔ وہ دورے بھی کرتے رہے، ہوائی جہاز کا سفر بھی شب و روز رہتا تھا اور دیگر اخراجات بھی ہوتے تھے مگر خال خال مواقع کے علاوہ وہ یہ تمام اخراجات اپنے وسائل سے پورے کرتے اور پھر جماعت سے تقاضہ بھی نہ ہوتا۔
- ایوب خان مرحوم کے دور میں مناصب کی پیشکش ہوئی مگر اصولوں کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوئے۔
- جب وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دیا تو کئی روز تک منتیں کی جاتی رہیں کہ وزارت اعلیٰ پر واپس آجائیں مگر مطالبات کی منظوری سے قبل واپسی کو مسترد کر دیا۔ اس دوران بھٹو مرحوم نے کہا کہ مفتی صاحب ہم نے اب تک آپ کو حکومت کب کرنے دی ہے، حکومت کا مزہ تو آپ کو اب آئے گا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم حکومت میں مزے لینے کے لیے نہیں بلکہ عوام کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔ اس لیے مطالبات تسلیم ہوئے بغیر استعفیٰ کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بھی متعدّد بار اقتدار میں شمولیت کی پیشکش ہوئی مگر کوئی پیشکش بار

آور نہ ہوئی۔

- اور یہ بھی اصول پرستی کا مظاہرہ تھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ اور انتخاب کے واضح اعلان کی شرط پر جب موجودہ حکومت میں شامل ہوئے تو دونوں امور کا اعلان ہوتے ہی بلا تاخیر اقتدار سے باہر نکل آئے کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔
- مفتی صاحب مرحوم کی اصول پرستی کے اس پہلو سے تمام جماعتی احباب بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ دوستوں کے جائز کاموں میں ان کی سفارش اور مدد سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن جونہی کسی دوست نے ان سے کوئی ایسی بات کہہ دی جو ان کے اصول اور وضع داری سے ٹکراتی ہو تو دوٹوک معذرت کر دی کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، میں آپ کے اس کام کے لیے اپنا اصول نہیں توڑ سکتا۔ وقتی طور پر بعض دوست ناراض بھی ہو جاتے مگر بعد میں جب معاملہ سمجھتے تو ناراضگی خود بخود ختم ہو جاتی۔
- شرافت و دیانت کی کیفیت یہ تھی کہ اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے ساتھ بھی اختلاف کا اظہار ایک دائرے میں رہ کر کرتے، اختلاف کو ذاتی مخالفت کا رنگ دینے سے گریز کرتے اور اختلاف بھی طعن و اعتراض کی زبان میں نہ ہوتا بلکہ دلائل و براہین کے حوالے سے بات کرتے۔

الغرض حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز نے پاکستان کی قومی سیاست میں یہ اثر چھوڑا کہ اسلام کی وکالت کو مرعوبیت، جھجک اور خوفِ ملامت کے دائرہ سے نکال کر اعتماد، بے باکی اور جرأت کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ اور سیاسی زندگی میں سادگی، اصول پرستی اور شرافت کی قدیم روایات کو ازسرِ نو زندہ کر کے آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ قائم کر دیے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء)

(۱۲)

حضرت مولانا مفتی محمودؒ صرف ایک سیاستدان نہیں تھے بلکہ دینی علوم کے معتبر استاذ، بیدار مغز مفتی، فقیہ النفس عالم، حق گو خطیب اور شب زندہ دار عارف باللہ بھی تھے۔ اس لیے ان کی ان متنوع اور گوناگوں حیثیتوں میں سے سیاستدان اور سیاسی قائد کی حیثیت کو الگ کرنا اور اس کے امتیازات و تخصصات کو جداگانہ طور پر پیش کرنا ایک مشکل اور دشوار امر ہے۔ اور شاید یہ ان کے ساتھ ناانصافی بھی ہو کہ انہیں صرف سیاسی قائد کے طور پر سامنے لایا جائے۔

سیاست زندگی بھر حضرت مفتی صاحبؒ کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے، انہوں نے سیاست کو مشغلہ، ہابی یا آج کے سیاسی پس منظر میں کاروبار کے طور پر نہیں بلکہ مشن اور فریضہ کے طور پر اختیار کیا اور اس کا حق ادا کر کے دکھایا۔ ان کا شمار ملک کے مقتدر اور کامیاب سیاستدانوں میں ہوتا تھا اور ان کی سیاسی قیادت کا لوہا ان کے معاصر بلکہ سینئر سیاستدانوں نے بھی مانا۔ لیکن آج سیاست اور سیاستدانوں کی اصطلاحات کے گرد مفہوم و تعارف کے جو نامانوس دائرے نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور جن لوازمات نے ایک سیاستدان کے لیے ناگزیر حیثیت اختیار کر لی ہے ان کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا مفتی محمودؒ کو ایک سیاسی قائد کے طور پر پیش کرتے ہوئے طبیعت ہچکچا رہی ہے اور دل کو خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کل قیامت کے روز مفتی صاحب گریبان پکڑ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ”ظالم! تم تو مجھے جانتے تھے، میری خلوت و جلوت سے واقف تھے، تم نے مجھے کس صف میں کھڑا کر دیا؟“

مجھے مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ ایک کارکن اور پھر ٹیم کے رکن کے طور پر طویل عرصہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جو کم و بیش دو دہائیوں پر محیط ہے۔ میں نے مفتی صاحب کو علماء کی صف میں انہیں سیاست کے اسرار و رموز سمجھاتے اور ان کے لیے انہیں تیار کرتے دیکھا ہے، سیاستدانوں کے ساتھ معاملات طے کرتے اور ان سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے دیکھا ہے، عوامی اجتماعات میں لوگوں کو ابھارتے اور ان کے جذبات کو جگاتے دیکھا ہے، اہل فکر و دانش کی محافل میں اسلام کی حکیمانہ ترجمانی کرتے اور اسلامی احکام و قوانین پر اعتراضات کے مسکت جوابات دیتے ہوئے دیکھا ہے، کہنہ مشق صحافیوں کے گھیرے میں ان کے تند و تیز سوالات کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے دیکھا ہے، مسند تدریس پر قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے علوم و معارف کو آج کی زبان و اسلوب میں پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور نصف شب تک جلسہ سے خطاب کے بعد علالت اور تھکاوٹ کے باوجود سحری کے وقت جائے نماز پر قبلہ رو بیٹھے اللہ اللہ کرتے اور آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک مولانا مفتی محمودؒ کا تعارف محض ایک سیاسی قائد اور سیاستدان کا تعارف نہیں ہے بلکہ میں ان کے ایک کارکن اور ساتھی کے طور پر انہیں اس سے بالکل مختلف حیثیت اور نظر سے دیکھتا ہوں اور ان سطور میں ان کی اسی حیثیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک مفتی صاحبؒ کی بنیادی حیثیت ایک عالم دین کی ہے مگر روایتی عالم دین نہیں بلکہ وہ عالم جس کے بارے میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ رجل یدری ویدری انہ یدری فھو عالم فاتبعوہ کہ وہ شخص جو علم رکھتا ہے اور علم کی ذمہ داری کا احساس بھی رکھتا ہے وہی صحیح معنوں میں عالم ہے اس کی پیروی کرو۔

مولانا مفتی محمودؒ ایک پختہ کار عالم دین تھے اور اس حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے نہ

صرف کماحقہ آگاہ تھے بلکہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آخر دم تک کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ اہل علم ہی کی ایک محفل میں علمی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انہوں نے سیاست کو اپنے انہی فرائض کی انجام دہی کے لیے ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر اختیار کیا تھا اور اسے منزل یا مقصود بنانے کی بجائے آخر وقت تک وسیلہ اور ذریعہ کے درجے میں ہی رکھا۔ مفتی صاحبؒ ایک عالم دین کے طور پر اس نظریاتی تحریک کے نمائندہ اور باشعور راہنما تھے جسے ولی اللّٰہی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے اس خطہ ارض میں مسلمانوں کے دینی تشخص، علوم و روایات اور ثقافت و تمدن کے تحفظ اور آزادی کے حصول کے لیے کم و بیش دو صدیوں پر محیط طویل جنگ لڑی اور دینی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ جیل کی کال کوٹھڑیوں، پھانسی کے پھندوں اور میدان جہاد کے معرکوں کو بھی رونق بخشی۔ مفتی صاحبؒ نے اسی درسگاہ حریت سے تربیت حاصل کی اور انہی اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ اپنے اساتذہ کے صرف علوم کے وارث نہیں تھے بلکہ ان کی جدوجہد اور روایات کے بھی امین تھے اور مفتی صاحبؒ کی زندگی بھر کی تگ و تاز اس بات پر گواہ ہے کہ انہوں نے اس وراثت و امانت کی حفاظت اور اسے اگلی نسل تک پہنچانے میں کوئی کمی اور کوتاہی اپنی استطاعت کی حد تک روا نہیں رکھی۔

مفتی صاحبؒ کی جدوجہد کا سب سے بڑا ہدف اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری رہا ہے۔ انہیں زندگی میں جب بھی کوئی فیصلہ کن موقع ملا انہوں نے اسلام کے لیے اس موقع کو استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایک ہوشیار سیاستدان کی طرح انہوں نے موقع کی نزاکت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میں اس سلسلہ میں تین مواقع کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام کو صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چالیس کے ایوان میں چار نشستیں حاصل ہوئی تھیں اور دو آزاد ارکان الیکشن کے بعد جمعیۃ میں شامل ہوگئے تھے۔ اس طرح جمعیۃ کے پاس چالیس میں سے چھ سیٹیں تھیں اور صوبائی حکومت کے لیے اصل مقابلہ نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ قیوم گروپ کے درمیان تھا جن کے پاس غالباً پندرہ اور گیارہ سیٹیں تھیں۔ خان عبدالولی خان اور عبد القیوم خان صوبائی سیاست میں روایتی حریف چلے آرہے تھے اور ایک دوسرے کو صوبائی حکمران کے طور پر قبول کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔ اس لیے دونوں نے جمعیۃ علماء اسلام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کے قائد کی حیثیت سے موقع کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کرلیا اور تعاون کے لیے جو شرائط عائد کیں ان میں وفاق میں دستور ساز اسمبلی میں دستور پاکستان کی ترتیب و تدوین کے دوران اسلامی امور میں جمعیۃ سے تعاون، جبکہ صوبہ میں اسلامی قوانین

واحکام کے نفاذ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ خان عبدالولی خان اور خان عبدالقیوم خان دونوں نے بظاہر ایک دوسرے کے خوف میں یہ شرطیں منظور کرلیں۔ اب جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے نئی شرط عائد کردی گئی کہ صوبہ میں وزیراعلیٰ بھی جمعیۃ کا ہوگا، یہ شرط بھی دونوں نے منظور کرلی۔ لیکن جمعیۃ علماء اسلام نے عوامی نیشنل پارٹی کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد میں حکومت بنانے کا فیصلہ کیا اور نہ صرف مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ بن گئے بلکہ عوامی نیشنل پارٹی اپنے منشور اور پارٹی مزاج کے علی الرغم دستور ساز اسمبلی میں اسلامی معاملات میں جمعیۃ کا ساتھ دینے کی پابند ہوگئی۔ جبکہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کی بیس میں سے تین نشستیں جیتنے والی جمعیۃ علماء اسلام نیشنل عوامی پارٹی کے سردار عطاء اللہ مینگل کے ساتھ شریک اقتدار ہوئی۔ تین میں سے ایک ممبر ڈپٹی اسپیکر بنا اور دوسرا صوبائی وزیر کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہوا۔ مفتی صاحب نے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اسلامی اصطلاحات کے نفاذ اور سادگی کے ساتھ حکومت کرنے کی جو مثال اس دس ماہ کے دور میں قائم کی وہ ان کی شخصیت اور جمعیۃ کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔ اور یہ پارٹی لیڈر کے طور پر ان کی معاملہ فہمی، سیاسی تدبر اور موقع شناسی کا ایک شاندار مظاہرہ بھی ہے۔

دوسرا موقع دستور ساز اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں منتخب ہونے والی اس دستور ساز اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت حاصل تھی اور اس کے منشور میں سوشلزم کا عنصر نمایاں تھا لیکن مولانا مفتی محمودؒ نے دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر جس سیاسی ہوشمندی کا ثبوت دیا یہ اسی کا ثمر ہے کہ دستور پاکستان میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کے علاوہ ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت موجود ہے جو سیکولر لابیوں کے ایجنڈے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں دیگر مذہبی شخصیات بھی موجود تھیں اور دستور میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کرانے کے لیے مسلسل کوشاں تھیں لیکن فیصلہ کن حیثیت مولانا مفتی محمودؒ کو حاصل تھی۔ وہ اس طور پر کہ دستور ساز اسمبلی میں بلوچستان سے چار ارکان منتخب ہوئے تھے جن میں سے تین نیشنل عوامی پارٹی کے تھے اور ایک کا تعلق جمعیۃ علماء اسلام سے تھا۔ یہ چار کے چار مفتی صاحب کے زیر اثر تھے، اور کہنے کو یہ چار تھے لیکن ایک مکمل صوبے اور وفاق کی ایک اکائی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ گویا ان چار ارکان کی صورت میں مفتی صاحبؒ کے پاس وفاق کی ایک مکمل اکائی کی قوت موجود تھی جن کی مرضی کے بغیر کوئی دستور پاس نہیں ہوسکتا تھا۔

دوسری طرف پیپلز پارٹی اکثریت کے زعم میں اپنے منشور اور نظریات کے مطابق دستور تشکیل دینے

پر مصر تھی اور ایوان میں من مانی کر رہی تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب کی قیادت میں اپوزیشن نے دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا جو کہ صرف اپوزیشن کا بائیکاٹ نہیں تھا بلکہ اس میں وفاق کی ایک مکمل اکائی کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ اس پر بھٹو حکومت مذاکرات پر مجبور ہوئی اور ان مذاکرات میں حکومت کو اپوزیشن کے دیگر مطالبات کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان اسلامی دفعات کو بھی دستور کے حصہ کے طور پر قبول کرنا پڑا جو آج بھی دستور میں شامل ہیں اور جنہیں پاکستان کے دستور سے نکالنے اور غیر موثر بنانے کے لیے نہ صرف ملک کی سیکولر لابیاں بلکہ عالمی استعماری قوتیں بھی مسلسل پیچ و تاب کھا رہی ہیں۔

تیسرا مرحلہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ان کی حکومت میں شامل ہونے اور اس شمولیت کو نفاذ اسلام کے لیے ہر ممکن طور پر مفید اور نتیجہ خیز بنانے کا تھا۔ مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد نے شمولیت کا فیصلہ کیا۔ یہ شمولیت سیاسی طور پر درست تھی یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر مستقل گفتگو کی ضرورت ہے۔ البتہ اس مرحلہ پر صرف یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مارشل لاء حکومت میں شمولیت یا عدم شمولیت کا فیصلہ کرنے کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کا جو اجلاس راولپنڈی میں حکومت میں شامل ہونے سے پہلے ہوا تھا اس میں راقم الحروف نے ضیاء حکومت میں شمولیت کی نہ صرف مخالفت کی تھی بلکہ اس پر طویل بحث کی تھی اور شمولیت کے حق میں مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے خلاف اپنا اختلافی نوٹ بھی ریکارڈ کرایا تھا۔ تاہم قومی اتحاد اور اس کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام نے بھی حکومت میں شمولیت اختیار کی اور مولانا مفتی محمودؒ عوامی جلسوں میں اس شمولیت کا یہی جواز پیش کرتے رہے کہ ہمارا مقصد صرف اسلام کا نفاذ ہے وہ کسی بھی ذریعے سے آئے ہم اسے قبول کریں گے۔ لاہور کے ایک اجلاس میں جو طویل خطاب کیا اس میں انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا کہ سیاسی عمل، جمہوری جدوجہد اور انتخابات ہمارا مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعے ہم نفاذ اسلام کی منزل حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں اگر اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ مل جاتا ہے اور ہم اس راستے سے منزل تک جلدی پہنچ سکتے ہیں تو ہمیں اسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور ہم نے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگاتے ہوئے مارشل لاء حکومت میں اسی لیے شمولیت اختیار کی ہے کہ اگر اس راستہ سے اسلام نافذ ہو سکتا ہو تو اس کو بھی آزما لیا جائے۔

چنانچہ ضیاء حکومت کی طرف سے حدود آرڈیننس، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر امور کے بارے میں چند اسلامی اصلاحات کے نفاذ پر مفتی صاحب نے نہ صرف ان اقدامات کی حمایت میں لاہور میں بہت بڑے جلوس کی قیادت کی بلکہ ملک بھر میں بیسیوں اجتماعات میں لاکھوں کے مجمع کے سامنے ان اقدامات کا دفاع

کیا۔ نفاذ اسلام کے لیے مارشل لاء حکومت کے یہ اقدامات موثر کیوں نہ ہوئے یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر کھلے دل سے بحث ہونی چاہیے لیکن اس حوالہ سے اس موقع پر یہ عرض کر رہا ہوں کہ مولانا مفتی محمودؒ نے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے قائد کی حیثیت سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو راستہ بھی ممکن نظر آیا اسے استعمال کرنے میں تامل سے کام نہیں لیا اور اس کے لیے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

الغرض حضرت مولانا مفتی محمودؒ ایک روایتی سیاسی رہنما نہیں بلکہ تحریک ولی اللّٰہی کے باشعور نمائندے اور پاکستان کے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک ہوشمند قائد تھے جنہوں نے اپنی سیاسی قوت کو محدود اور کم ہونے کے باوجود اپنے مقاصد کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس میں جہاں ان کے علمی تبحر، سیاسی تدبر، جرأت و بے باکی اور حکمت و دانش کا نمایاں حصہ ہے وہاں میرے نزدیک سب سے بڑا کردار ان کی اس اخلاقی بلندی کا ہے کہ وہ کسی حکومت یا سیاسی قوت کے اس درجہ میں احسان مند نہیں تھے کہ اس سے اپنے مشن اور پروگرام کی بات کرتے ہوئے انہیں کوئی حجاب یا رکاوٹ محسوس ہو۔ وہ بے لوث اور قناعت پسند سیاسی رہنما تھے، اسی صاف دامنی کی وجہ سے انہیں ملک کے علمی، دینی اور سیاسی حلقوں کا اعتماد حاصل تھا اور اسی اعتماد نے اس پیش رفت اور کامیابیوں کی راہ ہموار کی جو ان کی زندگی کے نمایاں ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کی قیادت کا آج کے دور میں ایک صحیح اور آئیڈیل نمونہ تھے، خدا کرے کہ ان کی روایات اور طرز سیاست کو اگلی نسل تک اصلی حالت میں منتقل کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ نومبر ۱۹۹۷ء)

(۱۳)

گزشتہ ایک کالم میں قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے منسوب کیے جانے والے اس جملے کے بارے میں اصل صورتحال کی وضاحت کروں گا کہ

”ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔“

یہ بات میرے سامنے ہوئی تھی اس لیے اس سلسلہ میں اصل قصہ کو تاریخ کے ریکارڈ پر لانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ لیکن پہلے اس پس منظر کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اصلاً جمعیۃ علماء ہند سے تھا جس نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ مجلس احرار اسلام نے بھی تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور ہندوستان کی تقسیم سے اختلاف کیا تھا اور روایتی جوش و خروش کے ساتھ کیا

تھا۔ جبکہ علماء دیوبند کی ایک بڑی تعداد نے جمعیۃ علماء ہند سے الگ ہو کر جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس انکار کی ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دونوں قیام پاکستان کے خلاف تھیں اور انہوں نے اس کی مخالفت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ ان جماعتوں کا موقف یہ تھا کہ:

- مسلم لیگی قیادت نفاذ اسلام میں سنجیدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتی ہے۔
- قیام پاکستان سے برصغیر کے مسلمان تقسیم ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے کسی کام نہیں آسکیں گے۔
- مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھارت میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔

جہاں تک نتائج کا تعلق ہے نصف صدی بعد ہمیں انہی نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا اظہار ان جماعتوں کے قائدین تحریک پاکستان کی مخالفت میں خدشات کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگی قیادت کئی بار اقتدار ملنے کے باوجود نفاذ اسلام کی طرف نصف صدی میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکی۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قوت کے تقسیم ہو جانے کے بعد مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان مرحوم کے اس اعتراف کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جو انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد ”اخبار جہاں“ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> ”ہمارے طرز عمل کے باعث برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے کی کسی مشکل میں کام نہیں آسکتے۔“

تاہم اس سب کچھ کے باوجود قیام پاکستان کی مخالفت ایک سیاسی رائے تھی جسے جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے راہنماؤں نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بلکہ جب دیکھا کہ مسلمانان ہند نے ان کی رائے کی حمایت نہیں کی اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا ہے تو انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کچھ حقائق قارئین کے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ تحریک پاکستان کی مخالفت میں علماء کرام میں سب سے نمایاں تین نام ہیں:

1. مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
2. امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
3. مولانا ابوالکلام آزادؒ

بلا شبہ ان تینوں حضرات نے قیام پاکستان کے خلاف اپنی رائے کو پورے شدومد کے ساتھ پیش کیا مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان کا طرز عمل کیا تھا اسے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ان کے پاکستان میں رہنے والے عقیدت مندوں نے آئندہ کے بارے میں راہنمائی طلب کی تو انہوں نے واضح طور پر ہدایت کی کہ پاکستان کی سالمیت واستحکام کے لیے کام کریں اور ماضی کو بھول جائیں۔ مولانا مدنیؒ نے اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت مثال دی جو ان کے مکتوب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد بننے سے پہلے اہل محلہ کا اختلاف ہو سکتا ہے کہ مسجد یہاں بنے وہاں نہ بنے، اتنی جگہ میں بنے اور اتنی میں نہ بنے۔ لیکن جب ایک فریق کی رائے غالب آگئی اور انہوں نے دوسرے فریق کی رائے کے خلاف مسجد بنا لی تو اب یہ مسجد سب کے لیے مسجد ہی ہے۔ اور اس کا احترام اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لاہور میں جلسہ عام منعقد کر کے اعلان کیا کہ قوم نے ان کی رائے کو قبول نہیں کیا اس لیے وہ قوم کا فیصلہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے حق میں دستبردار ہوتے ہیں، اور اب وہ پاکستان کی سالمیت واستحکام کے لیے بھرپور کردار ادا کریں گے۔ چنانچہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ میں مسلم لیگ کے ساتھ جس جماعت نے جہاد کشمیر کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا وہ مجلس احرار اسلام تھی۔

اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں بھی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر آچکی ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر جب ریاستوں کو اس بات کا اختیار ملا کہ وہ اپنی مرضی سے پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تو بلوچستان کی ریاست قلات کے نواب میر احمد یار خان مرحوم نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کے اعلان سے قبل کانگریسی راہنماؤں سے رابطہ کے لیے اپنے وزیر دربار میر غوث بخش بزنجو مرحوم کو بھیجا تاکہ بھارتی حکومت سے گفت وشنید کے بعد بھارت کے ساتھ قلات کے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔ میر غوث بخش بزنجو مرحوم دہلی پہنچے تو اس خیال سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ملے کہ اس طرح کانگریس کی ہائی کمان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی رہے گی۔ مولانا آزادؒ نے نواب قلات کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے میر غوث بزنجو کو دوسرے کانگرسی راہنماؤں کے ساتھ ملنے سے روک دیا اور یہ تلقین کر کے واپس بھیج دیا کہ پاکستان بن چکا ہے اس لیے آپ لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کریں اور اسے مضبوط بنائیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اسی قافلہ سے تھا اور اپنے ان اکابر کے اسی طرز عمل کے مطابق انہوں نے خود

کو پاکستان کی سالمیت و استحکام میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جب صدر یحییٰ خان نے پارلیمنٹ کا طلب کردہ اجلاس ملتوی کر دیا اور شیخ مجیب الرحمان نے اس کے ردعمل میں ہڑتال کا اعلان کر کے مشرقی پاکستان کا پورا نظام جام کر دیا تو پاکستان کی تقسیم کا خطرہ حقیقی طور پر بالکل سامنے نظر آنے لگا۔ اس موقع پر معاملات کو سلجھانے کے لیے قومی اسمبلی کی چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں نے لاہور میں اجلاس منعقد کر کے فریقین سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے وفد میں مولانا مفتی محمودؒ بھی مذاکرات میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب الرحمان سے ملے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ میں ان مذاکرات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اور خان عبدالولی خان دونوں شیخ مجیب سے ملے اور ان سے دیگر بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ:

> ”شیخ صاحب! یہ بات یاد رکھیں کہ آپ مسلم لیگی ہیں اور ہم کانگرسی۔ کل آپ پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے کہا تھا کہ نہ بنائیں اس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔ اور آج آپ پاکستان توڑ رہے ہیں تو ہم آپ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ اسے نہ توڑیں مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔“

اس پس منظر میں بعض مجالس میں اس وقت کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے، جس میں بھٹو مرحوم نے اپوزیشن پر پاکستان کی تقسیم کی ذمہ داری کا الزام عائد کیا تھا اور مفتی صاحبؒ اس وقت اپوزیشن لیڈر تھے، مولانا مفتی محمودؒ نے کہا تھا کہ:

> ”ہم پاکستان کی تقسیم کے ذمہ دار نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم تو ہندوستان کی تقسیم کے حق میں بھی نہیں تھے پاکستان کی تقسیم کے کس طرح حق میں ہو سکتے ہیں؟ یہ تقسیم کرنا تمہارا ہی کام ہے، کل بھی ملک تم نے تقسیم کیا اور آج بھی تم نے ملک کو دولخت کیا ہے۔ اگر یہ تقسیم گناہ ہے تو اس گناہ میں ہم نہ کل شریک تھے اور نہ آج اس گناہ میں ہم حصہ دار ہیں۔“

الفاظ اور جملوں کی ترتیب میں کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ نے جو کچھ کہا اس کا پورا مفہوم بیان ہو جائے۔ یہ بات انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ملک گیر کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ کی تھی، اور میں اس کنونشن کا اسٹیج سیکرٹری تھا۔ جبکہ بعض دیگر مجالس میں بھی انہوں نے یہ بات کہی

جسے یار دوستوں نے اس جملے میں تبدیل کر دیا کہ ”ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔“ اور اس کے بعد سے اس بات کو مسلسل دہرایا جا رہا ہے۔

بہر حال علماء کا وہ حلقہ جس نے ایک سیاسی رائے اور موقف کے طور پر پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی اور اسے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مجموعی مفاد میں مفید نہیں سمجھا تھا، انہوں نے پاکستان بن جانے کے بعد نہ صرف اسے خوش دلی کے ساتھ تسلیم کیا بلکہ آج وہی علماء پاکستان کے استحکام و سالمیت اور اسے ایک اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کے لیے سب سے زیادہ سرگرم عمل ہیں، اور غالباً تحریک پاکستان کی اصل منزل بھی یہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۹ء)

(۱۴)

راقم الحروف کو مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک کارکن اور پھر ایک رفیق کار کے طور پر کم و بیش پندرہ برس تک کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور میرے لیے یہ بات بھی سعادت و افتخار کی ہے کہ ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ نے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں منعقدہ اجلاس میں جب پہلی بار مجھے جمعیۃ کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات منتخب کیا تو میرا نام پیش کرنے والے اور مجلس شوریٰ کو بحث اور دلائل کے ساتھ اس پر قائل کرنے والے خود مولانا مفتی محمودؒ تھے۔ اس لیے آج جب ان کی یاد میں کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیے خیالات کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہا ہوں تو یادوں اور واقعات کا ایک متنوع سلسلہ ہے جو ذہن کی اسکرین پر باری باری منعکس ہو رہا ہے۔ مگر ان میں سے صرف ایک پہلو پر آج کی محفل میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ مولانا مفتی محمودؒ ایک مفتی اور فقیہ کی حیثیت سے اسلامی احکام کی تشریح، ترجمانی اور دفاع کی ذمہ داری سے کس تدبر اور بصیرت کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے تھے؟

افتاء اور تفقہ میں ابتداء اسلام سے دو الگ الگ ذوق پائے جاتے ہیں۔

1. ایک ذوق سختی اور تشدد کا ہے کہ مسئلہ بیان کرنے اور فتویٰ دینے میں کسی قسم کی کوئی لچک نہ دی جائے کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ لچک دینے کی صورت میں اس سے اکثر ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہ ذوق حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا تھا اور ہر دور میں اس ذوق کے حامل علماء کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے۔
2. دوسرا ذوق رخصت اور لچک کا ہے کہ مسئلہ پوچھنے والے کو شرعی اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر ممکن سہولت اور لچک فراہم کی جائے اور اسے مشکل اور الجھن سے نکالنے کی حتی

الوسع کوشش کی جائے۔ یہ ذوق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا تھا اور اس ذوق کے حاملین بھی ہر دور میں موجود چلے آرہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے دور کے ایک بڑے عالم دین سے فرمائش کی کہ وہ ان کے لیے احکام و مسائل کا ایک مجموعہ مرتب کر دیں لیکن ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ احکام اور مسائل لکھتے وقت عبداللہ بن عمرؓ کی سختی اور عبداللہ بن عباسؓ کی نرمی سے بچنا اور درمیان کی یعنی اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا۔ چنانچہ یہ دونوں ذوق شروع سے چلے آرہے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت کا تقاضہ بھی ہے تاکہ عام لوگوں کی ضروریات اور زمانے کے تقاضوں اور رجحانات کے مطابق ضرورت پڑنے پر ان میں سے کسی سے بھی استفادہ کیا جاسکے۔

راقم الحروف کو دونوں طرح کے مفتی صاحبان سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب اور علاقہ کے سب سے بڑے مفتی مولانا مفتی عبدالواحدؒ تھے جو بلاشبہ ایک متبحر عالم دین اور فقیہ النفس مفتی تھے۔ میں نے درس نظامی سے فراغت کے بعد عملی زندگی کا آغاز جامع مسجد میں ان کے نائب کی حیثیت سے کیا اور سالہا سال ان کی نیابت کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ ان کا ذوق سختی اور تشدد کا تھا اور وہ کسی مسئلہ میں ذرہ بھر لچک دینے کے روادار نہ تھے بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں میں جو سب سے زیادہ سخت ہو اسے بیان کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ تھوڑی سی لچک دیں گے تو لوگ اس لچک کا دائرہ خود بخود وسیع کر لیں گے اور پھر معاملات کو کنٹرول میں رکھنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

دوسری طرف جمعیۃ علماء اسلام کی قیادت مولانا مفتی محمود کے ہاتھ میں تھی اور مجھے ایک کارکن اور قریبی ساتھی کے طور پر ان کی رفاقت میسر تھی۔ ان کا ذوق نرمی اور سہولت کا تھا اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص مسئلہ پوچھنے آیا ہے تو اس بات کو غنیمت سمجھو کہ وہ دین کے دائرے میں رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے جتنی سہولت فراہم کر سکتے ہو اس کے لیے پوری کوشش کرو اور اصول کے دائرے کو قائم رکھتے ہوئے فروع و جزئیات میں زیادہ سختی نہ کرو۔ امت کے اجتماعی مسائل و مشکلات کے حوالہ سے احکام و مسائل کی تشریح میں بھی ان کا ذوق یہی تھا اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی بھی مسئلہ میں شرعی اصول و قواعد کی حدود میں رہتے ہوئے نرمی اور سہولت کا راستہ اختیار کیا جائے اور مسئلہ کو الجھانے اور ڈیڈلاک کی کیفیت پیدا کرنے کی بجائے مسئلہ کے حل اور سلجھاؤ کی کوئی صورت نکالی جائے۔

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ ۱۹۷۳ء کی دستور ساز اسمبلی میں جب

اسمبلیوں میں خواتین کی رکنیت کا مسئلہ سامنے آیا تو دینی حلقوں میں اچھی خاصی بحث چھڑ گئی کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان فرائض و حقوق کی جو تقسیم کی ہے اور حجاب کی جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کی موجودگی میں منتخب اسمبلیوں میں عورتوں کی رکنیت کا کوئی جواز بھی ہے یا نہیں۔ بہت سے علماء کا موقف یہ تھا کہ چونکہ اسمبلیوں میں پردہ اور حجاب کی پابندیاں برقرار نہیں رکھی جا سکتیں اس لیے عورتوں کا اسمبلیوں کا ممبر بننا شرعاً درست نہیں ہے۔ مگر مولانا مفتی محمودؒ نے اس سے الگ موقف اختیار کیا، ان کا کہنا تھا کہ اسلام عورت کو کسی بھی معاملہ میں رائے دینے کے حق سے محروم نہیں کرتا اور دورِ خلافتِ راشدہ میں علمی اجتماعی مسائل میں خواتین سے رائے لینے اور اس پر عمل کرنے کی متعدّد مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہیے البتہ پردہ کے شرعی مسائل کے پیش نظر یہ صورت اختیار کی جائے کہ کسی اسمبلی یا مشترک ایوان کی رکنیت کے لیے عورتوں کی عمر کی وہ حد مقرر کر دی جائے جس عمر میں فقہاء نے بھی پردہ کی پابندی نرم کر دی ہے۔

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ عورت جب بچے کی ولادت کی عمر سے گزر جاتی ہے اور اس کو ماہواری آنے کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے تو شریعت کی اصطلاح میں وہ "آئسہ" کہلاتی ہے اور اس کے لیے فقہاء حجاب اور مردوں کے ساتھ عدم اختلاط کی وہ پابندیاں اس قدر ضروری نہیں سمجھتے جو اس سے قبل اس پر شرعاً عائد تھیں۔ اور عام طور پر چالیس پینتالیس کی عمر تک پہنچ کر عورت اس حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ کا موقف یہ تھا جس کا انہوں نے کئی مجالس میں ہمارے سامنے اظہار کیا کہ عورتوں کو اسمبلیوں کی رکنیت سے نہ روکا جائے البتہ ان کی عمر کی حد مقرر کر دی جائے اور اسمبلیوں میں ان کی نشستیں الگ کر دی جائیں اس طرح دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے، خواتین کا رائے کا حق بھی مجروح نہیں ہوگا اور حجاب کے شرعی احکام کی خلاف ورزی سے بھی ہم محفوظ رہیں گے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کے اجتماعی مسائل میں بحیثیت مفتی اور فقیہ مولانا مفتی محمود کا ذوق کیا تھا اور وہ کس تدبر اور بصیرت کے ساتھ مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مفتی صاحبؒ کو قدرت نے اسلامی احکام و مسائل کی حکیمانہ تشریح اور دفاع کا بھی خصوصی ذوق عطا کیا تھا اور وہ اسلامی قوانین پر اعتراضات کے جواب میں پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے منطق و استدلال کا ایسا حصار قائم کر دیتے تھے کہ کسی بڑے سے بڑے مخالف کے لیے ان کے دلائل کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جب حدود آرڈیننس کے نفاذ کا مرحلہ آیا تو زنا کی شرعی سزا کے طور پر رجم کے قانون کا نفاذ اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔ آج کی دنیا میں جرائم کی جسمانی سزاؤں

مثلاً قتل کرنے، ہاتھ کاٹنے، کوڑے مارنے، سنگسار کرنے اور سر عام سزا دینے کو جدید کلچر اور اقوام متحدہ کے منشور کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی تصور کیا جاتا ہے۔ بالخصوص رجم یعنی سنگسار کرنے کی سزا بہت زیادہ سخت متصور ہوتی ہے اس لیے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ شادی شدہ مرد اور عورت کو زنا کی سزا بے شک موت ہی کی صورت میں دی جائے لیکن اس کا طریق کار بدل کر اگر سنگسار کرنے کی بجائے گولی یا پھانسی کی شکل میں موت کی سزا تجویز کر دی جائے تو اس صورت میں بھی اس سزا کی سنگینی کو دنیا کی نظروں میں خاصا کم کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں عالم اسلام کے معروف عالم دین اور محقق ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی ان دنوں پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے جو ممتاز علمی شخصیت ہیں، متعدّد علمی کتابوں کے مصنف ہیں، ایک دور میں شام کے وزیر اعظم رہے ہیں اور آج کل سعودی حکومت کے مشیر کے طور پر ریاض میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا مفتی محمود پاؤں کے انگوٹھے کے زخم کے سلسلہ میں راولپنڈی صدر کے ملٹری ہسپتال میں زیر علاج تھے، ڈاکٹر معروف الدوالیبی ان سے ملاقات کے لیے ہسپتال آئے اور دونوں میں اس مسئلہ پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ اگر زنا کی سزا میں ہم رجم کی بجائے گولی کے ذریعہ موت کی سزا تجویز کر دیں تو بھی شریعت کا تقاضہ پورا ہو جائے گا۔ مگر مفتی صاحب نے انہیں جو جواب دیا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا اس لیے انہیں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ رجم کی صورت میں اسلام کا اصل منشا سزا دینا نہیں ہے بلکہ خوف اور عبرت کی فضا قائم کرنا ہے تاکہ کوئی مرد یا عورت اس قبیح جرم کے قریب جانے کی جرأت نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جرم میں واقعہ کا عدالتی ثبوت اس قدر مشکل بنا دیا گیا ہے کہ گواہوں کے ذریعہ زنا کا ثبوت عام حالات میں کسی عدالت میں ممکن ہی نہیں، الاّ یہ کہ کوئی شاذ و نادر صورت ایسی پیش آجائے۔ اور اس جرم میں اعتراف ہی وہ واحد صورت ہے جس کے بعد کسی کو رجم کی سزا مل سکتی ہے اور اعتراف بھی ایک بار نہیں بلکہ چار بار اور پوری صراحت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ پھر شریعت مجرم کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اگر اعتراف اور عدالت کے فیصلے کے بعد بھی کسی مرحلہ میں اپنے اعتراف سے منحرف ہو جائے تو اس سنگین سزا سے بچ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جب پتھر مارے جا رہے ہوں اس وقت بھی اسے حق ہے کہ وہ بھاگ جائے اور اس کا یہ بھاگ جانا ہی اعتراف سے انحراف تصور کیا جائے گا۔ اس لیے اگر اسے اعتراف کے بعد موت کی سزا گولی کی صورت میں دی جائے تو وہ ایک لمحہ میں ہی ختم ہو جائے گا جبکہ پتھر مارنے کی صورت میں اسے آخری

پتھر کھانے سے پہلے بھی بھاگ جانے اور جان بچانے کا حق حاصل ہے۔ اس لیے گولی یا پھانسی کی شکل میں موت کی سزا دینے سے شریعت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اور مجرم کا جان بچانے کا حق قبل از وقت ختم ہو جاتا ہے۔

الغرض مولانا مفتی محمودؒ ایک صاحب بصیرت مفتی اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی احکام و قوانین کے ایک باشعور وکیل اور ترجمان بھی تھے جن کی یادیں اور تعلیمات اربابِ علم و دانش کے لیے ایک عرصہ تک مشعلِ راہ کا کام دیتی رہیں گی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

(۱۵)

اسلام آباد میں "دفاع پاکستان و افغانستان کونسل" کے اجلاس کے موقع پر حافظ محمد ریاض درانی سکیرٹری اطلاعات جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے یہ خوش خبری سنائی کہ مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کے فتاویٰ کا پہلا حصہ جمعیت پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو گیا ہے اور وہ میرے لیے اس کا نسخہ ساتھ لائے ہیں۔ یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی اس لیے کہ مدت سے اس بات کی تمنا تھی کہ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فتاویٰ کا جو ریکارڈ موجود ہے وہ کسی طرح اشاعت پذیر ہو جائے۔ الحمد اللہ کہ اس کا آغاز ہو گیا ہے اور کتاب العقائد، کتاب الطہارۃ، احکام مسجد اور مواقیت الصلاۃ کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کا اہم حصہ "فتاویٰ مفتی محمودؒ" کی جلد اول کے طور پر مارکیٹ میں آچکا ہے۔ فتاویٰ مفتی محمودؒ کے آغاز میں ہمارے فاضل دوست مفتی محمد جمیل خان کا تحریر کردہ تفصیلی مقدمہ ہے جو فقہ کی تدوین، فقہ حنفی کی خصوصیات اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فقہی ذوق و اسلوب کے حوالہ سے اہم معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے فقہی اسلوب و خدمات کے بارے میں ان کے بعض معاصر علماء اور اہل علم کے تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ چونکہ عملی سیاست میں براہ راست شریک رہے ہیں، حکومت و اپوزیشن کے تجربات سے خود گزرے ہیں اور سیاست و پارلیمان کے ایوانوں میں ہر مکتب فکر اور ذہنی سطح کے لوگوں سے دینی مسائل کے حوالہ سے ان کا براہ راست رابطہ اور معاملہ رہا ہے اس لیے آج کے جدید مسائل کے حل اور اسلامائزیشن کی تحریک کو فکری و عملی طور پر درپیش مشکلات کے باب میں ان کی بصیرت و تجربہ کو یقیناً امتیاز و تخصص حاصل ہے اور اسی وجہ سے ان کے فتاویٰ کی اشاعت کی ایک مدت سے خواہش رہی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے فقہی مقام اور ذوق و اسلوب کی ایک جھلک حضرت مولانا عبید اللہ دامت برکاتہم مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کے ان تاثرات میں دیکھی جاسکتی ہے جو مفتی محمد جمیل خان نے ''فتاویٰ مفتی محمودؒ'' میں ان الفاظ کے ساتھ شامل کیے ہیں۔

''مفتی صاحب نے اس ملاقات میں مجھ سے ایسی ہی بہت سی باتیں کہیں جن سے میرے دل کو تسلی ہوئی۔ مجھے اس بالمشافہہ گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ مفتی صاحب اپنے دل میں اتحاد بین المسلمین کے لیے بڑی تڑپ رکھتے ہیں اور فرقہ واریت سے انہیں طبعی نفرت ہے، چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھے اس لیے ایک نوجوان عالم کی زبانی اتنی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ نوجوان عموماً جذباتی ہوتے ہیں، ان کی سوچ بھی جذباتی ہوتی ہے، ان کے فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں، مجھے اطمینان ہوا کہ ہمارے ہم عصر علماء میں وہ ایک پختہ فکر صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں، ان کی یہی صفت میرے دل کو زیادہ بھائی۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان ملاقاتوں میں علمی، سیاسی اور ملی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل بھی زیر بحث آتے رہے اور ان کی فقہی رائے کو میں نے ہمیشہ قوی پایا۔ بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے، ایسی رائے کے حق میں ان کے پاس قوی دلائل ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر فقہی مسائل پر عمل کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ مخصوص حالات میں ایک حنفی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی خاص مسئلے میں آئمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کرے۔ ایسا آدمی ان کے نزدیک حنفیت سے خارج نہیں ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ

''امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے متعدّد مسائل میں امام صاحبؒ سے اختلاف کیا ہے، ان کی اپنی ترجیحات ہیں لیکن ان پر حنفیت سے خروج کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، وہ اپنے اختلافات اور ترجیحات کے باوجود حنفی تھے۔ اسی طرح اگر کسی مسئلے میں امام صاحبؒ کا قول موجود نہ ہو یا قول تو موجود ہو مگر سمجھ نہ آئے یا سمجھ بھی آئے لیکن حالات کی خاص نوعیت کے تحت اس پر عمل ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے امام کی پیروی درست ہوگی۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایسی مشکل صورت پیش آجائے تو صاحبین کے قول پر عمل کیا جائے، اگر صاحبین کے قول میں بھی یہی صورت پیش آئے تو امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی جائے، اس کے بعد آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اقرب قول پر عمل کر لیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی

خاص مسئلے میں خاص حالات میں خروج عن الحنفیت تو جائز ہے لیکن مذاہب اربعہ سے خروج جائز نہیں۔ اس نقطۂ نظر میں مفتی صاحبؒ منفرد تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ایسا کرنا ان علما کا کام ہے جن کی مذاہب اربعہ پر وسیع نظر ہے، جو کسی مسئلے کے ترجیحی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، عام آدمی کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ سنی سنائی باتوں پر عمل کرے کیونکہ ایسی اجازت دینے سے اس کے عقیدے میں خلل آسکتا ہے، لوگ اپنی مرضی سے ادھر ادھر بھٹکنے کے عادی بن سکتے ہیں۔ جب کہ ایسی صورت صرف اس وقت پیش آسکتی ہے جب ملکی قوانین کی تدوین کی صورت میں علماء کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ اصل چیز امام کا قول نہیں اصل چیز وہ نص ہے جس کی روشنی میں یہ قول متشکل ہوا ہے، یعنی منصوص چیز جو ائمہ اربعہ کرام کی عملی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوئی۔ ائمہ اربعہ نے بے پناہ تحقیق و جستجو کے بعد قرآن و حدیث سے مسائل مستنبط کیے ہیں اس لیے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی مسئلے پر اگر احناف کے ہاں کوئی دلیل یا سند نہیں تو دوسرے مذاہب سے اسے لینا درست ہوگا، بشرطیکہ وہ وہاں بہتر صورت میں موجود ہو۔“

جبکہ محدث عصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز کے جانشین مولانا مفتی احمد الرحمانؒ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے بارے میں حضرت بنوریؒ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

”اللہ تعالیٰ نے ان کو فقہ میں خاص مقام عطا فرمایا تھا۔ مولانا بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت پاکستان میں ان سے بڑا کوئی مفتی نہیں۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا تھا کہ میری نظروں میں آج تک کوئی ایسا عالم نہیں گزرا جس نے فقہ کی کتاب شامی کا بالاستیعاب تین دفعہ اول سے آخر تک پڑھا اور ان کو اس کتاب پر مکمل عبور حاصل ہے، کسی مسئلے پر آپ کے فتوے کے بعد کسی دوسرے فتوے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔“

اسی طرح مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی کا ارشاد ہے کہ

”مفتی محمود صاحبؒ مسائل کے سلسلے میں تنگ نظر نہیں تھے کہ اس میں کوئی لچک ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اتنے وسیع نظر تھے کہ حلال و حرام کی تمیز ختم کر دیں، درمیانی طور پر جتنی مسئلے میں گنجائش ہوتی رعایت فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فقہ میں بہت بلند مقام عطا

فرمایا تھا اور اہل فتویٰ کی حیثیت سے ان کی رائے کو مستند سمجھا جاتا تھا۔ مفتیان کرام میں ان کا ایک خاص مقام تھا اور وہ مجلس میں ہمیشہ اپنے علم اور فضل کی بنا پر بھاری پڑتے تھے اور ان کا انداز بیان بہت ہی زیادہ دلکش ہوتا تھا۔"

حضرت مفتی محمودؒ کے فتاویٰ کی اشاعت کا آغاز خوش آئند ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمیعت پبلی کیشنز کو اس کے باقی حصوں کی بھی جلد از جلد اشاعت کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے زیادہ سے زیادہ علماء کرام، طلبہ اور دینی کارکنوں کے لیے استفادہ اور ذہنی وفکری تربیت کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف۔ ۶ستمبر ۲۰۰۱ء)

(۱۶)

حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کو ہم سے رخصت ہوئے ۱۴ اکتوبر کو چھتیس برس گزر جائیں گے لیکن ابھی کل کی بات لگتی ہے، ان کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے، وہ مختلف تقریبات میں آتے جاتے دکھائی دے رہے ہیں، ان کی گفتگو کانوں میں رس گھول رہی ہے، ان کے استدلال اور نکتہ رسی کی ندرت دل و دماغ کو سراپا توجہ کی کیفیت میں رکھے ہوئے ہے اور ان کی فراست و تدبر کے کئی مراحل ذہن کی اسکرین پر قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ کے بارے میں بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے اور بہت لکھنے کا ارادہ ہوتا ہے لیکن آج کل سماعت و مطالعہ کا ہاضمہ اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ بعض ارادے

؎ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

کی دہلیز پر آکر دم توڑ دیتے ہیں۔ آج ان کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے کئی گھنٹے سوچتا رہا اور متعدّد پہلو باری باری سامنے آنے پر انہیں تولتا رہا بالآخر ذہن کی سوئی حضرت مفتی صاحبؒ کے استدلال کے اسلوب اور ندرت پر آکر رک گئی اور اسی کے حوالہ سے چند معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو استدلال کی جو قوت و صلاحیت عطا فرمائی تھی اس کا اعتراف سب حلقوں میں کیا جاتا تھا۔ ہمارے ایک مرحوم و مخدوم بزرگ کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحبؒ سامنے نظر آنے والے لکڑی کے ستون کو دلائل کے ساتھ سونے کا ستون ثابت کرنا چاہیں تو دیکھنے والا شخص ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ سیاسی، علمی، اور فکری سب قسم کے معاملات میں مفتی صاحبؒ کی اس خداداد صلاحیت کا ہم نے یکساں اظہار ہوتے دیکھا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر خود ان کی زبان سے براہ راست سنی ہوئی بعض باتیں ذکر کرنا چاہ رہا ہوں۔

۱۹۷۳ء کے دستور کی ترتیب و تدوین میں حضرت مفتی صاحبؒ بھی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بلکہ جمعیۃ علماء اسلام کے پارلیمانی لیڈر کے طور پر شریک تھے۔ اس دوران یہ بات زیر بحث آئی کہ کیا عورتوں کو اسمبلی میں نمائندگی دی جا سکتی ہے؟ ہمارے بعض سرکردہ ارباب علم و فضل کو اس میں اشکال تھا۔ مفتی صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ایک بڑے بزرگ کے ساتھ اپنی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت اشکال کس بات میں ہے، کیا عورتوں کو رائے دینے اور مشورہ میں شریک ہونے کا حق حاصل نہیں ہے یا پردہ اور مجلس کے اختلاط کے حوالہ سے اشکال درپیش ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ عورتوں کو رائے دینے کا حق تو ہے اور انہیں مشاورت میں شریک بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مشترکہ مجلس میں ان کا بے حجاب شریک ہونا درست دکھائی نہیں دیتا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ قرآن کریم نے آیت مقدسہ والقواعد من النساء میں عمر رسیدہ عورتوں کے لیے جو گنجائش دی ہے اگر اس کے تحت اسمبلی کی رکنیت کے لیے عورتوں کی عمر کی حد مقرر کر دی جائے، ان کی نشستیں مردوں سے الگ کر دی جائیں، اور لباس کی بھی کوئی مناسب حد بندی کر دی جائے تو پھر آپ کو کیا اشکال ہے؟ اس پر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ نے ایک موقع پر بتایا کہ قومی اسمبلی میں قادیانیت کے حوالہ سے بحث طول پکڑ گئی اور قادیانی امت کے سربراہ مرزا ناصر احمد کی طرف سے قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کیے جانے کے باعث اسمبلی کے وہ ارکان تشویش کا شکار ہونے لگے جو قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ''خاتم النبیین'' کے مختلف معنوں اور توجیہات نے اس تشویش میں اضافہ کر دیا، حتیٰ کہ خود وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ دونوں طرف سے آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاری ہیں اور حوالے دیے جا رہے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہے۔ اس لیے ہمیں تو قرآن کریم سے کوئی سیدھی سی بات بتائیں کہ حضرت محمدؐ کے بعد نبی نہیں آئے گا تب بات ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ بھٹو مرحوم کی یہ بات سن کر ایک بار تو مجھے بھی پریشانی سی ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈال دی اور میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! یہ بات تو قرآن کریم نے آغاز میں ہی واضح کر دی ہے کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مومن وہی ہے جو اس وحی پر ایمان لاتا ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس وحی پر بھی ایمان رکھتا ہے جو آپؐ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے بعد وحی نازل ہونا ہوتی تو اس کا بھی یہاں ذکر ہوتا، چونکہ اس کا ذکر نہیں ہے اس لیے حضورؐ کے بعد کسی وحی کا نزول نہیں ہوگا۔ یہ بات سن کر بھٹو مرحوم نے کہا کہ

بس بات سمجھ میں آگئی ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

اسمبلی کا ہی ایک اور واقعہ حضرت مفتی صاحبؒ نے سنایا کہ اسمبلی میں زیر بحث کسی مسئلہ پر مفتی صاحبؒ اور کچھ دیگر ارکان نے واک آؤٹ کیا تو اس پر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے اعتراض کیا کہ آپ حضرات یہاں قوم کی نمائندگی کے لیے آتے ہیں اور یہاں آنے اور بیٹھنے کی آپ کو تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ ملتے ہیں، اس لیے کام چھوڑ کر چلے جانا شرعاً درست نہیں ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا حکم ہے کہ جس مجلس میں غلط باتیں ہو رہی ہوں "فلا تقعدوا معهم" ان کے ساتھ مت بیٹھو۔ نیازی صاحب مرحوم نے کہا کہ پھر آپ مجلس میں واپس کیوں آگئے ہیں؟ مفتی صاحبؒ نے آیت کا دوسرا جملہ پڑھا "حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ" یہاں تک کہ وہ کسی اور گفتگو میں مصروف ہو جائیں۔ یعنی اگر مجلس کا ایجنڈا بدل جائے تو آپ اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ موقع شناسی اور اس کے مطابق گفتگو کرنے میں مہارت رکھتے تھے اور مخاطب کی بات کا اصل مقصد سمجھ کر اس کا جواب دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بار مفتی صاحبؒ نے بتایا کہ کسی مالدار شخص نے ان سے دریافت کیا کہ کیا حرام مال پر بھی زکوٰۃ دینا ہوتی ہے؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں اس کا مقصد سمجھ گیا کہ میں کہہ دوں گا کہ نہیں تو بات بن جائے گی کہ ہماری کمائی تو اکثر حرام کی ہوتی ہے اس لیے زکوٰۃ نہیں دینا پڑے گی۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاں بھئی! حرام مال میں بھی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے البتہ حلال مال کی زکوٰۃ اور حرام مال کی زکوٰۃ میں کچھ باتوں کا فرق ہے۔

- حلال مال میں زکوٰۃ فرض ہونے کے لیے نصاب کا ہونا ضروری ہے لیکن حرام مال کا کوئی نصاب نہیں ہے۔
- حلال مال میں حولان حول (سال کا گزرنا) شرط ہے لیکن حرام مال میں فوری ادائیگی ضروری ہے۔
- حلال مال میں اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ دینا ہوتی ہے جبکہ حرام مال سارے کا سارا دے دینا ضروری ہے۔
- حلال مال کی زکوٰۃ دینے پر اجر و ثواب ملے گا مگر حرام مال ثواب کی نیت کے بغیر صحیح جگہ پر خرچ کرنا ہوگا۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کا اصل مقصد تو مال کو پاک کرنا ہوتا ہے جو حلال میں اڑھائی فیصد دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر حرام مال پورے کا پورا دے دینے سے باقی کا حلال مال پاک ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا اسلام آباد کے گورنمنٹ ہاسٹل میں عام طور پر ۴ نمبر کمرہ میں قیام ہوتا تھا اور میں وقتاً فوقتاً جماعتی معاملات میں وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک روز مغرب کی نماز پڑھ کر ہم بیٹھے تو جماعتی و ملکی معاملات پر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ خاصی دیر کے بعد مفتی صاحبؒ کے خادم بھائی عبد الحلیم نے آکر پوچھا کہ کھانا تیار ہے لے آؤں؟ مفتی صاحبؒ نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی زاہد کیا خیال ہے؟ کھانا پہلے کھالیں یا پہلے نماز پڑھ لیں۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ مفتی صاحبؒ نے اس پر یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ کیا مطلب! اطمینان کا تعلق کھانے کے ساتھ ہے یا نماز کے ساتھ؟ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔

ایک موقع پر حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا کہ مسلمانوں پر حکمران انہیں میں سے چنے جانے چاہئیں اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی اطاعت کرو "وأولی الأمر منکم" اور ان حکمرانوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا استدلال "منکم" سے تھا کہ مسلمان حکمرانوں کا انتخاب خود ان میں سے ہی ہونا چاہیے۔

بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں لیکن کالم میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے چند باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

(۱۷)

سپریم کورٹ آف پاکستان کے فل بینچ نے چیف جسٹس محمد اجمل میاں کی سربراہی میں اپنے ایک فیصلے میں سندھ ہائی کورٹ کا وہ فیصلہ برقرار رکھا ہے جس میں فقہ حنفی سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حنفی ہونے کا ڈیکلیریشن داخل کر کے بینکوں میں زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے استثنا حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے قبل فقہ جعفریہ کے پیروکاروں کو یہ حق حاصل تھا مگر مس فرزانہ کوثر نے سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی کہ وہ فقہ حنفی کی پیروکار ہیں اور فقہ حنفی کی رو سے بھی حکومت کو بینکوں کی رقوم سے زکوٰۃ جبری طور پر وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لیے اسے یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے حنفی ہونے کا ڈیکلیریشن داخل کر کے زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے مستثنیٰ ہو سکے۔ سندھ ہائی کورٹ نے مس فرزانہ کوثر کا موقف

تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ صادر کر دیا تھا مگر اس کے خلاف حکومت پاکستان نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی جسے سپریم کورٹ نے مسترد کر دیا ہے اور سندھ ہائی کورٹ کا مذکورہ فیصلہ برقرار رکھا ہے۔

سندھ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے کی کیا وجوہات بیان کی ہیں اس وقت وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ البتہ اس سے ایک پرانی علمی بحث یاد آگئی ہے جو اسی موضوع پر ملک کے سرکردہ علماء کرام کے درمیان اس وقت شروع ہوئی تھی جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے زکوٰۃ آرڈیننس نافذ کر کے بینکوں کو پابند کر دیا تھا کہ وہ ہر سال یکم رمضان المبارک کو بعض متعیّن اکاؤنٹس میں جمع لوگوں کی رقوم میں سے زکوٰۃ کاٹ لیا کریں۔ اس وقت یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا حکومت کو بینک اکاؤنٹس میں سے زکوٰۃ جبرًا وصول کرنے کا شرعًا حق حاصل ہے؟ اور کیا اس طرح زکوٰۃ وضع کیے جانے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا موقف یہ تھا کہ اس صورت میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور حکومت کو بینک اکاؤنٹس میں سے زکوٰۃ جبرًا وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ انہیں اس سلسلہ میں دیوبندی مکتب فکر کے اکابر علماء کرام میں سے مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ، مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور مولانا مفتی عبد الستار (ملتان) کی حمایت حاصل تھی۔ جبکہ باقی اکثر علماء کا فتویٰ یہ تھا کہ حکومت بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ جبرًا وصول کر سکتی ہے اور ایسا کرنے سے صاحب مال کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات بھی اسی موقف پر دلائل دیتے ہوئے بحث کے دوران ہوئی۔ وہ حج کے لیے جا رہے تھے اور انہوں نے بنوری ٹاؤن کراچی کے دینی وعلمی مرکز جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں کراچی کے سرکردہ علماء کرام اور مفتیان عظام کو اس مسئلہ پر باہمی گفت وشنید کے لیے دعوت دے رکھی تھی۔ اس موقع پر اہل علم کے اجلاس میں وہ اپنے موقف کی وضاحت کر رہے تھے کہ اسی دوران انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ چند لمحوں میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا مفتی محمودؒ کا موقف یہ تھا کہ بینک اکاؤنٹس ''اموال ظاہرہ'' میں سے نہیں ہیں کہ جن پر حکومت کو جبرًا زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار ہو۔ بلکہ یہ ''اموال باطنہ ہیں'' جن کی زکوٰۃ ادا کرنا صاحب مال کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو سرکاری بیت المال میں جمع کرا دے اور چاہے تو اپنی مرضی سے مستحقین پر خرچ کرے۔ یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی تو بہر حال فرض ہے کہ شرعی فرائض میں سے ہے مگر حکومت کو زکوٰۃ دینا ضروری نہیں ہے بلکہ صاحب مال اپنی مرضی سے بھی زکوٰۃ کو شرعی مصارف پر خرچ کر سکتا ہے۔

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ

کے ادوار حکومت میں ہر قسم کے مال سے زکوٰۃ حکومت وصول کرتی تھی اور اسے بیت المال کے ذریعہ متعلقہ مصارف میں خرچ کیا جاتا تھا۔ مگر حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جب مال کی کثرت ہوئی تو یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ سونا چاندی یعنی نقد رقوم میں زکوٰۃ کی جبری وصولی سے لوگوں کے ذاتی معاملات میں سرکاری تجسس کے امکانات بڑھ جائیں گے اور لوگوں کی ''پرائیویسی'' متاثر ہوگی۔ اس لیے امیرالمومنین حضرت عثمانؓ نے خلیفہ راشد کی حیثیت سے یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ زرعی پیداوار اور مال مویشی تو اموال ظاہرہ ہیں جن کی تفصیلات آسانی کے ساتھ زیادہ کرید کیے بغیر معلوم کی جا سکتی ہے اس لیے ان کی زکوٰۃ سرکاری طور پر وصول کی جائے گی۔ مگر سونا چاندی وغیرہ یعنی نقد رقوم کی تفصیلات حاصل کرنے کے لیے کرید اور تجسس سے کام لینا پڑتا ہے جس سے پرائیویسی متاثر ہوتی ہے اس لیے یہ اموال باطنہ ہیں ان کی زکوٰۃ جبراً وصول نہیں کی جائے گی۔ اور صاحب مال کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے اموال کا سالانہ حساب خود کر کے زکوٰۃ بیت المال کو ادا کرے یا اپنی صوابدید پر مستحق لوگوں کے حوالہ کر دے۔ چنانچہ اس وقت سے اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم بھی چلی آرہی ہے۔ آج کے دور میں اس بات کو زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھنے کے لیے ''اوپن منی'' اور ''پرائیویٹ منی'' سے تعبیر کر دیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہو۔

بعد میں جب معاملات کچھ اور آگے بڑھے تو سوال پیدا ہوا کہ مال تجارت کا شمار کس کھاتے میں کیا جائے گا؟ تو امیرالمومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں ان کی طرف سے یہ حکم نافذ ہوا کہ وہ مال تجارت جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتا ہے یعنی سرکاری اہل کاروں کی نظروں سے کھلے بندوں گزرتا ہے وہ بھی اموال ظاہرہ میں شمار ہوگا اور اس کی زکوٰۃ سرکاری کارندے وصول کر سکیں گے۔ البتہ حرکت میں نہ آنے والا مال تجارت اور نقد رقوم بدستور اموال باطنہ کے زمرے میں شامل رہیں گی۔

اس پس منظر میں یہ عملی سوال پیدا ہوا کہ ''بینک اکاؤنٹس'' ان میں سے کس زمرے میں شمار ہوتے ہیں؟ علماء کرام کے ایک بڑے گروہ کا موقف یہ ہے کہ چونکہ یہ مال ''ڈکلیئر'' ہو چکا ہے اور اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے پرائیویسی کی حدود میں دخل نہیں دینا پڑتا اس لیے یہ ''اوپن منی'' ہے اور حکومت کو اس کی زکوٰۃ جبراً وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔ جبکہ مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے ہمنوا سرکردہ علماء کرام کے نزدیک بینک اکاؤنٹس کو اموال ظاہرہ میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اکاؤنٹ ہولڈر اور بینک کے درمیان آپس کا معاملہ ہے اور بینک اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کے اکاؤنٹس کی تفصیلات کو خفیہ رکھنے کا پابند ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ یہ رقم اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے بینک کے لیے قرض ہے جس کا اصول یہ ہے کہ قرض رقوم کی زکوٰۃ مقروض کے ذمہ نہیں بلکہ قرض دینے والے کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور وہ

قرض کی واپسی کے بعد اس کی سابقہ دور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ قرض کی مدت کے دوران اس پر زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہے گی مگر قرض کی واپسی سے پہلے وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند نہیں ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ کے موقف کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ زکوٰۃ شرعی فریضہ ہے اور کسی بھی شرعی فریضہ کی ادائیگی کے لیے نیت شرط ہے۔ جبکہ بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کی جبری وصولی کے وقت رقم کے مالک کی نیت اس کے ساتھ شامل نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر اس کی نیت نہیں ہے تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ مفتی صاحبؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ "زکوٰۃ آرڈیننس" کی رو سے زکوٰۃ کی جبری وصولی صرف ان اکاؤنٹس میں ہوگی جن پر سود ادا کیا جاتا ہے، جبکہ غیر سودی اکاؤنٹس اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے عملاً اس کی ظاہری صورت یہ بن گئی ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو اصل رقم تو پوری کی پوری واپس مل جائے گی البتہ سود میں سے کٹوتی ہوگی اور وہ اسے اڑھائی فیصد کم لے گا۔ اس لیے اسے زکوٰۃ شمار کرنا مناسب نہیں ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ اپنا موقف پیش کرتے ہوئے علماء کرام کی مجلس میں علمی بحث و مباحثہ کے دوران اپنے رب کے حضور پیش ہوگئے اور زکوٰۃ آرڈیننس ملک میں بدستور چلتا رہا۔ اب سندھ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں میں مولانا مفتی محمودؒ کے موقف کی صدائے بازگشت سنائی دی ہے تو یہ تفصیلات ایک بار پھر ذہن میں تازہ ہوگئی ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے نامور حنفی فقیہ امام ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ نے اپنی معروف کتاب "بدائع الصنائع" میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ اس دور کے معروضی حالات کی مناسبت سے بحث کی ہے، اہل علم اسے وہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ البتہ انہوں نے اس میں کچھ ایسے دلچسپ مسائل بھی بیان فرمائے ہیں جن سے قارئین کو آگاہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اگلے مضمون میں ان میں سے بعض امور کا ان شاء اللہ تعالیٰ تذکرہ ہوگا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۶ مارچ ۱۹۹۹ء)

(۱۸)

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو اللہ رب العزت نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت ایک کامیاب سیاستدان ہونے کے ساتھ محدث، فقیہ، خطیب، پارلیمنٹیرین، شب زندہ دار اور عارف باللہ تھے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ وہ جس مسند پر بھی بیٹھے اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آئے۔ انہوں نے مدت العمر جامعہ قاسم العلوم ملتان میں حدیث و فقہ اور منقولات و معقولات کے متنوع علوم کی تدریس کی اور مسند افتاء پر ہزاروں فتاویٰ جاری کیے۔ اور جب لاہور کے مدرسہ قاسم العلوم

میں انہوں نے دورۂ تفسیر قرآن کریم کے عنوان سے قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا درس دیا تو اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

ایک دور وہ تھا جب پنجاب میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا نہ عمومی طور پر رواج تھا اور نہ ہی دینی مدارس کے طلبہ کو ترجمہ و تفسیر اہتمام کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے نصاب تعلیم میں جلالین اور بیضاوی کے کچھ حصے کے سوا تفسیر نام کی کوئی چیز شامل نہیں تھی۔ اس روایت کو توڑتے ہوئے ہمارے جن بزرگوں نے قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کو عوامی درس اور تدریسی نصاب دونوں سطح پر رواج دیا ان میں حضرت مولانا حسین علیؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ یہ بزرگ عام اجتماعات میں قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر الگ طور پر کرتے تھے اور علماء و طلبہ کے لیے ترجمہ و تفسیر کی کلاسوں کا الگ اہتمام کرتے تھے جن سے لاکھوں افراد نے فائدہ اٹھایا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے ۱۹۴۳ء میں گکھڑ کی جامع مسجد میں درسِ قران کریم کا آغاز کیا اور ۱۹۵۲ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے آغاز پر وہاں تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تو طلبہ کے لیے ترجمہ قرآن کریم کی مستقل کلاس شروع کی۔ اس کلاس میں وہ دو سال میں قرآن کریم کا ترجمہ مکمل پڑھاتے تھے۔ مدرسہ میں روزانہ اسباق کا آغاز اس کلاس سے ہوتا تھا، کافیہ کے درجہ سے اوپر کے تمام درجات کے طلبہ کی اس سبق میں شمولیت لازمی ہوتی تھی اور ہمارے طالب علمی کے دور میں غیر حاضری پر جرمانہ بھی ہوتا تھا۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ خدمت بحمد اللہ تعالیٰ میرے سپرد ہے۔

حضرت والد صاحب مدظلہ کے ترجمہ قرآن کریم کے تین الگ الگ حلقے ہوتے تھے۔ روزانہ صبح نماز فجر کے بعد جامع مسجد گکھڑ میں ہفتہ میں تین دن قرآن کریم اور تین دن حدیث نبویؐ کا درس ہوتا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں روزانہ ترجمہ کی مذکورہ کلاس ہوتی تھی اور شام کو روزانہ گکھڑ کے نارمل اسکول میں، جہاں اسکولوں کے اساتذہ کی تربیتی کلاسیں، ایس وی، جے وی، سی ٹی وغیرہ ہوتی تھیں، ان اساتذہ کے لیے درسِ قرآن کریم کا الگ حلقہ ہوتا تھا۔ تینوں کا رنگ الگ الگ تھا اور ہر کلاس میں اسی کے ماحول اور ذوق کے مطابق ترجمہ ہوا کرتا تھا۔ ان تین حلقوں کے ساتھ ایک چوتھے حلقے کا اضافہ اس وقت ہوا جب ۱۹۷۶ء میں بھٹو حکومت کے صوبائی وزیر اوقاف نے، جو گوجرانوالہ سے ہی تعلق رکھتے تھے، مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کو سرکاری تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا جس پر شہر کے علماء نے حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی سرپرستی میں اس آرڈر کو مسترد کرتے ہوئے مزاحمتی تحریک شروع کرنے کا اعلان

کیا۔ اس مزاحمتی تحریک میں سینکڑوں علمائے کرام اور کارکن گرفتار ہوئے جن میں راقم الحروف اور میرے دو چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس خان قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر بھی شامل تھے، ہم اس موقع پر کئی ماہ تک گوجرانوالہ کی ڈسٹرکٹ جیل میں رہے۔ اس موقع پر ضرورت محسوس ہوئی کہ شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات کے دوران مدرسہ خالی نہ رہنے دیا جائے تاکہ حکومت کو اس پر قبضہ کرنے میں آسانی نہ ہو۔ اس ضرورت کے تحت تعطیلات کے دوران مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ تفسیر قرآن کریم کا اعلان کر دیا گیا اور پھر دو عشروں تک حضرت والد محترم مدظلہ نے شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات کے دوران ہزاروں علمائے کرام اور طلبہ کو قران کریم کا ترجمہ اور تفسیر پڑھائی۔

مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور، جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا قائم کردہ مدرسہ ہے اور جہاں حضرت لاہوریؒ نے ایک مدت تک عوامی اور علمی دونوں حلقوں میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا، ان کے بعد ان کے جانشین اور ہمارے شیخ و مربی حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے آخر عمر تک یہ تسلسل جاری رکھا۔ جبکہ ان کے وصال کے بعد ایک درویش صفت عالم دین حضرت مولانا حمید الرحمان عباسی مدظلہ خاموشی کے ساتھ خدمت قرآن کریم کا یہ سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جس سال مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ نے سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا اسی سال مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی فرمائش پر حضرت مفتی محمودؒ نے دورۂ تفسیر پڑھایا۔ دونوں جگہ سینکڑوں علماء و طلبہ شریک درس تھے اور دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے رنگ میں علماء و طلبہ کو قرانی علوم و معارف سے فیض یاب کیا۔ میری چھٹیاں تو اس سال ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں گزریں اس لیے میں دونوں میں سے کسی دورے کا رنگ اس سال نہ دیکھ سکا اور شرکاء سے پوچھ کر اندازہ کیا کہ ان کا ماحول اور رنگ کیا تھا۔

حضرت والد صاحب مدظلہ اس کے بعد ربع صدی تک مسلسل پڑھاتے رہے اور ان کا دورۂ تفسیر پورے کا پورا سی ڈی میں محفوظ ہو گیا ہے جو ناظم مدرسہ نصرۃ العلوم فاروق گنج گوجرانوالہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک ہی سال پڑھایا اور اس کے بعد ان کی مصروفیات نے انہیں موقع نہیں دیا کہ وہ اس تسلسل کو باقی رکھ سکیں۔ اس لیے یہ خواہش رہی کہ وہ بھی کسی طرح محفوظ ہو کر علماء و طلبہ کے پاس پہنچ جائے تو اس سے استفادۂ عام کی کوئی صورت نکل آئے۔ جمعیۃ پبلکیشنز لاہور کی طرف سے شائع کردہ ان افادات کا مجموعہ ”تفسیر محمود“ کے نام سے تین جلدوں میں میرے سامنے ہے۔ جامعہ

اشرفیہ لاہور کے استاذ حضرت مولانا محمد یوسف خان اور حضرت مولانا صدر الشہیدؒ آف بنوں کے فرزند مولانا حفیظ الرحمان نے اس سال حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ان دروس کو تحریری صورت میں ضبط کیا تھا۔ جبکہ حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی، مولانا عبدالرحمان، پروفیسر امجد علی شاکر اور حافظ محمد ریاض درانی نے اسے مرتب کتاب کی شکل دی ہے۔ تین جلدوں میں قرآن کریم کا ترجمہ مکمل ہے البتہ تفسیری حواشی تمام آیات پر نہیں ہیں مگر جن مقامات پر حضرت مفتی صاحب نے قرآنی علوم واحکام کی تشریح کی ہے وہ ان کے خصوصی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا امتیازی ذوق عصر حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر ان پر آیات واحادیث کا انطباق تھا اور آیاتِ قرآنی سے دورِ حاضر کے مسائل کے بارے میں استدلال واستنباط تھا جو جابجا جھلکتا ہے اور اس ذوق کے حاملین کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے تفسیری ذوق کا اندازہ ان افادات کے تفصیلی مطالعہ سے ہی پورے طور پر ہو سکتا ہے البتہ بطور نمونہ اس کی چند جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

شمسی اور قمری سال میں قمری تقویم کی ترجیح کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

> ”قمری ماہ میں واضح علامت چاند کی ہے کہ ایک دیہاتی اور پہاڑی کی چوٹی پر رہنے والا، جنگل اور بیابان میں رہنے والا، صحراؤں کے دامن میں رہنے والا یہ معلوم کر لے کہ آج چاند کی کیا تاریخ ہے۔ اور اس علامت میں ماہ و سال کو عالم فضا میں رکھا گیا کہ کرہ ارض پر کوئی شخص اس قدرتی کیلنڈر سے شاکی نہ رہے اور ہر آدمی اتنا دیکھ کر تاریخ معلوم کر سکے۔ جبکہ بارہ ماہ پر مشتمل شمسی سال کی تقسیم جعلی (مصنوعی) ہے۔ دراصل شمس اپنی ایک دائرہ کی حرکت ایک سال میں مکمل کرتا ہے اور قمر ہر ماہ دائرہ پورا کرتا ہے۔ مثلاً شمس اگر آج حمل میں ہے تو دوبارہ پورے سال کے بعد برج حمل میں آئے گا۔ اس کو لوگوں نے بارہ پر تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن قمر ہر ماہ کو حرکتِ ذاتی سے براہ راست ثابت کرتا ہے اور ایک ماہ کی قمری حرکت بالکل واضح ہے۔ اب دیکھیے کہ حرکت شمس ایک دائرہ میں ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ہوتی ہے، اب ۳۶۵ دنوں کو تو ۳۱، ۳۰، ۲۸ میں تقسیم کر دیا ہے لیکن چھ گھنٹے ہر سال باقی رہ جاتے ہیں، چار سال بعد چوبیس گھنٹے بچ گئے لہٰذا انہوں نے کہا کہ چار سال بعد فروری کا مہینہ ۲۸ دن کی بجائے ۲۹ دن کا ہو گا اور اس میں بچت شامل ہو گی۔ یہ تو بالکل جعلی (مصنوعی) ہے۔ اسلام ہمیشہ اس بات کی تائید کرتا ہے جس کا تعلق عوام سے ہو کیونکہ قرآن کریم کا تعلق عوام سے ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے قمری مہینہ کو ترجیح دی ہے۔“

ارتداد کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ

”بخاری کی حدیث میں ہے من بدل دینہ فاقتلوہ کہ جو اپنے دین سے مرتد ہو جائے اس کو قتل کر دو۔ آج کل کے مرتدین نے اس میں کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر اس کا دل کا عقیدہ تبدیل ہو گیا تو تم اسے اسلام پر کیسے رکھ سکتے ہو؟ ہمارے موجودہ آئین میں اور اس سے پہلے آئین میں ارتداد کا حق دیا گیا ہے چنانچہ ان کے نزدیک ایک مسلمان کفر کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک ارتداد بنیادی حق ہے لیکن ہم نے حکمت کے ساتھ اسے بدل دیا۔ ہم نے کہا کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم ہر مذہب کو آزادی دینا چاہتے ہو، تو یوں نہ کرو کہ ہر شہری کو اختیار ہے کہ جو چاہے مذہب اختیار کرے بلکہ ہر شہری کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے، بدلنے والی بات نہ کرو۔“

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس کے منکرین چودہ سو سال سے موجود تھے لیکن آج سائنس کے (چاند پر جانے کے) اس کارنامہ کی وجہ سے ہم جیت گئے۔ ہم نے کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں لیکن آج تک ایک طبقہ انکار کر رہا تھا وہ بھی آج شرمندہ ہے۔ آج ہم جیت گئے، اسلام جیت گیا، ہمیں خوشی ہونی چاہیے نہ کہ الٹا ہم کہیں کہ اسلام پر ضرب لگی ہے۔ یہاں شکست اسلام کی نہیں اس یونانی حکمت کی ہے جس یونانی حکمت کو ایک طبقہ اسلام سمجھ بیٹھا تھا حالانکہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔“

الغرض حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے اس نوعیت کے تفسیری افادات آج کے ماحول اور تناظر کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو تکمیل تک پہنچانے والے تمام احباب کو جزائے خیر سے نوازیں اور حضرت مفتی صاحب کے ان تفسیری افادات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے استفادہ کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء)

(۱۹)

آج کی نشست میں پاکستان کے معاشی مسائل کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے چند ارشادات وافکار کو پیش کیا جا رہا ہے جو مولانا ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری (گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان) کی

کتاب ''مولانا مفتی محمودؒ کی علمی، دینی وسیاسی خدمات'' سے ماخوذ ہیں۔ اس مرد درویش کے خیالات وارشادات ملاحظہ فرمائیے اور اس کی فراست وبصیرت پر اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان فاصلوں کو بھی دیکھنے کی کوشش فرمائیے جو ان کی وفات کو صرف دو عشرے گزرنے کے ساتھ ہی ہمارے اور ان کے درمیان نہ صرف دکھائی دے رہے ہیں بلکہ دن بدن بڑھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملک میں سب سے اہم مسئلہ ملک کی ۹۰ فیصد آبادی کے بڑے طبقے اور غریب عوام کے مسائل ہیں جو ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جنہیں اپنے وطن میں نہ مکان میسر ہے، نہ خوراک نہ لباس اور نہ زندگی کی دوسری سہولتیں میسر ہیں اور وہ یقیناً حیوانات سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ جب تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک پاکستان میں کسی کو امن وسکون حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک عام مسلمان تو پاکستان میں محنت کرنے کے باوجود اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اور بھوک اور فاقہ کشی کی زندگی گزارتا رہے جبکہ چند انسان یہاں خرمستیاں کرتے پھریں۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر ایک کتا بھی فرات کے کنارے بھوک سے مرتا ہے تو قیامت کے دن عمر (رضی اللہ عنہ) سے اس کا سوال کیا جائے گا۔''

''اس کے لیے بنیادی طور پر زمینداروں اور کارخانوں کے مسائل کا حل کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا شرعاً اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق وہ تمام زمینیں جو قریب کے زمانے میں آباد ہوئی ہیں، ان کے آباد کار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیے جائیں اور قدیم آباد زمینوں سے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریزوں نے ''حق الخدمت'' میں بطور جاگیر کے کسی کو عطا کی تھیں؟ اگر ایسا ہے تو ایسی تمام اراضی کو لازماً واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر مزارعین کو اس کے باوجود مظلومیت محسوس ہو تو کوئی بھی اسلامی حکومت ضرورت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تینوں امام اس بات پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں۔ چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اس لیے ضرورت کے تحت اس کو

ممنوع قرار دینا کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا“۔

”رہا بڑے بڑے صنعت کاروں کا مسئلہ تو اس سے متعلق سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت لازمی طور پر مزدوروں کی تنخواہوں کو اس حد تک بڑھادے کہ مزدور کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے جس سے اس کی زندگی کی بنیادی ضروریات، بچوں کی تعلیم اور علاج وغیرہ کی حسن وخوبی کے ساتھ کفالت ہو سکے۔“

”زراعت کو عام کیا جائے، غیر آباد زمینوں کو آباد کیا جائے، زمینوں کو ناجائز طور پر سیاسی رشوتوں کے لیے الاٹ نہ کیا جائے، زمین بے زمین لوگوں میں الاٹ ہو، آب پاشی کے ذرائع میں توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعہ سے بھی ملکی زراعت کو ترقی دی جاسکتی ہے بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں، صرف ایک شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں، اس طرح مزدور کسان بے کار ہو جائیں گے۔“

”بڑے شہروں میں کارخانوں کے قیام نے دیہات کی ترقی تو کیا ان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا ہے غریب لوگ دیہات سے بھاگ رہے ہیں، شہروں میں کارخانوں (اور دیگر سرکاری وغیر سرکاری اداروں) میں ملازمت کرتے ہیں، شہروں کے مسائل بھی اس طرح بڑھ جاتے ہیں اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ دیہی ترقیاتی اسکیموں پر زور دیا جائے، اس لیے کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہے، اس کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا اور اس روش سے ملک کی زرعی معیشت بھی بہت متاثر ہوئی ہے۔“

”غریبوں سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر بعض لوگ ہم پر ”سوشلسٹ مولوی“ ہونے کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ اسلام غریبوں کا حامی اور مددگار بن کر آیا ہے۔ ہم اسلامی تعلیمات کے مطابق غریبوں کی مشکلات دور کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم پاکستان میں سرمایہ داری کی حفاظت کے لیے اسلام کا نام استعمال نہیں ہونے دیں گے، سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کی حفاظت کے خواہاں اور امریکی سامراج کی مدد سے پاکستان کو ترقی دینے کے دعویدار پاکستان اور اس کے عوام کے دشمن ہیں۔“

”موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت جس میں غریب، غریب تر اور امیر امیر تر بنتے جارہے ہیں، اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے، مغربی استعماری نظام، مغرب زدہ ظالمانہ

نظام ہمارے تمام مسائل کی بنیاد ہے جب تک اس کا خاتمہ نہیں کیا جاتا، اس وقت تک معاشرے میں فلاح کا کوئی تصور بے سود ہے، بے کار ہے، خام خیالی ہے۔“

”سادگی اختیار کی جائے، وزیر اپنا نمونہ پیش کریں، اپنے گھروں کی تزیین وآرائش پر ہزاروں روپے خرچ نہ کریں، ڈرائنگ روم میں قیمتی صوفوں کی بجائے چٹائی کیوں نہیں بچھائی جاسکتی؟ اور بیڈ روم میں نفیس پلنگوں کی بجائے عام چارپائی کیوں کام نہیں دے سکتی؟ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شہری علاقوں میں بڑے مکانوں کی تعمیر پر پابندی لگائی جائے۔ تین سو گز سے زیادہ مکان کسی صورت میں نہ بننے دیا جائے۔ ہمارے اکثر ملکی قوانین ایسے ہیں جو رشوت کا دروازہ کھولتے ہیں اور لوگوں کے مصائب میں اضافہ کرتے ہیں، ان کا جائزہ لے کر ہر قانون میں چور دروازے بند کیے جائیں۔ رشوت بدعنوانی پر کڑی سزائیں دی جائیں اور ان کا قلع قمع کیا جائے۔ شلوار قمیص کی حوصلہ افزائی ہو، سرکاری ملازم دفتر میں قومی لباس پہن کر آئیں۔ اس طرح غیر ملکی لباس جو نفسیاتی رعب داب عطا کرتا ہے اس سے نجات مل جائے گا۔ ایسے ضوابط بنائے جائیں کہ جھوٹ چھاپا یا لکھا نہ جاسکے۔ جھوٹ ایک زہر ہے، جو معاشرہ کی اچھائیوں کو ڈس لیتا ہے بے حیائی اور فحاشی کی روک تھام ہو اور ذرائع ابلاغ کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔“

”ہم پاکستان کے غریب عوام، کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور تمام آدمیوں کو اس سطح پر لانا چاہتے ہیں جہاں پاکستان کے تمام مسلمان عملاً بھائی بھائی نظر آسکیں اور یہ اس وقت ممکن ہو گا جبکہ بے لاگ طور پر ملک میں قرآن وسنت کے احکام نافذ کر دیے جائیں، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد کا عملی نمونہ اختیار کر لیا جائے اور ملک سے سیاسی، اقتصادی اور معاشی ظلم وجبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔“

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۲۰۱۰ء)

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ

(۱)

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ (تاریخ وفات: ۴/فروری ۱۹۸۱ء) سے میرا تعلق مختلف نسبتوں اور حوالوں سے ہے اور میں خود کو ان خوش قسمت افراد میں سمجھتا ہوں جنہیں حضرت مرحوم سے مسلسل

استفادہ کا موقع ملا۔ زندگی کے کسی مرحلہ میں موقف اور پالیسی کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو جانا ایک الگ امر ہے جو انسانی فطرت کا لازمی حصہ ہے، لیکن آج بھی اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو بحمد اللہ تعالیٰ زندگی کے کسی لمحہ میں کوئی ایسا واضح جھول محسوس نہیں ہوتا جو حضرت مولانا ہزارویؒ کے ساتھ عقیدت و محبت اور ان کی دیانت وللہیت پر اعتماد کے حوالے سے خدانخواستہ پیدا ہو گیا ہو، الحمد للہ علیٰ ذالک۔

مولانا ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق علاقائی بھی ہے کہ ہمارا آبائی گاؤں کڑمنگ، جہاں ہمارے دادا محترم جناب نور احمد خان مرحوم رہائش پذیر تھے اور جہاں میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی ولادت ہوئی، بفہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے متعدّد بار سنا ہے کہ دادا مرحوم کڑمنگ سے اوپر پہاڑ کی چوٹی پر اپنی قیام گاہ "چیڑاں ڈھکی" سے سودا سلف لینے کے لیے پیدل بفہ جایا کرتے تھے۔ بفہ مولانا ہزاروی کا آبائی شہر ہے اور آخری آرام گاہ بھی ہے۔ مولانا ہزارویؒ ہمارے خاندانی محسن بھی ہیں کہ دادا محترم جناب نور احمد خان مرحوم کی وفات کے بعد والد محترم مولانا سرفراز خان صفدر اور عم مکرم مولانا صوفی عبد الحمید سواتی ابھی نوعمر تھے اور اہل خاندان کی روایتی بے اعتنائی کا شکار تھے تو انہیں زمانہ کے ظلم وستم سے پہلی پناہ حضرت مولانا ہزارویؒ کے بفہ میں قائم کردہ دینی مدرسہ میں ملی جو پناہ گاہ بھی تھی اور دونوں بھائیوں کے روشن اور تابناک مستقبل کا آغاز بھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے حضرت مولانا ہزارویؒ کے زیر سایہ اس دینی مدرسہ میں تعلیم کا آغاز کیا جس کے ثمرات وفیوض سے آج ایک دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔ آج جب ان دونوں بھائیوں کے علمی ودینی فیضان کا سلسلہ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلا ہوا دیکھتا ہوں تو چشم تصور ماضی کے ان مناظر میں کھو جاتی ہے اور جہاں اس فیضان کے سبب اول کے طور پر حضرت مولانا ہزاروی قدس اللہ سرہ العزیز کا بابرکت چہرہ سامنے آتا ہے، وہاں خاندان اور علاقہ کے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے جن کے منفی طرز عمل اور روایتی سلوک نے دونوں بھائیوں کو مولانا ہزارویؒ کے پاس پہنچا دیا اور ان کا یہ رویہ بھی اس عمومی فیضان کا تکوینی طور پر سبب ہی ثابت ہوا۔ بہرحال حضرت مرحوم میرے والد محترم مدظلہ اور عم مکرم مدظلہ کے محسن اول اور استاد بھی ہیں۔

مولانا ہزارویؒ کے ساتھ میرے تعلق کا تیسرا اور عملی پہلو یہ ہے کہ سیاسی فکر اور دینی جدوجہد میں وہ میرے مربی اور استاذ ہیں اور مجھے زندگی میں اس حوالہ سے جن بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا ہے، ان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حضرت مولانا ہزارویؒ کا اسم گرامی آتا ہے۔ بالخصوص اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے اور تکلفات سے گریز کا سبق مجھے مولانا ہزارویؒ سے ہی ملا ہے۔ البتہ

موقف کے اظہار میں سختی اور شدت کے باب میں ان کی پیروی نہ کر سکا کہ والد محترم مدظلہ شروع سے اس بات کی تلقین کرتے چلے آرہے ہیں کہ اپنے موقف اور نظریہ پر پوری دل جمعی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اس کے اظہار میں ہمیشہ نرمی سے کام لیا جائے اور الفاظ کے چناؤ اور انداز بیان میں ملائمت کا پہلو غالب رکھا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ عملی زندگی میں اس کے مثبت اثرات کا متعدّد بار تجربہ کر چکا ہوں۔

مولانا ہزارویؒ ایک سادہ منش اور وضع دار بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کے لیے جس وضع کو جوانی میں اختیار کیا، آخر وقت تک اسے نبھایا اور اس شان سے نبھایا کہ اس باب میں کوئی دوسرا ان کی پیروی نہ کر سکا۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی کی رکنیت کے دور میں بھی ان کا قیام دہلی دروازہ لاہور سے باہر جمعیۃ علماء اسلام کے دفتر میں ہوتا تھا جو بعد میں رنگ محل میں کرایہ کی ایک نئی بلڈنگ میں منتقل ہو گیا۔ وہ اکثر اوقات اپنے کپڑے خود دھویا کرتے تھے، انتہائی سادہ خوراک سے ان کی گذر اوقات ہوتی تھی۔ رنگ محل سے ریلوے اسٹیشن تک اکثر پیدل جایا کرتے تھے۔ ان کے ہاں لیڈرانہ رکھ رکھاؤ اور پروٹوکول کا کوئی تصور نہ تھا۔ جماعتی دوستوں اور کارکنوں کے ہاں کسی قسم کی ترجیحات کے بغیر بے تکلف چلے جایا کرتے تھے اور ان کی یہی ادا ان کے ساتھ اور ان کے حوالہ سے جماعت کے ساتھ کارکنوں کی محبت اور جوش وولولہ میں اضافہ کا باعث بن جاتی تھی۔

سیاست میں جماعت سازی سب سے مشکل فن اور انتہائی صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ بڑی بڑی قدآور سیاسی شخصیتیں اس گھاٹی میں اتر کر چوکڑی بھول جاتی ہیں۔ یہ فن مولانا ہزارویؒ کے پاس تھا اور فن کے ساتھ حوصلہ اور صبر کا ذخیرہ بھی ان کے پاس وافر مقدار میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لینے والی جماعت، جمعیۃ علماء اسلام کو قیام پاکستان کے آٹھ نو سال بعد جب دوبارہ منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس کٹھن کام کے لیے ارباب بصیرت کی نظر مولانا ہزارویؒ پر پڑی اور انہوں نے اس اعتماد کی لاج رکھتے ہوئے چند سالوں میں شبانہ روز محنت اور بے لوث جدوجہد کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام کو ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں میں لا کھڑا کیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام نے متحدہ پاکستان میں ووٹوں کے اعتبار سے تیسری پوزیشن حاصل کی تھی اور جمعیت کو قومی سیاست میں یہ مقام حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی بے لوث محنت اور حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی سیاسی بصیرت وفراست کی بدولت حاصل ہوا۔ جمعیۃ کی سیاسی اہمیت اور وجود کی گاڑی انہوں دو پہیوں پر منزل کی طرف رواں دواں تھی کہ حوادث زمانہ نے ان دو پہیوں کے درمیان توازن کو قائم نہ رہنے دیا اور جمعیۃ کی گاڑی پھر ایسی لڑکھڑاہٹ کا شکار ہوئی کہ اس کے

بعد بہت سے خوش کن مراحل سے گزرنے کے باوجود ۱۹۷۰ء کی پوزیشن پر واپس نہ جا سکی۔ جمعیۃ علماء اسلام آج بھی مسلسل لڑکھڑاہٹ کا شکار ہے، اسے نہ مولانا ہزارویؒ کا ایثار و حوصلہ مل رہا ہے اور نہ مولانا مفتی محمودؒ کی بصیرت و فراست حاصل ہو رہی ہے اور ہم جماعتی زندگی کو نئی اقدار سے روشناس کرانے کے شوق میں پرانی اور بابرکت وضع داری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین۔

مولانا ہزارویؒ دینی فتنوں کے تعاقب کا خصوصی ذوق اور ملکہ رکھتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت، علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کی علماء دشمنی اور مودودی صاحب مرحوم کی جدید دینی تعبیرات پر انہوں نے شدت کے ساتھ تنقید کی اور وہ علماء کرام کو مسلسل ان فتنوں کا تعاقب کرنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ مودودی صاحب تو ان کی بے لاگ تنقید کا آخر وقت تک نشانہ رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ پر تنقید و طعن کو مودودی صاحب نے جس طرح حقوق اور مشن میں شامل کر لیا تھا، مولانا ہزارویؒ جیسے باحمیت عالم دین کے لیے اسے گوارا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ لوگوں کی طرف سے زبان کی ترشی اور لہجہ کی تلخی کی شکایات والزامات کے باوجود مولانا ہزارویؒ آخر وقت تک اس محاذ پر پوری شدت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔

سیاسیات میں مولانا ہزارویؒ بنیادی طور پر ایک سامراج دشمن راہ نما تھے۔ انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ میں متحرک کردار ادا کیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ اس لیے عالمی اسٹیج پر برطانوی استعمار کے جانشین اور وارث امریکی استعمار کے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ ممکن ہی نہ تھا۔ استعمار دشمنی میں وہ اس قدر بے لچک تھے کہ امریکی استعمار کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے والے کسی بھی سیاسی لیڈر کے دیگر افکار و نظریات اور معاملات و معمولات کی طرف نظر ڈالنے کی انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان کی ترجیحات میں امریکہ دشمنی سب سے مقدم تھی اور وہ اس کے لیے باقی ہر معاملہ میں مصلحت کا پہلو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

اخلاق واقدار کی کساد بازاری کے اس دور میں سچی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا ہزارویؒ کی یاد بہت آتی ہے لیکن ایثار، دیانت، بے باکی، خلوص، جرأت، سادگی، حق گوئی اور جہد مسلسل کے ایسے پیکر اب کہاں!

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

(ماہنامہ الشریعہ۔ جون ۱۹۹۳ء)

(۲)

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مابین اختلافات کو میرے مطالعہ و مشاہدہ کی رو سے دو تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1. اول یہ کہ حضرت مولانا ہزارویؒ دوسری سیاسی پارٹیوں بالخصوص جماعت اسلامی کے ساتھ میل جول کو ایک حد سے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ جبکہ مولانا مفتی محمودؒ دینی و قومی مقاصد کے لیے دینی و سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ کے قیام کے ہر دور میں خواہاں رہے ہیں۔ اس کا آغاز ایوب خان مرحوم کے دور میں جمہوری مجلس عمل سے ہوا اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد تک پہنچا۔ اس دوران دوسری سیاسی و دینی جماعتوں کے ساتھ نصف درجن سے زیادہ مشترکہ فورم بنے جن میں سے بعض میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ بھی وقتی ضرورت سمجھ کر شریک ہوئے مگر یہ بات ایک مستقل پالیسی کے طور پر ان کے لیے قابل قبول نہیں تھی اس لیے وہ اس رخ پر زیادہ دیر تک ساتھ نہیں چل سکے۔

2. تنظیمی ماحول میں جب مشرقی پاکستان میں حضرت مولانا پیر محسن الدین احمدؒ کی سربراہی میں جمعیۃ علماء اسلام کے قیام کے بعد مرکزی سطح پر "کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام" تشکیل پائی تو اس کا ناظم عمومی حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو منتخب کیا گیا۔ جبکہ یہ حیثیت اس سے قبل جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان میں حضرت مولانا ہزارویؒ کو حاصل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ مرکزی نائب امیر تھے۔ ون یونٹ کے خاتمہ کے بعد مغربی پاکستان کی سطح پر جمعیۃ علماء اسلام کا وجود ختم ہو گیا اور وہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں تقسیم ہو گئی تو حضرت مولانا ہزارویؒ کی پوزیشن کل پاکستان جمعیۃ میں مولانا مفتی محمودؒ کے نائب کے طور پر ایک مرکزی ناظم کی بن گئی۔ چونکہ دونوں بزرگوں کے سیاسی مزاج اور ترجیحات میں ایک فرق موجود تھا جس کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا ہے تو عام جماعتی حلقوں میں اس فرق کے اثرات محسوس کیے جانے لگے۔

اسی تسلسل میں جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو جمعیۃ کے اندر یہ رجحان سامنے آیا کہ مفتی صاحبؒ کو جماعتی عہدہ چھوڑ دینا چاہیے جو انہوں نے مجلس شوریٰ کے ایک اجلاس کے بعد چھوڑ دیا اور حضرت مولانا ہزارویؒ کو مرکزی ناظم عمومی چن لیا گیا۔ اس پر جمعیۃ کے بعض اندرونی حلقوں میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا ہزارویؒ کے رجحانات میں فرق کی وجہ سے اس طرح جمعیۃ خلفشار کا شکار ہو جائے گی۔

چنانچہ مجلس عمومی کے اجلاس میں مفتی صاحبؒ کو دوبارہ ناظم عمومی بنا دیا گیا۔ میرے خیال میں یہ بات بھی باہمی بعد میں اضافہ کا باعث بنی اور پھر فاصلے بڑھتے چلے گئے۔

3. تیسرا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں وزارت اعلیٰ کے حوالہ سے جس طرح بات آگے بڑھی وہ بھی ان اختلافات میں توسیع کی وجہ بن گئی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جمعیۃ علماء اسلام نے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چند سیٹیں حاصل کیں مگر خان عبد الولی خان اور خان عبد القیوم خان کے مابین سیاسی اختلاف کی شدت کے ماحول میں وہ چار یا پانچ سیٹیں صوبائی حکومت کی تشکیل کے لیے بیلنس پاور اور بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ خان عبد القیوم خان کی مسلم لیگ اور خان عبد الولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی دونوں کی یکساں کوشش تھی کہ جمعیۃ علماء اسلام ان کا ساتھ دے تاکہ ان کی حکومت بن جائے یا کم از کم ان کی حریف پارٹی کی حکومت نہ بن سکے۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے خائف تھیں جس کی وجہ سے دونوں پارٹیاں ساتھ دینے کی صورت میں جمعیۃ کی ہر شرط ماننے کو تیار تھیں۔ اس کشمکش میں مفتی صاحبؒ کا رجحان واضح طور پر خان عبد الولی خان کی طرف تھا جبکہ مولانا ہزارویؒ خان عبد القیوم خان کے ساتھ کولیشن کے خواہاں تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کو شامل کر لیں کہ مفتی صاحبؒ کی پالیسی صوبہ میں حکومت بنانے اور مرکز میں بھٹو حکومت کے مقابلہ میں اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کی تھی۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ مرکز میں بھٹو حکومت کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے اور اپوزیشن بالخصوص جماعت اسلامی کے ساتھ کسی قسم کی کولیشن کے حق میں نہیں تھے۔ اس میں ایک اور بات کا اضافہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس وقت افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی عسکری مزاحمت منظم نہیں ہوئی تھی مگر اس کی شروعات ہو چکی تھی اور اس کے مسلسل آگے بڑھنے کے رجحانات نمایاں تھے۔ اس کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ کا رجحان بالکل واضح تھا کہ وہ اس مزاحمت کے حق میں تھے اور اسے شرعی جہاد سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ اس جہاد اور مزاحمت کو سپورٹ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اسے خطہ میں امریکی عزائم کی تکمیل میں معاونت تصور کرتے تھے۔ اس مسئلہ پر حضرت مولانا ہزارویؒ کے ساتھ میری طویل خط وکتابت ہوئی تھی جسکی میں نے ایک عرصہ تک تاریخی دستاویز سمجھ کر حفاظت کی مگر بدقسمتی سے گزشتہ تین چار سال سے تلاش بسیار اور بار بار تگ و دو کے باوجود اسکا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ خدا جانے وہ

اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟ فیا اسفاہ۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا ہزارویؒ کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع ہوتے ہوئے میں نے خود دیکھا مگر حضرت مولانا ہزارویؒ کی تمام تر محبت و عقیدت اور ادب و احترام کے باوجود میں اس معاملہ میں حضرت درخواستیؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خود میرے ذہنی رجحانات یہی تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے چند بزرگوں مثلاً حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کا ذہنی جھکاؤ بھی اسی طرف تھا۔

(ماہنامہ الشریعہ، اکتوبر ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا محمد زکریاؒ

یہ خبر پورے عالم اسلام کے لیے انتہائی صدمہ اور گہرے رنج و غم کا باعث بنی ہے کہ ملت اسلامیہ کے بزرگ رہنما، تبلیغ اسلام کی عالمی تحریک تبلیغی جماعت کے سرپرست اعلیٰ، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سابق شیخ الحدیث اور لاکھوں مسلمانوں کے روحانی پیشوا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ ۲۴ مئی کو مدینہ منورہ میں طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد زکریاؒ کا تعلق علماء کے اس عظیم خاندان سے تھا جس نے دنیائے اسلام کو بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی جیسی عظیم شخصیات کے علوم و فیوض سے بہرہ ور کیا۔ اس علمی خانوادہ نے ایک طویل عرصہ تک دین حق کی تبلیغ و اشاعت اور ترویج کے لیے ٹھوس اور نتیجہ خیز خدمات سرانجام دیں اور ان کی جدوجہد کے مثبت ثمرات و نتائج آج پورے عالم اسلام میں نمایاں طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔

مولانا محمد زکریاؒ نے ایک عرصہ تک مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے اور ہزاروں طلبہ کو "قال اللہ و قال رسول اللہ" کا درس دیا۔ مولانا مرحوم کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جو آج اپنے شفیق استاذ کی جدائی کے غم میں نڈھال دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ عربی اور اردو میں متعدّد وقیع کتابوں کے مصنف تھے جنہیں علمی و دینی حلقوں میں شاندار پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور تبلیغی نقطۂ نظر سے لکھے گئے چند اہم رسائل کے مجموعہ کو "تبلیغی نصاب" کے عنوان سے اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا وہ مقام بخشا کہ ماضی قریب میں شاید ہی کسی اور تصنیف کو یہ قبولیت حاصل ہوئی ہو۔ دنیا

کی کم و بیش ہر اہم زبان میں اس کتاب کے تراجم موجود ہیں اور عالم اسلام میں دعوت و تبلیغ سے تعلق رکھنے والا کوئی گھر، مرکز یا مسجد ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں تبلیغی نصاب موجود نہ ہو یا اس کا باقاعدہ درس نہ ہوتا ہو۔ اس مجموعۂ رسائل کو تبلیغ اسلام کی عالمی تحریک تبلیغی جماعت کے باقاعدہ نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا محمد زکریاؒ نے کچھ عرصہ قبل سہارنپور سے ہجرت کر کے دیار حبیب علی صاحبہا التحیۃ والسلام کو اپنا وطن بنا لیا اور آخر دم تک مدینہ منورہ میں ہی قیام پذیر رہے۔ ان کی تمام تر ہمدردیاں، تعاون اور خدمات تبلیغی جماعت کے لیے وقف تھیں اور انتہائی ضعف، علالت اور اعذار کے باوجود آخر دم تک اس تحریک کی عملی سرپرستی فرماتے رہے۔ اس علالت اور پیرانہ سالی میں افریقہ، پاکستان اور بھارت کے سفر، وہاں کئی کئی ہفتے قیام اور علماء و عوام سے ملاقاتیں اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہمت اور حوصلہ سے زیادہ اس مشن کے ساتھ ان کے قلبی لگاؤ کا مظہر ہے۔

مولانا زکریاؒ قافلہ ولی اللّٰہی اور کاروانِ علماء حق کے بزرگ ترین رہنما اور مربی تھے اور انہیں عوام کے علاوہ خواص اور اکابر علماء کے علمی و روحانی ملجاء و ماویٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ اکابر و اصاغر ان کی دعاؤں کو اپنے لیے سعادت اور نجات کا ذریعہ خیال کرتے اور بڑے بڑوں کو یہ تمنا ہوتی کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ان کے لیے اٹھیں، جب یہ ہاتھ اٹھتے تو ہر طرف سکون و انبساط کی لہر دوڑ جاتی اور پوری محفل روحانی کیف و لذت کے دائرے میں آجاتی۔ وہ بظاہر ایک درویش عالم دین اور منکسر المزاج بزرگ تھے لیکن عوام و خواص کے دلوں میں ان کی حکومت تھی۔ اور اس بات میں کوئی شبہ یا مبالغہ نہیں ہے کہ تحریک ولی اللّٰہی اور دعوت و تبلیغ سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والے دینی، علمی اور روحانی حلقوں کے دلوں کا بادشاہ دنیا سے اٹھ گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد زکریاؒ تو سعادت اور نیک بختی کی شاہراہ پر اپنا زندگی کا سفر مکمل کر کے ہم سے رخصت ہو گئے اور جنت البقیع میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قدموں میں جا بسے ہیں، لیکن عالم اسلام میں علمی، روحانی اور دینی اعتبار سے جو خلا چھوڑ گئے ہیں وہ کبھی پورا نہیں ہو گا۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ اہل علم و فضل ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔ اس لحاظ سے ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کو ہونے والے نقصان کی گہرائی و گیرائی میں ہوشربا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یقیناً یہ صدمہ عالم اسلام کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات بلند فرمائیں، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ہم سب کو ان کے نقش

قدم پر چلتے ہوئے دین حق کی مثبت اور مؤثر خدمات سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۲ء)

حضرت مولانا مفتی عبد المتینؒ

دینی، علمی اور جماعتی حلقوں کے لیے یہ خبر انتہائی صدمہ کا باعث ہوگی کہ آزاد کشمیر کے بزرگ اور مقتدر عالم دین حضرت مولانا مفتی عبد المتین صاحب (تاریخ وفات: ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۲ء) فاضل دیوبند طویل علالت کے بعد گزشتہ جمعہ کے روز راولپنڈی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب مرحوم آزاد کشمیر کے علاقہ تھب تحصیل باغ کے رہنے والے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے شاگرد اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ العالی کے ہم سبق تھے۔ متبحر عالم، نکتہ رس مفتی اور نیک دل بزرگ تھے۔ آزاد کشمیر میں سرکاری طور پر افتاء کا محکمہ قائم ہوا تو مفتی صاحب مرحوم اس سے منسلک ہو گئے اور ایک عرصہ تک ضلعی مفتی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

تحریک آزادئ کشمیر میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی رکھتے تھے اور مختلف مراحل میں آزادئ کشمیر کی جدوجہد میں عملاً شریک رہے۔ آزاد کشمیر کے قیام کے بعد وہاں کے علماء نے ریاست میں اسلامی قوانین کے اجراء ونفاذ کے لیے جو نتیجہ خیز جدوجہد کی، اس میں مرحوم پیش پیش رہے اور وہ بھی ان قائدین میں شامل تھے جن کی قیادت میں آزاد کشمیر میں رسوائے زمانہ عائلی قوانین کے خلاف جدوجہد کی گئی۔

مفتی صاحب مرحوم حضرت الشیخ مدنی نور اللہ مرقدہ کے تلمیذ ہونے کے ساتھ ان کے سیاسی افکار اور جدوجہد کے بھی امین تھے اور آزاد کشمیر میں جمعیۃ علماء آزاد کشمیر کی تشکیل وتنظیم میں اس جذبہ کے ساتھ تمام عمر سرگرم عمل رہے۔ سرکاری ملازمت کے دوران اور ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے اس جذبہ میں کسی دور میں بھی نرمی یا جھجک محسوس نہیں کی گئی اور بلاشبہ وہ ان گنے چنے بزرگوں میں شامل ہیں جن کی ذاتی توجہات اور شخصی اثرورسوخ کو جمعیۃ علماء آزاد کشمیر کی تنظیم وتشکیل میں بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے۔

راقم الحروف کو گزشتہ آٹھ دس برس سے آزاد کشمیر کے دینی وجماعتی اجتماعات میں مسلسل شرکت کی

سعادت حاصل ہوتی رہی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی صاحب مرحوم علالت، کمزوری اور مصروفیات کی پرواکیے بغیر جوانوں سے زیادہ حوصلہ کے ساتھ جماعتی کاموں میں حصہ لیتے رہے اور ان کا حوصلہ وعزم ہمارے جیسے نوجوانوں کے لیے بھی قابل رشک رہا۔

مولانا مفتی عبد المتین مرحوم آزاد کشمیر کے متعدّد دینی مدارس کی سرپرستی فرماتے تھے۔ راولاکوٹ، نعمان پورہ اور باغ کے مدارس کے ساتھ ان کا سرپرستی اور معاونت کا تعلق بار بار دیکھنے میں آتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے گاؤں تھب میں مدرسہ امداد الاسلام کے نام سے تعلیم قرآن کا ایک مدرسہ قائم کیا جس کی افتتاحی تقریب اور اس کے بعد سالانہ تقریبات میں مجھے بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوتی رہی ہے۔

مرحوم نے متعدّد شادیاں کیں مگر اولاد کی نعمت سے محروم رہے، لیکن ان کے بھائی عبد الحئ صاحب اعلیٰ سرکاری افسر ہونے کے باوجود دینی ذوق کے حامل ہیں اور ان سے بجاطور پر یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی دینی روایات بالخصوص ان کے قائم کردہ مدرسہ امداد الاسلام تھب کی بقاوترقی کے لیے موثر خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔

مفتی صاحب مرحوم کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ مختلف ہسپتالوں میں زیر علاج رہے۔ گزشتہ ماہ مظفر آباد میں جمعیۃ علماء آزاد کشمیر کے مرکزی کنونشن کے موقع پر مجھے سی ایم ایچ مظفر آباد میں ان کی خدمت میں حاضری اور عیادت کی سعادت حاصل ہوئی۔ علالت اور کمزوری کے باوجود حسب سابق تپاک سے ملے۔ جماعتی خلفشار اور بعض حضرات کے رویہ پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ حضرت درخواستی مدظلہ اور حضرت والد محترم مدظلہ کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ مظفر آباد سے انھیں راولپنڈی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لایا گیا جہاں وہ گزشتہ جمعہ کے روز خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ تھب میں ہفتہ کے روز آزاد کشمیر کے بزرگ عالم دین، جمعیۃ علماء آزاد کشمیر کے سربراہ اور مفتی صاحب مرحوم کے ہم سبق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خاں مدظلہ العالی نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں آزاد کشمیر کے سرکردہ علماء، جمعیۃ کے راہ نماؤں اور ہزاروں دیگر مسلمانوں نے شرکت کی اور نماز جنازہ کے بعد اشک بار آنکھوں کے ساتھ انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے سربراہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم، ناظم عمومی حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحب اور حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب مدظلہ نے اپنے تعزیتی پیغامات میں حضرت مولانا مفتی عبد المتین صاحب کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کی دینی وقومی

خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ خدام الدین لاہور)

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز (تاریخ وفات: ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء) کی زیارت میں نے طالب علمی کے دور میں پہلی بار کی۔ سن یاد نہیں لیکن اتنا ذہن میں ہے کہ انارکلی لاہور میں جلسہ عام تھا، میرا بچپن اور لڑکپن کا درمیان کا زمانہ تھا، والد محترم شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم جلسہ سننے کے لیے گوجرانوالہ سے لاہور گئے تو مجھے ساتھ لے گئے۔ انارکلی بازار میں بہت بڑا اجتماع تھا اور حضرت قاری صاحب نورّ اللہ مرقدہ نے اس سے خطاب فرمایا۔ خطاب کے مشتملات ذہن میں نہیں ہیں اور نہ ہی میں اس وقت عمر کے اس مرحلہ میں تھا کہ تقریر کے موضوع اور مواد کو ذہن میں محفوظ کر سکتا، البتہ حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ، جلسے کا ماحول اور اسٹیج کی بعض جھلکیاں اب بھی ذہن کی سکرین پر جھلملا رہی ہیں۔ اس کے بعد یاد نہیں کہ کتنی بار دیکھا اور کہاں کہاں زیارت سے فیض یاب ہوا، مگر دو مواقع کی یاد ذہن میں ایسے تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

میرا بیعت کا تعلق شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند و جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے تھا اور حضرت سے جماعتی تعلق بھی گہرا تھا کہ وہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے ذمہ دار راہ نماؤں میں سے تھے اور میں جمعیۃ کا اس دور میں فعال کارکن تھا۔ اس دوہرے تعلق کی وجہ سے شیرانوالہ لاہور میں اکثر آنا جانا رہتا تھا بلکہ زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ حضرت حکیم الاسلام جب بھی لاہور تشریف لاتے، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی خواہش اور کوشش ہوتی کہ وہ شیرانوالہ میں بھی جلوہ افروز ہوں اور کئی بار حضرت حکیم الاسلام تشریف بھی لائے۔ ایک موقع پر ایک مخصوص سی نشست میں حضرت حکیم الاسلام تشریف فرما ہوئے اور پاکستان کے معروف سیاستدان نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم بھی شریک مجلس تھے۔ نواب زادہ صاحب متحدہ ہندوستان کے دور میں آل انڈیا مجلس احرار الاسلام کے سیکرٹری جنرل رہے ہیں۔ علماء دیوبند سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ مسلکاً متصلب دیوبندی اور فرائض وواجبات کے پابند شب زندہ دار بزرگ تھے۔ اس محفل کی تیسری بڑی شخصیت حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی تھی جو میزبان تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، خطیب اسلام حضرت

مولانا محمد اجمل خانؒ بھی موجود تھے۔ ان بزرگوں کے درمیان دیوبند اور علماء دیوبند کے حوالہ سے جو گفتگو ہوئی اور جس انداز میں انہوں نے باہمی محبت کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کیں، اس کا منظر ابھی تک ذہن میں نقش ہے۔ یہ حضرات گفتگو فرما رہے تھے اور ہم ان کی باتوں کی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی زیارت کا ایک اور منظر جو ذہن میں ابھی تک تازہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے حوالہ سے ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی قیادت میں صد سالہ اجلاس میں جانے والے قافلہ میں میرا نام بھی شامل تھا، لیکن میں قافلہ کے ساتھ سفر نہ کر سکا تھا۔ قافلہ کی روانگی کے بعد دوسرے دن سفر کے لیے نکلا اور واہگہ سے سرحد کراس کر کے انبالہ، دہلی اور سہارنپور سے ہوتا ہوا جب دیوبند پہنچا تو صد سالہ اجلاس کی آخری نشست جاری تھی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز اختتامی خطاب فرما رہے تھے۔ عجیب منظر تھا، چاروں طرف لاکھوں مسلمانوں بلکہ علماء کرام کا ہجوم تھا اور حضرت قاری صاحبؒ صد سالہ اجلاس کی شاندار کامیابی پر سراپا تشکر بنے الوداعی کلمات ارشاد فرما رہے تھے۔

یہ تو چند مناظر وہ ہیں جو آنکھوں دیکھے ہیں اور جو میری زندگی کے بہترین لمحات میں سے ہیں۔ اس سے ہٹ کر غائبانہ ملاقاتوں اور حضرت قاری صاحب کی تحریرات وخطبات سے استفادہ کے مواقع کو شمار کرنا تو کجا میں اندازے سے بھی ان تصوراتی اور فکری ملاقاتوں کی تعداد بیان نہیں کر سکتا۔ میری ولادت تقسیم ہند سے ایک سال بعد کی ہے۔ اس لیے تقسیم ہند سے قبل ہمارے اکابر کے درمیان مختلف حوالوں سے تقسیم کے جو دائرے سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں، وہ میری ولادت سے پہلے کے ہیں، لیکن اس دور کے واقعات پڑھتا اور سنتا ہوں تو کبھی کبھی ذہن میں آتا ہے کہ اگر میں اس دور میں ہوتا تو اپنی ذہنی افتاد اور انداز فکر کے حوالے سے اسی کیمپ میں ہوتا جسے معروف معنوں میں "مدنی گروپ" کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے ہے، لیکن اس فکری وابستگی اور جانبداری کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نور اللہ مرقدہ اور ان کے رفقا کے بارے میں عقیدت، محبت، احترام، قلبی وابستگی اور استفادہ کے حوالہ سے دل کے کسی کونے میں کوئی ایسی بات بحمد اللہ تعالیٰ محسوس نہیں کرتا جسے فرق سے تعبیر کیا جا سکتا ہو اور بلاشبہ ان بزرگوں میں سے میری عقیدت و محبت کا سب سے بڑا مرکز حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی رہی ہے اور اس کی کچھ وجوہ ہیں جن کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔

سب سے پہلی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاندان سے ہیں اور ان کے پوتے ہیں۔ میں نسبتوں کے حوالے سے بہت خوش عقیدہ شخص ہوں اور نسبتوں کی برکات پر نہ صرف یقین رکھتا ہوں، بلکہ جب اور جہاں موقع ملے، ان سے استفادہ کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی دو عظیم شخصیات کو جنوبی ایشیا کی مسلم تاریخ میں ایک ایسے سنگم کی حیثیت حاصل ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم جنوبی ایشیا کا رشتہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے مسلم جنوبی ایشیا کے ساتھ برقرار رکھنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور یہ ان کی اجتہادی بصیرت اور مومنانہ فراست کا ثمرہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں ہر طرف نہ صرف قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں شب و روز گونج رہی ہیں، بلکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی مسلم تہذیب اور معاشرت کا عملی نمونہ پوری آب و تاب کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے اور مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب و ثقافت کی انتہائی طاقت ور اور طوفانی یلغار جنوبی ایشیا میں غلبہ پانے میں اگر کسی طبقہ اور ادارہ سے خوف اور رکاوٹ محسوس ہو رہی ہے تو وہ یہی مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا قافلہ ہے جو کفر و الحاد کی تہذیب کے سامنے سد سکندری بنا ہوا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کے ساتھ میری محبت و عقیدت کی دوسری بڑی وجہ دارالعلوم دیوبند اور اس قافلہ حق کے لیے ان کی طویل اور مسلسل خدمات ہیں جن میں کوئی دوسری شخصیت ان کی مثل نہیں ہے۔ ان کے طویل دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند نے جو ترقی کی اور وسعت و تنوع کے جن دائروں سے یہ ازہر ایشیا متعارف ہوا، وہ علمی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور نہ صرف خاندان قاسمیؒ بلکہ قافلہ رشیدؒ و قاسمؒ کے لیے باعث فخر و اعزاز ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم دادا کے ورثہ کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں بیش بہا اضافہ کرکے اسے تاریخ میں زندہ جاوید بنا دیا اور تاریخ کے اوراق میں جب بھی دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ ہوگا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔

حضرت قاری صاحب کے ساتھ میری عقیدت و محبت کی تیسری اور سب سے بڑی وجہ ان کا علمی مقام اور متکلّمانہ شان ہے۔ وہ علم کا پہاڑ اور معلومات کا سمندر تو تھے ہی، مگر اس علم کے اظہار اور ابلاغ کے لیے ان کا انداز و اسلوب ایسا حکیمانہ اور فطری تھا کہ ان کو سننے اور پڑھنے والا افادہ اور استفادہ کے اس سفر میں خود کو ان کے قدم بہ قدم چلتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ میں ایک طالب علم کے طور پر دیوبندی مکتب فکر میں تین بزرگوں کو سب سے بڑا متکلّم سمجھتا ہوں۔ (۱) حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، (۲) حضرت مولانا شبیر

احمد عثمانیؒ، (۳) حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ۔ مگر اس ترتیب کے ساتھ کہ حضرت نانوتویؒ اہل علم کی اوپر کی سطح کے لیے متکلّم تھے۔ اس سے نچلے درجہ کے اہل علم کے لیے بھی ان سے استفادہ آسان کام نہیں تھا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے علوم قاسمی کی قدرے تسہیل کر کے اس سے عام اہل علم کو استفادہ کا موقع فراہم کیا جبکہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے اس دائرے کو مزید وسعت دی اور عام اہل علم اور طلبہ کے ساتھ جدید پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ میں اس حوالے سے جنوبی ایشیا کے عوامی خطبا میں سے دو شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوں کہ مشکل سے مشکل علمی مسئلہ کو پبلک اجتماع میں ایسے سادہ اور فطری لہجے میں بیان کرتے تھے کہ سننے والوں میں سے شاید ہی کوئی استفادہ سے محروم رہتا ہو۔ ان میں پہلا نمبر حکیم الامت حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کا ہے جبکہ میرے مطالعہ ومشاہدہ کے مطابق اس فن کے دوسرے امام ہمارے پاکستان کے معروف احراری خطیب حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے۔ انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے اس فن سے نوازا تھا کہ مشکل ترین علمی مسئلہ کو عام فہم انداز میں اس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کر جاتے تھے کہ کسی ان پڑھ دیہاتی کو بھی اسے سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

علم کلام دین کے اہم ترین شعبوں میں سے ہے اور اسلامی عقائد واحکام کی تشریح ووضاحت کے لیے اپنے دور کے اسلوب بیان، اصطلاحات، زبان اور لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ہر شخص اور طبقہ کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرنا دین کا اہم تقاضا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسی ہتھیار کا کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے اپنے دور میں اسلامی عقائد کے خلاف مسیحیت اور آریہ سماج کے طوفانی حملوں کو ناکام بنایا تھا اور اپنے معاصرین میں اسلام کی برتری کے ساتھ ساتھ اپنی علمی وجاہت اور تفوق کا پرچم بلند کیا تھا۔ آج دین کی اہم ضروریات کا یہ پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے اور ہم آج کی دنیا میں اپنے ایک صدی پہلے کے علمی اسلوب اور اصطلاحات کے ذریعے دین سمجھانے کے درپے ہیں جس سے افہام وتفہیم کا ماحول بننے کی بجائے الجھاؤ اور کنفیوژن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت وتبلیغ اور دینی احکام وقوانین کی تشریح میں ان کے اسلوب کا احیا کیا جائے اور وقت کے تقاضوں، اسلوب، اصطلاحات اور نفسیات کا ادراک کرتے ہوئے پورے شعور وحکمت کے ساتھ آج کے دور میں اسلام کو درپیش فکری اور علمی چیلنجز کا سامنا کیا جائے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اپریل ۲۰۱۲ء)

حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ

(۱)

حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ بھی طویل علالت کے بعد چل بسے اور وہاں کا رختِ سفر باندھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ مفتی صاحبؒ کم وبیش دس برس سے فالج، ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے مریض تھے اور علالت کے طویل دور سے گزرتے ہوئے گزشتہ ہفتہ کو جناح میموریل ہسپتال گوجرانوالہ میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفتی صاحبؒ کا شمار برصغیر کے ان سرکردہ علماء میں ہوتا تھا جنہوں نے تحریکِ آزادی اور دیگر دینی وقومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انہوں نے جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد تحریک ختم نبوت میں سرگرم کردار ادا کیا۔ گوجرانوالہ شہر میں بازار حسن کے خاتمہ اور ''حج فلم'' پر پابندی کے لیے عوامی تحریکوں کی قیادت کی۔ بھٹو آمریت کے دور میں مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کو محکمہ اوقاف نے تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو اس کے خلاف تحریک مزاحمت آپ ہی کی قیادت میں چلی۔ پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود جواں ہمتی کے ساتھ انہوں نے تحریک کی کامیابی کے لیے جدوجہد فرمائی۔

جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل نو میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم کے ساتھ جس شخصیت نے سب سے زیادہ محنت، سرگرمی اور جفاکشی کے ساتھ شبانہ روز محنت کی وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت تھی۔ وہ علالت کی شدت کے دور تک جمعیۃ کے مرکزی ناظم کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

جماعتی مشن اور اکابر کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کا تعلق والہانہ تھا۔ آخر دم تک حضرت درخواستی مدظلہ العالی اور حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کرتے رہے اور دوستوں کو تلقین کرتے کہ وہ اکابر کا ساتھ دیں۔ حتیٰ کہ ان کی خواہش رہی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت درخواستی مدظلہ پڑھائیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منظور فرمالی اور حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم نے مفتی صاحبؒ کی خواہش کے مطابق ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مفتی صاحبؒ کی نماز جنازہ شیرانوالہ باغ کے وسیع میدان میں پڑھائی گئی جس میں ہزاروں لوگوں کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام پنجاب کے امیر مولانا غلام ربانی، صوبہ سندھ کے رہنما مولانا عبد الحق، شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر، حضرت

مولانا قاضی عبد القادر آف جھاوریاں، حضرت مولانا مفتی زین العابدین، حضرت مولانا قاضی شمس الدین اور دیگر سرکردہ اکابر نے شرکت کی۔ اور نماز جنازہ کے بعد قبرستان کلاں گوجرانوالہ میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مفتی صاحبؒ کی مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۳ء)

(۲)

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بیان کردہ یادداشتیں)

بعد الحمد والصلوٰۃ! آج کی نشست میں تذکرہ ہے حضرت مولانا مفتی عبد الواحد نور اللہ مرقدہ کا، ان کے تعارف اور تذکرہ سے پہلے کچھ پسِ منظر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ شہر کی قدیمی مساجد میں سے ہے، اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے یہاں ایک بزرگ ہوا کرتے تھے مولانا سراج الدین احمد جو کہ بڑے عالم اور فقیہ تھے، انہیں فقیہِ پنجاب کہا جاتا تھا۔ مسجد کے عقب میں بازار تھانے والا کی گلی مولوی سراج دین اور مسجد مولوی سراج دین ان ہی کے نام پر ہیں اور وہ مسجد شہر کی جامع مسجد ہوا کرتی تھی۔ اس وقت شہر دروازوں کے اندر ہوتا تھا۔ سیالکوٹی دروازہ، لاہوری دروازہ، ایمن آبادی دروازہ، گرجاکھی دروازہ، شیخوپورہ دروازہ، وغیرہ۔ وہاں مولانا سراج الدین احمد خطیب ہوا کرتے تھے، اس درجے کے عالم تھے کہ انہوں نے ہدایہ کا فارسی میں "سراج الہدایہ" کے نام سے ترجمہ کیا تھا جو شائع نہیں ہوا مگر پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود بتایا جاتا ہے۔ ان کے زمانے میں یہ مسجد تنگ پڑ گئی تو لوگوں نے مشورہ کیا کہ باہر کشادہ مسجد بناتے ہیں۔ جس جگہ اب مرکزی مسجد شیرانوالہ باغ ہے، یہاں اس وقت کھلا میدان ہوتا تھا۔ یہ مسجد اس کھلے میدان میں اس وقت کے شہر کی حدود سے باہر بنائی گئی تھی تاکہ لوگ جمعہ وعید کی نماز بآسانی ادا کر سکیں۔

۱۳۰۱ ہجری میں یہ مسجد بنی تھی۔ دو بھائی شیخ صاحب دین اور شیخ نبی بخش جو کہ چمڑے کے تاجر تھے، انہوں نے یہ مسجد بنوائی۔ مسجد کے سنگِ بنیاد کے پتھر پر، جو مسجد کے بڑے ہال کے درمیان والے دروازے پر نصب ہے، مولانا سراج الدین کا نام، ان دونوں بھائیوں کے نام اور تاریخ درج ہیں۔ جبکہ راولپنڈی کی راجہ بازار کے قریب واقع مرکزی جامع مسجد بھی انہی دونوں بھائیوں نے بنوائی تھی، دونوں

مسجدیں ایک ہی نمونے اور ایک ہی سائز پر بنوائی گئیں۔ راولپنڈی والی مسجد میں صاحبزادہ فیض علی فیضی صاحب خطیب تھے جو کہ دھونکل کے رہنے والے تھے اور بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ میرا کئی دفعہ ان کے پاس جانا ہوا، دھونکل کے قریب ان کے والد صاحب پیر محمد بڈھا نقشبندیؒ کا دربار بھی ہے۔ جبکہ گوجرانوالہ کی جامع مسجد جب بنی تو مولوی سراج الدین احمد اس کے خطیب تھے۔

مولانا سراج الدین احمد کے بعد ان کے بیٹے مولانا نذیر حسین مرحوم اس مسجد کے خطیب بنے۔ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ کی بات ہے جب امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہوا جس میں انگریزوں نے باغ کا گھیراؤ کر کے جلسہ گاہ میں فائرنگ کی اور بے شمار لوگوں کو شہید کر دیا تھا۔ یہ مشہور سانحہ ہے، اس پر جیسے ہندوستان کے بہت سے دیگر علاقوں میں بغاوت ہوئی اسی طرح گوجرانوالہ شہر میں بھی بغاوت ہوئی اور لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ یہاں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مارشل لاء لگایا گیا جسے لوگوں نے توڑ دیا اور پھر برطانوی شاہی ایئر فورس کو بمباری کرنا پڑی۔ کالج روڈ اور گوندلانوالہ روڈ پر بمباری کے بعد شہر کو کنٹرول کیا گیا۔ اس صورتحال میں انگریز کے خلاف لوگوں کے دلوں میں شدید نفرت پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں علماء نے فیصلہ کیا کہ پورے ملک میں انگریزوں کے دیے ہوئے اعزازات، تمغے، شیلڈز واپس کریں گے۔ چنانچہ ترکِ موالات کے نام سے بائیکاٹ کی تحریک چلی، پانچ سو علماء نے کراچی میں فتوٰی دیا کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے اور ان کے دیے ہوئے اعزازات واپس کیے جائیں۔ مولانا مفتی عبد الواحدؒ سے میں نے یہ سنا ہے کہ مولانا نذیر حسین مرحوم کو شہر میں برطانوی حکومت کی طرف سے آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات دیے گئے تھے، انگریز کے زمانے میں نمایاں شخصیات کو اس طرح کے اختیارات دے دیے جاتے تھے۔ مولانا نذیر حسین صاحب بھی وجیہ اور باوقار آدمی تھے اور شہر کے بااثر لوگوں میں سے تھے لیکن جب اکثر لوگوں نے اعزازات واپس کر دیے اور مولانا نذیر حسین صاحب سے بھی ایسا کرنے کا مطالبہ ہوا تو انہوں نے اعزازات واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مسجد کے نمازیوں اور مولانا صاحب کا تنازعہ ہو گیا۔ شہر کے معززین اور مسجد کی انتظامیہ کا تقاضا یہ تھا کہ مولوی صاحب یہ اختیار واپس کریں لیکن مولوی صاحب اڑ گئے اور اعزاز واپس نہیں کیا بلکہ مسجد چھوڑ دی۔ یہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا، ان کا معاملہ اللہ تعالٰی کے سپرد۔ یہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔

مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ چونکہ صرف شہر کی نہیں بلکہ پورے علاقے کی بڑی مرکزی مسجد تھی، اہم فیصلے یہاں ہوا کرتے تھے، مولانا نذیر حسین صاحب بڑے عالم تھے، چنانچہ اب مسجد کی انتظامیہ کو ان کی سطح کے خطیب کی تلاش تھی۔ اس دوران محدثِ پنجاب حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ جو کہ راولپنڈی

اور اٹک کے درمیان سہال کے رہنے والے تھے، فاضلِ دیوبند تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد تھے، حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے ساتھیوں میں سے تھے اور اس درجہ کے عالم تھے کہ اگر اس علاقے سے کوئی دارالعلوم دیوبند پڑھنے جاتا تو علامہ کاشمیریؒ اس سے فرماتے کہ آپ کے علاقے میں مولانا عبدالعزیز صاحب موجودہ ہیں پھر آپ میرے پاس کیا کرنے آئے ہو؟ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ ان کا مرتبہ کیا تھا۔ بہت بڑے محدث تھے، ان کی بخاری شریف پر معروف علمی کتاب ہے "النبراس الساری علٰی اطراف البخاری" اور "نصب الرایہ علٰی احادیث الہدایہ" پر ان کا حاشیہ بھی ہے۔ بڑی علمی شخصیت تھی، آپؒ سکول ملازمت کے سلسلے میں گوجرانوالہ آئے تھے، عطاء محمد اسلامیہ ہائی سکول میں ٹیچر تھے اور چوک نیائیں میں مسجد عائشہ کے سامنے ایک اونچی مسجد ہے جو کہ اب اہلحدیث حضرات کے پاس ہے، وہ اس مسجد کے امام وخطیب تھے۔ بطور عالم ان کی خاصی شہرت تھی، تو مولانا عبدالعزیز صاحب سے لوگوں نے کہا کہ جب تک کوئی خطیب نہیں ملتا آپ یہاں جمعہ پڑھا دیا کریں، انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ دو تین جمعے پڑھائے تو لوگوں نے سوچا کہ کسی اور کو تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس طرح مولانا عبدالعزیزؒ مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں خطیب مقرر ہوئے۔

مرکزی مسجد کے ساتھ جو مدرسہ انوار العلوم ہے یہ مولانا عبدالعزیزؒ نے ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ یہ شہر کا سب سے قدیمی مدرسہ ہے جس کے افتتاح کے لیے حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ تشریف لائے تھے، وہ دیوبند سے کشمیر جاتے ہوئے تقریباً ہر سال یہاں آتے تھے اور مولانا عبدالعزیز صاحب کے پاس ایک آدھ دن کا قیام فرماتے تھے۔ اس مدرسے کو بڑے اعزازات حاصل ہیں۔ ہمارا اس مدرسے سے بڑا قدیمی تعلق ہے، ہمارے والدِ محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ، دونوں اس مدرسے کے طلباء میں سے ہیں۔ دونوں بھائی ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء یہاں پڑھتے رہے پھر یہیں سے وہ دیوبند گئے اور واپس آکر والدِ محترمؒ اسی مدرسہ میں مدرس ہوئے تھے۔ جب گکھڑ والوں نے امام مانگا تو یہیں سے والد صاحبؒ کو گکھڑ بھیجا گیا تھا، ۱۹۴۳ء میں گکھڑ گئے جہاں وہ ۲۰۰۹ء تک دینی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ والدِ محترمؒ مولانا مفتی عبدالواحدؒ اور مولانا عبدالقدیر کیمل پوریؒ کے شاگرد ہیں اور اس دور کی بڑی یادیں سناتے تھے۔ مولانا عبدالعزیزؒ بڑے عالم فاضل آدمی تھے، مطالعہ وتحقیق ان کا مشغلہ تھا۔ "العدل" کے نام سے ایک رسالہ بھی شروع کیا تھا، ان کا زیادہ تر مباحثہ اہل حدیث حضرات کے ساتھ ہوتا تھا۔ امرتسر میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ چوٹی کے اہل حدیث عالم تھے، ان کا مجلہ "اہل حدیث" شائع ہوتا تھا۔ امرتسر اور گوجرانوالہ کے درمیان تقریباً پچپن میل کا فاصلہ ہے۔ دونوں حضرات کا

اپنے اپنے رسالوں میں مناظرہ رہتا تھا اور ویسے بھی آپس میں مناظرے چلتے تھے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان ایک حدیث کے متن اور سند پر تحریری مناظرہ ہوا جس پر علامہ سید سلیمان ندویؒ حکم بنے، انہوں نے فیصلہ دیا تھا کہ مولانا عبدالعزیز صاحب کا موقف درست ہے۔

یہ میں نے مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کا مختصر پس منظر ذکر کیا ہے جو حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ سے میں نے مختلف اوقات میں سن رکھا ہے۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ حضرت مولانا عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے اور حضرت علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ علامہ کاشمیریؒ کا جب دیوبند والوں سے بعض امور پر اختلاف ہوا تو وہ دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل گجرات (انڈیا) چلے گئے تھے جہاں دارالعلوم اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور حضرت علامہ صاحبؒ نے وہاں پڑھانا شروع کیا۔ مولانا مفتی عبدالواحدؒ نے ڈابھیل میں علامہ صاحبؒ سے دورۂ حدیث کیا اور پھر گوجرانوالہ اپنے چچا محترم کی معاونت کے لیے ان کے پاس آگئے۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ مولانا عبدالعزیزؒ فالج کے حملے کی وجہ سے بیمار ہوئے تو ان کی جگہ مولانا مفتی عبدالواحد نے سنبھالی جو نہ صرف ایک عالم فاضل آدمی تھے بلکہ غضب کے سیاستدان بھی تھے۔ ۱۹۴۴ء میں مولانا عبدالعزیزؒ بالکل معذور ہو گئے اور آخری عمر میں اپنے گاؤں سہال منتقل ہو گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں تدفین بھی۔

مولانا عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد ان کی جگہ ان کے بھتیجے مولانا مفتی عبدالواحد صاحبؒ مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کے خطیب مقرر ہوئے اور اس کے ساتھ ملحق مدرسہ انوار العلوم کے مہتمم بھی۔ حضرت مفتی عبدالواحدؒ اپنے وقت کے بڑے عالم اور استاد العلماء تھے۔ وہ حضرت والد صاحبؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کے استاد بھی تھے۔ میں نے حضرت والد صاحبؒ کو جن بزرگوں کا سب سے زیادہ احترام کرتے دیکھا ہے ان میں ایک حضرت مفتی عبدالواحدؒ بھی ہیں۔ ہم ان کے جوتے سیدھے کرتے تھے اور ان کی خدمت کرتے تھے۔ ہمیں جب بھی کوئی الجھن والا مسئلہ پیش آتا تو سب سے پہلے مفتی صاحبؒ سے مشورہ کرتے۔ میں بچپن میں کئی مرتبہ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ان کے پاس آیا ہوں، حضرت مولانا عبدالعزیزؒ کی لائبریری بہت اچھی تھی، اس میں بڑی نایاب اور علمی کتب تھیں جس سے ان کے مطالعہ کے عمدہ ذوق کا پتہ چلتا تھا، حضرت مفتی عبدالواحدؒ بھی صاحبِ مطالعہ بزرگ تھے۔

میں اس بات کا شاہد ہوں کہ حضرت مولانا عبدالواحدؒ بڑے ذہین اور نکتہ رس مفتی تھے۔ میں نے اتنا مستغنی مفتی کوئی نہیں دیکھا کہ لوگ مسئلہ لاتے تھے، ایک نظر اسے دیکھتے اور قلم اٹھا کر دو جملوں میں اس کا جواب لکھ دیتے۔ عام طور پر تو مفتی صاحبان کتابوں کی کتابیں دیکھتے ہیں تب کہیں جا کر فتویٰ دیتے ہیں۔

میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کو کبھی کتاب دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا، مشکل سے مشکل مسئلے کا تین چار جملوں میں جواب لکھ دیتے تھے اور کمال کا جواب لکھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ آنے والے کو دلائل کی ضرورت نہیں، مسئلے کی ضرورت ہے اس لیے صرف مسئلہ بتانا چاہیے، ہاں کوئی عالم آئے تو اس کو دلائل بتاؤ۔ عام آدمی کو کیا پتہ کہ صحیح حدیث کیا ہوتی ہے، ضعیف کیا ہوتی ہے، عام مخصوص منہ البعض کیا ہوتا ہے اور عام مطلق کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ صرف مسئلے کا جواب تین چار سطروں میں لکھتے تھے۔ اور میں جس زمانے میں ان کے ساتھ ہوتا تھا تو مسئلہ لکھ کر بندے کو میرے دفتر میں بھیجتے تھے کہ جا کر زاہد سے مہر لگوا کر لاؤ۔

مجھے تقریباً بارہ سال مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی خدمت و نیابت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ تقسیم ملک سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کے بڑے رہنماؤں میں سے تھے اور پنجاب کے بڑے قائدین میں سے تھے۔ مفتی صاحبؒ جمعیۃ میں بھی تھے، کانگریس میں بھی اور احرار کے ساتھ بھی تھے۔ جمعیۃ اور کانگریس کے ضلعی صدر رہے۔ جب جمعیۃ علماء اسلام قائم ہوئی تو قیام پاکستان کے بعد مفتی صاحبؒ اس کے مرکزی ناظم تھے۔ یعنی حضرت مفتی صاحبؒ سیاسی و تحریکی دنیا کے سرگرم بزرگ تھے، پاکستان بننے سے پہلے بھی اور پاکستان بننے کے بعد بھی۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی ختم نبوت تحریکات میں انہوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ البتہ ۱۹۸۴ء کی تحریک سے پہلے مفتی صاحبؒ ۱۹۸۲ء میں وفات پا چکے تھے۔

مفتی صاحبؒ پورے علاقے کے علماء کا مرجع تھے۔ کوئی مسئلہ، کوئی الجھن پیش آتی تو سبھی مکاتب فکر کے علماء مفتی صاحبؒ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ میں نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اہلحدیث، بریلوی، دیوبندی اور شیعہ علماء شہر کے بڑے مسائل پر رہنمائی کے لیے مفتی صاحبؒ کے پاس آیا کرتے تھے۔ میں نے تین بڑے علماء کی ذاتی دوستی دیکھی ہے اور میں ان کا پیغام رساں رہا ہوں۔ مولانا اسماعیل سلفیؒ، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہؒ اور مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی مثالی دوستی تھی، انہیں بلانے یا پیغام پہنچانے کے لیے مفتی صاحبؒ مجھے ہی بھیجا کرتے تھے۔ سب مکاتب فکر کے لوگ یہاں آیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں مرکزی مسجد تحریکات کا مرکز بھی تھی اور دینی راہنمائی کا مرکز بھی۔

میں نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ مسجد قاسم علی خان پشاور اب جو کردار ادا کر رہی ہے، گوجرانوالہ کی یہ جامع مسجد سو سال تک کرتی رہی ہے۔ بڑے بڑے معرکے ہوتے تھے۔ رمضان و عیدین کے مواقع پر گواہ آ رہے ہیں، شہادتیں آ رہی ہیں، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ سبھی شریک ہیں، فیصلہ مفتی صاحبؒ نے کرنا ہوتا تھا۔ رات ایک دو بجے تک بیٹھتے اور فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ نافذ ہوتا تھا۔ ایک زمانے

میں تمام علاقے میں ان کو یہ حیثیت حاصل تھی۔ البتہ سرکاری طور پر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے قیام کے بعد خود حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا اور فرماتے تھے کہ اب یہ ذمہ داری کمیٹی کی ہے، ہم اسی کے فیصلے پر عمل کریں گے۔

مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ جب سے بنی ہے شہر کی تحریکات کا مرکز رہی ہے۔ اور الحمد للہ اب تک یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اب بھی شہر کا کوئی اہم دینی مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہم بلاتے ہیں اور سب مکاتب فکر کے لوگ آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بریلوی حضرات میں مسلکی حوالے سے ایک سخت مزاج بزرگ مولانا ابوداؤد محمد صادق گزرے ہیں، جامع مسجد کی میٹنگوں میں وہ بھی آتے تھے، ان کے ساتھ مل کر ہم نے جلوسوں کی قیادت کی ہے۔ یہ مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی برکات ہیں کہ کوئی دینی تحریک ہو، شہر کا کوئی مسئلہ ہو، کوئی قومی مسئلہ ہو، ہمارے بلانے پر سب آتے ہیں۔ اور جب مرکزی مسجد کی مشترکہ میٹنگ ہوتی ہے تو انتظامیہ کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ مسجد کے محراب سے آگے سامان وغیرہ کے لیے ایک کمرہ ہوتا تھا جو کہ توسیع کے بعد اب مسجد کے ہال میں شامل ہو گیا ہے۔ میرے ابتدائی دور میں سی آئی ڈی کے ایک دوست کہنے لگے کہ جب محراب والے پچھلے کمرے کا دروازہ میٹنگ کے لیے کھلتا ہے تو ہم مشورے شروع کر دیتے ہیں کہ شہر میں کچھ ہونے والا ہے۔

پھر ایک وقت آیا کہ مولانا مفتی عبدالواحدؒ کا شمار تبلیغی جماعت کے اکابر میں ہوتا تھا۔ وہ تبلیغی جماعت کے شوریٰ کے حضرات میں سے تھے اور جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی شوریٰ میں بھی تھے۔ یعنی ان کے پاس اس وقت سیاسی تحریکات کی سم بھی تھی اور تبلیغی سم بھی، اور دونوں ایکٹو تھیں۔ جمعیۃ میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ، ان سب اکابر کے مشوروں کا مرکز مولانا مفتی صاحبؒ ہوتے تھے جس کی وجہ ان کی خداداد ذہانت اور معاملہ فہمی تھی۔

میرا ذوق شروع سے جماعتی و تحریکی رہا ہے۔ الحمد للہ میں طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کے کارکنوں میں شامل تھا۔ ایک دفعہ مرکزی جامع مسجد میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی تقریر تھی، مولانا بڑے شعلہ بیان اور شعلہ نوا مقررین میں سے تھے، ہم بھی سننے کے لیے آئے۔ مفتی صاحبؒ نے ہم دو چار ساتھیوں سے فرمایا کہ پولیس نے مولانا کی گرفتاری کے لیے گھیرا ڈالا ہوا ہے، ہم نے انہیں گرفتاری سے بچانا ہے، اور ایسے طریقے سے نکالنا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ یہ کام انہوں نے ہمارے ذمے لگا دیا۔ بازار میں ایک بزرگ بابا یسین مرحوم چائے کی دوکان کرتے تھے۔ بڑی اچھی نعت پڑھا کرتے تھے،

ان کا قد اور شکل و شباہت حضرت ہزارویؒ سے ملتی تھی۔ ہم نے بابا یسین کو اعتماد میں لے کر مولانا ہزارویؒ کو گرفتاری سے بچانے کا طریقہ کار طے کیا۔ پلاننگ کے مطابق جب حضرت ہزارویؒ کی تقریر ختم ہوئی تو بابا یسین سر پر پگڑی باندھے اور چادر اوڑھے تین چار طالب علموں کے ساتھ مولانا ہزاروی زندہ باد، شیر سرحد زندہ باد، مجاہد اسلام زندہ باد کے نعروں کے ساتھ مسجد کے مرکزی دروازے سے باہر نکلے۔ اس پر ساری پولیس کی توجہ ادھر ہوگئی۔ ہم نے سمجھا رکھا تھا کہ دروازے سے کچھ دور تک بابا جی کو لے کر جانا ہے۔ دوسری طرف ہم نے مولانا ہزارویؒ کو سائیکل پر بٹھا کر مفتی صاحبؒ کے گھر پہنچا دیا۔ ادھر بابا جی یسین جب گلی کے نکڑ تک پہنچے تو پولیس نے انہیں گھیر لیا۔ وہ بولے کیا بات ہے؟ پولیس نے کہا کہ گرفتار کرنا ہے۔ کہنے لگے میں بابا یسین ہوں چائے والا۔ تھانہ چونکہ ساتھ ہی ہے تو انہوں نے پہچان لیا کہ یہ تو بابا یسین ہے۔ اس طرح ہم مولانا ہزاروی کو نکالنے میں کامیاب رہے۔ تحریکی دور میں اس طرح کے کام ہم کر لیا کرتے تھے۔

تحریکات میں تو مفتی صاحبؒ امام تھے اور بڑے بے نیاز انداز کے بزرگ تھے۔ شہری معاملات کے سلسلے میں ڈی سی کی میٹنگ میں جایا کرتے تھے، اب میں ان کی جگہ جایا کرتا ہوں۔ ایک دفعہ حضرت مفتی صاحبؒ نے ڈی سی سے کہا کہ یوں نہ کریں ورنہ فساد ہو جائے گا۔ اس نے کہا مولوی صاحب! دیکھ لیں گے۔ مولانا وہاں سے چلے آئے اور اپنے علماء کو سمجھایا کہ کوئی جھگڑا نہیں کرنا بلکہ یہ محنت کرو کہ دس محرم کے دن کوئی بھی جلوس دیکھنے نہ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بس جلوس ہی تھا لیکن اسے دیکھنے والے نہیں تھے۔ سب سٹپٹا گئے کہ یہ کیا ہوا آدمی کدھر گئے ہیں، وہ جلوس جو چھ گھنٹے میں ختم ہوتا تھا اس دن ڈیڑھ گھنٹے میں نمٹ گیا۔ اب ڈی سی نے سوچا کہ میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا دیکھ لیں گے، یہ تو مولوی صاحب نے دیکھ لیا ہے۔ مفتی صاحبؒ کے بارے میں ضلعی انتظامیہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ بندہ جب کسی کام پر آ جاتا ہے تو پھر اس کام کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے، ان کو شہر میں یہ حیثیت حاصل تھی۔

مجھے الحمد للہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارنے کا موقع ملا ہے۔ ہوا یوں کہ مفتی صاحبؒ وقتاً فوقتاً تبلیغی جماعت کے ساتھ چالیس دن، چار ماہ لگانے کے لیے نکل جاتے تھے اور یہاں جمعہ پڑھانے کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ چونکہ مرکزی مسجد تھی اس لیے لوگوں کی شکایت تھی کہ جمعہ کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ اس زمانے میں اندرون شہر تقریریں کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا، ایک دفعہ مفتی صاحب موجود نہیں تھے تو جامع مسجد والوں نے مجھے جمعہ پڑھانے کے لیے بلایا۔ میں نے جمعہ پڑھایا۔ مفتی صاحبؒ کی اپنی اولاد نہیں تھی، نہ بیٹا نہ بیٹی۔ بھتیجے تھے لیکن آپس میں خاندانی صلح نہیں تھی۔

لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آپ اپنی عدم موجودگی میں زاہد صاحب کو نائب مقرر کر دیں، مفتی صاحبؒ نے یہ بات منظور کر لی، اس طرح میرا کام بن گیا۔

درمیان میں ایک لطیفے کی بات عرض کرتا ہوں کہ کچھ سال پہلے ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے استاد جی! امامت کے لیے جگہ چاہیے جو شہر میں ہو، بڑی مسجد ہو، رہائش بھی ساتھ ہو۔ میں نے کہا کہ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ شہر میں کوئی خطیب صاحب فوت ہو جائیں اور انہوں نے کوئی بیٹا، بھتیجا، بھانجا اپنے بعد کے لیے تیار نہ کیا ہو، تبھی کوئی امکان ہے ورنہ نہیں۔ میرا داؤ اس لیے لگ گیا تھا کہ مفتی صاحبؒ کی اپنی اولاد تھی نہیں جبکہ بھائیوں اور بھتیجوں سے صلح نہیں تھی۔

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے، میں اس وقت موقوف علیہ میں تھا، مولانا مفتی عبد الواحدؒ مدرسہ نصرۃ العلوم میں تشریف لائے اور حضرت والد صاحبؒ سے کہا کہ مولوی صاحب! اللہ پاک نے آپ کو بہت بیٹے دیے ہیں، میرا بیٹا نہیں ہے، آپ ایک مجھے دے دیں۔ ہم الحمد للہ نو بھائی تھے، ایک فوت ہو گیا ہے، آٹھ اب بھی ہیں۔ والد محترمؒ نے فرمایا جو مرضی ہے لے جائیں سبھی آپ کے ہیں۔ مفتی صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا زاہد! شام کو بستر لے کر مرکزی مسجد آجانا۔ میں شام کو بستر اٹھا کر وہاں چلا گیا، اس طرح مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں میری تقرری ہوئی۔ تب سے الحمد للہ وہیں ہوں، سینتالیس سال ہو گئے ہیں، اس دوران بڑے اتار چڑھاؤ بھی آئے ہیں۔ گزشتہ سال رہائش کی تبدیلی کی وجہ سے اب وہاں صرف جمعہ پڑھاتا ہوں اور ہفتے کے دوران بھی ایک دو بار حاضری کا موقع مل جاتا ہے۔ میں نے بارہ سال مفتی صاحبؒ کے ساتھ خدمت و نیابت کے طور پر گزارے ہیں۔ تحریکی، جماعتی اور مسلکی زندگی میں ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپؒ سمجھاتے بھی تھے، رہنمائی بھی کرتے تھے، ڈانٹتے بھی تھے، سرپرستی بھی کرتے تھے، حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور کسی مشکل میں ہوتا تو پشت پر دیوار بن کر کھڑے بھی ہوتے تھے۔ آج کل اگر پشت پناہی ہے تو سمجھانا نہیں ہے، سمجھانا ہے تو پشت پناہی نہیں ہے۔ میں نے ایک مربی کے طور پر جتنا مکمل ان کو پایا ہے کسی اور کو نہیں پایا۔

تحریک مسجد نور کا قصہ آپ کو سناتا ہوں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران ایک بہت بڑا دو روزہ قومی اجتماع کیا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار کے قریب علماء آئے تھے۔ اجتماع میں مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے پبلک شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس پر پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نے انتقاماً مسجد نور اور مدرسہ نصرۃ العلوم کو محکمہ اوقاف کے قبضے میں لینے کا اعلان کر دیا۔ مفتی عبد الواحدؒ نے شہر کے ایک متحرک طالب علم لیڈر نوید

انور نوید، مولانا سید عبد المالک شاہؒ، صوفی رستم علی قادری، ڈاکٹر غلام محمد اور مجھے بلا کر فرمایا کہ بات سنو، ہم نے گورنمنٹ کو مسجد کا قبضہ نہیں دینا اور یہ لڑائی تم نے لڑنی ہے۔ ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے لڑیں گے اور ہم نے الحمدللہ مولانا کی سرپرستی اور پشت پناہی میں وہ لڑائی لڑی۔ چار پانچ ماہ تک یہ تحریک چلی اس دوران ہم نے شہر کی سڑکوں پر اودھم مچائے رکھا اور حکومت کو قبضہ نہیں لینے دیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو بالآخر اپنا وہ نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا، اس تحریک کی ایک الگ داستان ہے۔

میں اپنی اس دور کی ''وارداتوں'' میں سے چند کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ میری رہائش ۱۹۸۰ء تک گکھڑ میں رہی ہے۔ میں اس زمانے میں جمعہ پڑھانے کے لیے گکھڑ سے آیا کرتا تھا، تقریباً دس سال میں نے گکھڑ سے گوجرانوالہ آکر صبح کی نماز کے بعد درس دیا ہے۔ ہم اذان سے پہلے اٹھتے تھے، والدہ مرحومہ ناشتہ کرایا کرتی تھیں، اذان کے بعد بس پر بیٹھ کر گوندلانوالہ چوک تک آتا وہاں سے دوڑ لگا کر مسجد تک پہنچتا، نماز میں شریک ہوتا اور اس کے بعد درس دیتا تھا اور پھر مدرسہ انوار العلوم کے اسباق ہوتے تھے۔ مسجد نور کی تحریک کے دوران تقریباً تین ماہ تک یہ کیفیت رہی کہ پولیس والے مسجد کو گھیرا ڈال لیتے تھے کہ مولوی صاحب کو پکڑنا ہے۔ میں پولیس کے گھیرے میں سے گزر کر مسجد میں داخل ہوتا تھا اور جمعہ پڑھا کر باہر نکل جاتا تھا۔ تین ماہ تک یہ آنکھ مچولی چلتی رہی۔ میاں عبد الرشید صاحب یہاں کے اے سی تھے، بعد میں اوقاف پنجاب کے سیکرٹری رہے ہیں۔ چند سال کے بعد ایک وفد کے ساتھ ان کے پاس جانا ہوا تو کہنے لگے آپ کی بات بعد میں سنوں گا، پہلے یہ بتائیں کہ تین مہینے ہم نے انتہائی کوشش کی لیکن آپ کو نہ پکڑ سکے، آپ نکلتے کیسے تھے؟ ہم تو عصر تک چاروں طرف مسجد کا محاصرہ رکھتے تھے۔ میں نے کہا اپنے داؤ نہیں بتایا کرتے پھر بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

تحریکوں میں کام جاری رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ذمہ دار حضرات گرفتاری سے بچیں۔ تین مہینے یہ کیفیت رہی لیکن تقدیر تو تقدیر ہوتی ہے کہ جب گرفتاری ہوئی تو کیسے ہوئی۔ چونکہ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ میں نے، ڈاکٹر غلام محمد مرحوم اور صوفی رستم علی قادری نے گرفتاری نہیں دینی، لیکن جب گرفتاری مقدر تھی تو یہ ہوا کہ ایک رات میں گکھڑ میں تھا، صبح سحری کے وقت اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ بعض معاملات پر مشورے کے لیے۔ میں مغرب کے بعد گھر پہنچا اور چھوٹے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم و مغفور سے کہا کہ میں آج رات گھر میں ہوں، صبح سحری کے وقت نکلنا ہے، میرے متعلق کسی کو بتانا نہیں۔ پولیس میری گرفتاری کے لیے سرگرم تھی۔ میں بھائی کو یہ سمجھا رہا تھا کہ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عام عادت ہوتی ہے کہ گھنٹی بجے تو آدمی دروازے پر جاتا ہے۔ بے خیالی میں

دروازہ کھول کر باہر نکلا تو آگے ڈی ایس پی حشمت صاحب کھڑے تھے۔ بولے ارے مولوی صاحب! آپ کدھر ہوتے ہیں ہمارا تو آپ نے کچومر نکال دیا ہے۔ میں نے کہا میں ذرا اندر سے چادر لے آؤں۔ کہنے لگے نہیں چادر ہم منگوا لیں گے، آپ تشریف لائیں ہمارے ساتھ چلیں۔ اس طرح میں پکڑا گیا۔

شیرانوالہ باغ کے چھوٹے دروازے سے اندر آئیں تو سامنے مسجد کا گیٹ ہے اور گلی میں لاہوری دروازے کی طرف مفتی عبدالواحد صاحبؒ کا چھوٹا سا سلور کی تار بنانے کا کارخانہ تھا جس کے اوپر رہائش تھی۔ مولانا علی احمد جامیؒ کھیالی کے ہمارے دوست تھے، وہ اور میں شیرانوالہ باغ کے بڑے گیٹ سے اندر آئے مسجد میں جانے کے لیے تو پولیس کی ایک گاڑی باغ میں داخل ہوئی۔ میں نے کہا جامی صاحب! یہ گاڑی میرے لیے آئی ہے، کہنے لگے چھوڑو یار آپ کو ہر وقت اپنی ہی فکر رہتی ہے۔ گاڑی باغ میں موجود بارہ دری کی عمارت کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی، ہمیں نظر نہیں آرہی تھی۔ جب ہم کچھ آگے بڑھے تو گاڑی سامنے کھڑی تھی، اللہ کی قدرت کہ جو بندہ مجھے پہنچانتا تھا وہ گاڑی میں ہی رہا باہر نہیں آیا جبکہ انسپکٹر مجھے جانتا نہیں تھا۔ وہ ہماری طرف آیا، ہم باغ کے چھوٹے گیٹ تک پہنچ چکے تھے، آکر کہنے لگا مولوی صاحب کدھر ہیں؟ میں نے کہا بڑے مولوی صاحب؟ اس کے نزدیک تو میں ہی بڑا مولوی صاحب تھا اور وہ مجھے ہی پکڑنے آیا تھا۔ کہنے لگا ہاں بڑے مولوی صاحب۔ مفتی صاحبؒ تب حیات تھے، میں نے کہا وہ سامنے ان کا کارخانہ ہے ادھر جا کر دیکھ لو، وہاں بیٹھے ہوں گے۔ وہ ادھر ہوا تو میں چھوٹی گلی میں ہو کر نکل گیا۔ جب تک انہیں معاملے کا پتہ چلا میں کہیں اور پہنچ چکا تھا۔

یہ مولانا عبدالواحد صاحبؒ کے حوالے سے چند باتیں میں نے ذکر کی ہیں۔ بڑے عالم، بڑے بزرگ، بڑے مشفق اور ہمارے استادِ محترم تھے۔ اللہ پاک نے ان سے بہت خدمت لی ہے۔ جامع مسجد شیرانوالہ باغ اور مدرسہ انوار العلوم بلکہ ہم بھی ان کی یادگار ہیں۔ اور یہ ان کا ہی فیض ہے کہ الحمد للہ نصف صدی کے قریب مجھے بھی جامع مسجد کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اللہ پاک ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں ان کی حسنات اور نیکیاں جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

(۲۲ اگست ۲۰۱۶ء)

(۳)

میرے مخدوم و محترم بزرگ استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ پرانے اور بزرگ علماء کرام میں سے تھے، گوجرانوالہ کی قدیم مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ کے خطیب اور مدرسہ انوار العلوم کے

مہتمم تھے۔ والد بزرگوار حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے استاذ گرامی تھے اور میں نے والد محترمؒ کو ان کا بے حد احترام کرتے ہوئے اور ان سے مختلف امور میں ہمیشہ راہنمائی حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے بحمد اللہ تعالیٰ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء تک مسلسل تیرہ سال مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کی خطابت میں ان کی نیابت و خدمت کا شرف حاصل رہا ہے اور ان کی وفات کے بعد سے اب تک یہ ذمہ داری سرانجام دے رہا ہوں۔ وہ تقسیم ہند سے قبل جمعیۃ العلماء ہند کے سرگرم راہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، اس دور میں جمعیۃ کے ضلعی صدر بلکہ ایک مرحلہ میں کانگریس کے ضلعی صدر بھی رہے۔ سیاسی، علمی اور فقہی معاملات میں ان کی رائے کو ہمارے ہاں ہمیشہ سند اور دلیل کا درجہ حاصل رہا ہے۔ رؤیت ہلال اور دینی و سیاسی تحریکات کے معاملہ میں ان کے دور میں مرکزی جامع مسجد (شیرانوالہ باغ) گوجرانوالہ کو پورے علاقے میں وہی مقام حاصل تھا جو پشاور میں مسجد قاسم علی خان کو حاصل ہے، بلکہ وہ مسجد قاسم علی خان کے سابق خطیب حضرت مولانا مفتی عبد القیوم پوپلزئیؒ کے دوستوں میں سے بھی تھے۔

میرے سامنے کی بات ہے کہ گوجرانوالہ میں ایک انتہائی نیک دل پولیس افسر سٹی انسپکٹر کے طور پر تعینات ہوئے، وہ دیندار اور خدا ترس آدمی تھے، علماء کرام کے ساتھ زیادہ میل جول رہتا تھا، پکے نمازی تھے اور اپنے عملہ کو بھی پابند رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر تجویز پیش کی کہ وہ شہر میں نمازوں کے لیے ایک ہی وقت مقرر کرانا چاہتے ہیں تاکہ اذان اور نماز ایک وقت میں ہوں اور نماز کے لیے بازار بند ہو جایا کریں۔ اکثر لوگوں نے ان کے اس جذبہ کو سراہا اور ان کی حمایت کی مگر مولانا مفتی عبد الواحدؒ نے اس سے اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ جمعہ کی نماز کے علاوہ کسی اور نماز کے لیے بازار بند کرانا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ اور یہ لوگوں کو خواہ مخواہ حرج میں ڈالنے والی بات ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نمازوں کے اوقات میں گھنٹوں کی گنجائش دی ہے کہ اس دوران کسی وقت بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے تو اس گنجائش کو محدود کر کے لوگوں کو ایک ہی وقت میں نماز ادا کرنے پر مجبور کرنا شریعت کا تقاضہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے علاقہ یعنی شیرانوالہ باغ اور بازار تھانے والا کے اردگرد مساجد میں نمازوں کے اوقات میں باہمی مشورہ کے ساتھ فرق رکھا ہوا ہے کہ دکاندار حضرات باری باری کسی نہ کسی مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کر لیں۔ میری ذاتی رائے انسپکٹر صاحب کے حق میں تھی لیکن چونکہ میں سرکاری اجلاسوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کی نمائندگی کرتا تھا اس لیے انہوں نے مجھے پابند کیا کہ اگر کسی اجلاس میں یہ بات آئی تو تم نے اس کی مخالفت کرنی ہے اور ان کو سمجھانا ہے کہ ایسا کرنا نہ تو شرعاً ضروری ہے اور نہ ہی حکمت کا تقاضہ ہے۔ مفتی صاحبؒ کی بات میں وزن تھا اس لیے انسپکٹر صاحب کو بات جلد سمجھ آگئی اور کسی اجلاس اور فیصلے

کی نوبت نہ آئی۔

رؤیت ہلال کے بارے میں صورتحال یہ تھی کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ اسی طرح رؤیت ہلال کی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی جیسا کہ پشاور کی مسجد قاسم علی خان ابھی تک اپنی روایت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ رمضان المبارک اور عیدین کا چاند دیکھنے کے لیے شیرانوالہ باغ کی مسجد میں علماء کرام جمع ہو جایا کرتے تھے اور تمام مکاتب فکر دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث حتیٰ کہ شیعہ علماء بھی وہیں رجوع کرتے تھے۔ رات گئے تک شہادتوں کا انتظار رہتا تھا، گواہ لائے جاتے تھے، ان سے شہادت سنی جاتی تھی، ردو جرح ہوتی تھی اور اکثر اوقات سحری کے لگ بھگ فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ پورے علاقہ میں جامع مسجد کے فیصلے کا انتظار کیا جاتا تھا، فون کے ذریعہ بھی رابطہ کیا جاتا تھا لیکن فون کی سہولت کم ہوتی تھی اس لیے بہت سے علاقوں کے لوگ خود جامع مسجد میں آکر بیٹھ جاتے تھے کہ فیصلہ سن کر واپس جائیں گے۔ حضرت والد گرامی مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ گکھڑ میں رہتے تھے مگر مسلسل رابطہ رکھتے تھے اور کوئی فیصلہ کرنے سے قبل دریافت کرتے تھے کہ جامع مسجد میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟

رؤیت ہلال کی شب مرکزی جامع مسجد میں علماء کرام کی سرگرمیاں اور گہما گہمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر جب حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسے اکابر کی مساعی سے حکومتی سطح پر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی قائم ہوئی تو ہمارے ان دونوں بزرگوں یعنی مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے رؤیت ہلال کے سلسلہ میں قدیم سے چلا آنے والا یہ اہتمام یکسر ترک کر دیا۔ اس سے اگلے سال میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے دریافت کیا کہ رؤیت ہلال کے اہتمام کے لیے علماء میں سے کس کس کو بلانا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے، اب یہ ذمہ داری مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی ہے، وہ جو اعلان کریں گے اسی کے مطابق ہم عمل کریں گے، یہی بات حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے فرمائی۔ تب سے اسی پر ہمارے ہاں مسلسل عمل چلا آرہا ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور، ۴ جون ۲۰۱۶ء)

(۴)

میں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبد الواحد قدس اللہ سرہ العزیز کے معاون اور نائب کے طور پر ذمہ داریاں ۱۹۶۹ء میں سنبھالی تھیں، لیکن اس سے قبل بھی ان کی غیر موجودگی میں جامع مسجد میں جمعہ پڑھانے کا متعدّد بار اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ یہاں میں نے اپنے عمومی ماحول سے ایک مختلف بات یہ دیکھی کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر خطیب کے سامنے لاؤڈ اسپیکر پر نہیں دی جاتی،

بلکہ مسجد کی حدود سے باہر امام کے سامنے حوض پر کھڑے ہو کر بغیر لاوڈ اسپیکر کے دی جاتی ہے۔ جبکہ گکھڑ میں حضرت والد محترمؒ اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت صوفی صاحبؒ کا معمول یہ تھا کہ مؤذن جمعہ کی اذان ثانی لاوڈ اسپیکر پر امام صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر دیتا تھا۔ مجھے اس پر الجھن ہوئی تو میں نے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ سے دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک جمعہ کی اذان ثانی مسجد کی حدود سے باہر دینا بہتر ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔ مسجد کے صحن کے آخر میں جو حوض ہے، وہ مسجد کا حصہ نہیں ہے، اس لیے ہم اعتکاف کرنے والوں کو وہاں تک جانے سے منع کرتے ہیں اور ہمارا مؤذن جمعہ کی اذان ثانی حوض پر امام کے سامنے کھڑے ہو کر دیتا ہے۔ میں نے اس کے بعد مزید اس مسئلہ کی کرید کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے کہ اس قسم کے جزوی اور فروعی مسائل میں میرا ذوق اور معمول یہ ہے کہ جہاں کسی ذمہ دار بزرگ کے فتویٰ پر عمل ہو رہا ہو، میں وہاں اسی پر عمل کرتا ہوں اور ماحول کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ ہمارے اکابر میں سے تھے، والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے استاذ تھے اور میں نے کئی بار حضرت والد محترمؒ کو بعض مسائل میں ان سے رجوع کرتے دیکھ رکھا تھا، اس لیے میں بھی کم و بیش بیالیس سال سے ان کے فتویٰ پر عمل کرتا آ رہا ہوں اور اب بھی اس پر کسی نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اس کا پس منظر کافی عرصہ کے بعد اس وقت میرے علم میں آیا جب حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ العالی کی کتاب "مطالعہ بریلویت" سامنے آئی جس میں انہوں نے اس مسئلے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ فتویٰ دراصل مولانا احمد رضا خان کا تھا کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر نہیں بلکہ مسجد کی حدود سے باہر ہونی چاہیے۔ اس مسئلہ پر مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کا اپنے بہت سے معاصر علماء کرام سے تحریری مباحثہ بھی ہوتا رہا اور ان کے معاصر علماء کرام نے، جن میں دیوبندی اور بریلوی دونوں شامل ہیں، ان کے اس فتویٰ سے اتفاق نہیں کیا تھا مگر ہمارے ہاں مرکزی جامع گوجرانوالہ میں جمعہ کی اذان ثانی مسجد کی حدود سے باہر حوض پر دیے جانے کا انہی کی رائے کے مطابق معمول چلا آ رہا ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ نومبر ۲۰۱۱ء)

(۵)

اب سے ربع صدی پہلے کی بات کہ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد شہر کا تبلیغی مرکز ہوا کرتی تھی۔ حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جامع مسجد کے خطیب تھے اور مجھے انہوں نے نائب

کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ ہمارے ملک کے بڑے علماء میں سے تھے، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے اور میرے والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے استاذ محترم تھے۔ وہ تبلیغی جماعت کے ملکی سطح پر ذمہ دار حضرات میں شمار ہوتے تھے اور جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے بھی آخر وقت تک مرکزی ناظم رہے۔ ان کا شمار تبلیغی جماعت اور جمعیۃ علماء اسلام پاکستان دونوں کی ہائی کمان میں ہوتا تھا۔ تبلیغی جماعت کا شب جمعہ کا اجتماع مرکزی جامع مسجد میں ہوا کرتا تھا اور ہمارے ایک محترم بزرگ مرزا محمد یعقوبؒ شب جمعہ کو اکثر بیان کیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی حضرت مولانا محمد احمد بہاول پوری کی طرح موج میں آکر رات کو بیان میں فرمادیا کرتے تھے کہ بزرگو دوستو! دین کا کام تو اب دعوت ہی کے راستے سے ہوگا، جلسوں سے کچھ نہیں ہوگا، جلوسوں سے کچھ نہیں ہوگا، ووٹوں سے کچھ نہیں ہوگا اور تحریکوں سے کچھ نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اگلے روز مجھے اسی مسجد میں جمعہ پڑھانا ہوتا تھا، جبکہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ گذشتہ ایک صدی سے دینی تحریکات کا مرکز چلی آرہی ہے۔ تحریک آزادی، تحریک ختم نبوت، تحریک نفاذ اسلام، تحریک بحالی مسجد نور، تحریک نظام مصطفیٰ اور اس جیسی درجنوں تحریکات میں جامع مسجد بیس کیمپ رہی ہے۔

مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کی ایک روایت چلی آرہی ہے کہ جب بھی دینی حوالے سے کوئی مسئلہ پیش آتا ہے، جامع مسجد میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام جمع ہوکر اس کے بارے میں مشترکہ لائحہ عمل طے کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق تحریک منظم ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں شب جمعہ کے اجتماع میں مرزا محمد یعقوب صاحب مرحوم کا اس قسم کا کوئی بیان میرے لیے مسئلہ بن جاتا تھا اور میں اگلے روز دینی تحریکات کی اہمیت، جلوسوں جلسوں کی ضرورت اور دیگر متعلقہ امور پر خطبہ جمعہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتا۔ متعدّد بار ایسا ہوا کہ جس رات مرزا صاحب مرحوم

> ”جلسوں سے کچھ نہیں ہوگا، جلوسوں سے کچھ نہیں ہوگا، تحریکوں سے کچھ نہیں ہوگا اور جیلوں میں جانے سے کچھ نہیں ہوگا“

کی گردان پڑھتے، میں اگلے روز جمعہ کے اجتماع میں

> ”دین کے لیے جلسہ کرنا بھی ثواب ہے، جلوسوں کا اہتمام بھی ثواب کی بات ہے، جیل میں جانا بھی ثواب ہے اور تحریک چلانا بھی ثواب کا کام ہے“

کی گردان دہرا دیتا۔ اس سے اچھا خاصا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ مرزا صاحب مرحوم اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور میرے لیے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے تحریکی کردار سے دست بردار ہونا ممکن نہیں

تھا۔ چنانچہ کچھ دوستوں کی شکایت پر حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحبؒ نے ہم دونوں کو طلب کر لیا اور ہمارا موقف سن کر جہاں مرزا صاحب مرحوم سے یہ کہا کہ وہ اس قسم کی باتیں بیان میں نہ کہا کریں، وہاں مجھ سے بھی فرمایا کہ میں جواب میں جلدی اور تیزی نہ دکھایا کروں۔ لیکن اس کے بعد یہ معاملہ اس طرح جلدی ٹھپ ہو گیا کہ تبلیغی جماعت کے حضرات نے اپنا مرکز اور شب جمعہ کا اجتماع مرکزی جامع مسجد سے مکی مسجد ڈیوڑھا پھاٹک میں منتقل کر لیا اور اس کے بعد قلعہ چند بائی پاس کے قریب اپنا نیا اور وسیع مرکز تعمیر کر لیا جہاں اب بحمد اللہ خوب کام ہو رہا ہے۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب اور شمس العلماء حضرت مولانا شمس الحق افغانی قدس اللہ سرہما کی جدائی کا غم ابھی مندمل نہیں ہو پایا تھا کہ علمی دنیا کو ایک اور محقق عالم، وسیع المطالعہ مصنف اور نکتہ رس خطیب کی مفارقت کا غم بھی اٹھانا پڑ گیا ہے۔ یہ شخصیت حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ کی ہے جن کے بارے میں گزشتہ روز اخبارات میں غیر نمایاں طور پر ایک کالمی خبر شائع ہوئی ہے کہ ان کا ملتان میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجون۔

نجمہ محبوب اور وحید مراد کی موت اور آخری تقریبات کے ایک ایک لمحہ کی تفصیلات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرنے والے اخبارات کے نزدیک اس خبر کی اہمیت یقیناً اتنی نہیں ہوگی۔ لیکن علم و تحقیق، جذبہ و خلوص اور ایمان و معرفت سے تعلق رکھنے والی دنیا کے لیے مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ کی وفات جس قدر صدمہ اور علمی و دینی نقصان کا باعث ہے اس کا اندازہ دینی و علمی شعور سے بہرہ ور افراد ہی کر سکتے ہیں۔

مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زبان و قلم اور ذہانت و فراست کی دولت سے مالا مال کیا تھا اور انہوں نے ان خداداد صلاحیتوں کے عملی مظاہرہ کے لیے جس میدان کا انتخاب کیا وہ بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آتا ہے۔ مرحوم نے مذہب اہل سنت کی ترویج و اشاعت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت و ناموس کے تحفظ و دفاع کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور پھر زبان و قلم دونوں ہتھیاروں کے ساتھ اس میدان میں عمر بھر سینہ سپر رہے۔ ان کی خطابت آج کے معیار پر اگرچہ پوری نہ اترتی تھی کہ آواز، لے اور تھرکنے کے فن سے نا آشنا تھے۔ مگر معلومات کی وسعت، نکتہ رسی اور تحقیق و تجزیہ کے اعتبار

سے ان کی تقریر فن خطابت و تکلم کا شاہ پارہ ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے مرحوم کو جوانی کے زمانہ میں تبلیغی اجتماعات اور مدارس کے سالانہ جلسوں میں سنا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مرحوم صحابہؓ دشمنی کے نوکیلے تیروں کو تحقیق و تجزیہ کی مضبوط ڈھال پر روک کر جب نکتوں کے جوابی تیروں کی بارش کرتے تھے تو صحابہؓ دشمنی کی صفوں میں کیسی کھلبلی مچ جایا کرتی تھی۔ مولانا سید نور الحسن شاہ صاحب بخاریؒ نے دفاع صحابہؓ کے مقدس مشن میں جہاں زبان کی قوت کو بے دریغ استعمال کیا وہاں قلم کی بھرپور صلاحیتیں بھی اس میدان میں صرف کر دیں۔ ان کی ضخیم علمی و تحقیقی کتابیں اور مختلف جرائد میں ان کے مضامین و مقالات ان کے زور بیان اور قلم کی کاٹ پر شاہد عدل ہیں۔

مولانا مرحوم کی زندگی کے اہم کارناموں میں مذہب اہل سنت کی تقریر و تصنیفی خدمات کے علاوہ تنظیم ”اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان“ کا قیام و تنظیم بھی ہے۔ انہوں نے حضرت علامہ دوست محمد صاحب قریشی نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا عبد الستار تونسوی کے ساتھ مل کر رفض و بدعت کی روک تھام اور اہل سنت کی بیداری کے لیے تنظیم اہل السنۃ کے پلیٹ فارم پر جو شبانہ روز محنت کی ہے وہ پاکستان کی دینی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مگر افسوس کہ آج تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ بھی حضرت مولانا عبد الستار تونسوی مدظلہ العالی کی شخصیت کا نام ہی رہ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھیں اور اپنے مرحوم رفقاء کے مشن کی تکمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ آج ہم سے رخصت ہوئے ہیں اور اپنے خلوص و للّٰہیت، علم و فضل اور جہد و عمل کی انمٹ روایات چھوڑ گئے ہیں، وہ روایات ہی ان کا اصل ورثہ ہیں اور اس ورثہ کا تحفظ بعد والوں پر ان کا سب سے بڑا حق ہے۔ مشاہیر کی موت پر رسماً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی موت ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارے کی موت ہے لیکن مولانا سید نور الحسن بخاریؒ نے تحقیق و تصنیف کی دنیا میں تنہا جتنا کام کیا ہے اور جس استقامت و حوصلہ کے ساتھ کیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات حقیقتاً صادق آتی ہے کہ ان کی موت فی الواقع ایک فرد کی نہیں بلکہ ادارے کی موت ہے۔

حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ صاحب درخواستی، قائد جمعیۃ حضرت مولانا عبید اللہ انور اور جمعیۃ کے دیگر راہنماؤں مولانا محمد اجمل خان صاحب، علامہ خالد محمود، مولانا غلام ربانی، مولانا محمد رمضان اور راقم الحروف نے مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی موت کو علمی و دینی حلقوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے اور دعا کی ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان، رفقاء اور متوسلین کو صبر جمیل کی ارزانی فرمائیں، آمین

یارب العالمین۔ ادارہ ہفت روزہ ترجمان اسلام اس صدمہ جانکاہ میں حضرت العلام مولانا عبد الستار تونسوی، تنظیم اہل السنۃ کے جملہ ارکان اور مرحوم کے تلامذہ، رفقاء اور اہل خاندان کے غم میں شریک ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ نومبر ۱۹۸۳ء۔ جلد ۲۷ شمارہ ۳ و ۴)

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بیان کردہ یادداشتیں)

آج کی نشست میں شیخ العلماء حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ (۲۷/اپریل ۱۹۸۵ء) کے حوالے سے چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ مولانا عبید اللہ انورؒ میرے شیخ تھے اور امیر بھی۔ میں نے ایک طویل عرصہ ان کے ساتھ ایک خادم، مرید اور ساتھی کے طور پر گزارا ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درمیانے بیٹے تھے۔

حضرت لاہوریؒ کے بڑے بیٹے حضرت مولانا حافظ حبیب اللہؒ فاضل دیوبند تھے، ان کی زیارت میں نہیں کر سکا کہ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ "مہاجر مکی" کہلاتے تھے، وہیں زندگی گزاری اور ان کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ حضرت لاہوریؒ کے دوسرے بیٹے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ تھے۔ جبکہ حضرت لاہوریؒ کے تیسرے بیٹے حضرت مولانا حافظ حمید اللہ تھے، ان کی شیرانوالہ، لاہور میں متعدّد بار زیارت کر چکا ہوں۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا خاندان گکھڑ منڈی کے قریب مشرق کی جانب چند میل کے فاصلے پر واقع گاؤں جلال سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت لاہوریؒ کے والد محترم سکھ مذہب سے مسلمان ہوئے تھے اور اللہ رب العزت نے ان کو یہ مقام عطا فرمایا کہ ان کے بیٹے مولانا احمد علی لاہوریؒ کا شمار برصغیر کے چوٹی کے علماء اور اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خاندان کے ساتھ میرا پہلا تعلق یہ تھا کہ وہ ہمارے علاقے کے تھے۔ اور دوسرا تعلق یہ تھا کہ حضرت لاہوریؒ نے قرآن کریم کی تعلیم جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ میں ایک بزرگ حضرت باواجی عبد الحقؒ سے حاصل کی جو تقریباً پچاس سال جامع مسجد کے امام رہے۔ حضرت باواجی عبد الحقؒ بھی ایک نومسلم تھے۔ مجھے اس مسجد میں گزشتہ چار عشروں سے خطیب کے طور پر خدمت سرانجام دینے کی سعادت حاصل ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اپنے والد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے جانشین تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا تھا اور انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ بلکہ حضرت لاہوریؒ نے ان کا نام حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے ناموں پر رکھا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کو ان دونوں بزرگوں سے نسبت تھی جس کی برکت سے وہ بڑے عالم، فلسفی اور ولی اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے۔ حضرت لاہوریؒ نے انہیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اپنے والد کی مسند پر بیٹھ کر انہوں نے ساری زندگی انہی کے اعمال کا سلسلہ قائم رکھا۔ قرآن کریم کا درس، دورۂ تفسیر، ذکر اذکار اور خانقاہ قادریہ کا جو معمول حضرت لاہوریؒ سے چلا آ رہا تھا مولانا عبید اللہ انورؒ کی وفات تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور اب بھی بحمد اللہ تعالیٰ جاری ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اپنی تندرستی کے زمانہ میں ملک کے مختلف علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ گوجرانوالہ اور گکھڑ میں بھی بہت دفعہ آئے۔ لاہور کے گرد و نواح کے علاقے گوجرانوالہ، سیالکوٹ، قصور، شیخوپورہ وغیرہ حضرت لاہوریؒ کے فیض یافتہ ہیں۔ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی جامع مسجد نور کا سنگ بنیاد بھی حضرت لاہوریؒ نے رکھا تھا۔ اسی تسلسل میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ بھی سفر کرتے تھے اور اپنے عقیدت مندوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ مولانا عبید اللہ انورؒ بہت سادہ منش بزرگ تھے، میں نے ان کو سائیکل پر سفر کرتے بھی دیکھا ہے اور تانگے پر بھی، بسوں پر بھی سفر کرتے دیکھا ہے اور پیدل چلتے بھی دیکھا ہے۔ یہ میرا بالکل بچپن کا زمانہ تھا اور حضرت بالکل جوان تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ تقسیم پاکستان سے پہلے جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان کے امیر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ پنجاب کے امیر بنے اور آخر وقت تک جمعیۃ علماء اسلام صوبہ پنجاب کے امیر رہے۔ میرا حضرت سے ایک تعلق یہ تھا کہ وہ جمعیۃ کے امیر تھے اور میں ایک کارکن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی خوبیوں سے نوازا تھا اور بڑے جری آدمی تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و فلسفہ پر چند متخصصین تھے ان میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ بھی تھے۔ انہوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے استفادہ کیا تھا۔ شیرانوالہ، لاہور ان کا ٹھکانہ تھا اور وہی ان کی جماعتی و تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ ایک مرتبہ سیاسی سرگرمیوں میں زخمی ہو گئے، ان کی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچا تھا۔ اس کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے کیونکہ سفر مشکل ہو گیا تھا، دیر تک سیدھا بیٹھنا اور بالکل سیدھا لیٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے آخری دور میں ان کے خلاف

تحریکیں چلیں، اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء اسلام نے بھی ایک جلوس کا اہتمام کیا۔ یہ غالباً ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ حضرتؒ جمعہ شیرانوالہ لاہور میں پڑھاتے تھے لیکن جمعۃ الوداع کی نماز باغ (جواب ایک چھوٹا سا باغیچہ رہ گیا ہے) میں پڑھائی۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر جمعیۃ علماء اسلام نے صدر ایوب خان کے خلاف تحریک کے سلسلہ میں جلوس نکالنے کا اعلان کیا جس کی قیادت مولانا عبید اللہ انورؒ نے کرنی تھی۔ یہ جلوس جب نکلا تو پولیس نے گھیراؤ کرکے لاٹھی چارج کیا جس میں حضرتؒ کی پشت پر ایک لاٹھی لگی۔ اس کے نتیجہ میں ریڑھ کی ہڈی کا ایک مہرہ ہل گیا جس نے باقی ماندہ زندگی بہت تکلیف دی۔ چنانچہ حضرتؒ نے باقی زندگی اس کیفیت میں گزاری کہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتے تھے اور جمعرات کو مرکز تشریف لاتے تھے۔ کبھی ہم بہت مجبور کرتے تو جمعیۃ کی کسی مجلس میں آجاتے لیکن زیادہ گوشہ نشینی میں رہتے۔ اس حوالہ سے لوگ انہیں "امام غائب" کہا کرتے تھے لیکن اس کی وجہ یہی تھی کہ کمر کے مسئلہ کی وجہ سے وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے اس لیے زیادہ تر آرام فرماتے تھے۔ لیکن جن حضرات کو حضرتؒ کے معمولات کا علم تھا انہیں حضرتؒ سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ہمارا حضرت سے ایک تعلق تھا، بہت اعتماد کرتے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ رات کو سوتے نہیں تھے بلکہ تلاوت، ذکر اذکار یا مطالعہ میں گزارتے تھے۔

میں نے چند بزرگ ایسے دیکھے ہیں جن کا مستقل معمول یہ تھا کہ وہ رات کو نہیں سوتے تھے۔ ایک مولانا عبید اللہ انورؒ، دوسرے مولانا سید حامد میاںؒ کہ ان کا معمول بھی یہ تھا کہ ساری رات نماز، مطالعہ، ذکر اذکار یا ساتھی بیٹھے ہیں تو گپ شپ میں گزارتے تھے۔ ان کے علاوہ اہل حدیث علماء میں سے بھی ایک بڑے بزرگ مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب تھے، فیصل آباد سے تعلق تھا، اللہ اللہ کرنے والے بزرگ تھے اور ان کا بھی یہی معمول تھا کہ رات کو نہیں سوتے تھے۔ چنانچہ ہم نے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے ملاقات کرنی ہوتی تو رات بارہ بجے کے بعد جاتے تھے۔ حضرتؒ صبح اشراق پڑھ کر ظہر تک سوتے تھے۔ حضرت سید حامد میاںؒ سے بھی میرا تعلق رہا ہے کہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا سیکرٹری اطلاعات تھا اور وہ مرکزی خزانچی تھے۔ ایک دور میں حساب کتاب کرنے کے لیے رات بارہ بجے کے بعد میں جاتا تھا، بڑے مزے کی مجلس اور گپ شپ ہوتی تھی، چائے کے دور کے ساتھ سحری تک یہ سارے معاملات ہوتے تھے۔ یہی معمول تھا حکیم عبد الرحیم اشرف مرحوم کا، بلکہ ان کا تو یہ طریقہ تھا کہ میرے بارے میں اگر انہیں پتہ چلتا کہ میں فیصل آباد کسی جلسہ میں آیا ہوا ہوں تو وہ گاڑی بھیج دیتے تھے۔ میں جلسہ سے فارغ ہوکر جب اسٹیج سے نیچے اترتا تو حکیم صاحب کی گاڑی کھڑی دیکھ کر سمجھ جاتا حکیم صاحب نے بلایا ہے۔ پھر رات کو واپس آنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا، رات کو گپ شپ اور مذاکرہ چلتا رہتا تھا، صبح فجر کی نماز پڑھ کر

ہی واپسی ہوتی تھی۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کا معمول بھی یہی تھا، مطالعہ بہت کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں وسعتِ مطالعہ کے اعتبار سے تین چار آدمی دیکھے ہیں کہ ہر موضوع پر طویل کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ۔ ایک حضرت والد محترمؒ مطالعہ و تحقیق کے آدمی تھے اور بہت وسیع المطالعہ شخصیت تھے۔ دوسرے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بڑے بیٹے حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ، اور تیسرے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ۔ اور ان کے بعد حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحبؒ بڑے کتاب دوست آدمی تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ جب لاٹھی چارج میں زخمی ہو کر ہسپتال پہنچے تو ہم عیادت کے لیے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ میرے نام کے ساتھ ''راشدی'' کا اضافہ بھی اسی موقع پر ہوا۔ میرا اصل نام تو ''محمد عبد المتین خان زاہد'' ہے۔ ابتداء میں جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ''زاہد گکھڑوی'' کے نام سے لکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم کچھ ساتھی عیادت کے لیے حضرتؒ کے پاس ہسپتال گئے جن میں حضرت مولانا سعید الرحمان علویؒ بھی تھے، حضرتؒ فرمانے لگے کہ زاہد صاحب! یہ گکھڑوی بڑا ثقیل لفظ ہے، زور لگانا پڑتا ہے کہتے ہوئے۔ کوئی سادہ سا لفظ ساتھ رکھیں۔ میں نے کہا حضرت! گکھڑ سے ہی تعلق ہے اس لیے یہ اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتا ہوں۔ فرمانے لگے کہ سلسلہ کی نسبت کرو۔ ہمارا سلسلہ کہلاتا ہے عالیہ قادریہ راشدیہ۔ عالیہ حضرت علیؓ کے حوالہ سے، قادریہ حضرت شیخ عبد القادرؒ جیلانی کے حوالہ سے، اور راشدیہ حضرت شاہ محمد راشد سندھیؒ کے حوالہ سے۔ جب حضرتؒ نے فرمایا کہ سلسلہ سے نسبت کرو مولانا سعید الرحمان علویؒ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے کہا علوی تو یہ بیٹھے ہوئے ہیں اور قادری بھی بہت ہیں، اب میں راشدی ہو جاؤں؟ فرمایا ہاں ہو جاؤ۔ چنانچہ اس دن سے میں ''زاہد الراشدی'' ہوں۔ اور یہ نام ایسا معروف ہوا کہ بہت سے لوگوں کو میرے اصل نام کا علم نہیں ہے۔ وہاں ہسپتال میں حضرتؒ کی زیارت کے لیے ہر ہفتے دو دفعہ جانا ہوتا تھا۔ حضرتؒ ہمارے شیخ تھے، مربی تھے، ہماری محبت و عقیدت کا مرکز تھے، ہم ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے، ان کا دل بہلاتے، حال احوال پوچھتے، دل جوئی کرتے۔

یہ واقعہ معمولی نہیں تھا اور حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ پورے ملک میں تمام پارٹیوں نے احتجاج کیا تھا اور اس سے اگلے جمعہ ہم نے پھر جلوس نکالا حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی قیادت میں۔ یہ ایک بڑا جلوس تھا جس میں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتیں بھی شریک ہوئیں۔ سب نے احتجاج کیا کہ ایک عالم دین اور شریف آدمی کو زخمی کر دیا گیا۔ جلوس میں سید امین گیلانی نے بڑے درد بھرے لہجے میں ایک نظم پڑھی

جس کا کچھ حصہ مجھے یاد ہے۔ اور مجمع ایسے غمزدہ تھا کہ محرم کے کسی ماتمی جلسہ کا گمان ہو رہا تھا۔ سید امین گیلانیؒ کی نظم کا ایک بند یہ تھا

نورِ دیدہ وہ احمد علیؒ کا
خود ولی اور بیٹا ولی کا
ماریں فاسق اسے تازیانہ
اٹھ رے اٹھ قوم کے جوانا
بیٹھنے کا نہیں ہے زمانہ

اس زمانے میں صدر محمد ایوب خان ریڈیو پاکستان پر ماہانہ تقریر کیا کرتے تھے۔ ہم نے رنگ محل لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام کے دفتر میں بیٹھے ریڈیو پر ان کی تقریر سنی۔ مولانا عزیز الرحمان خورشیدؒ ہفت روزہ ترجمان اسلام کے ایڈیٹر تھے جبکہ ان کے ساتھ ان کے بھائی مولانا سعید الرحمان علوی اور میں تھا۔ صدر ایوب خان مرحوم نے اپنی تقریر میں اس واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایک بزرگ عالم دین پر تشدد ہوا ہے۔ اب صورت یہ بنی کہ ہم چاہتے تھے صدر ایوب خان کی اس تقریر پر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کا بیان اس کے ساتھ ہی اخبارات میں چھپے۔ رات کے آٹھ بجے تقریر ہوئی تھی جبکہ ہسپتال کے دروازے اس زمانے میں رات کو بند ہو جایا کرتے تھے۔ ہم صحافی مزاج کے لوگ بے چین تھے کہ صدر ایوب خان کی تقریر کل چھپ جائے گی لیکن حضرتؒ کا بیان پرسوں چھپے گا، ایسے نہیں ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں موبائل فون کا تو تصور ہی نہیں تھا کہ حضرتؒ سے بیان نوٹ کروا لیتے۔ میں اور مولانا سعید الرحمان علوی اٹھے اور ہسپتال پہنچے، عمارت کا چکر لگایا کہ کہیں سے اندر جانے کا راستہ مل جائے۔ قریبی علاقے انارکلی کے مولانا میاں عبد الرحمان ہمارے ساتھ تھے، ان سے کہا کہ بھئی کوئی راستہ تلاش کرو کہ اندر جا سکیں۔ معلوم نہیں کہ ہسپتال کی کونسی دیوار پھلانگ کر ہم اندر پہنچے اور جا کر حضرتؒ کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرتؒ حیران ہو گئے کہ بھئی کدھر؟ ہم نے معاملہ عرض کیا کہ صدر ایوب خان کی تقریر نشر ہوئی ہے جس پر آپ کا جواب چاہیے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے جواب لکھوایا کہ یہ میری ذات کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ملکی نظام کی بات ہے، جن مقاصد کے لیے ہم پر تشدد ہوا ہے ان کے بارے میں صدر ایوب خان نے کوئی بات نہیں کہی، ہم نے تو قوم پر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں احتجاج کیا تھا، یہ میری ذات کا معاملہ نہیں ہے۔ حضرتؒ نے یہ چند جملے کہے جو میں نے لکھے، ہم لیٹر پیڈ اور مہریں وغیرہ سب جیب میں ڈال کر ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں سے نکلے اور سیدھا نوائے وقت کے دفتر میں پہنچے۔ رات دس بجے کا

وقت تھا اور مجید نظامی مرحوم ابھی دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا یہ مولانا کا بیان ہے؟ ہم نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگا کمال کر دیا ہے آپ لوگوں نے۔ ہم نے کہا جی یہ بیان برابر لگنا چاہیے، کہنے لگا بالکل برابر لگے گا۔ چنانچہ اگلے دن نوائے وقت کی مرکزی سرخی صدر ایوب خان مرحوم کا جملہ تھا کہ مولانا عبید اللہ انورؒ پر جو زیادتی ہوئی ہے اس پر مجھے افسوس ہے۔ جبکہ مولانا کی آدھی سرخی تھی کہ یہ میری ذات کا مسئلہ نہیں بلکہ قوم کا مسئلہ ہے۔ صبح یہ دونوں بیانات ساتھ ساتھ دیکھ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

الحمد للہ مجھے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کا اعتماد بھی مسلسل حاصل رہا ہے، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کا بھی اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا بھی۔ میں جمعیۃ کا سیکرٹری اطلاعات تھا، بسا اوقات یوں ہوتا تھا کہ کسی مسئلے پر فوری بیان دینا ضروری ہوتا تھا اور ان بزرگوں میں سے کسی سے رابطہ نہیں ہو رہا ہوتا تھا، ایسی صورت میں بیان لکھ کر بھیج دیتا تھا جو اخبارات میں شائع ہو جاتا تھا، کبھی مولانا عبید اللہ انورؒ کی طرف سے، کبھی حضرت درخواستیؒ کی طرف سے اور کبھی مولانا مفتی محمودؒ کی طرف سے۔ الحمد للہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے میرے بھجوائے ہوئے بیان کو غلط کہا ہو۔ البتہ مفتی صاحبؒ نے ایک دفعہ کہا بھئی! میں یہ نہیں کہتا کہ پوچھ کر بیان جاری کیا کرو لیکن بتا تو دیا کرو کہ آپ کے نام سے یہ بیان بھیجا ہے، کیونکہ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ ساتھی کہتے ہیں آپ کا بڑا اچھا بیان آیا ہے تو میں کچھ بھی نہیں کہہ پاتا اور میرا بیان وہ مجھے دکھاتے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کا مجھے یہ اعتماد بھی حاصل رہا ہے کہ ان گنت معاملات ایسے تھے کہ میں نے کوئی رائے دی کہ حضرت یوں ہونا چاہیے۔ حضرتؒ فرماتے اچھا! ہماری رائے تو یہ نہیں تھی، آپ کی رائے ہے تو یہی ٹھیک ہے۔ وہ جماعت کے صوبائی امیر تھے اور میں کارکن تھا، میں ان کے رفقاء میں شامل تھا اور ان کی ٹیم کا حصہ تھا لیکن میرا حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے ساتھ اصل تعلق سلسلہ قادریہ میں بیعت کا تھا۔ میں اکثر شیرانوالہ لاہور میں ان کی مجلسِ ذکر میں شامل ہونے کی کوشش کرتا اور مہینہ میں دو تین مرتبہ وہاں جانے کا معمول تھا۔ ان کے باقاعدہ اسباق ہوتے تھے جیسا کہ ہر روحانی سلسلہ کے ہوتے ہیں۔ جب میں حضرتؒ سے بیعت ہوا تو یہ میرا طالب علمی کا دور تھا۔ حضرت طلباء کو وظیفہ نہیں بتایا کرتے تھے، فرماتے تھے اپنی پڑھائی پر توجہ دو جب فارغ ہو گے پھر وظیفہ بتاؤں گا۔ کافی عرصہ بعد کی بات ہے جب میں عملی سیاست میں تھا، میں نے ایک دن عرض کیا حضرت! آپ نے کوئی سبق تو دیا نہیں حالانکہ میں سلسلہ قادریہ میں آپ سے بیعت ہوں۔ انہوں نے ایک جملہ فرمایا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہو یہی آپ کا سبق

ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا کیونکہ اسباق کی پابندی مجھ سے شاید نہ ہو پاتی۔ اس کے بعد میں نے کبھی حضرتؒ سے اس بارے میں بات نہیں کی۔ لیکن جس سبق کی حضرتؒ نے تائید و تصدیق کی تھی الحمدللہ وہ اب تک جاری ہے۔

جماعتی زندگی میں مختلف مراحل آئے، میں ایک زمانہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا ٹھیک ٹھاک چودھری رہا ہوں۔ ہماری نئی پود اس سے واقف نہیں ہے لیکن اس وقت لوگ سمجھتے تھے کہ جمعیۃ کے سارے اہم معاملات میں میرا بڑا کردار ہوتا ہے۔ ایک دفعہ لاہور کی جمعیۃ کو مجھ سے کچھ شکایات پیدا ہوگئیں جس پر انہوں نے میرے خلاف باقاعدہ ایک کیس بنا کر پیش کیا حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی خدمت میں۔ چنانچہ حضرتؒ کی سربراہی میں ایک جرگہ بیٹھا جس میں ہمارے ایک دوست حافظ محمد یوسف ایڈووکیٹ جو لاہور ہائی کورٹ کے وکیل تھے انہوں نے اکیس الزامات پر مشتمل یہ کیس پیش کیا۔ انہوں نے کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ تقریر فرمائی جسے سب سنتے رہے۔ سب الزامات اور ثبوت وغیرہ پیش ہوئے تو میری باری آئی۔ اب جب آدمی عملی میدان میں کام کرتا ہے تو اسے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا مولوی صاحب! آپ کا کیا موقف ہے؟ میں نے کھڑا ہو کر کہا کہ حافظ صاحب نے اکیس باتیں فرمائی ہیں، ان میں سے کچھ باتیں شاید ٹھیک بھی ہوں گی لیکن میں سب الزامات تسلیم کرتا ہوں اور معافی مانگتا ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ کیا معاملہ کرنا ہے۔ اس پر سب حیران و پریشان ہو گئے کہ یہ کیا ہوا، اس نے تو ایک منٹ میں بات نمٹا دی۔ حضرتؒ بہت خوش ہوئے اور بعد میں مجھے شاباش دی کہ تم نے ایک بڑا بوجھ ہمارے سر سے ہٹا دیا ہے۔ ایسے مواقع پر بسا اوقات بات کو فوری نمٹا دینا ہی فائدے میں رہتا ہے۔

یہ ۱۹۸۴ء میں غالباً حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی وفات سے ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ میرے بڑے بیٹے عمار خان ناصر کا حفظ قرآن کریم مکمل ہوا تھا۔ میں نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ میرا آخری سبق حضرت درخواستیؒ نے سنا تھا، میری خواہش ہے کہ عمار کا آخری سبق آپ سنیں۔ میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ میرا حال تمہیں معلوم ہے۔ میں نے کہا حضرت! معلوم ہے لیکن جی چاہتا ہے۔ میں واقعتاً ان کی کیفیت جانتا تھا کہ سفر کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ پروگرام جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں تھا اور اس میں حضرت والد صاحبؒ بھی تشریف لائے تھے، مولانا اجمل خانؒ بھی اور مولانا عبید اللہ انورؒ بھی۔ میاں اجمل قادری صاحب بتاتے ہیں کہ صبح سے طبیعت خراب تھی لیکن کہتے تھے کہ جانا ہے، راشدی صاحب کا بیٹا ہے میں نے ضرور جانا ہے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود تشریف لائے۔ میں اس پر حضرتؒ کا بڑا احسان مند ہوں کہ وہ یہ تکلیف برداشت کر کے تشریف لائے اس نسبت سے کہ زاہد نے کہا

ہے۔ حضرتؒ نے عمار کا آخری سبق سنا، بیان فرمایا اور دعا دی۔

میں یہاں دو کرامتیں ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی اور دوسری حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کی۔ میں اکثر جماعتی دوروں پر جاتا تھا، اس سلسلہ میں جماعت کا دفتر میرے سفری خرچ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ہم فقیر لوگ ویسے ہی خالی جیب ہوتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے کوئٹہ جانا تھا جماعتی سلسلہ میں، سوچا کہ لاہور جمعیۃ کے دفتر جا کر وہاں سے سفر کا خرچہ لوں گا اور پھر ریلوے اسٹیشن پر کوئٹہ ایکسپریس میں بیٹھ جاؤں گا۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے دفتر کے ناظم مولانا غلام اکبر سلیمانی تھے جو جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل تھے۔ لاہور دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ناظم صاحب کمالیہ گئے ہوئے ہیں۔ گاڑی کے روانہ ہونے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ رہتا تھا اور میرے پاس سفر کا خرچہ نہیں تھا۔ میں وہاں سے شیرانوالہ چلا گیا جہاں ہمارے ایک بزرگ ہوتے تھے عبد الحمید بٹ صاحب، سوچا ان سے ادھار لے کر چلا جاؤں گا واپسی پر ان کو لوٹا دوں گا، پتہ چلا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ پھر سوچا کہ ہفت روزہ خدام الدین کے ایڈیٹر مولانا سعید الرحمان علوی سے لیتا ہوں لیکن وہ بھیرہ گئے ہوئے تھے۔ اب گاڑی کی روانگی میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ یا اللہ! اب کیا کروں، کوئٹہ والے انتظار میں ہیں انہوں نے کل پروگرام رکھے ہوئے ہیں اور یہاں یہ صورت حال بنی ہوئی ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ شیرانوالہ لاہور میں اوپر چوبارہ میں رہتے تھے۔ کوئی ہنگامی بات ہوتی تو ہم اوپر چٹ بھیج دیتے۔ میں نے چٹ پر صرف یہ لکھ کر بھیجا کہ حضرت! میں جماعتی دورے پر ہفتہ دس دن کے لیے کوئٹہ جا رہا ہوں، دعا کی درخواست ہے۔ حضرتؒ چٹ ہاتھ میں لیے نیچے آئے اور کہنے لگے ماشاء اللہ ماشاء اللہ آپ کوئٹہ جا رہے ہیں۔ پھر ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فرمایا اس دفعہ کرایہ ہماری طرف سے ہو جائے۔ وہ لفافہ میں نے کھول کر دیکھا تو مطلوبہ کرائے سے دو تین گنا زیادہ تھے اور یہ اللہ رب العزت کی طرف سے خاص امداد تھی۔

جس دن حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کا انتقال ہوا وہ ہسپتال میں تھے۔ اس سے ایک دن پہلے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ جو خود بھی علیل تھے حضرتؒ کی عیادت کے لیے لاہور تشریف لائے، ہم نے حضرت درخواستیؒ کو ریلوے اسٹیشن پر وصول کیا۔ میرے ساتھ مولانا سعید الرحمان علویؒ کے علاوہ کچھ اور دوست تھے۔ حضرت درخواستیؒ نے خیبر میل سے اتر کر مصافحہ کرتے کرتے فرمایا مجھے پتہ چلا ہے کہ مولوی عبید اللہ صاحبؒ بیمار ہیں، میں عیادت کے لیے آیا ہوں اور ساتھ احرام کی چادریں بھی لے آیا ہوں۔ اللہ اکبر! باباجی احرام کی چادریں کیوں ساتھ لائے ہیں؟ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارے پیر صاحبؒ گئے کیونکہ حضرت درخواستیؒ احرام کی چادریں کفن کے لیے لائے ہیں۔ چنانچہ صبح دس بجے حضرتؒ انتقال کر گئے

اور انہی چادروں میں دفن ہوئے۔ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں جنہیں اللہ والے ہی سمجھتے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ میرے شیخ تھے میرے بزرگ تھے۔ ان کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت کا اور مہربانی و شفقت کا تعلق تھا۔ ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں بیٹھے آخرت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مرزا جانباز مرحوم بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے حضرت وہاں اگر جوتے پڑنا شروع ہو گئے تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟ اس پر میں نے کہا کہ میں تو اس چادر میں گھس جاؤں گا۔ حضرتؒ کی سفید چادر ہوتی تھی، سنا تو ہنسے اور فرمایا ہاں ہاں بالکل۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ان کے ساتھ ہی منسلک رکھے۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۸ اگست ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ

غالباً ستائیسواں روزہ تھا کہ معمول کے مطابق صبح نو بجے کے قریب اخبار ہاتھ میں لیا تو اس کے دوسرے صفحہ پر ایک کالمی ایک سطری سرخی کے ساتھ کسی سیاہ حاشیہ کے بغیر چند سطری خبر تھی کہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہؒ انتقال کر گئے۔ زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور دل دوہرے رنج وغم میں ڈوب گیا۔ ایک صدمہ مولانا مرحوم کی وفات پر اور دوسرا قومی پریس کی بے خبری، سطحیت، ظاہر بینی یا بے حسی پر کہ ایک قومی اخبار کے نامہ نگار یا ایڈیٹر کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ جس شخص کی وفات کی خبر کو وہ چند سطروں میں غیر اہم جگہ پر شائع کر رہا ہے وہ ان سینکڑوں شخصیات پر اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور دینی و ملی خدمات کے لحاظ سے بھاری ہے جن کی معمول کی سرگرمیاں بھی روزنامہ اخبارات کے صفحۂ اول کی زینت بنتی رہتی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ کا تعلق اس قافلۂ عزیمت و استقامت اور کاروانِ عزم و استقلال سے تھا جس نے برصغیر پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں فرنگی استعمار کی یلغار کے بعد اس کے اقتدار، کروفر، جاہ وجلال اور زرق برق تہذیب و ثقافت سے متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر اسلامی تعلیمات و احکام اور اسلاف کی روایات کو نہ صرف سینے سے لگائے رکھا بلکہ پورے جوش و جذبہ کے ساتھ معاشرہ میں اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی سرگرم عمل رہا۔ اور آج اس قافلۂ حق و صداقت کی جدوجہد اور قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ اسلامی دنیا کا یہ خطہ اسلامی روایات کے ساتھ وابستگی اور دینی حمیت و جذبہ کے لحاظ سے پورے عالم اسلام میں ممتاز اور مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ ۸ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ میں رشیدیہ رائے پور جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم مولانا مفتی فقیر اللہؒ اپنے وقت کے جید اور مجاہد عالم دین تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ جیسے نابغہ روزگار علمی شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے علم و فضل کے خزانوں سے اپنا دامن بھرا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہؒ کی تعلیم و تربیت کے بیشتر مراحل مدرسہ رشیدیہ رائے پور جالندھر اور مدرسہ خیر المدارس جالندھر میں طے ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی فقیر اللہؒ، حضرت مولانا عبد العزیز رائے پوریؒ، اور حضرت مولانا محمد ابراہیمؒ میاں چنوں جیسی علمی شخصیات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ نے دورۂ حدیث خیر المدارس جالندھر میں مکمل کر کے حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ سے سندِ اجازت حاصل کی۔ اور ان کے علاوہ حدیث میں آپ کو اپنے وقت کے ممتاز محدثین حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، حضرت مولانا شبیر احمدؒ عثمانی، حضرت مولانا محمد زکریاؒ اور حضرت مولانا فقیر اللہؒ نے بھی سند مرحمت فرمائی۔ فراغت کے بعد کم و بیش بیس سال تک خیر المدارس جالندھر میں ہی تعلیم و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد خیر المدارس ملتان میں منتقل ہوئے اور مدرسہ رشیدیہ رائے پور جالندھر سے ساہیوال میں منتقل ہو گیا۔ یوں مولانا عبد اللہ رائے پوریؒ کچھ عرصہ بعد جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں منتقل ہو گئے جہاں آپ وفات تک کم و بیش بتیس برس تک علمِ حدیث کا درس دے کر تشنگانِ علوم نبویؐ کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کرتے رہے۔

حضرت مفتی فقیر اللہؒ کے تینوں فرزند مولانا محمد عبد اللہؒ، مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی اور مولانا قاری لطف اللہؒ قیام پاکستان کے بعد ساہیوال منتقل ہو گئے۔ اس شہر میں جو اس وقت منٹگمری کہلاتا تھا، جامعہ رشیدیہ کے قیام و ترقی میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ تینوں بھائیوں کو اللہ رب العزت نے علم و فضل اور جذبہ و عزم کے ساتھ ساتھ حق گوئی اور بے باکی کی نعمت سے بھی مالامال فرمایا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے حوالہ سے جسٹس محمد منیر نے اپنی انکوائری رپورٹ میں تینوں بھائیوں کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔ اس تحریک میں تینوں بھائی گرفتار ہوئے اور مولانا محمد عبد اللہؒ ساہیوال اور میانوالی کی جیلوں میں ایک سال تک نظر بند رہے۔ حضرت کو تحریک ختم نبوت کے ساتھ بے حد شغف تھا، آپ کا شمار تحریک ختم نبوت کے ممتاز راہنما حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے خصوصی رفقاء میں ہوتا تھا اور آپ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے آخر وقت تک نائب امیر رہے۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ کا روحانی تعلق حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے تھا

اور آپ کو حضرت رائے پوری کے علاوہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجرؒ مدنی سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی۔

شیخ الجامعہ حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ نے اپنے نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط تدریسی دور میں زیادہ تر علمِ حدیث ہی کی خدمت کی۔ آپ کا مشکوٰۃ شریف کا سبق بہت مشہور تھا اور اکثر اہل علم آپ کے املاء کرائے ہوئے اسباق سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ حضرت جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے اور بخاری شریف جیسی جلیل القدر کتاب آخر تک آپ کے درس میں شامل رہی۔ آپ سے ہزاروں علماء اور طلبہ نے استفادہ کیا اور فیض حاصل کرنے والوں میں سے جن علماء نے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی ان میں سے چند سرکردہ حضرات کے نام گرامی درجِ ذیل ہیں۔ مولانا مفتی زین العابدین، فیصل آباد۔ مولانا عبد الرحمان، جامعہ اشرفیہ لاہور۔ مولانا قاضی عبد الکریم، کلاچی۔ مولانا قاضی عبداللطیف سینیٹر۔ مولانا فیض محمد، مہتمم قاسم العلوم ملتان۔ مولانا محمد شریف جالندھریؒ، سابق مہتمم خیر المدارس۔ مولانا قاری سعید الرحمان، راولپنڈی۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مدیر بینات کراچی۔ مولانا محمد ضیاء القاسمی، فیصل آباد۔ شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد، فیصل آباد۔ مولانا گلزار احمد مظاہری۔ مولانا سید ابوذر بخاری۔ مولانا محمد زکریا ایم ایس اے، کراچی۔ مولانا مفتی عبد الستار، ملتان۔ مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی۔ حافظ عبد الرشید ارشد، لاہور۔ مولانا عبد الوحید مکی۔ مولانا مجاہد الحسینی۔ مولانا محمد سلیمان طارق وغیرھم۔

حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ کی ذاتی زندگی انتہائی سادگی اور کفایت شعاری سے عبارت تھی۔ جبکہ معاملات میں اس قدر سخت اور بے لچک تھے کہ آپ کے رفقاء کو بسا اوقات وہی بات کہنا پڑتی جو حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی طرف سے انہیں پرانے کپڑوں میں کفن دینے کی وصیت پر حضرت سیدنا عمر فاروقؓ نے کہی تھی کہ آپؓ نے بعد والوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ مگر مولانا محمد عبداللہ مرحوم ایسے موقع پر فرماتے تھے کہ میں عزیمت پر عمل کرتا ہوں، تمہارے لیے رخصت ہے تم رخصت پر عمل کرو۔ اب یہ کمال عزیمت ہی کی بات ہے کہ آج کے دور میں

- وہ جامعہ رشیدیہ سے اپنی تنخواہِ قلیل وصول کرتے وقت مہینہ میں کی ہوئی چھٹیوں کا حساب کر کے اتنے دنوں کی تنخواہ وضع کروالیتے تھے۔ ان کی ڈائری پر بسا اوقات یہ تفصیل بھی درج ہوتی کہ آج اتنے گھنٹے پڑھایا، اتنے گھنٹے آرام کیا اور اتنا وقت مہمانوں کے پاس رہا، اور مہینہ کے اختتام پر ان تفصیلات کی روشنی میں ان کی تنخواہ کا ہر ماہ حساب ہوتا تھا۔ درسگاہ میں بھی پڑھائی

کے وقت کے علاوہ جو وقت گزارتے اس کا حساب کر کے اتنا بجلی کا بل مدرسہ میں جمع کروا دیتے۔

- وہ اتفاقیہ رخصت کے استحقاق کو اپنے لیے نہیں مانتے تھے۔
- حضرت کے لیے جامعہ رشیدیہ میں ایک کمرہ الگ مخصوص کیا گیا تھا مگر وہ آخر وقت تک جامعہ کو اس کمرہ کا کرایہ ادا کرتے رہے۔
- حضرت مدرسہ کے شیخ الحدیث ہونے کے باوجود مدرسہ کے لیٹر پیڈ اور قلم دوات کو فتویٰ نویسی کے علاوہ کسی کام کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔
- وہ مدرسہ کی سالانہ تعطیلات کی تنخواہ بھی وصول نہیں کرتے تھے۔
- جامعہ کے سالانہ جلسہ اور دیگر تقریبات میں انہیں مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پڑتا جس کا اہتمام مدرسہ کی طرف سے ہوتا تھا لیکن بعد میں وہ اس کی قیمت مدرسہ کے حساب میں جمع کرواتے تھے۔
- دوسرے مدارس کے سالانہ اجتماعات اور امتحانات وغیرہ کے لیے جاتے تو ان سے سفر کے اخراجات سے زائد رقم وصول نہ کرتے تھے۔ اور جو رقم ان کی طرف سے خدمت میں پیش کی جاتی اس میں سے سفر کے اخراجات وضع کر کے باقی رقم واپس کر دیتے۔
- مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ کی پہلی بیوی سے دو لڑکے مولانا عبید اللہ اور مولانا مطیع اللہ اور ایک لڑکی صاحب اولاد ہے۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دوسری بیوی کی وفات کے بعد فرمایا کہ میں اکیلا ہوں کھانا اپنے لڑکوں کے ہاں کھایا کروں گا، بیوی نہیں ہے اس لیے میرے اور کوئی اخراجات نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر مدرسہ سے تنخواہ لینا بند کر دی اور پھر مسلسل آٹھ برس کا عرصہ آخر عمر تک کوئی تنخواہ نہیں لی۔

اس عزیمت واحتیاط کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی بڑے جاگیر دار تھے یا ان کا کوئی کارخانہ چلتا تھا بلکہ وہ بے سروسامان قسم کے سفید پوش بزرگ تھے۔ یہ تقویٰ اور دیانت کے اعلیٰ اصولوں اور عظیم اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ تھا جس پر وہ تمام عمر اس قدر سختی کے ساتھ قائم رہے کہ فی الواقع وہ اپنے بعد والوں کے لیے ”مشکلات“ پیدا کر گئے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہؒ معاملات کے ساتھ ساتھ عبادات کے بارے میں بھی اپنے معمولات کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ حتیٰ کہ سفر کے دوران بھی نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا۔ ان کا

معمول یہ تھا کہ سفر تھوڑا تھوڑا کر کے کرتے۔ بس کے ذریعے جاتے تو اتنے فاصلہ کا ٹکٹ لیتے جہاں اگلی نماز کا وقت ہو جاتا، وہاں اتر کر نماز باجماعت ادا کرتے اور پھر آگے سفر کرتے۔

دو سال قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا لیکن علاج معالجہ کے ساتھ ساتھ پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ علم حدیث کے طلبہ اپنی سعادت سمجھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ دوسرے طلبہ کے علاوہ تبلیغی جماعت کے مرکز رائے ونڈ کے مدرسہ سے بھی طلبہ کو علم حدیث کی تعلیم کے لیے اہتمام کے ساتھ ان کی خدمت میں بھیجا جاتا اس لیے وہ تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں حتی الوسع کوشش کرتے اور علالت کے باوجود درس و تدریس کا معمول اکثر و بیشتر قائم رہتا۔ کچھ عرصہ قبل کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے زبان بند ہو گئی مگر اس سے قبل جو آخری گفتگو انہوں نے اپنے گھر والوں سے کی اس میں غیبت سے بچنے، نماز کی پابندی کی تلقین، بچیوں کو دین کی تعلیم دلانے، اور پردہ کی پابندی کی تاکید فرماتے ہوئے دین کی مسلسل تبلیغ کرنے پر زور دیا۔

۲۶ رمضان المبارک کو غروب آفتاب کے وقت خود بخود آنکھیں کھولیں، ارد گرد ماحول پر نظر ڈالی، زبان پر اللہ اللہ کا ذکر جاری ہوا، چہرہ خود بخود قبلہ رخ ڈھلک گیا۔ یوں غروب آفتاب کے ساتھ ہی علم و فضل کا یہ آفتاب بھی نصف صدی تک دنیا کے ایک حصہ کو اپنا علم و فضل اور تقویٰ و کردار کے ساتھ روشن کرتا ہوا موت کی وادیوں میں غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نمازِ جنازہ حضرت کے بہنوئی مولانا ولی محمد فاضل دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی جس میں شہر کے ہزاروں افراد کے علاوہ ملک بھر کے جید علماء کرام، خطباء، راہنمایانِ ملک و ملت نے شرکت فرمائی۔

(ہفت روزہ خدام الدین، لاہور۔ ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ء)

مولانا حافظ جی حضورؒ

(۱)

بنگلہ دیش کے بزرگ عالم دین حافظ جی حضورؒ گزشتہ ماہ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۹۰ برس سے متجاوز تھی اور وہ آخر دم تک نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ حافظ جی حضورؒ حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے خلفاء میں سے تھے اور ایک بڑی دینی درسگاہ کے سربراہ تھے۔ ان کا شمار بنگلہ دیش کے بزرگ علماء اور ممتاز روحانی پیشواؤں میں ہوتا تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد انہوں نے خلافتِ اسلامیہ کے قیام کے منشور پر صدارتی انتخاب میں بھی حصہ لیا اور تحریکِ خلافت کے نام سے ایک جماعت کی قیادت کرتے رہے۔

۱۹۸۵ء میں انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے زیر اہتمام لندن میں منعقد ہونے والی عالمی ختم نبوت کانفرنس میں ان کی زیارت ہوئی۔ ان کی سادگی اور خلوص نے بہت متاثر کیا اور ان پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوگئی جن کے تذکرے اب صرف کتابوں میں ملتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حافظ جی حضورؒ کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ قبضِ علم اور قحط الرجال کے اس دور میں ایسے بزرگوں کا اٹھ جانا یقیناً ہماری آزمائشوں میں اضافہ کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ اکابر کے نقش قدم پر استقامت کے ساتھ چلنے کی توفیق دیں، آمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ جون ۱۹۸۷ء)

(۲)

بنگلہ دیش کے بزرگ عالم دین حضرت حافظ جی حضورؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سرکردہ خلفاء میں سے تھے۔ خانقاہی مزاج کے گوشہ نشین بزرگ تھے لیکن پاکستان سے علیحدگی کے بعد بنگلہ دیش میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کو انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود میدان عمل میں نکل کر پھر سے زندہ کر دیا۔ وہ خلافت اسلامیہ کی بحالی کے نعرہ کے ساتھ میدان سیاست میں آئے اور جسٹس عبدالستار کے مقابلہ میں صدارتی الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا جس میں انہوں نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے صدارتی انتخاب کا دوسرا معرکہ جنرل ارشاد کے خلاف لڑا اور رائے عامہ کو اس حد تک متوجہ کر لیا کہ بین الاقوامی اداروں اور پریس کو حیرت میں ڈال دیا۔ الیکشن سے قبل بین الاقوامی مبصرین ان کی کامیابی کے امکانات کا تذکرہ کرنے لگے لیکن وہ الیکشن نہ جیت سکے، البتہ جنرل ارشاد کے بعد انہوں نے صدارتی امیدوار کے طور پر دوسری پوزیشن حاصل کر کے واضح کر دیا کہ بنگلہ قومیت کے نام پر پاکستان سے علیحدگی کے باوجود بنگالی مسلمانوں کے دلوں سے اسلامی نظام کے نفاذ کے جذبہ کو کھرچا نہیں جا سکا اور بنگلہ دیش کے عوام آج بھی قرآن وسنت کے نظام کے نفاذ کی تڑپ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ حافظ جی حضورؒ اور خلافت کے نعرہ کی اس عوامی پذیرائی نے مغربی دنیا کو چونکا دیا اور ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں، چنانچہ اس کے بعد بنگلہ دیش میں این جی اوز کا جال بچھا دیا گیا اور مختلف ذرائع اور بہانوں سے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی برین واشنگ کے لیے ایک وسیع نیٹ ورک قائم ہوگیا۔

(روزنامہ اوصاف، ۸ فروری ۲۰۰۱ء)

والدہ ماجدہ مرحومہ

گزشتہ دنوں راقم الحروف کی والدہ مکرمہ کا انتقال ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون ۔ مرحومہ کی عمر ساٹھ برس سے زائد تھی اور وہ کچھ عرصہ سے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں ۔ دو ہفتہ سے ان کی طبعیت زیادہ خراب تھی چنانچہ انہیں شیخ زاید ہسپتال لاہور میں داخل کرا دیا گیا مگر وہ تین چار روز بیہوش رہنے کے بعد وفات پا گئیں ۔ ان کی نماز جنازہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں حضرت والد محترم مدظلہ نے پڑھائی جس میں ممتاز علماء کرام، سیاسی راہنماؤں، سماجی شخصیات اور جماعتی کارکنوں کے علاوہ ہزاروں شہریوں نے شرکت کی اور نماز جنازہ کے بعد مقامی قبرستان میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مرحومہ ایک عبادت گزار اور شب زندہ دار خاتون تھیں اور انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں بسر کیا۔ وہ صبح و شام اپنے گھر میں بچیوں اور بچوں کو قرآن کریم حفظ و ناظرہ، ترجمہ قرآن اور بہشتی زیور کی تعلیم دیا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ تقریباً پینتالیس برس سے تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔ وہ خود قران کریم کی حافظہ نہیں تھیں لیکن جن بچیوں نے ان سے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ان کی تعداد پچیس سے زائد ہے جبکہ باقی شاگرد بچوں اور بچیوں کا کوئی شمار نہیں ہے ۔ ان کے شاگردوں میں ان کے اپنے بچوں راقم الحروف، مولانا عبدالقدوس خان قارن اور مولانا عبدالحق خان بشیر کے علاوہ بریگیڈیر محمد علی چغتائی اور اے آئی جی پولیس احمد نسیم جیسی ممتاز شخصیات شامل ہیں ۔ سابق وفاقی وزیر غلام دستگیر خان، میئر گوجرانوالہ کارپوریشن الحاج محمد اسلم بٹ، کونسلر ڈاکٹر محمد احمد اور سابق ڈپٹی میئر میاں محمد عارف ایڈووکیٹ کے علاوہ ممتاز علماء کرام علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا قاضی عصمت اللہ، مولانا محمد فیروز خان، مولانا حکیم عبدالرحمان آزاد، مولانا خالد حسن مجددی، مولانا حکیم محمود اور دیگر شخصیات نے مولانا محمد سرفراز خان اور راقم الحروف سے ملاقات کر کے مرحومہ کی وفات پر تعزیت کی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء بترمیم)

حضرت مولانا عبدالحقؒ (اکوڑہ خٹک)

(۱)

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، نہ کوئی پیغمبرؑ اس سے محفوظ رہا اور نہ کوئی ولی اور قطب، اس نے آنا ہوتا ہے اور یہ آ کر رہتی ہے ۔ یوں تو لاکھوں افراد اس دار فانی سے گزر جاتے ہیں مگر

بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک عالم کو یتیم اور بے سہارا کر جاتی ہیں اور ایسی موت کی کسک اور تکلیف صدیوں تک محسوس ہوتی ہے۔ شیخ الحدیث محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا عبدالحقؒ بھی انہی چیدہ شخصیات میں شامل ہیں جن کی موت سے علمی دنیا خود کو یتیم اور بے سہارا محسوس کر رہی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ تعالیٰ علم کا ایک روشن چراغ تھے جن سے ہزاروں لوگوں نے روشنی حاصل کی اور پھر خود آسمانِ علم پر جگمگانے لگے۔ جس طرح شیخ الحدیثؒ کی شخصیت ہمہ صفت تھی اسی طرح ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے ہر شعبہ میں اپنا مقام بنایا اور اپنی حیثیت منوائی۔ ان سے فیض یافتگان کی فہرست تو بہت طویل ہے، مشتِ از خروارے حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ، مولانا سید اسعد مدنی، مولانا محمد یونس خالص، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا سمیع الحق، مولانا مفتی غلام فرید، مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی، مولانا فضل الرحمان اور مولانا عبدالقیوم حقانی کا تذکرہ بے جا نہیں ہوگا۔ ان حضرات نے اپنے اپنے شعبہ میں قومی ہی نہیں، بین الاقوامی شہرت پائی ہے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کی عصر حاضر کے مسائل پر بہت گہری اور عمیق نظر تھی۔ ان کی قومی اسمبلی کی تقاریر اور بحثیں، دارالعلوم حقانیہ میں دوران تدریس کے مباحث اور جامع مسجد کے خطابات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ علمی و دینی حلقوں میں تو وہ ایک سند اور اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہی تھے مگر سیاسی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی ان کی بات کو بہت وزن حاصل تھا۔ قومی اسمبلی کے لیے ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۵ء میں منتخب ہو کر گئے اور انہیں پشاور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی خصوصی ڈگری بھی دے رکھی تھی۔

حضرت شیخ الحدیثؒ نے حاصل ہونے والی اس قدر عوامی تائید و حمایت کو کبھی ذاتی منفعت اور مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ وہ گروہی تعصبات اور فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالاتر تھے۔ انہوں نے ہمیشہ عوامی قوت کو نفاذ شریعت کے لیے استعمال کیا۔ وہ اپنی ذات کو بھی نفاذ شریعت کے لیے مختص کر چکے تھے حتیٰ کہ آخری عمر میں پیرانہ سالی، نقاہت اور شدید علالت کے باوجود متحدہ شریعت محاذ کی سربراہی کو قبول کیا اور نفاذ شریعت کے لیے مؤثر کردار ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(اداریہ ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء)

(۲)

غالباً ۳۰ اگست کی صبح کا قصہ ہے راقم الحروف نیویارک کے علاقہ بروک لین میں ضلع گجرات کے ایک دوست جناب محمد دین کے ہاں قیام پذیر تھا۔ صبح نماز سے پہلے کا وقت تھا، میرے ساتھ کمرہ میں حضرت

مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی محو خواب تھے۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوں، تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ جناب ظفر علی ڈار میرے کمرہ میں آئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ شریعت بل کے محرک مولانا سمیع الحق انتقال کر گئے ہیں۔ میں نے چونک کر پوچھا کہ مولانا سمیع الحق یا مولانا عبد الحق؟ انہوں نے کہا ہاں ہاں مولانا عبد الحق کا انتقال گیا ہے، میں نے ابھی انا للہ وانا الیہ راجعون ہی پڑھا تھا کہ مولانا فداء الرحمان درخواستی کی آواز آئی کہ اٹھو بھئی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نیند سے بیدار ہوا اور مولانا درخواستی کو خواب سنایا۔ انہوں نے کہا کہ خواب تو اچھا ہے، خواب میں کسی کی موت کی خبر اس کی زندگی اور عزت کی علامت ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں مولانا میاں محمد اجمل قادری سے فون پر بات ہوئی تو انہیں یہ خواب بتایا، ان کا جواب بھی وہی تھا جو مولانا فداء الرحمان درخواستی سے سن چکا تھا اور خود میں نے بھی تعبیر رویا کی بعض کتابوں میں یہی کچھ پڑھ رکھا تھا۔ مگر سچی بات ہے کہ ان سب امور کے باوجود حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ کی علالت اور نقاہت کی وجہ سے دل کو تردد اور تفکر سے نجات نہیں دلا سکا تھا۔

۸ ستمبر کو مدینہ منورہ پہنچا تو استاذ محترم قاری محمد انور صاحب نے یہ الم ناک خبر سنائی کہ حضرت مولانا عبد الحقؒ کا گزشتہ روز انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قاری محمد انور صاحب میرے حفظ قرآن کے شفیق استاد ہیں اور آج کل مدینہ منورہ میں جامعہ محمد بن مسعود کے تحت تحفیظ القرآن کے ایک مدرسہ میں پڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ خبر ریڈیو سے سنی تھی جس کے مطابق جنازہ بھی ادا کیا جا چکا تھا۔

خواب پیغمبرؑ کے سوا کسی کا حجت نہیں ہے لیکن یہ درست ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ بسا اوقات آنے والے واقعات کی طرف اشارہ فرما دیتے ہیں۔ میرے ساتھ اسی قسم کا واقعہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے بارے میں بھی رونما ہو چکا ہے۔ مولانا ہزارویؒ کی وفات سے پانچ چھ روز پہلے کا قصہ ہے خواب میں دیکھتا ہوں کہ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں علماء کا ایک اجلاس ہے اس میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ کرسی پر بیٹھے ہیں جبکہ باقی حضرات ان کے سامنے نیچے بیٹھے ہیں جیسے سب ان کا خطاب سننے کے لیے جمع ہوں اور میں حسب معمول سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اچانک اجتماع میں ایک بزرگ کو دیکھ کر چونک جاتا ہوں، یہ بزرگ مولانا عبد الواسع لدھیانویؒ ہیں جو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ کے بھانجے تھے اور تقسیم ہند سے پہلے مجلس احرار اسلام کے سرگرم راہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، ان کا چند سال قبل انتقال ہو گیا تھا جس کا مجھے خواب میں بھی ادراک تھا اور اسی لیے بار بار غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہیں تو چند سال قبل خود ہم جنازہ پڑھ کے سپرد خاک کر چکے ہیں یہ یہاں کیسے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ بھائی کیوں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے

ہو، میں نے کہا کہ حضرت آپ؟ کہنے لگے کہ ہاں یہ میں ہی ہوں اور بابے کو لینے آیا ہوں۔ بابے سے مراد حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ تھے جنہیں جماعتی کارکن محبت سے بابا کہا کرتے تھے۔ صبح ہوئی تو میں نے سب سے پہلے مولانا علامہ محمد احمد لدھیانویؒ کو فون پر خواب سنایا اور کہا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا ہزارویؒ کو لینے آرہے ہیں اور پھر اس واقعہ کے چار پانچ دن بعد مولانا ہزارویؒ کا انتقال ہو گیا۔

اس پس منظر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی وفات کی خبر اگرچہ میرے لیے کم از کم غیر متوقع نہیں تھی لیکن خبر سنتے ہی دل کی جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ معاً ذہن جنازہ اور تدفین کے مراحل کی طرف منتقل ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایک منحنی سے وجود اور مٹھی بھر ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں علم وعمل اور خلوص و تواضع کے اس بحرِ ذخار کو آخر کس حوصلہ کے ساتھ لوگ مٹی کے نیچے دبا رہے ہوں گے۔ فوراً مسجد نبویؐ میں حاضری دی، حسن اتفاق سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر شریف کے ساتھ جگہ مل گئی، مسجد نبویؐ کے اس حصہ کو جناب نبی رسالت مآبؐ نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ فرمایا ہے، وہیں بیٹھ کر حضرت مولانا عبدالحقؒ کو ایصال ثواب کے لیے قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ دوسرے روز مکہ مکرمہ میں اللہ رب العزت نے حضرت شیخ الحدیثؒ کی طرف سے طواف بیت اللہ کے سات چکر لگانے اور ایصال ثواب کے لیے قرآن کریم کا کچھ حصہ مسجد حرام میں تلاوت کرنے کی توفیق بھی دے دی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کون تھے اور ملک وقوم کے لیے ان کی علمی، دینی وسیاسی خدمات کا دائرہ کس قدر وسیع ہے؟ یہ تذکرہ ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے اور بلاشبہ یہ ان کا حق ہے کہ نئی نسل کو ان کی تگ وتاز، جدوجہد وعمل اور خلوص وایثار کی تابندہ روایات سے آگاہ کیا جائے کیونکہ تاریخ ایسی ہی شخصیات کا مجموعہ ہوتی ہے بلکہ مولانا عبدالحقؒ کا وجود ایسی ہستیوں میں سے ہے جو خود تاریخ بنایا کرتی ہیں اور جن کی جہد وعمل کی روایات تاریخ کا مایۂ صد افتخار حصہ بنتی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحقؒ کی زندگی بنیادی طور پر ایک مصلح اور استاذ کی زندگی تھی، انہوں نے معاشرہ میں قرآن وسنت کی تعلیم کو عام کیا بلکہ صوبہ سرحد میں دینی تعلیم کو ایک تحریک بنا دیا جو آج عظیم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ کی قیادت میں جاری وساری ہے۔ ان کے بلاواسطہ اور بالواسطہ شاگردوں کو شمار کیا جائے تو ہزاروں میں گنتی مشکل ہو جائے گی۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف براہ راست مصروف جہاد ہے جن میں حزب اسلامی کے امیر مولانا محمد یونس خالص اور پکتیا کے شہرہ آفاق کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی بطور خاص

قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحقؒ تین مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں اجمل خٹک جیسے معروف سیاست دان کو مولانا مرحوم کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا، ۱۹۷۷ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ نصر اللہ خٹک اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود شکست کھا گئے، اور ۱۹۸۵ء میں انہیں چارپائی پر پڑے ہوئے ہی علاقہ کے لوگوں نے قومی اسمبلی کا رکن چن لیا۔ قومی اسمبلی میں حضرت مولانا مرحوم کے خطابات علم و دانش، عزم واستقلال اور خلوص و خیر خواہی کا مرقع ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن پاکستان میں اسلامی نظام کا عملی اور مؤثر نفاذ رہا ہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے کسی ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ شریعت بل کی جدوجہد کے سلسلہ میں قیادت کے لیے ان سے درخواست کی گئی تو فرمانے لگے کہ ”بے جان لاشہ ہوں، ہل جل نہیں سکتا لیکن شریعت کے لیے جہاں حکم ہو جانے کے لیے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں چارپائی کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں“۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں ضعف، نقاہت اور علالت ان کے آڑے نہیں آئی، انہیں اسی حالت میں لاہور، بنوں اور راولپنڈی کے اسفار کی زحمت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمائی۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے ساتھ ساتھ افغانستان میں جہاد کی کامیابی اور اسلام کا غلبہ ان کی زندگی کی ایک بڑی تمنا رہی ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے، اپنی جیب سے انہیں سفر خرچ دیتے، ان کے حالات کی خبر رکھتے، مشاورت میں شریک ہوتے اور مجاہدین کی کامیابی کے لیے دعاگو رہتے۔ الغرض حضرت مولانا عبدالحقؒ کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے علماء بلکہ مجاہدین افغانستان بھی اپنے ایک عظیم مربی، سرپرست اور دعاگو بزرگ سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے جانشین حضرت مولانا سمیع الحق کو توفیق دیں کہ وہ اپنے عظیم باپ کی تابناک روایات کو زندہ رکھتے ہوئے قافلہ علماء حق کی قیادت کا فریضہ بہتر طور پر سرانجام دے سکیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء)

(۳)

حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کا شمار پاکستان ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی ان عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا میں علوم دینیہ کی ترویج واشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ و فروغ کا ذریعہ بنیں۔ تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے مولانا عبدالحقؒ کی دینی، علمی، تدریسی اور فکری خدمات جنوبی ایشیا اور اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا میں دینی جدوجہد کی اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور

جہاد افغانستان کو دیکھا جائے تو اس کی پشت پر مولانا عبدالحقؒ کی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے جو بظاہر ایک منحنی سا وجود رکھتے تھے، لیکن علم و فضل اور عزم و ہمت کے اس کوہِ گراں کے ساتھ کمیونزم کے فلسفہ ونظام نے سر پٹخ پٹخ کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا اور آج کا مؤرخ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جہاد افغانستان کی علمی، فکری اور دینی اساس مولانا عبدالحقؒ کی شخصیت اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والا تعلیمی ادارہ دارالعلوم حقانیہ ہے جس کے اثرات افغانستان اور وسطی ایشیا کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔

جہاد افغانستان کی علمی و فکری آبیاری میں ہمارے بہت سے بزرگوں کا حصہ ہے، مگر میں تاریخ کے ایک طالب علم اور اس جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر تین شخصیات کو ان سب کا سرخیل سمجھتا ہوں۔ ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت مولانا عبدالحقؒ کا ہے اور ان کے بعد جہاد افغانستان کے علمی وفکری سرپرستوں میں میرے خیال میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا نام آتا ہے جنہوں نے نہ صرف پاکستان کے علماء و طلبہ کو جہاد افغانستان کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا اور افغان مجاہدین کی سیاسی و اخلاقی پشت پناہی کی بلکہ جہاد افغانستان کے خلاف مختلف اطراف سے اٹھائے جانے والے شکوک واعتراضات کا جواب دیا اور جہاد افغانستان کی ہر لحاظ سے پشتیبانی کی۔

حضرت مولانا عبدالحقؒ کی خدمات کو میں ایک اور حوالہ سے بھی تاریخ کا اہم حصہ شمار کرتا ہوں، اور وہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی دستوری جدوجہد کا باب ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلیوں میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس شخصیت نے دستور سازی میں سب سے زیادہ سنجیدہ کردار ادا کیا ہے اور دستور سازی کے تمام مراحل میں پوری توجہ اور تیاری کے ساتھ محنت کی ہے، وہ حضرت مولانا عبدالحقؒ ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے مرحلہ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ قائد حزب اختلاف تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا صدرالشہیدؒ، مولانا نعمت اللہؒ، مولانا عبدالحکیمؒ، مولانا شاہ احمدؒ نورانی، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور بہت سے دیگر بزرگوں نے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کے لیے محنت کی۔ مگر دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا مطالعہ کیا جائے اور دستور سازی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مولانا عبدالحقؒ کے جداگانہ اور امتیازی کردار کا تذکرہ بہرحال ضروری ہو جاتا ہے۔

(روزنامہ اسلام۔ ۷ مئی ۲۰۱۲ء)

حضرت حافظ غلام حبیب نقشبندیؒ

(تاریخ وفات: ۲۱ ستمبر ۱۹۸۹ء)

حضرت مولانا عبد الرحمان قاسمیؒ کے ساتھ میرا تعارف جمعیۃ علماء اسلام کے حوالے سے ہوا۔ ان دنوں چکوال ضلع جہلم کا حصہ ہوتا تھا اور قاسمی صاحبؒ جمعیۃ کے ضلعی جنرل سیکرٹری تھے جبکہ میں صوبائی سیکرٹری اطلاعات تھا۔ لاہور اور جہلم کی مختلف جماعتی محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں ان کی صاف گوئی، جرأت اور محنت شعار مزاج سے متاثر تھا اور وہ بھی ایک کارکن کے طور پر مجھے احترام سے نوازتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق دوستی اور پھر برادرانہ مراسم تک پہنچ گیا جو ان کے آخری لمحات تک الحمد للہ قائم رہا۔ کافی عرصہ بعد ایک دن ان کا شناختی کارڈ دیکھا تو چونک سا گیا کہ اس پر ان کی تاریخ ولادت ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء درج تھی جبکہ میری تاریخ پیدائش بھی یہی ہے۔ میں نے انہیں بتایا تو خوش ہوئے اور اس احساس نے ذہنی ہم آہنگی میں اور اضافہ کر دیا کہ ہم دونوں ایک ہی روز اس عالم رنگ و بو میں وارد ہوئے تھے۔ جماعتی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ آئے اور جماعتی سیاست نے کئی پلٹے کھائے مگر مزاج اور ذہن کی ہم آہنگی نے ہمیں ہر دور میں ایک ہی کیمپ میں رکھا اور فکر و مزاج کی یگانگت بحمد اللہ قائم رہی۔

میں فکر و سیاست کی دنیا کا آدمی ہوں لیکن ذکر و سلوک کے شعبہ کے مخلصین سے محبت ہمیشہ رہی ہے۔ کوئی اللہ والا میسر آجائے تو حسب موقع استفادہ کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر یہ رنگ مجھ پر نہ چڑھ سکا۔ حتیٰ کہ خود میرے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبید اللہ انور قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی شاید میری اسی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے ایک روز یہ کہہ کر مجھے چھٹی دے دی کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہی تمہارا سبق ہے۔ جبکہ مولانا عبد الرحمان قاسمیؒ کا نسبی تعلق ایک ایسے باصفا بزرگ سے تھا جن کے متوسلین و معتقدین ہزاروں کی تعداد میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اس مشن میں اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا حافظ غلام حبیب نور اللہ مرقدہ کے ساتھ ان کے شریک کار تھے اور بعد میں ان کے جانشین بھی بنے۔ مگر اس فرق و امتیاز کے باوجود ہماری سیاسی رفاقت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ میں نے قاسمی صاحبؒ میں یہ خوبی دیکھی کہ سیاسی پیش قدمی، جماعتی جدوجہد اور قید و بند تک کے مراحل سے گزرنے میں پیرزادگی کبھی ان کے آڑے نہیں آئی۔ اور دینی تحریکات میں انہوں نے جفاکش کارکن اور ایثار پیشہ کے طور پر ہمیشہ سرگرم کردار ادا کیا جس کی یادیں بہت دیر تک ذہن میں تازہ رہیں گی۔

حضرت مولانا حافظ غلام حبیبؒ کے ساتھ میرا تعلق قاسمی صاحبؒ کی وساطت سے تھا۔ ابتداء میں

قاسمی صاحبؒ کے دوست کے طور پر اور پھر جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بزرگانہ شفقت اور دعاؤں سے نوازا۔ مجھے ان کی تین باتوں نے بطور خاص متاثر کیا۔

1. پہلی بات ان کی حق گوئی اور اس معاملہ میں کسی کی پرواہ نہ کرنا ہے۔ وہ غلط بات پر فی الفور ٹوک دیا کرتے تھے اور کسی رعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس حوالے سے مجھے دو بزرگ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک حضرت مولانا مفتی بشیر احمد پسروری قدس اللہ سرہ العزیز جن کے ساتھ نیاز مندانہ تعلق تو عرصہ سے تھا مگر جب ان کے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں حاضری کا موقع ملا اور ان کی اسٹیج پر موجودگی کے دوران مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تو ایک بزرگ نے خطاب سے پہلے میرے کان میں کہا کہ یہاں ذرا سنبھل کر بات کرنا، باباجی تقریر کے دوران اٹھ کر ٹوک دیا کرتے ہیں۔ یہ نصیحت میرے کام آئی اور میں نے گفتگو کی تکنیک ہی یہ اختیار کرلی کہ کوئی بات کہنے کے بعد مڑ کر باباجی سے پوچھ لیا تھا کہ ”کیوں حضرت ٹھیک ہے؟“ یہی بات مجھے مولانا عبد الرحمان قاسمیؒ نے اس دن کہی جب میں پہلی دفعہ دارالعلوم حنفیہ چکوال کے جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے کھڑا ہوا جب کہ حضرت مولانا حافظ غلام حبیب نقشبندی قدس اللہ سرہ العزیز اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ چنانچہ پسرور والی تکنیک کسی حد تک میں نے یہاں بھی دہرائی اور ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے باباجی کی دعاؤں اور شفقتوں سے فیض یاب ہوا۔

2. حضرت حافظ صاحبؒ کی دوسری بات جس نے مجھے بطور خاص متاثر کیا ان کی تواضع اور انکساری تھی۔ ہزاروں افراد کے محبوب روحانی پیشوا ہونے کے باوجود وہ مجھ جیسے کارکنوں کو جس انداز سے ملتے اس سے خود ہی ہمیں شرمساری ہوتی۔ لیکن ان کے انداز میں تواضع اس طرح جھلکتی جیسے یہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہو۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولے گا جب ایک موقع پر مسجد حرام میں تھا اور مغرب کے بعد مختلف علماء کے حلقوں میں گھوم پھر کر اس منظر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اسی دوران ایک طرف خاصا بڑا حلقہ دیکھ کر متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حافظ غلام حبیب نقشبندیؒ مریدوں کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ میں بھی وہاں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ان کے قریب جا پہنچا، انہوں نے دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا، سینے سے لگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے وہاں بیٹھنے کو کہا۔ یہ میرے لیے انتہائی شرمندگی کا مقام تھا مگر انہوں نے زبردستی ساتھ بٹھا لیا۔ جبکہ اس سے اگلا مرحلہ میرے لیے اور زیادہ امتحان اور

آزمائش کا مرحلہ ثابت ہوا جب انہوں نے سب شرکاء محفل کو میری طرف متوجہ کر کے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ میں ان کے سامنے حج کے ضروری مسائل بیان کروں گا۔ میرے لیے یہ بات قطعی طور پر خلاف توقع تھی کہ حرم پاک تھا، سامنے بیت اللہ شریف تھا، حلقہ حضرت حافظ صاحبؒ کے معتقدین کا تھا۔ اس لیے معذرت کی مگر معذرت قبول نہ ہوئی اور مجھے ان حضرات کے سامنے کچھ نہ کچھ کہنا پڑا۔ یہ حضرت حافظ صاحبؒ کی شفقت، تواضع، اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کا مزاج تھا جس کا نقش ابھی تک ذہن پر مرتسم ہے۔

3. ان کی تیسری بات جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ قرآن کریم کے ساتھ ان کا شغف اور قرآنی مضامین پر ان کا عبور تھا۔ موضوع پر خطاب کرتے ہوئے وہ اپنے مضمون کے مطابق قرآن کریم کی آیات اس ترتیب کے ساتھ پڑھتے چلے جاتے تھے جیسے کوئی پختہ کار حافظ تراویح میں قرآن پاک سناتا ہے۔ مجھے کئی بار اس کا اتفاق ہوا اور مضامین کے لحاظ سے قرآنی آیات پر ان کے اس قدر استحضار پر خوشگوار حیرت ہوتی۔ اس حوالہ سے بھی ایک ذاتی واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دوران سفر میری طبیعت ذکر واذکار کی بجائے مسائل پر غور و خوض اور فکر و تدبیر کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اور سفر کا بیشتر حصہ دینی و قومی مسائل پر سوچتے ہوئے خاموشی کے ساتھ گزرتا ہے۔ مگر ایک بار حضرت حافظ صاحبؒ کی علالت کے دوران بیمار پرسی کے لیے چکوال حاضر ہوا اور کچھ دیر ان کی خدمت میں بیٹھا تو واپسی پر بس میں بیٹھتے ہی زبان پر بے ساختہ قرآن کریم کی مختلف سورتوں کی تلاوت جاری ہوگئی اور راولپنڈی پہنچنے تک مسلسل تلاوت کرتا رہا جو میری زندگی کا منفرد تجربہ تھا۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی تاثر ابھر رہا تھا کہ یہ حضرت حافظ صاحبؒ کی صحبت کا اثر ہے۔

میں دعا گو ہوں کہ رب العزت حضرت حافظ صاحبؒ اور برادرم قاسمی صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے خاندان اور متوسلین کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

حضرت مولانا عزیر گلؒ

(۱)

سترہ نومبر کو روزنامہ جنگ لاہور کے آخری صفحہ پر ایک کونے میں یہ خبر نظر سے گزری کہ تحریکِ آزادی برصغیر کے نامور مجاہد اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے رفیق حضرت مولانا عزیر گلؒ انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ علالت اور ضعف و نقاہت کی خبریں کافی عرصہ سے آرہی تھیں اور عمر بھی سو سال سے تجاوز کر چکی تھی مگر اس کے باوجود دل اس خبر پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوا۔ خبر کو بار بار پڑھا، ذمہ دار علماء کرام کے تعزیتی پیغامات بھی ساتھ تھے اس لیے ماننے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، زبان پر بے ساختہ اناللہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا کہ موت ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اس نے بہرحال جانا ہے کل من علیھا فان ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

مولانا عزیر گلؒ کون تھے؟ آج کی نسل اس سے باخبر نہیں ہے اور نئی نسل کو اس کے ماضی اور اقدار و روایات سے باخبر رکھنے کی ذمہ داری جن حضرات پر ہے انہیں نہ اس کی ضرورت کا احساس ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت ان کے ذہنوں میں موجود ہے۔ مولانا عزیر گلؒ اس قافلۂ حریت کے فرد تھے جس نے برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف عسکری، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی جنگ لڑی اور بالآخر اسے شکست دے کر اس خطۂ زمین کی آزادی کی راہ ہموار کی۔

اس قافلۂ حریت کے ایک عظیم سالار شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے جنہوں نے اس صدی کے دوسرے عشرہ میں متحدہ ہندوستان کی آزادی کا منصوبہ بنایا اور ملک کے طول و عرض میں مجاہدین آزادی کی فوج منظم کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کو جنگِ آزادی میں ہمنوا بنا کر ان کا تعاون حاصل کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ یہ منصوبہ برطانوی سی آئی ڈی کے کاغذات میں ”ریشمی خطوط سازش کیس“ کے نام سے اس کے ریکارڈ کا ایک اہم حصہ ہے اور ہماری تاریخ میں ”تحریک ریشمی رومال“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ”دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا“ کے مصداق یہ منصوبہ عین اس وقت برطانوی سی آئی ڈی کے ہتھے چڑھ گیا جب کہ ملک کے اندر حریت پسند افواج کی تربیت و تنظیم کا کام کم و بیش مکمل ہو چکا تھا اور ترکی کی خلافت عثمانیہ سے عسکری و سیاسی تعاون کے حصول کے لیے حجاز مقدس میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ترک حکام کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھے۔ جہادِ آزادی کی منصوبہ بندی کے بارے میں ریشمی رومالوں پر لکھے گئے خفیہ خطوط برطانوی کارندوں کے ہتھے چڑھتے ہی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا اور متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں تحریک سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات حراست میں لے لیے گئے۔

مولانا عزیر گلؒ اس تحریک اور منصوبہ بندی میں شیخ الہندؒ کے معتمد رفیق تھے اور انہی کے ساتھ گرفتار ہو

کر مالٹا جزیرہ میں کم و بیش پونے چار سال تک نظر بند رہے۔ مولانا عزیر گلؒ مالاکنڈ ایجنسی کے رہنے والے تھے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دینی تعلیم کی تکمیل کی اور پھر انہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ آزاد قبائل میں فرنگی فوجوں کے ساتھ مسلسل لڑنے والے حریت پسند قبائل کے ساتھ شیخ الہندؒ کے خصوصی روابط تھے اور اس علاقہ میں شیخ الہندؒ کے شاگردوں اور حریت پسند رفقاء کی ایک بڑی تعداد مصروفِ جہاد تھی۔ قبائل کے ساتھ خفیہ روابط کے لیے مولانا عزیر گلؒ کو شیخ الہندؒ کے معتمد ایلچی کی حیثیت حاصل تھی اور وہ باہمی رابطہ کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو مولانا عزیر گلؒ پر کس قدر اعتماد تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے مطابق حجازِ مقدس میں ترک حکام کے ساتھ شیخ الہندؒ کا جو خفیہ معاہدہ طے پانے والا تھا اسے ہندوستان کے معتمد رفقاء تک پہنچانے کی ذمہ داری مولانا عزیر گلؒ کے سپرد ہوئی تھی۔ مولانا عزیر گلؒ اپنے استاد اور قائد حضرت شیخ الہندؒ کے عاشق زار تھے، مالٹا کی تنہائیوں میں خدمت کی سعادت حاصل کی اور اپنے عظیم استادؒ کے عظیم مشن میں ان کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

مولانا عزیر گلؒ حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی تک ان کے ساتھ متحرک رہے مگر ان کی وفات کے بعد پھر کام میں وہ مزہ نہ ملا اور قیام پاکستان کے بعد تو بالکل ہی گوشہ نشین ہو گئے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں سخاکوٹ سے دو میل کے فاصلے پر "سیرے" نامی گاؤں ان کا آبائی گاؤں ہے، وہیں سکونت اختیار کر لی۔ راقم الحروف کو متعدّد بار حضرت مولانا عزیر گلؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ تب صحت مند اور چاق و چوبند تھے، مزاج میں بے تکلفی، نمود و نمائش سے دلی نفرت اور مہمان نوازی ان کی خصوصیات تھیں۔ اپنے محبوب استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی یادوں کے سہارے جی رہے تھے، انہی کا تذکرہ اکثر زبان پر رہتا اور بہت سے دوست تو یہی محبوب تذکرہ سننے ان کی مجلس میں جایا کرتے تھے۔

مولانا عزیر گلؒ کا سینہ تحریک آزادی کی کئی ان کہی کہانیوں کا مخزن تھا، اے کاش کہ اس خزانہ کو تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ کرنے کا کوئی اہتمام ہو جاتا مگر اب کفِ افسوس ملنے سے کیا فائدہ۔ وہ اپنی یادوں اور خزانوں سمیت ہم سے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء)

(۲)

(اسیر مالٹا کانفرنس مردان کے موقع پر خصوصی تحریر)

آزادئ ہند کے عظیم مجاہد مولانا عزیر گلؒ کی یاد میں شیر گڑھ مردان میں منعقد ہونے والا آج کا سیمینار اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ نئی نسل کو ان عظیم اسلاف کی جدوجہد اور قربانیوں سے واقف کرانے کی ایک کوشش ہے جنہوں نے برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش پر برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلسل جنگ لڑی اور جن کی جہد مسلسل کا ثمرہ ہے کہ آج یہ خطہ اسلامی روایات اور دینی حمیت کے امین کی حیثیت سے پورے عالم اسلام میں نمایاں نظر آرہا ہے اور جسے پوری دنیا میں اسلامی بنیاد پرستی کا سب سے بڑا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔

اس خطے کی جنگ آزادی کی تاریخ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کا شمار تحریک حریت کے ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کے تذکرہ کے بغیر اس تاریخ کا بنیادی باب مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ دیوبند کے قصبہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد قائم ہونے والے اس دینی مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے دنیا میں متعارف ہوا اور جسے آج بھی جنوبی ایشیا میں دینی تعلیم، اسلامی حمیت اور مذہبی ثقافت کا سب سے بڑا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۶ء میں بظاہر دینی علوم کی حفاظت و ترویج کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور اس دینی درسگاہ نے قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی حفاظت اور تعلیم و ترویج میں جو شاندار کردار ادا کیا اس کے مظاہر ان ہزاروں دینی مدارس کی صورت میں نظر آرہے ہیں جو جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں آج پورے وقار اور عزم کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دینی اقدار و روایات کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن یہ ہدف صرف تعلیم و تدریس تک محدود نہیں تھا بلکہ مسلم امہ کی عظمت رفتہ کی بحالی اور وطن کی حریت و استخلاص اس کی اصل منزل تھی جس کے لیے اس درسگاہ اور اس کی معاون ہزاروں درسگاہوں نے عزم و استقلال اور جوش و ولولہ سے بہرہ ور کارکنوں اور رہنماؤں کی کھیپ مہیا کی اور امت مسلمہ کو عزیمت و استقامت کے ساتھ آزادی اور اسلامی تشخص کی بحالی کا راستہ دکھایا۔

مولانا عزیر گلؒ انہی حضرت شیخ الہند کے رفیق کار اور معتمد خاص تھے جنہوں نے اپنے دور میں آزادئ وطن کی اس جدوجہد کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ عملاً خود آگے بڑھ کر قیادت فرمائی۔ اس لیے مولانا عزیر گل کے مشن اور مقام کو سمجھنے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ ایک دور وہ تھا جب شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کر کے اسی مادر علمی میں

ایک عرصہ تک تعلیمی و تدریسی خدمات میں مصروف رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ تحریک آزادی کے لیے بھی ان کے روابط بڑھتے رہے۔ اور وہ مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ملک میں جلد از جلد ایسا ماحول پیدا ہو کہ وہ برطانوی استعمار کے جابرانہ تسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کر سکیں۔ جب تک ان کی یہ سرگرمیاں در پردہ رہیں بات آسانی سے آگے بڑھتی رہی لیکن جونہی انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے شاگردوں، عقیدت مندوں اور خیر خواہوں کی اتنی کھیپ مہیا کر چکے ہیں جو آزادی کی کسی نئی عملی جدوجہد کی بنیاد بن سکتی ہے تو انہوں نے اپنے عزائم کا کھلم کھلا اظہار کرنا شروع کر دیا اور اس سے خالص تعلیمی اور تدریسی ماحول میں ارتعاش کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ دارالعلوم دیوبند کے منتظمین جو ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں سے لاتعلق رہتے ہوئے خالصتاً تعلیمی اور تربیتی ماحول کو قائم رکھے ہوئے تھے، انہیں اس مرحلہ پر تشویش ہوئی اور یہ خطرہ محسوس ہوا کہ جو کچھ وہ امن و سلامتی کے ماحول میں کر پا رہے ہیں وہ بھی کہیں زد میں نہ آ جائے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی سوانح حیات "حیات گیلانی" میں مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی اس منظر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ

> "کہنا چاہیے کہ پھر وہی جذبہ جو مولانا مناظر احسن گیلانی کو ٹونک سے اجمیر تک لے گیا تھا وہی بالآخر دیوبند کھینچ لایا اور کون نہیں جانتا کہ اس زمانے میں دیوبند آزادی کی جنگ کا مرکز تھا، شیخ الہند بقید حیات تھے اور ریشمی رومال کی تحریک شباب پر تھی۔ اسی جذبے نے آپ کو شیخ الہند کے قریب کیا اور اس وقت کے نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمان عثمانی نے آپ کو اپنا وکیل بنا کر شیخ الہند رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا رحمہ اللہ نے "بیتے ہوئے دن" میں اس واقعہ کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں، ایک دن مولانا حبیب الرحمان عثمانی نے فقیر کو یاد کیا اور کہا کہ تم شیخ الہند سے مل کر دریافت کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے؟ مولانا یہ سوال لے کر حضرت شیخ الہند کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور جو کہا گیا تھا وہ پوچھا تو شیخ الہند نے جواب میں فرمایا کہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا گیا تھا اور آخر میں فرمایا کہ تعلیم و تعلم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن خود اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے قائم کیا تھا، فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا

ہے جسے آخری حد تک کر گزروں گا۔ چنانچہ اس کے ڈیڑھ دو سال بعد حج کے ارادہ سے حجاز کا سفر کیا اور اسی سفر حجاز میں مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچائے گئے اور وہاں سے ساڑھے تین سال بعد رہائی ملی۔" (حیات گیلانی ص ۲۴۲)

حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریک جو ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے تاریخ کا حصہ بنی، ان کے اسی عزم کا مظہر تھی اور انہوں نے اس کے لیے نہ صرف متحدہ ہندوستان کے اندر آزادی کے متوالوں کو حریت و استخلاص کی فیصلہ کن جدوجہد کے لیے تیار کیا بلکہ عالمی سطح پر برطانوی استعمار کے مخالفوں جرمنی اور جاپان کے ساتھ ساتھ ترکی کی خلافت عثمانیہ اور افغانستان کے ساتھ بھی روابط کو استوار کیا اور انہیں اس جدوجہد میں متحدہ ہندوستان کے حریت پسندوں کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔ لیکن ابھی یہ تانا بانا بنا جا رہا تھا اور اسی سلسلے میں شیخ الہند حجاز مقدس میں مقیم تھے جو اس وقت تک ترکی کی خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا کہ اچانک مکہ مکرمہ کے عثمانی گورنر شریف مکہ حسین ہاشمی نے برطانوی استعمار کے ساتھ ساز باز کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور اسی کشمکش میں خلافت عثمانیہ کی مخالفت نہ کرنے پر شیخ الہندؒ کو ان کے رفقاء سمیت گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

مولانا عزیر گلؒ اس سفر میں حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص اور خادم کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھے اور گرفتاری کے بعد مالٹا کے جزیرہ کی ساڑھے تین سالہ نظربندی میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ مولانا عزیر گلؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس تحریک کی تیاری میں قبائل کے ساتھ روابط کے لیے وہ شیخ الہند کے خاص نمائندے تھے اور اس حوالے سے بہت سے رازوں کے امین تھے لیکن مزاج کے اعتبار سے شہرت سے دور بھاگنے والے بزرگ تھے۔ اس لیے تحریک آزادی کے اس نازک مرحلے کے بہت سے رازہائے درون خانہ ان کے سینے میں ہی ان کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ مجھے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کی ادارت کے دور میں دو تین مرتبہ مولانا عزیر گل کی خدمت میں ان کے گاؤں میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک بار تو ایسا اتفاق ہوا کہ میں جب ان کے گاؤں "سیرے" پہنچا تو ان کے بھائی مولانا عبد الحق نافع گلؒ کا انتقال ہو چکا تھا، نماز جنازہ کی ادائیگی اور قبر میں ان کی تدفین کے بعد قبر پر دعا ہو رہی تھی، میں اس دعا میں شریک ہوا۔

مولانا نافع گلؒ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں رہے ہیں، میرے چچا مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم ایک مشفق استاد کے طور پر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے مگر میں ان کی زیارت نہ کر سکا تھا۔ ان حاضریوں کے موقع پر میں نے ماضی کے واقعات کے حوالہ سے مولانا عزیر گلؒ کو متعدد بار کریدنے کی

کوشش کی، ایک دفعہ وہ بے تکلف بھی ہوئے مگر میرے ہاتھ میں قلم دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے حوالہ سے تاریخ بیان کی جائے اور تحریک آزادی کے واقعات کا ان کی روایت سے تذکرہ کیا جائے۔ البتہ اپنے محبوب استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا تذکرہ انتہائی والہانہ انداز میں کرتے اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے چہرے کی کیفیت بھی اور ہی ہو جاتی تھی۔ مجھے جب ان کی خدمت میں جانا ہوتا، مالاکنڈ میں صاحبزادہ خالد جان کے پاس پہنچ جاتا جو جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سرحد کے سابق سیکرٹری جنرل صاحبزادہ عبد الباری جانؒ کے بھتیجے ہیں اور جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم کارکن ہیں۔ اب غالباً جمعیۃ کی طرف سے سینٹ کے ممبر ہیں، وہ مجھے لے کر مولانا عزیر گلؒ کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک آدھ رات قیام ہوتا اور مختلف حوالوں سے گفتگو ہوگی، قلم کو حرکت دینے کی اجازت نہ تھی اس لیے یہ ملاقاتیں ذاتی استفادہ اور زیارت تک محدود رہیں اور میں کوشش کے باوجود انہیں محفوظ نہیں رکھ سکا۔ یہ ہمارے اکابر کی بے نفسی تھی ورنہ تحریک آزادی میں کردار کے حوالہ سے مولانا عزیر گلؒ اس مقام کے بزرگ تھے کہ ان کے حالات و کردار پر کئی ضخیم کتابیں شائع ہو سکتی تھیں مگر خود کو چھپانے اور اپنا اجر صرف اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنے کے ذوق نے انہیں کئی پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں جو کچھ تھے شیخ الہندؒ تھے اور میں صرف ان کا ایک خادم تھا۔ اس لیے جتنا تذکرہ بھی کرنا ہے شیخ الہندؒ کا کرو اور ان کی خدمات اور جدوجہد سے لوگوں کو متعارف کراؤ۔

میں حضرت مولانا عزیر گلؒ کی یاد میں سیمینار کا اہتمام کرنے والے دوستوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کا شکر گزار بھی ہوں کہ ان کے یاد دلانے پر ذہن میں ماضی کی کچھ حسین یادیں تازہ ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ کو جنت الفردوس میں بلند تر مقام سے نوازیں اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۳ اپریل ۲۰۰۶ء)

حضرت مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ

حضرت مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ (تاریخ وفات: ۲۷ جون ۱۹۹۱ء) کے ساتھ غائبانہ تعارف تو بچپن ہی سے تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں طالب علمی کے زمانے میں (۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۰ء) میرا معمول یہ تھا کہ شہر میں جہاں کہیں کسی لائبریری یا دار المطالعہ کا پتہ چلتا وہاں تک رسائی کی کوشش کرتا اور اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے لیے کچھ نہ کچھ وقت روزانہ صرف ہو جاتا۔ انہی میں سے ایک دار المطالعہ چوک

نیائیں میں اہل حدیث دوستوں کا بھی تھا۔ سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ روزانہ یا کم از کم ہفتہ میں دوبارہ وہاں ضرور جاتا اور کچھ وقت مطالعہ میں گزارتا۔ ہفت روزہ المنبر سے وہیں شناسائی ہوئی اور مختلف عنوانات پر حکیم صاحب کی تحریرات پڑھنے کا موقع ملا۔ البتہ یہ دور حکیم صاحب کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور فکری موافقت کا دور نہیں تھا۔ کیونکہ میرا شمار اس دور میں دینی مدارس کے ان طلبہ میں ہوتا تھا جو جماعت اسلامی کے شدید مخالف اور جمال عبدالناصر مرحوم کے پرجوش حامی تھے۔ ہم لوگ اس وقت جمال عبدالناصر کو عالم اسلام کی استعمار دشمن قوتوں کا نمائندہ سمجھتے تھے جبکہ جماعت اسلامی ہمارے نزدیک استعمار دوست حلقوں اور دانشوروں کی کمین گاہ تصور ہوتی تھی۔ حکیم صاحب مرحوم جمال عبدالناصر کے شدید مخالف تھے اور ایک عرصہ تک ان کا تعلق جماعت اسلامی کے ساتھ رہ چکا تھا، اس لیے ان کے مضامین پڑھنے کے باوجود ان کے لیے دل کے کسی گوشے میں انس یا موافقت کا کوئی جذبہ اس دور میں موجود نہیں پاتا تھا۔

یہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی صحبت اور تربیت کا فیض ہے کہ طالب علمی کے دور سے ہی یہ ذوق چلا آرہا تھا کہ کسی بھی مسئلہ پر کچھ کہنے سننے یا رائے قائم کرنے سے پہلے موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا اور دونوں فریقوں کے نقطۂ نظر اور موقف سے آگاہی حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسی نقطۂ نظر سے حکیم صاحب مرحوم کی تحریرات کا مطالعہ کرتا، ان میں مین میخ نکالتا اور کبھی کبھار دوستوں کی محفل میں ان پر تبصرہ بھی کرتا تھا۔

اس صورتحال میں تبدیلی کا آغاز اس وقت ہوا جب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ کے کچھ مضامین قادیانیت کے خلاف سامنے آئے۔ قادیانیت کے خلاف جدوجہد میری گھٹی میں شامل تھی۔ زندگی میں پہلی بار چار پانچ سال کی عمر میں والد صاحب کو آٹھ دس ماہ تک مسلسل گھر سے غائب پایا تو یہ ۱۹۵۳ء کا سال تھا جب وہ تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں کم وبیش دس ماہ جیل میں رہے اور ان کی گرفتاری ورہائی کا منظر اب تک نگاہوں کے سامنے ہے۔ قادیانیت کے خلاف حکیم صاحبؒ کے مضامین اور کتابچے منظر عام پر آئے تو انہیں نہ صرف خود پڑھا بلکہ بہت سے دوستوں کو پڑھایا۔

حکیم صاحبؒ کا اپنا انداز تحریر تھا، وہ بات کو سمجھانے کے لیے اسے کئی پہلوؤں اور نکات میں تقسیم کر لیتے تھے اور پھر ایک ایک کو موضوعِ بحث بنا کر اپنا موقف پورے شرح وبسط کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ زیر بحث مسئلہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا پہلو بھی مخاطب کی نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ مجھے اس طرزِ تحریر سے مناسبت نہیں ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ لمبی سے لمبی بات مختصر الفاظ

میں اس طرح بیان ہو جائے کہ مخاطب بات کا اصل مقصد سمجھ لے۔ مگر اس کے باوجود قادیانیت کے بارے میں حکیم صاحب مرحوم کے مضامین بہت پسند آئے اور اس کے بعد کافی عرصہ تک یہ سلسلہ رہا کہ جدید تعلیم سے بہرہ ور کوئی دوست قادیانیت کے بارے میں لٹریچر کی نشاندہی کے لیے کہتا تو اسے جن کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ان میں حکیم صاحبؒ کے مضامین اور کتابچے بھی شامل ہوتے۔ یوں حکیم صاحبؒ کے ساتھ کسی درجہ ذہنی انس اور فکری ہم آہنگی کے دور کا آغاز ہوا۔

حکیم صاحبؒ کے ساتھ پہلی ملاقات غالباً اس دور میں ہوئی جب انہوں نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ کا آغاز کیا اور اس کے لیے مختلف مکاتب فکر کے اہل علم کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں تدریس کے لیے جن حضرات کو اکٹھا کیا ان میں عزنی خیل ضلع لکی مروت کے مولانا احمد جان بھی تھے جن کا تعلق جمعیۃ علماء اسلام سے تھا اور وہ ایک موقع پر جمعیۃ کی طرف سے ایم این اے بھی منتخب ہوئے تھے۔ میرا ان سے جماعتی تعلق تھا اور دوستانہ بے تکلفی بھی تھی اور وہی مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ کے ساتھ میری ملاقات کا باعث بنے۔ یہ ملاقات حکیم صاحبؒ کی رہائش گاہ پر ہوئی جو رات کافی دیر تک جاری رہی اور اس میں میرے ایک اور مخدوم حضرت مولانا عبد الغفار حسنؒ بھی موجود تھے۔ مولانا عبد الغفار حسنؒ بزرگ اہل حدیث عالم دین تھے اور میرے ان بزرگوں میں سے تھے جو ہمیشہ شفقتوں اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے ساتھ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جیل میں اکٹھے رہے اور اسی مناسبت سے مجھے بھتیجا کہتے تھے۔ اور میری بھی کوشش رہتی تھی کہ جب بھی موقع ملے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر راہنمائی، شفقت اور دعاؤں کا حصہ وصول کروں۔

بہر حال مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ کی رہائش گاہ پر ان سے اور ان کے ہمراہ مولانا عبد الغفار حسنؒ اور مولانا احمد جان عزنی خیل کے ساتھ ابتدائی ملاقات کی یہ طویل نشست اب تک اپنی بیشتر تفصیلات سمیت ذہن میں محفوظ ہے اور کبھی کبھی اسے ذہن کی اسکرین پر سجا کر ”حظ مکرر“ کا لطف اٹھا لیتا ہوں۔ سچی بات ہے کہ حکیم صاحبؒ کی سادگی، خلوص، جذبۂ خیر خواہی اور دینی تقاضوں کے ساتھ ان کی بے لچک وابستگی نے بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا ایک ان گنت سلسلہ ہے جنہیں شاید شمار بھی نہ کر سکوں۔ بہت سے دینی و قومی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی رہی۔ متعدّد امور میں مجھے ان سے اختلاف بھی رہا مگر ان کی شفقت اور خلوص نے ہمیشہ متاثر کیا۔ میری حیثیت ہر لحاظ سے ان کے سامنے بچوں جیسی تھی لیکن انہوں نے ہر بار شفقت بھرے احترام سے نوازا۔

حکیم صاحبؒ کی خواہش ہوتی تھی کہ میں جب بھی فیصل آباد جاؤں ان سے ضرور ملوں۔ اور کئی مواقع پر یہ معلوم کر کے کہ میں فیصل آباد گیا اور ان سے نہیں ملا تو وہ باقاعدہ ناراضی کا اظہار کرتے اور اگلی ملاقات میں یا خط کی صورت میں اس کا شکوہ کرتے۔ مگر میرے لیے اکثر اوقات مشکل یہ ہوتی تھی کہ حکیم صاحبؒ کے ساتھ ملاقات کے لیے تھوڑا بہت وقت کفایت نہیں کرتا تھا۔ وہ شب زندہ دار بزرگ تھے اور ان کے ساتھ اطمینان کی ملاقات رات کو ہی ہو سکتی تھی۔ اس لیے ملاقات کرنے والے کو شب زندہ دار بننا پڑتا تھا جبکہ میں اس معاملہ میں بہت کمزور بلکہ بہت ہی کمزور واقع ہوا ہوں۔ اس لیے کئی بار ان کی ناراضی بلکہ ڈانٹ کا حظ اٹھانا پڑا۔

ایک دور میں حکیم صاحبؒ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں سیاسی جھمیلوں سے خود کو الگ کر کے تعلیمی لائن اختیار کروں اور ان کے پاس جامعہ تعلیمات اسلامیہ آجاؤں۔ مگر اس وقت سیاست کا جنون ذہن پر اس قدر حاوی تھا کہ اس قسم کا کوئی مشورہ سنتے ہوئے بھی ذہن پر بوجھ محسوس ہوتا تھا اس لیے ان کی مخلصانہ پیشکش کو قبول نہ کر سکا۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جب دستوری اور قانونی طور پر چند اسلامی اصلاحات سامنے آئیں تو حکیم صاحبؒ کی انتہائی مخلصانہ کوشش تھی کہ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام متحد ہو کر جنرل صاحب کا بھرپور ساتھ دیں اور سب مصلحتوں اور تقاضوں کو چھوڑ کر پوری قوت کے ساتھ جنرل ضیاء الحق مرحوم کی پشت پر کھڑے ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے حکیم صاحبؒ نے جن دینی کارکنوں کو قائل کرنے کی مسلسل کوشش کی ان میں میرا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے کئی نشستوں میں مجھے اس بات پر قائل کرنا چاہا کہ میرے جیسے کارکنوں کو جنرل ضیاء الحق مرحوم کے کیمپ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ جب جنرل صاحب مرحوم نے وفاقی مجلس شوریٰ تشکیل دی تو حکیم صاحبؒ کی خواہش تھی کہ میں بھی اس میں شامل ہوں جس کے لیے وہ غالباً جنرل صاحب مرحوم سے بات کر چکے تھے۔ مجھے حکیم صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو اپنے ساتھ دو تین اور مرضی کے افراد کے نام بھی شوریٰ کے لیے پیش کر سکتا ہوں۔ مگر میرے لیے اس وقت دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک یہ کہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ذمہ دار حضرات میں شمار ہوتا تھا اور میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی مرضی کے بغیر اس قسم کا کوئی قدم اٹھاتا۔ جبکہ ان دونوں بزرگوں کی رائے اس کے حق میں نہیں تھی۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ میں خود بھی ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا اور میرا موقف یہ تھا کہ جنرل صاحب کے اقدامات کا کوئی عملی نتیجہ موجودہ حالات میں سامنے آنے کی توقع نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اقدامات کی

اصولی حمایت کے باوجود نظریاتی کارکنوں کو اس کیمپ میں شامل ہونے کی بجائے ''ریزرو'' میں رہنا چاہیے اور سب لوگوں کو اسلامی اصلاحات کی ناکامی کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہو جانا چاہیے۔ اس لیے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ حکیم صاحبؒ یہ سب کچھ خلوص، شفقت اور ہمدردی کے ساتھ کہہ رہے ہیں، ان کی مخلصانہ جدوجہد میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔

مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف مسلکاً اہل حدیث تھے مگر روایتی مسلکی تعصب سے بالکل پاک اور عین اس طرح تھے جیسے کسی بھی مسلک کے صاحبِ علم اور سنجیدہ حضرات کو ہونا چاہیے۔ ان کے تعلقات اور روابط ہر مسلک کے حضرات سے تھے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ مختلف مسالک کے علماء اور کارکنوں کے درمیان مفاہمت کی فضا قائم ہو اور مشترکہ قومی و دینی مقاصد کے لیے سب مل جل کر کام کریں۔ اسی لیے دینی حلقوں کے باہمی اتحاد کی ہر سنجیدہ کوشش میں وہ پیش پیش رہے۔ اسلامی روایات و اقدار کا تحفظ، نظام شریعت کا نفاذ، ملکی سالمیت اور قومی وحدت ان کی دلچسپی کے خصوصی موضوعات تھے اور ان میں سے کسی بھی امر کے بارے میں کوئی مسئلہ پیش آتا تو بالکل بے لچک ہو جاتے تھے۔ ان حوالوں سے ان کی ترجیحات اپنی ہوتی تھیں اور کوئی سیاسی یا غیر سیاسی مصلحت ان کی راہ میں حائل نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ ان دانشوروں میں سے تھے جو حکمرانوں کے ساتھ الجھاؤ اور کشمکش کی فضا قائم کرنے کی بجائے حکمت و دانش اور مفاہمت کے ماحول میں ان سے کام لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ انہیں یہ فن آتا تھا اور کئی بار دینی و قومی تحریکات نے ان کی اس صلاحیت سے استفادہ کیا۔ لیکن طاقتور حکمرانوں کے ساتھ روابط اور قرب کے باوجود ان کا دامن مفادات اور اغراض کی آلائشوں سے ہمیشہ پاک رہا اور ان کے کسی بڑے سے بڑے مخالف کو بھی اس حوالہ سے ان پر انگلی اٹھانے کی کبھی گنجائش نہیں ملی۔ وہ ذاکر و شاغل بزرگ تھے، ان کے شب و روز کے اوقات کا ایک متعیّن حصہ ذکر و اذکار اور نوافل میں گزرتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں انہیں اپنے دوستوں کی محفل میں بسا اوقات ''وہابی صوفی'' بھی کہہ دیا کرتا تھا۔

آخر عمر میں حکیم صاحبؒ کی یادداشت متاثر ہو گئی تھی۔ اس دوران ایک روز میں بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوا تو حسب عادت پرتپاک طریقہ سے ملے اور تاثر یہی دیا جیسے مجھے پہچان گئے ہوں۔ لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اخلاقاً ایسا کر رہے ہیں اور یادداشت ان کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبولیت سے نوازیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر سرفراز کریں، آمین یارب العالمین۔

(مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ۔ حیات و خدمات (۱)۔ اشاعت ۲۰۱۷ء)

حضرت مولانا جمیل احمد میواتی دہلویؒ

حضرت مولانا پیر جمیل احمد میواتی ثم دہلویؒ (۱۹ جنوری ۱۹۹۲ء) کی زیارت و ملاقات ۱۹۷۰ء میں پہلی بار ہوئی جب وہ جمعیۃ علماء اسلام کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ضلع لاہور کے ایک حلقہ کے امیدوار تھے۔ اس کے بعد ان سے متعدّد ملاقاتیں ہوئیں، بعض مجالس ذکر میں شرکت کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور ان کی شفقت اور دعاؤں سے شاد کام ہونے کا موقع بھی ملا۔ حضرت مرحوم کے ساتھ میرا تعلق دو حوالوں سے تھا۔ ایک جمعیۃ علماء اسلام کے حوالہ سے کہ وہ علماء حق اہل سنت والجماعت کے اس قافلہ کے ذی شعور افراد میں سے تھے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نور اللہ مرقدہ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ جمعیۃ کے اجلاسوں میں شریک ہونا اور تحریکات میں حصہ لینا، حالانکہ الیکشن کے جھمیلوں میں پڑنا تصوف و سلوک کے شعبہ سے تعلق رکھنے والوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے اکابر نے دین کے مختلف شعبوں میں وحدت و اشتراک کو کچھ اس شان سے اجاگر کیا کہ سیاست و الیکشن کی معرکہ آرائی بھی سلوک و احسان کی طرح خالص دین اور عبادت کے ذوق میں ڈھل کر رہ گئی۔ جبکہ دوسرا حوالہ شیرانوالہ لاہور کا تھا کہ وہ میرے لیے روحانی فیض کا سرچشمہ تھا اور حضرت مولانا مرحوم بھی اسی تعلق سے وہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور حسن اتفاق یہ تھا کہ ہماری سیاست اور سلوک دونوں کا مرکز شیرانوالہ تھا، جہاں سے مرشدی حضرت مولانا عبید اللہ انور قدس اللہ سرہ العزیز کی برکت سے ہمیں دونوں خوراکیں بیک وقت حاصل ہوتی رہیں۔ ویسے بھی تصوف و سیاست آپس میں جڑواں ہیں، اول الذکر کا موضوع فرد کی اصلاح ہے اور دوسرے شعبہ کا مقصد معاشرت و اجتماعیت کو صحیح طور پر چلانا ہے۔ فطری بات ہے کہ جب تک ان دونوں میں جوڑ اور توازن نہ ہو ان میں سے کوئی بھی شعبہ تنہا اپنا کام پوری طرح سرانجام نہیں دے سکتا۔

سید الصوفیہ حضرت حسن بصریؒ کو دیکھ لیجئے کہ انہوں نے لاکھوں افراد کی اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دیا لیکن اس کے ساتھ اجتماعی برائیوں کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے اور وقت کے حکمرانوں کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ سید الطائفہ حضرت شیخ عبد القادرؒ جیلانی کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈال لیجئے، ان کی بنیادی محنت فرد کی اصلاح تھی لیکن اجتماعی خرابیوں پر انہوں نے کبھی خاموشی اختیار نہیں کی اور حق گوئی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ہمارے برصغیر کے اکابر میں حضرت مجدد الفؒ ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لے کر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ تک جس بزرگ کو بھی دیکھیں آپ کو یہی منظر دکھائی دے گا کہ سوسائٹی کے ایک پرزے کے طور پر فرد کی

اصلاح وتربیت کے کام میں بھی منہمک ہیں اور معاشرے کی اجتماعی مشینری کو درست رکھنے کے لیے ملی مقاصد کی نشاندہی اور ان کی اصلاح کے عمل سے بھی غافل نہیں ہیں۔

حضرت مولانا جمیل احمد میواتی دہلویؒ بھی اسی قافلہ کے فرد تھے، اس لیے انہوں نے بھی اپنی تگ وتاز کے لیے کسی ایک شعبے پر قناعت نہیں کی بلکہ تصوف وسلوک کو اپنی جولانگاہ بنانے کے ساتھ ساتھ نفاذِ اسلام کی جدوجہد، عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی تحریک، دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتدریس کے شعبوں میں بھی فکر وعمل کا حصہ ڈالا۔ ان کا تعلق میوات سے تھا لیکن تقسیم ہند کے وقت ان کے والدین دہلی میں آباد تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ حضرت مولانا کا روحانی تعلق پہلے شیخ الاسلام حضرت حسین احمدؒ مدنی سے تھا، ان کے انتقال پر ملال کے بعد سلوک وتصوف کی تعلیم وتربیت شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے زیر سایہ حاصل کی۔ حضرت لاہوریؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد سلوک کے مراحل قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری اور صاحب السیف حضرت مولانا بشیر احمد قادری پسروریؒ کی نگرانی میں طے کیے۔ وہ حضرت رائے پوریؒ اور حضرت پسروریؒ سے خلافت پانے کا اعزاز رکھتے تھے۔ جبکہ محبت ومودت کا تعلق حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، حضرت قاری محمد ابراہیمؒ میواتی (کراچی) سے قائم تھا۔ اتنی خوشبوؤں کے اجتماع اور تناسب سے حضرت مولانا دہلویؒ کی شخصیت تشکیل پائی اور پھر اس گلدستہ کی خوشبو سے ہزاروں افراد کے ارواح وقلوب معطر ہوئے۔ حضرت مولانا دہلویؒ کے ارادت مندوں کا دائرہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے جنہوں نے ان سے اللہ کا ورد بھی سیکھا اور حق گوئی کا سبق بھی حاصل کیا۔ اور آج ان کے تربیت یافتہ علماء اور دیگر حضرات ملک کے مختلف حصوں میں عام لوگوں کی روحانی تربیت اور اصلاح کی خدمات سرانجام دینے میں شب وروز مصروف ہیں۔

مولانا دہلوی نے ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ علماء اسلام کے تحت قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا جو ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن دینی جدوجہد کا تقاضہ تھا اور علماء حق اہل السنت والجماعت کے قافلہ کا اجتماعی فیصلہ تھا اس لیے وہ بلا تامل اس میدان میں کود پڑے اور نفاذِ اسلام اور تحفظ ختم نبوت کی تحریکات میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کا زندگی بھر یہ عمل رہا کہ الیکشن میں جہاں کہیں کوئی قادیانی کھڑا ہوتا اس کے مقابلہ میں مسلمان امیدوار کی بطور خاص حمایت کرتے اور پوری کوشش کرتے کہ قادیانی کامیاب نہ ہونے پائے۔ ایک بار تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جلوس کا پروگرام تھا اور ان کے مرید اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے، حضرت مولانا دہلویؒ نے اپنے اکلوتے فرزند ارجمند مولانا مفتی سعید حسن

دہلوی کے بارے میں فرمایا کہ سعید میاں کو بھی ساتھ لے جاؤ، اگر جلوس پر گولی چلے تو اسے آگے کر دینا۔ اگر حضورؐ کی ختم نبوت پر میرا بچہ قربان ہو گیا تو یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہو گی۔

حضرت مولانا دہلویؒ گفتار کے ساتھ کردار کے بھی غازی تھے اور بلاشبہ وہ گفتار و کردار میں معاصر علماء و صوفیاء کے لیے مشعلِ راہ تھے۔ یہی جذبہ تھا جس نے ماضی میں ہماری خانقاہوں کو سوسائٹی کے روحانی اور اعصابی مراکز کا مقام دے رکھا تھا، اور اسی کے فقدان کے باعث آج وہ خانقاہیں بانجھ ہوتی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت دہلویؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان جیسے مجاہد اور باعمل صوفیہ کی رہنمائی سے ایک بار پھر ملت اسلامیہ کو شاد کام فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ نومبر ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ

(۱)

گذشتہ دنوں باغبانپورہ لاہور کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد اسحاق قریشی فاضل دیوبند طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خصوصی تربیت یافتہ حضرات میں سے تھے اور انہوں نے تمام عمر اپنے شیخ کی طرز پر قرآن کریم کی تعلیمات اور اللہ اللہ کا ورد عام کرنے میں بسر کر دی۔ ان کی نماز جنازہ حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی مدظلہ نے پڑھائی اور ایک تعزیتی اجلاس میں مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا رشید احمد پسروری، مولانا عبد الرشید کشمیری، محمد ظہیر میر ایڈووکیٹ، صاحبزادہ محمد امجد خان، قاری محمد عبد اللہ آفاقی اور حافظ محمد ظفر اللہ شفیق نے مرحوم کی دینی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ مارچ ۱۹۹۳ء)

(۲)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وفات کے بعد ان کے جاری کردہ سلسلہ درس قرآن کو تادیر قائم رکھنے میں ان کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے ساتھ جن علماء کرام نے مسلسل محنت کی، ان میں حضرت مولانا محمد اسحاق قادریؒ اور حضرت مولانا حمید الرحمن عباسیؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد

اسحاق قادریؒ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے شاگرد تھے اور میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کے ساتھ دورۂ حدیث میں ہم سبق تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں سال ہا سال رہ کر ان سے قرآن فہمی کا ذوق سیکھا اور پھر ان کے جانشین حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ کی معاونت میں اپنے شیخ کی مسند پر بیٹھ کر سال ہا سال تک اس سلسلہ درس کو جاری رکھا۔ ان کا زندگی بھر کا معمول رہا کہ وہ سائیکل پر لاہور کے مختلف علاقوں میں جاتے اور کئی مقامات پر ہفتہ وار درس دیتے۔ وہ ایک دور میں جمعیۃ علماء اسلام ضلع لاہور کے امیر رہے اور دینی تحریکات میں سرگرم کردار ادا کرتے رہے۔ وہ اللہ اللہ کرنے والے بزرگ تھے اور ذکر الٰہی کے حلقے سجا کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مگن رکھتے تھے۔

باغبان پورہ لاہور کی جامع مسجد امن اور جی ٹی روڈ پر واہگہ بارڈر سے چند میل پہلے چوک یادگار شہداء کا دینی مدرسہ جامعہ حنفیہ قادریہ ان کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے جن کی تولیت وانتظام کی ذمہ داری ان کے فرزند مولانا قاری جمیل الرحمن اختر (فاضل نصرۃ العلوم) سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے والد محترمؒ کے سلسلہ خیر کو جاری رکھنے بلکہ بڑھانے میں مصروف ہیں۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۱ستمبر ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ

(۱)

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ گزشتہ روز طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۱۰۰ برس کے لگ بھگ تھی اور وہ ۱۹۶۲ء سے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر چلے آ رہے تھے۔ مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ جنہیں پاکستان کے دینی وعلمی حلقوں میں حضرت درخواستیؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عالم اسلام کی ممتاز علمی شخصیات میں شمار ہوتے تھے اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ بے پناہ شغف اور بے شمار احادیث زبانی یاد ہونے کے باعث انہیں حافظ الحدیث کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

حضرت درخواستیؒ کا تعلق ضلع رحیم یار خان کی بستی ''درخواست'' سے تھا جس کے باعث وہ درخواستی کہلاتے تھے۔ انہوں نے دینی تعلیم پہلے اپنے گاؤں میں اور بعد میں دین پور شریف میں حاصل کی جو اپنے وقت کے ولی کامل اور مجاہدِ تحریک آزادی حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کا مرکز تھا اور اب بھی ان کا

خاندان اس روحانی مرکز کو آباد رکھے ہوئے ہے۔ حال ہی میں جرمن وزارت خارجہ کے ایک سابق ڈپٹی سیکرٹری نے اپنی یادداشتوں میں اس تحریک آزادی کا ذکر کیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے منظم کی تھی اور جس کے تحت جرمن، جاپان، ترک اور افغان حکومتوں نے مل کر برطانوی استعمار سے برصغیر پاک وہند کی آزادی کے لیے مجاہدینِ آزادی کی عملی امداد کا اہتمام کرنا تھا۔ لیکن قبل از وقت منصوبہ کے انکشاف کے باعث یہ تحریک ناکامی کا شکار ہوگئی تھی۔ دین پور شریف اس تحریک کے اہم مراکز میں سے تھا اور حضرت خلیفہ غلام محمدؒ کو تحریک کے راہنماؤں میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ حضرت درخواستیؒ بھی اس تحریک کے کارکنوں میں سے تھے اور کبھی کبھی اس دور کے واقعات مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ یہ ان کا طالب علمی کا دور تھا لیکن اپنے شیخ و مربی حضرت خلیفہ غلام محمدؒ کے حوالہ سے تحریک آزادی کے کاموں میں بھی شریک رہتے تھے۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ بنیادی طور پر تعلیم و تربیت کے میدان کے بزرگ تھے، انہوں نے ساری زندگی قرآن کریم اور حدیث رسولؐ کا درس دیا اور لاکھوں تشنگان علوم کو علوم نبوت سے سیراب کیا۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت اور ذکر اللہ کی تلقین ان کا خصوصی ذوق تھا اور بڑے بڑے علماء و مشائخ ان کی روحانی مجالس میں بیٹھنے کو سعادت سمجھتے تھے۔ حضرت درخواستیؒ کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں دیکھا جب وہ میرے حفظ قرآن کریم کی تکمیل پر ہمارے قصبہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور میرا آخری سبق سننے کے ساتھ ساتھ ختم قرآن کریم کی تقریب سے ایمان افروز خطاب بھی فرمایا۔ اس کے بعد ان سے مسلسل تعلق رہا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے ان کے ساتھ خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں سالہا سال تک رفاقت نصیب رہی۔ اور میں اسے اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں کہ جماعتی، دینی و سیاسی معاملات میں آخر وقت تک مجھے ان کا اعتماد اور شفقت حاصل رہی۔

حضرت درخواستیؒ کو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وفات کے بعد علماء کرام نے اپنی امارت کے لیے منتخب کیا اور وہ نظام العلماء پاکستان کے امیر چنے گئے جو ایوب خان مرحوم کے مارشل لاء کے دور میں سیاسی جماعتوں پر پابندی کے باعث جمعیۃ علماء اسلام کی جگہ مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اور پھر مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد سیاسی جماعت کے طور پر جمعیۃ علماء اسلام کی بحالی پر وہ اس کے امیر چنے گئے۔ ان کی امارت میں کام کرنے والوں میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبید اللہ انورؒ، مولانا سید گل بادشاہؒ، مولانا سید محمد شاہؒ امروٹی، اور مولانا مفتی عبد القیومؒ پوپلزئی جیسے اکابر

علماء شامل رہے ہیں جو مجالس میں ان کے ساتھ دوزانو بیٹھتے اور ان سے راہنمائی کے طالب ہوتے۔

۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام کے ایک حلقہ کی طرف سے تجویز آئی کہ حضرت درخواستیؒ کی علالت اور ضعف کے باعث انہیں جمعیۃ کا سرپرست بنا دیا جائے اور مولانا مفتی محمودؒ کو امیر منتخب کیا جائے۔ شیرانوالہ لاہور میں جمعیۃ کی جنرل کونسل کے کھلے اجلاس میں مولانا مفتی محمودؒ نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ حضرت درخواستیؒ کی موجودگی میں ہم کسی اور کی امارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بات مولانا درخواستیؒ کی بزرگی اور راہنمائی پر اپنے دور کے اہل علم کے بھرپور اعتماد کا مظہر تھی اور ان کے علم وفضل کا اعتراف تھی۔

شدید علالت اور ضعف کے آخری چند سالوں کو چھوڑ کر حضرت درخواستیؒ پورے ملک میں متحرک رہتے تھے اور شاید ہی پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی حصہ ایسا ہو جہاں انہوں نے بار بار علماء کے جلسوں اور پبلک اجتماعات سے خطاب نہ کیا ہو۔ وہ جہاں جاتے نفاذ اسلام اور تحفظ ختم نبوت کے لیے علماء اور کارکنوں کو تیار کرتے، ان سے کام کرنے کا عہد لیتے، نمایاں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی دستار بندی کرتے اور دینی مدارس ومکاتب کے قیام کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے تھے۔ وہ ایک دن میں دس دس اجتماعات سے خطاب کرتے اور اس طرح مسلسل سفر میں رہتے تھے کہ میرا جیسا نوجوان کارکن بھی چند دن سے زیادہ ان کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا۔ ان کی زندگی کا مشن پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ، عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ اور قریہ قریہ دینی مدارس کا قیام تھا۔ وہ جہاں جاتے اور جس مجلس میں ہوتے ان کی گفتگو انہی مقاصد کے حوالہ سے ہوتی تھی۔ ان کا خطاب معروف معنوں میں سیاسی نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی مربوط گفتگو کا مزاج تھا، لیکن اس روحانی اور علمی شخصیت کا کمال یہ تھا کہ لوگ گھنٹوں بیٹھے ان کی غیر مربوط گفتگو کی چاشنی سے محظوظ ہوتے رہتے۔ بسا اوقات ساری ساری رات گزر جاتی اور جب وہ تقریر کے بعد دعا سے فارغ ہوتے تو پتہ چلتا کہ فجر کی اذان کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ جھوم جھوم کر احادیث رسولؐ کی تلاوت کرتے تو ایک عجیب سماں کی کیفیت ہوتی، خود بھی روتے اور ساتھ حاضرین کو بھی رلاتے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کرتا ہوں اور ان کی احادیث سناتا ہوں تو مجھے وقت کا ہوش نہیں رہتا، یہ ان کے عشقِ رسولؐ کی علامت تھی۔

حضرت درخواستیؒ میرے مشفق امیر تھے، انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی شفقتوں اور اعتماد سے نوازا لیکن میں ان کے ساتھ اس سے زیادہ وفا نہ کر سکا کہ جمعیۃ علماء اسلام میں دھڑے بندیوں کے کئی دور آئے مگر میں ان کے علاوہ کسی اور کو اپنا امیر نہ مان سکا۔ شاید یہی ایک بات آخرت میں ان کے ساتھ رفاقت کی وجہ بن

جائے، آمین۔ آج میرا امیر مجھ سے جدا ہو گیا ہے اور میں وطن سے دور بہت دور گلاسگو کی مرکزی جامع مسجد میں بیٹھا آنسو بہا رہا ہوں اور ان الفاظ کے ذریعے اپنے دل کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اے کاش وقت کے یہ بے رحم فاصلے درمیان میں نہ ہوتے اور میں ان کی آخری زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۱۹۹۴ء)

(۲)

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز کو میں نے پہلی بار ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو دیکھا تھا جب میرا حفظ قرآن کریم مکمل ہوا۔ میں نے قرآن کریم سب سے پہلے اپنے والد محترم اور والدہ مرحومہ سے پڑھنا شروع کیا، پھر جب مرکزی جامع مسجد گکھڑ منڈی میں مدرسہ تجوید القرآن کا قیام عمل میں لایا گیا تو وہاں حفظ کا آغاز کیا جو اکتوبر ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا۔ میرے استاد محترم قاری محمد انور صاحب نے، جو آج کل مدینہ منورہ کے ایک مدرسہ میں قرآن کریم کی تدریس میں مصروف ہیں، اس موقع پر اپنے دو اساتذہ حضرت مولانا قاری فضل کریم صاحبؒ اور حضرت مولانا قاری سید حسن شاہ صاحبؒ کو مدعو کیا ہوا تھا اور ایک تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا تاکہ میں ان بزرگوں کو آخری سبق سناؤں۔ اچانک اس روز حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ صوبہ سرحد کے کسی شہر سے واپس جاتے ہوئے پہلے گکھڑ اور پھر گوجرانوالہ میں رکے تو والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے انہیں اس تقریب کے لیے روک لیا۔ اور اس طرح مجھے اپنا آخری سبق حضرت درخواستیؒ کو سنا کر ان سے تلمذ کا شرف حاصل کرنے کی سعادت مل گئی۔ سورۃ المرسلات کا دوسرا رکوع میرا آخری سبق تھا جو میں نے حضرت درخواستیؒ اور مندرجہ بالا تینوں بزرگوں کو ایک عام اجتماع میں سنایا۔ شاید یہ ان حضرات کا رعب تھا کہ میں اس چھوٹے سے سبق میں بھی بھول گیا اور سناتے ہوئے ایک آیت مجھ سے رہ گئی۔

اس کے تقریباً دو برس بعد کی بات ہے جب میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں زیر تعلیم تھا، ایک روز معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں تشریف لائے ہیں۔ میں بھی زیارت و ملاقات کی نیت سے وہاں پہنچا، وہ عقیدت مندوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے، میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ خیال تھا کہ جب ہجوم کم ہو گا تو مصافحہ کر لوں گا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے نظر پڑتے ہی مجھے آواز دے کر بلوایا اور کہا ”او! ادھر آؤ اب ملتے بھی نہیں ہو“۔ میں نے

قریب ہو کر مصافحہ کیا تو انہوں نے وہ آیت پڑھی جو میں آخری سبق میں بھول گیا تھا۔ اور پوچھا کہ اب یہ آیت یاد ہے یا نہیں؟ میرے لیے اتنی بات ہی کافی تھی کہ اس بزرگ کو دو تین سال قبل ایک عام اجتماع میں سبق سنانے والے طالب علم کا چہرہ بھی یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ وہ سبق سناتے ہوئے کون سی آیت بھول گیا تھا۔

اس کے چند برس بعد اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہوا کہ جہلم میں جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام کا سالانہ جلسہ تھا۔ حضرت درخواستیؒ اس جلسہ میں خطاب کے لیے آئے ہوئے تھے اور میں بھی ایک سامع کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ حضرت درخواستیؒ جلسہ گاہ میں پہنچے تو بے شمار لوگ قطار میں لگے ان سے باری باری مصافحہ کر رہے تھے۔ میں بھی لائن میں لگ گیا اور رومال کے ساتھ اپنے منہ کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ آنکھیں اور چہرے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا، اس خیال سے کہ پہچان لیں گے تو کہیں پھر سبق والی بات نہ کہہ دیں۔ میری باری آئی، چلتے چلتے مصافحہ کیا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ ”او! اب چھپتے بھی ہو، سبق یاد ہے؟“

یہ ان کی بے پناہ قوت حافظہ اور یادداشت کا اظہار بھی تھا اور محبت و شفقت کا مظاہرہ بھی جو ان کے ہر عقیدت مند کے حصہ میں ہمیشہ آتا رہا ہے۔ وہ پرانی وضع کے ایک نیک دل، سادہ منش اور صاف گو عالم دین تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انہیں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بعد جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا امیر منتخب کیا گیا تو بہت سے حضرات متعجّب ہوئے کہ وہ اس ڈھب کے آدمی نہیں ہیں اور انہیں آج کی سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے جس جرأت کے ساتھ علماء کے اس قافلہ کی قیادت کی وہ تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔

وہ اپنے ذوق کے لحاظ سے ”فنافی الحدیث“ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو یاد کرنا، ہر وقت ان کا تذکرہ کرتے رہنا، اور ہر موقع پر جناب نبی اکرمؐ کی کوئی نہ کوئی حدیث سنا دینا ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ انہیں حافظ الحدیث کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور بلاشبہ انہیں اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ احادیث یاد کرنے کا شرف حاصل تھا۔ ایک موقع پر یاد پڑتا ہے کہ کسی شخص نے ان سے سوال کیا کہ کسی کو آپ سے زیادہ حدیثیں بھی یاد ہیں؟ تو غالباً ان کا جواب یہ تھا کہ یہاں تو نہیں البتہ مدینہ منورہ میں ایک خاتون سے ملاقات ہوئی تھی جنہیں مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ کافی عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ خاتون شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ کی دختر محدثہ امۃ اللہ دہلویہؒ تھیں جنہوں نے حجاز مقدس میں نصف صدی تک علم حدیث کی مسند تدریس آباد رکھی اور بڑے بڑے محدثین ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے ان سے روایت حدیث کی اجازت لینے پر فخر کیا کرتے تھے۔

حضرت درخواستیؒ کا احادیث نبویہؐ کے ساتھ شغف انہیں اپنے سب معاصرین میں ممتاز کیے ہوئے تھا۔ وہ جب رسول اللہؐ کا تذکرہ کرتے یا آپؐ کی کوئی حدیث سناتے تو اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے اور وہ صرف خود نہیں روتے تھے بلکہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے بھی آنسوؤں کو روکنا مشکل ہوجایا کرتا تھا۔ رسول اللہؐ کا تذکرہ کرتے ہوئے اور آپؐ کی احادیث سناتے ہوئے انہیں نہ وقت گزرنے کا کوئی احساس ہوتا تھا اور نہ ہی گرد و پیش کا کوئی ہوش رہتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں رات کو خطاب کررہے ہیں اور ذکر یارؐ میں اس قدر محو ہیں کہ صبح کی اذان کا وقت ہوگیا ہے۔ وہ روایتی طرز کے مقرر نہیں تھے اور نہ ہی ان کی گفتگو میں کوئی ربط اور ترتیب ہوتی تھی۔ لیکن حدیث نبویؐ کے ساتھ ان کے جذب و مستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ گھنٹوں ان کے سامنے بیٹھے جھومتے اور سبحان اللہ کا ورد کرتے رہتے تھے۔ وہ آخری وقت تک جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر رہے اور مجھے ان کی امارت میں کم و بیش تیس برس تک ایک کارکن اور مختلف مناصب کے ذمہ دار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔

عام جلسوں، خصوصی اجلاسوں، نجی محافل، اور تنہائی کی ملاقاتوں کا شمار اندازے سے بھی کرنا چاہوں تو میرے بس میں نہیں ہوگا۔ انہیں خوشی اور ناراضگی دونوں حالتوں میں دیکھا اور خلوت و جلوت کے کم و بیش ہر انداز کا مشاہدہ کیا۔ لیکن ایک کیفیت جس میں کسی حالت میں بھی فرق نہیں دیکھا وہ ان کی دینی حمیت تھی۔ وہ دین کے معاملہ میں قطعی بے لچک تھے، گھر میں بھی، جماعت کی خصوصی مجالس میں بھی، اور عام اجتماعات میں بھی۔ اور اس بارے میں وہ کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے، وہ جس چیز کو ناجائز سمجھتے تھے کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی ان سے اس کے بارے میں لچک کا تقاضا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

نفاذ شریعت اور تحفظ ختم نبوت کے لیے جدوجہد کو انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے رکھا تھا، عام اجتماعات میں سب سے زیادہ انہی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ جس علاقہ میں جاتے وہاں کے علماء اور دینی کارکنوں کو اس جدوجہد کے لیے تیار کرتے، ان سے عام اجتماعات میں عہد لیتے اور بعض کی دستار بندی کراتے۔ جس عالم یا کارکن کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے اس کے سر پر سب کے سامنے پگڑی باندھتے اور نفاذ شریعت کے لیے کام کرنے کا وعدہ لیتے۔ یہ ان کا حوصلہ افزائی کا مخصوص انداز تھا جسے ان کے عقیدت مند اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے۔ بہت سے علماء و کارکنوں نے وہ رومال اور دستاریں برکت کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں جو کسی نہ کسی موقع پر حضرت درخواستیؒ نے ان کے سر پر بندھوائی تھیں۔ خود میرے ساتھ کئی بار اس شفقت کا مظاہرہ فرمایا۔

ایک بار مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ان کا بیان تھا، حسب روایت بہت سے علماء اور کارکنوں کی

دستار بندی کی پھر مجھے آواز دی۔ مگر جب میں پہنچا تو دستاریں اور رومال ختم ہو چکے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا انہوں نے اپنے سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر رومال بندھا تھا، وہ رومال کھول کر ٹوپی اتاری اور میرے سر پر رکھ دی۔ یہ ٹوپی اب بھی میرے پاس محفوظ ہے اور کبھی کبھی تبرک کے لیے پہنا کرتا ہوں۔ بعد میں کئی مواقع پر انہوں نے اس کا تذکرہ کیا اور مختلف مجالس میں یوں کہا کہ ”میں نے راشدی والوں کو اپنی ٹوپی پہنا دی ہے اور اب اڑا پھرتا ہے۔“ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں اس وقت جو کچھ بھی ہوں چند بزرگوں کی دعاؤں اور شفقتوں کے باعث ہوں۔ ورنہ اپنے دامن اعمال کی طرف دیکھتا ہوں تو اس میں شرمندگی اور حسرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

نفاذ شریعت اور تحفظ ختم نبوت کے لیے کلمہ حق بلند کرنے اور علماء اور کارکنوں کو اس کی خاطر تیار کرتے رہنے کے علاوہ قدرت نے جو خصوصی ذوق حضرت درخواستیؒ کو ودیعت کیا تھا وہ دینی مدارس کا قیام تھا۔ جس علاقے میں جاتے دینی مدارس کی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے۔ مدارس کے سالانہ اجتماعات میں خود اپیل کر کے چندہ کراتے، جہاں گنجائش ہوتی اپنی جیب سے بھی دیتے۔ اپنے عقیدت مندوں کا نام لے لے کر انہیں جلسے میں کھڑا کرتے اور ان سے مدرسے کے لیے چندے کی اپیل کرتے۔ جہاں مدرسہ نہ ہوتا وہاں دینی درسگاہ قائم کرنے کی ترغیب دیتے اور کوشش کرتے کہ ان کی موجودگی میں ہی مدرسے کے قیام کی طرف عملی پیش رفت ہو جائے۔ ان کے ایک رفیق سفر میاں محمد عارف مرحوم واقعہ سناتے ہیں کہ قبائلی علاقہ کے سفر میں وہ ایک جگہ رکے تو لوگ ان کا نام سن کر جمع ہوئے۔ ایک صاحب حیثیت شخص نے انہیں اپنے گھر چلنے اور چائے پینے کی دعوت دی۔ اس سے پوچھا کہ یہاں کوئی دینی مدرسہ ہے؟ جواب ملا کہ نہیں۔ اس پر کہا کہ پہلے مدرسہ قائم کرنے کا وعدہ کرو پھر تمہارے گھر چلیں گے۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ گھر پہنچے تو کہا کہ نیکی کے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے اس لیے مدرسہ کے لیے جگہ مخصوص کر دو۔ اس نے اپنے گھر کے ساتھ اپنی زمین میں ایک ٹکڑا مخصوص کر دیا۔ حضرت درخواستیؒ نے کہا کہ اب مزید دیر کس بات کی ہے؟ دو چار اینٹیں لاؤ کہ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔ وہ اینٹیں لایا اور مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس طرح وہ دوران سفر اس جگہ تھوڑی دیر آرام کے لیے رکے تھے کہ وہاں ایک دینی مدرسے کا آغاز کر کے آگے بڑھ گئے۔

افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد کے بعد جہاد افغانستان کا آغاز ہوا تو حضرت درخواستیؒ نے افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے قبائلی علاقہ کا طوفانی دورہ کیا جہاں ان کے مرید اور شاگردوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ جہاد افغانستان کی حمایت میں پر جوش بیانات جاری کر کے پورے علاقہ میں جہاد

کے حق میں فضا گرم کر دی، جس کے اثرات مدت تک محسوس کیے جاتے رہے۔ افغان مجاہدین کے ایک سرگرم راہنما مولوی نصر اللہ منصور شہیدؒ ایک بار شیرانوالہ لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی اجلاس کے موقع پر آئے اور کہا کہ میں حضرت درخواستیؒ کی زیارت کے لیے آیا ہوں جنہوں نے قبائلی علماء اور عوام کو جہاد افغانستان کی حمایت کے لیے تیار کر کے ہمارا راستہ صاف کر دیا ہے۔ حضرت درخواستیؒ آخر وقت تک علالت، ضعف، اور نقاہت کے باوجود جہاد افغانستان کے لیے فکر مند رہے اور اس سلسلہ میں بہت سے اجتماعات میں شریک ہو کر خطاب کیا۔ ایک موقع پر اسلام آباد میں افغان مجاہدین کی سات بڑی جماعتوں کے سربراہوں کو جمع کر کے انہیں آپس میں متحد رہنے اور دشمن کی سازشوں سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ساتوں بڑے افغان لیڈر حضرت درخواستیؒ کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن جنہیں خانہ کعبہ کے اندر کیا ہوا معاہدہ متحد نہ رکھ سکا حضرت درخواستیؒ کی تلقین ان پر کیا اثر کر سکتی تھی؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۶ اگست ۱۹۹۸ء)

(۳)

(جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی کے زیر اہتمام "حافظ الحدیث کانفرنس" منعقدہ یکم اکتوبر ۲۰۰۰ء سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حافظ الحدیث مولانا عبد اللہ درخواستیؒ اپنے دور کے اکابر علماء کرام میں سے تھے اور انہوں نے کم و بیش پون صدی تک دینی علوم کی ترویج و اشاعت، اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ اور نظام شریعت کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کی۔ اور اس میں پینتیس برس کا وہ عرصہ بھی شامل ہے جس میں وہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے علماء حق کے اس عظیم قافلہ کی متحرک قیادت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ مجھے ۱۹۶۰ء میں حضرت درخواستیؒ کو قرآن کریم حفظ کا آخری سبق سنا کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا اور پھر ان کی وفات تک ان سے عقیدت و محبت اور وفاداری کا سلسلہ قائم رہا۔ ان کے ساتھ سفر و حضر اور جلوت و خلوت کی رفاقت کے اس طویل سلسلہ کی بے شمار یادیں ہیں جن کا تذکرہ شروع کر دوں تو کسی ایک پہلو کا بھی اس محفل میں شاید احاطہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان میں سے صرف ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا ارادہ ہے جس کا تعلق ہمارے آج کے حالات اور جدوجہد سے بھی ہے۔ اور چونکہ میں خود اس مورچے اور محاذ کا آدمی ہوں اس لیے طبعی طور پر اسی پہلو کو گفتگو کے لیے ترجیح دینا زیادہ پسند کروں گا۔

یہ پہلو حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کی زندگی بھر کی جدوجہد کے اہداف سے تعلق رکھتا ہے کہ انہوں نے پون صدی کی اس طویل جدوجہد میں کن اہداف کو سامنے رکھا اور کن مقاصد کے لیے وہ عمر بھر ایک مضطرب اور بے چین روح کی طرح طول و عرض میں دیوانہ وار گھومتے رہے۔ جن حضرات نے حضرت درخواستیؒ کو خصوصی مجالس اور عوامی اجتماعات میں گفتگو کرتے سنا ہے اور ان کے چار چار پانچ پانچ گھنٹوں پر مشتمل طویل خطبات و مواعظ کی محفلوں میں بار بار حاضری دی ہے وہ میری اس بات کی تائید کریں گے کہ حضرت درخواستیؒ کی جدوجہد اس ملک میں صرف اور صرف دینِ اسلام کے نفاذ اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے تعاقب کے لیے تھی۔ اور ان کی اس محنت و کاوش کو اہداف کے حوالہ سے سات خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1. سب سے پہلے وہ اس ملک میں کفر و استبداد اور ظلم و استعمار کے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور اس کی جگہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے خواہاں تھے۔ اس مقصد کے لیے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے پلیٹ فارم پر ان کی امارت میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شمس الحقؒ افغانی، حضرت مولانا عبد الحقؒ، حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ، حضرت مولانا عرض محمدؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا پیر محسن الدین اور حضرت مولانا مفتی عبد القیوم پوپلزئی جیسے اکابر نے جدوجہد کی ہے، اور حضرت درخواستیؒ تیس برس سے زائد عرصہ تک امیر کی حیثیت سے اس قافلہ کی قیادت کرتے رہے۔

2. دوسرے نمبر پر حضرت درخواستیؒ کی محنت عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور منکرین ختم نبوت کے تعاقب کے لیے تھی۔ وہ کم و بیش اپنے ہر تفصیلی بیان میں اس دینی فریضہ کا ذکر کرتے اور شرکائے محفل سے ختم نبوت کے تحفظ کے لیے کام کرنے کا عہد لیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے کئی عملی مہمات کی قیادت بھی کی جو تحریک تحفظ ختم نبوت کی تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

3. تیسرے نمبر پر حضرت درخواستیؒ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ محبت و عقیدت کے جذبات کو بیدار کرتے تھے، ان کے واقعات اور کارناموں کا کثرت کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے، اور ان کے ناموس کے تحفظ کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ بعض حلقوں کی طرف سے حضراتِ صحابہ کرامؓ کے ایمان اور عدالت کے بارے میں کیے

گئے اعتراضات وشبہات کا جواب دیتے تھے اور صحابہ کرامؓ پر اعتراض وتنقید کرنے والوں کو کھلے بندوں للکارتے تھے۔

4. چوتھے نمبر پر حضرت درخواستیؒ کے خطابات وتقاریر کا ایک اہم موضوع ''جہاد'' ہوتا تھا۔ جس دور میں جہادِ افغانستان کا آغاز نہیں ہوا تھا وہ اس وقت بھی عام طور پر جہاد کے فضائل بیان کرتے اور علماء کرام اور دینی کارکنوں کو جہاد میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تھے۔ اور جب افغانستان میں جہاد کا عملی آغاز ہوا تو وہ اس جہادی تحریک کے پشت پناہ بن گئے، انہوں نے افغان علماء کی اس جدوجہد کو شرعی جہاد قرار دیا، اس کی حمایت میں ملک بھر کا دورہ کیا اور خاص طور پر افغانستان کی طویل سرحد کے ساتھ قبائلی علاقوں کا طوفانی دورہ اور تفصیلی دورہ کرکے علماء کرام اور عوام کو جہادِ افغانستان کی حمایت ونصرت کے لیے تیار کیا۔ پاکستان کے علماء کرام اور کم وبیش سب اہم دینی جماعتوں نے جہادِ افغانستان کی حمایت واعانت کی ہے لیکن اس جہاد کی پشتی بانی میں جو عظیم کردار حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا عبد الحقؒ کا ہے وہ افغان جہاد کی تاریخ میں ایک مستقل اور روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

5. پانچویں نمبر پر حضرت درخواستیؒ دینی مدارس کے قیام اور ان کی ترقی واستحکام کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ملک بھر پر ان کی نظر ہوتی تھی، جس علاقہ میں دینی مدرسہ نہ ہوتا وہ خود وہاں جاکر علماء کرام کو دینی درسگاہ قائم کرنے کی ترغیب دیتے اور چندہ جمع کرنے میں ان کے ساتھ تعاون کرتے۔ حضرت درخواستیؒ مدرسہ ومسجد کا سنگِ بنیاد رکھتے اور بعد میں بھی ان مدارس کی نگرانی وسرپرستی کرتے رہتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ایسے مدارس کی تعداد ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں یقیناً ہوگی جو حضرت درخواستیؒ کی ترغیب وتوجہ سے قائم ہوئے اور ان کی سرپرستی میں چلتے رہے۔ وہ ان مدارس کو دین کے قلعے کہا کرتے تھے۔ اس مردِ قلندر کی اس بات کا اعتراف آج کے بین الاقوامی میڈیا اور عالمی ادارے بھی کرنے پر مجبور ہیں جو نفاذِ اسلام کی جدوجہد، جہادی تحریکات، اسلامی علوم کے تحفظ وترویج اور اسلامی معاشرت وتمدن کی بقاء کا سب سے بڑا سبب اور سرچشمہ ان مدارس کو قرار دے رہے ہیں۔

6. چھٹے نمبر پر حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ علماء کرام، دینی کارکنوں، اپنے ارادت مندوں اور

اپنے اجتماعات کے شرکاء کو اللہ اللہ کے ذکر کی خاطر خاص طور پر تلقین کرتے تھے۔ وہ عام اجتماعات میں اللہ اللہ کا ورد کراتے، سبحان اللہ ذوق و شوق سے کہنے کی ترغیب دیتے اور اللہ والوں کی مجالس میں جا کر ذکر اللہ سیکھنے اور دلوں کی صفائی کا درس دیا کرتے تھے۔ وہ جس جذب وکیف کے عالم میں کھلے جلسے میں کلمہ طیبہ اور تسبیحات واذکار کا ورد کراتے تھے اس کے اثر سے بڑے بڑے سخت دل بھی موم ہو جایا کرتے تھے اور بہت سے لوگوں کی زندگیوں کے رخ تبدیل ہو جاتے تھے۔

7. ساتویں نمبر پر مختلف دینی حلقوں، بالخصوص علماء دیوبند سے تعلق رکھنے والی متعدّد دینی جماعتوں اور مراکز میں باہمی ربط و مفاہمت کو فروغ دینا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کر مشترکہ جدوجہد کے لیے تیار کرنا حضرت درخواستیؒ کا خصوصی ذوق تھا۔ مختلف جماعتوں اور مراکز کے اجتماعات میں شریک ہوتے، ان کے راہنماؤں کو اپنے اجتماعات میں بلاتے اور ایک دوسرے سے تعاون اور باہمی احترام کی تلقین کیا کرتے تھے۔

میں نے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کی جدوجہد کا احاطہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان میں سے صرف سات اہم اہداف کا ذکر کیا ہے جو آج بھی ہماری دینی جدوجہد کے بنیادی مقاصد اور اہداف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی مقاصد ہیں جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے حوالہ سے ہمارے اہم دینی فرائض اور ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ اور ہمارے مرحوم پیشوا اور امیر حضرت درخواستیؒ رحمہ اللہ کے ساتھ نسبت و تعلق اور محبت و عقیدت کے پس منظر میں یہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ آئیے حضرت درخواستیؒ کے اس مشن اور جدوجہد کی تکمیل کے لیے مسلسل محنت اور کاوش کے عزم کی تجدید کرتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ اللہ رب العزت حضرت درخواستیؒ کے درجات کو جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں آخر دم تک ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

(۴)

اس سال لندن آتے ہوئے کراچی میں چند روزہ قیام کے دوران حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز کے منجھلے فرزند مولانا حاجی مطیع الرحمان درخواستی کے ساتھ بھی کچھ روز کی سفری رفاقت رہی اور اسی موقع پر ان سے حضرت درخواستیؒ کی وہ تاریخی تقریر آڈیو کیسٹ کے ذریعے سننے

کا موقع ملا جو انہوں نے امام العلماء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وفات پر ۱۹۶۲ء میں رمضان المبارک کے آخری جمعۃ المبارک کے اجتماع میں خانپور کی عید گاہ میں کی تھی۔ حضرت لاہوریؒ کا انتقال اسی رمضان المبارک میں ہوا تھا اور حضرت درخواستیؒ ان کے جنازہ میں شرکت کے بعد لاہور سے واپس آئے تھے، رمضان المبارک کا آخری جمعہ تھا اور مدرسہ مخزن العلوم عید گاہ خانپور میں حضرت درخواستیؒ سے اس سال قرآن کریم کا دورہ تفسیر پڑھنے والے اڑھائی سو کے لگ بھگ طلبہ کا اختتامی سبق بھی اسی موقع پر ہوا۔ اس آڈیو کیسٹ میں حضرت درخواستیؒ کی جمعہ کی تقریر سے قبل کی تقریر کے علاوہ جمعہ کے بعد دورۂ تفسیر کا آخری سبق اور درس شامل ہے۔ اس کے ساتھ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کے اس خطاب کا ایک حصہ بھی ہے جو انہوں نے دین پور شریف میں تشریف آوری کے موقع پر فرمایا تھا۔ اور اس میں جہاد آزادی ہند میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کی خدمات کا تذکرہ ہے۔

حضرت درخواستیؒ کا یہ خطاب جو اڑتیس سال قبل کا ہے، میں نے پہلی بار سنا لیکن یوں لگتا ہے جیسے آج کے ماحول میں اور آج کے حالات کے تناظر میں وہ علماء کرام اور اہل دین کے کسی بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں اور کفر و استعمار کی قوتوں کی سازشوں اور کوششوں کے مقابلہ میں اہل حق کے موقف کا اعلان کر رہے ہیں۔ جب سے یہ تقریر سنی ہے بہت سے دوستوں کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ یہ کیسٹ ''مولانا حاجی مطیع الرحمن درخواستی نائب مہتمم جامعہ مخزن العلوم عید گاہ خانپور ضلع رحیم یار خان'' سے ضرور حاصل کریں اور ایمان کی تازگی نیز اہل حق کے موقف اور عزم سے آگاہی کے لیے کبھی کبھی اسے اہتمام کے ساتھ ضرور سن لیا کریں۔

حضرت درخواستیؒ معروف معنوں میں سیاستدان نہیں تھے بلکہ صاحب جذب اور صاحب حال بزرگ تھے جن پر ہر وقت جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی احادیث کا عشق غالب رہتا تھا۔ مگر حق گوئی اور فتنوں کے تعاقب میں وہ اپنے دور کے علماء کرام میں صف اول کے لوگوں میں سے تھے اور بہت سے ایسے مواقع میرے سامنے ہیں جب ملک کے اہم سیاسی مسائل میں ان کی ''مجذوبانہ بصیرت'' نے اہل حق کے لیے مشعل راہ کا کام دیا اور بعض ایسے واقعات کا عینی شاہد ہوں جب ان کی بات سیاسی مصلحتوں کی خاطر نظر انداز کر دی گئی مگر بعد کے حالات کا منظر یہ تھا کہ سیاسی مصلحتوں کا سراب زیادہ دیر تک آنکھوں کو متوجہ نہ رکھ سکا اور ''مجذوبانہ بصیرت'' کی بات وقت کے میزان پر درست نکلی۔ اس پس منظر میں حضرت درخواستیؒ کے اس خطاب کے بعض اہم حصے اپنی زبان اور ترتیب کے ساتھ قارئین کی خدمت

میں پیش کر رہا ہوں مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ اسے محض اخباری رپوٹنگ کے طور پر پڑھا جائے کیونکہ اصل لطف تو حضرت درخواستیؒ کے خصوصی انداز میں ہے جو کیسٹ سے براہ راست سن کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔

امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اللہ والے تھے جنہوں نے قرآن کریم کی اشاعت کو زندگی کا مشن بنا رکھا تھا حتیٰ کہ بیماری کی حالت میں بھی اس مشن کو جاری رکھا اور آخر دم تک قرآن کریم کا درس اور تعلیم دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس سے قبل حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ اور دیگر اکابر ہم سے جدا ہوئے ہیں اور اب حضرت لاہوریؒ بھی ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کا خلاء پر نہیں ہو سکتا البتہ ہمیں ان کا مشن جاری رکھنا چاہیے اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ مشن جاری رہے گا۔ اہل باطل خوش نہ ہوں کہ حق کہنے والے چلے گئے، نہیں بلکہ ایک جائے گا تو دوسرا اس کی جگہ حق کہنے والا کھڑا ہو گا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہمارے لیے سعادت کی بات ہو گی کہ ہم جانے والوں کے مشن کو سینے سے لگائے رکھیں اور انہی کی طرح محنت اور جدوجہد کرتے ہوئے ان سے جا ملیں۔

ملکی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت درخواستیؒ نے اس خطاب میں کہا کہ دینی اقدار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، رمضان المبارک کی بے حرمتی ہو رہی ہے، ناچ گانا عام ہے، فلمیں بن رہی ہیں، سینما آباد ہیں اور لوگوں کو بے حیا بنایا جا رہا ہے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وحدیث کا انکار ہو رہا ہے، نبی کے یاروں صحابہ کرامؓ کی توہین ہوتی ہے اور حضورؐ کے گھرانے کی بے احترامی کی جاتی ہے لیکن کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا، اس زندگی سے موت بہتر ہے اور اس حالت میں جینے کا کوئی مزہ نہیں۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور ملک کے صدر اور تمام افسروں سمیت ہر شخص پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے فرنگی کی سیاست نہیں آتی مگر قرآن وحدیث کی سیاست کو میں چھوڑ نہیں سکتا، میری سیاست قرآن و سنت ہے اور قرآن و سنت کے نظام کی بالادستی ہمارا سب سے بڑا مشن ہے اس سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں قرآن کا نظام آئے، حدیث رسولؐ کا نظام آئے۔ کلب خانے بند ہوں، سینماؤں پر تالے لگ جائیں، رمضان المبارک کا احترام ہو اور اسلامی احکام کی حکمرانی قائم ہو، اس سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ ہم دار و رسن قبول کر سکتے ہیں لیکن اسلامی نظام سے دست بردار نہیں ہوں گے۔

ہمیں ملک کا غدار کہا جا رہا ہے، ہم غدار نہیں ہیں ملک کے وفادار ہیں اور میں تو خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر پاکستان کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ پاکستان کی حفاظت فرما اور اسے ہندوؤں اور سکھوں کے غصہ

سے محفوظ رکھ۔ جو شخص خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر، رو کر ملک کے لیے دعائیں مانگے وہ غدار کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم ملک کے وفادار ہیں مگر اس ملک کو فرنگی نظام سے نجات دلا کر محمدیؐ نظام کے ذریعے مستحکم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ملک کی بقا اور استحکام اسی میں ہے۔ مگر لڈو کھا کر ملک کو برباد کرنے والے ملک میں فرنگی نظام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اسلامی نظام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ ہم صدر کی رعایا ہیں اور اپنے افسروں کی بھی رعیت ہیں لیکن اگر صدر بھی اسلامی نظام سے بے وفائی کریں گے تو ہم ان کی بات نہیں مانیں گے اور میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سر دے دیں گے مگر اسلامی نظام کے خلاف کوئی بات قبول نہیں کریں گے۔ ہمارے ملک کو پہلے فرنگی نظام کے ذریعے برباد کیا جاتا رہا اور اب امریکی نظام کے ذریعے ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں مگر ہم نے نہ فرنگی نظام کو قبول کیا تھا اور نہ ہی امریکی نظام کو قبول کریں گے۔ ہمارے بزرگوں نے فرنگی نظام کے خلاف جنگ لڑی تھی اور ہم امریکی نظام کے تسلط کے خلاف جنگ لڑیں گے اور ہمارا اعلان ہے کہ ہم سولی چڑھ جائیں گے، دار و رسن کو منظور کر لیں گے مگر امریکی نظام کا تسلط برداشت نہیں کریں گے۔

میں صدر پاکستان سے، ملک کے افسروں سے، ججوں سے اور حکمرانوں سے کہتا ہوں کہ یہ ملک ہم سب کا ہے۔ ہمارا بھی ہے اور آپ کا بھی ہے اس لیے ہم سب کو اس ملک کی فکر کرنی چاہیے اور سب کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ نہ تم ہمارے لیے غیر ہو نہ ہم تمہارے لیے غیر ہیں، سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہم سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور غلام ہیں۔ اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ نبی اکرمؐ کا نظام اور قانون نافذ کر کے اس ملک کو بچا لیں۔ یہ ملک اسی نظام سے بچے گا، فرنگیوں اور امریکیوں کے نظام سے یہ ملک باقی نہیں رہے گا۔ لڈو کھا کر ملک کو بدنام کرنے والوں سے میں کہتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ تم نے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا چھوڑ دی ہے، دوستوں کو دشمن سمجھ لیا ہے اور دشمنوں کو دوست بنا رکھا ہے۔ اس لیے خدا تم سے ناراض ہے اور شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے، اس حالت سے باہر نکلو، قرآن و سنت کو سینے سے لگاؤ اور اللہ کے بندوں کی بات مانو تاکہ یہ ملک دشمن کی سازشوں سے محفوظ ہو جائے۔ میرے اندر کوئی کمال نہیں ہے البتہ قرآن کریم کا جوہر اللہ تعالیٰ نے سینے میں رکھ دیا ہے میری کوشش ہے کہ یہ جوہر مرنے تک ساتھ رہے اور اسے ساتھ لے کر قبر میں جاؤں، میں خانپوریوں سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں قرآن سناتا رہوں گا، حدیث رسول سناتا رہوں گا، تم مجھے بے شک جوتے مارو مجھے پتھر مارو میں تمہارے جوتے کھا لوں گا تمہارے پتھر برداشت کر لوں گا مگر قرآن سنانے سے باز نہیں آؤں گا اور قرآن کے نظام کی دعوت دینے سے کبھی باز نہیں آؤں گا۔

(ہفت روزہ الہلال ۔ ۱۰ نومبر ۲۰۰۰ء)

(۵)

۵ مارچ کو ڈریم لینڈ ہوٹل اسلام آباد میں حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز کی یاد میں ایک تقریب تھی جو مختلف سیاسی و دینی رہنماؤں اور اسلام آباد وراولپنڈی کے علماء کے ایک بھرپور اجتماع کا ذریعہ بن گئی۔ تقریب کے بعض شرکاء کا کہنا تھا کہ ایک بڑے عرصہ کے بعد اسلام آباد میں علماء کرام اور دینی کارکنوں کا اتنا بھرپور اجتماع دیکھنے میں آیا ہے۔

حضرت درخواستیؒ کی دینی و ملی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے فرزند و جانشین مولانا فداء الرحمان درخواستی کی زیر نگرانی جامعہ انور القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''انوار القرآن'' نے ایک ضخیم اور جامع حافظ الحدیث نمبر شائع کیا ہے جو سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ خوبصورت جلد اور عمدہ کمپوزنگ و طباعت سے مزین ہے اور نامور اہل قلم اور اصحاب دانشوروں کی نگارشات کا مجموعہ ہے۔ مذکورہ بالا تقریب اسی ''حافظ الحدیث نمبر'' کی رونمائی کی تقریب کے طور پر منعقد کی گئی تھی جس کی صدارت پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی نے کی اور اس سے حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدظلہ، جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمن، اور جماعت اسلامی پاکستان کے امیر جناب قاضی حسین احمد کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام کے دیگر رہنماؤں سینیٹر مولانا سمیع الحق، مولانا عبد الغفور حیدری ایم این اے، حافظ حسین احمد ایم این اے، شاہ عبد العزیز ایم این اے، مولانا منظور احمد چنیوٹی، مولانا قاری سعید الرحمن، مولانا محمد عبد الرؤف فاروقی، حاجی جاوید ابراہیم پراچہ، مولانا محمد شفیع قاسمی، مولانا محمد صابر سرہندی، مولانا قاضی عبد الرشید، مولانا عبد الرؤف ملک اور دیگر راہنماؤں نے خطاب کیا، جبکہ ماہنامہ انوار القرآن کراچی کے مدیر مولانا عبد الرشید انصاری نے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔

حضرت درخواستیؒ نے کم و بیش پون صدی تک مسلسل دینی و علمی خدمات سرانجام دی ہیں اور نصف صدی کے لگ بھگ قافلہ حق کی نمائندہ جماعت جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر رہے ہیں۔ ان کی امارت میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ، حضرت مفتی عبد القیوم پوپلزئیؒ، حضرت مولانا عرض محمدؒ آف کوئٹہ، حضرت مولانا پیر محسن الدین احمدؒ آف ڈھاکہ، حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، حضرت مولانا مفتی محمد عبد اللہؒ، حضرت مولانا بشیر احمد پسروریؒ، اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ جیسے اکابر علماء نے دینی و جماعتی خدمات میں حصہ لیا ہے۔

مجھے بھی تقریباً تیس سال تک ایک کارکن کے طور پر اور اس دوران سترہ سال کا عرصہ ان کی ٹیم اور کابینہ کے خادم رکن کی حیثیت سے ان کی امارت میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے مقررین جب ان کی خدمات اور جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کر رہے تھے تو میری نگاہوں کے سامنے ماضی کے مناظر ایک ایک کر کے گھومتے جا رہے تھے۔ اجتماع میں زیادہ تر وہ علماء کرام اور کارکن تھے جو حضرت درخواستیؒ کے براہ راست یا بالواسطہ شاگرد تھے اور عقیدت و ارادت کے جذبات کے تو بھی حامل تھے کہ یہی جذبہ انہیں اس محفل میں لے کر آیا تھا۔

حضرت درخواستیؒ کی جدوجہد اور تگ و تاز کے مختلف میدان تھے، وہ اپنے وقت کے ایک بڑے مدرس اور محدث تھے جنہیں "حافظ الحدیث" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور اس اعزاز میں وہ اپنے تمام معاصرین میں منفرد تھے۔ وہ دینی فتنوں کے خلاف ایک شمشیر براں تھے اور جہاں بھی عقیدہ اور ایمانیات کے حوالہ سے کوئی فتنہ اور خطرہ دیکھتے تھے بلا خوف و خطر اس کے خلاف میدان میں کود جایا کرتے تھے۔ وہ حکومتوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے اور ہر غلط بات پر حکمرانوں کو برملا ٹوک دیا کرتے تھے۔ وہ علماء کرام اور کارکنوں کے حالات کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے اور کسی قسم کی رو رعایت کے بغیر خلوت و جلوت ہر جگہ انہیں تنبیہ کر دیتے تھے۔ وہ عوام کی دینی و اخلاقی حالت کی مسلسل نگرانی کرتے تھے، ان کے خطبات کا بیشتر حصہ اصلاح و تذکیر پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ ایک عظیم مربی اور روحانی شیخ تھے جو اپنے مرشد حضرت دین پوری قدس اللہ سرہ العزیز کی پیروی میں لوگوں کو اللہ اللہ کا ذکر سکھانے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ اور وہ ایک عظیم مجاہد تھے جن کی زبان ہمیشہ جہاد اور مجاہدین کے تذکرہ سے تر رہتی تھی۔

مقررین اپنے خطابات میں حضرت درخواستیؒ کی اس چومکھی لڑائی کا تذکرہ کر رہے تھے جو انہوں نے زندگی بھر باطل کے خلاف لڑی اور ان کی بصیرت افروز باتوں کو یاد کر کے ایمان کی تازگی کا سامان کر رہے تھے جن کے ذریعہ انہوں نے اہل وطن کو آنے والے فتنوں سے بروقت خبردار کر دیا تھا۔ جہاد افغانستان میں حضرت درخواستیؒ کے سرگرم کردار کا بھی تذکرہ ہوا اور ایک مقرر نے بتایا کہ ابھی افغانستان سے مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تھی اور روسی افواج کے خلاف مسلح مزاحمت کا کوئی واضح پروگرام سامنے نہیں آیا تھا کہ افغان مہاجرین کے ایک کیمپ میں حضرت درخواستیؒ تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطاب کے دوران مہاجر سامعین کی مسلسل اٹھک بیٹھک شروع کرا دی۔ بعد میں فرمایا کہ انہوں نے اب جہاد کرنا ہے اور میں ان کو تربیت دے رہا ہوں۔ یہ ان کی خداداد بصیرت کی بات تھی کہ انہوں نے آنے والے دور کی ضروریات سے بروقت لوگوں کو خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے حرم پاک کا قصہ سنا کر بہت سے سامعین کو آبدیدہ کر دیا کہ حضرت درخواستیؒ وہاں ایک محفل میں مسلسل احادیث نبویؐ پڑھتے جا رہے تھے اور بڑے بڑے عرب علماء دانتوں میں انگلیاں دبائے ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے کہ دنیائے عجم میں بھی حدیث رسولؐ کا اتنا بڑا شیدائی اور اتنا بڑا حافظ ہو سکتا ہے؟

راقم الحروف کو بھی اس اجتماع میں اظہار خیال کی دعوت دی گئی اور میں نے عرض کیا کہ اس موقع پر اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کی بجائے حضرت درخواستیؒ کا ہی ایک پیغام پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے جمعیۃ علماء اسلام کا امیر منتخب ہوتے وقت قوم کو دیا تھا اور جس کی تازگی، ضرورت اور اہمیت چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ صرف برقرار ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مرد درویش قبر سے اٹھ کر ہمارے آج کے حالات کو دیکھ رہا ہے اور ہمیں سنبھلنے اور ہوش میں آنے کا پیغام دے رہا ہے۔

یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا انتقال ہوا تھا اور ان کے جنازہ میں شرکت کے بعد حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ نے مدرسہ مخزن العلوم عید گاہ خانپور میں جمعۃ المبارک کے پہلے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ اس خطاب کی کیسٹ حضرت درخواستیؒ اور جامعہ مخزن العلوم کے نائب مہتمم حضرت مولانا حاجی مطیع الرحمان درخواستی کے پاس محفوظ ہے اور میں علماء کرام وطلبہ کو اکثر تلقین کیا کرتا ہوں کہ وہ یہ کیسٹ حاصل کریں اور اسے کبھی کبھی ایمان کی تازگی کے لیے ضرور سن لیا کریں۔ اس کیسٹ میں سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں جو آج کے حالات میں بھی ہمارے لیے سبق اور پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس پیغام کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل کا عہد ہی حضرت درخواستیؒ کے ساتھ ہماری عقیدت و محبت کا عملی اظہار ہو گا۔ حضرت درخواستیؒ اس خطاب میں فرماتے ہیں کہ

> ”اہل باطل خوش نہ ہوں کہ حق کہنے والے چلے گئے۔ نہیں بلکہ ایک جائے گا تو دوسرا اس کی جگہ حق کہنے والا کھڑا ہو گا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہمارے لیے سعادت کی بات ہو گی کہ ہم جانے والوں کے مشن کو سینے سے لگائے رکھیں اور انہی کی طرح محنت اور جدوجہد کرتے ہوئے ان سے جا ملیں“۔

> ”دینی اقدار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، رمضان المبارک کی بے حرمتی ہو رہی ہے، ناچ گانا عام ہے، فلمیں بن رہی ہیں، سینما آباد ہیں، لوگوں کو بے حیا بنایا جا رہا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث کا انکار ہو رہا ہے، نبیؐ کے یاروں صحابہ کرامؓ کی توہین ہوتی ہے اور

حضورؐ کے گھرانے کی بے احترامی کی جاتی ہے لیکن کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ ہمارے ملک کو پہلے فرنگی نظام کے ذریعہ برباد کیا جاتا رہا اور اب امریکی نظام کے ذریعہ ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں مگر ہم نے نہ فرنگی نظام کو قبول کیا تھا اور نہ ہی امریکی نظام قبول کریں گے۔ ہمارے بزرگوں نے فرنگی نظام کے خلاف جنگ لڑی تھا اور ہم امریکی نظام کے تسلط کے خلاف جنگ لڑیں گے اور ہمارا اعلان ہے کہ ہم سولی پر چڑھ جائیں گے، دار و رسن کو منظور کر لیں گے مگر امریکی نظام کا تسلط برداشت نہیں کریں گے"۔

"میں صدر پاکستان سے، ملک کے افسروں سے، ججوں سے اور حکمرانوں سے کہتا ہوں کہ یہ ملک ہم سب کا ہے، ہمارا بھی ہے، آپ کا بھی ہے۔ اس لیے ہم سب کو اس ملک کی فکر کرنی چاہیے اور سب کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ نہ تم ہمارے لیے غیر ہو نہ ہم تمہارے لیے غیر ہیں، ہم سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہم سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور غلام ہیں۔ اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ حضور اکرمؐ کا نظام اور قانون نافذ کر کے اس ملک کو بچا لیں، یہ ملک اسی نظام سے بچے گا۔ فرنگیوں اور امریکیوں کے نظام سے یہ ملک باقی نہیں رہے گا۔ لڈو کھا کر ملک کو بدنام کرنے والوں سے میں کہتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں بند ہیں، تم نے دوست کو دشمن سمجھ لیا ہے اور دشمنوں کو دوست بنا لیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اور شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے۔ اس حالت سے باہر نکلو، قرآن و سنت کو سینے سے لگاؤ، اور اللہ کے بندوں کی بات مانو تاکہ یہ ملک دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ ہو جائے"۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۸ مارچ ۲۰۰۳ء)

(۶)

برادر مکرم مولانا فضل الرحمان درخواستی زید مجدہم نے گزشتہ روز فون پر بتایا کہ وہ حافظ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی نور اللہ مرقدہ کی یاد میں ایک سیمینار کا اہتمام کر رہے ہیں، بے حد خوشی ہوئی۔ اپنے بزرگوں کو یاد رکھنا، ان کی خدمات و تعلیمات سے آگاہ ہونا اور ان کا تذکرہ کرتے رہنا باعث خیر و برکت ہونے کے ساتھ ساتھ راہنمائی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور آج کے دور کی بطور خاص اہم ضرورت ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے ہمارا یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے کہ اپنے بزرگوں کا نام تو لیتے ہیں اور ان کے تذکرہ کے

فوائد و ثمرات بھی حاصل کرتے ہیں مگر ان کی حیات و خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مطالعہ و آگاہی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی راہنمائی سے محروم رہتے ہیں، اور دوسرا نقصان اس سے بھی بڑا یہ ہوتا ہے کہ بار بار ان کا نام لینے سے لوگ انہیں بھی ہم پر قیاس کرنے لگتے ہیں اور ہم ان کی نیک نامی کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کے تعارف کو خراب کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

حافظ الحدیث شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے کم و بیش پون صدی تک پاکستان میں امت مسلمہ اور خاص طور پر علماء کرام اور دینی کارکنوں کی علمی و روحانی اور دینی و فکری راہنمائی کی ہے۔ لاکھوں لوگوں نے ان سے مختلف حوالوں سے استفادہ کیا ہے جو بلاشبہ وطن عزیز کی علمی و دینی جدوجہد کی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ وہ ہزاروں علماء کرام کے استاد اور لاکھوں انسانوں کے دینی و روحانی مربی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے متعدّد دینی تحریکات کی جو قیادت اور سرپرستی فرمائی وہ انحطاط اور تنزل کے اس دور میں بہت یاد آتی ہے۔ مجھے حضرت درخواستیؒ کے ساتھ ایک کارکن کے طور پر ربع صدی تک خدمت سرانجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی جسے دنیا و آخرت میں اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہوں۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کا خصوصی ذوق دینی مدارس کا قیام اور ان کی سرپرستی تھا۔ جس علاقہ میں جاتے وہاں معلوم کرتے کہ دینی تعلیم کا کوئی ادارہ موجود ہے؟ اگر یہ دیکھتے کہ وہ علاقہ دینی مکتب و مدرسہ سے خالی ہے تو ان کی پہلی ترجیح یہ ہوتی تھی کہ علماء کرام اور اپنے عقیدت مندوں کو ترغیب دے کر مدرسہ قائم کراتے اور پھر اس کی سرپرستی بھی کرتے۔

دینی اجتماعات میں ان کے بیانات دینی معلومات کے ساتھ ساتھ جذب و کیف کا حسین امتزاج ہوتے تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا حدیث رسولؐ کا تذکرہ ہوتا تھا، وہ جس محفل میں ہوتے کوئی نہ کوئی حدیث سناتے۔ جبکہ عوامی بیانات میں تو روانی کے ساتھ احادیث پڑھتے جاتے تھے۔ ان کے بیانات میں جہاد اور دینی جدوجہد کا تذکرہ لازمی ہوتا تھا، وہ اپنے سامعین کو دینی جدوجہد میں کسی نہ کسی طرح شریک رہنے کی تلقین کرتے۔ علماء اور طلباء کو بطور خاص ابھارتے، انہیں مجمع میں کھڑا کر کے ان سے دینی جدوجہد کرنے کا وعدہ لیتے اور بسا اوقات علماء کرام اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی کے لیے دستار بندی بھی فرماتے۔ خود مجھے دوبارہ یہ شرف حاصل ہو چکا ہے اور دونوں مواقع پر میری باری آنے پر دستاریں ختم ہو جانے پر انہوں نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر میرے سر پر رکھ دی۔ یہ دونوں ٹوپیاں میرے پاس محفوظ ہیں اور ان میں سے ایک ٹوپی

جمعہ وعیدین کو دستار کے نیچے اہتمام سے پہنتا ہوں۔

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے وصال کے بعد علماء حق کے سب سے بڑے قافلہ ''جمعیۃ علماء اسلام پاکستان'' کا امیر منتخب کیا گیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک وہ اس حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ افغانستان میں روسی استعمار کی عسکری یلغار کے بعد وہاں کے غیور علماء کرام نے علم بغاوت بلند کیا اور بیرونی جارحیت کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تو ان کی سرپرستی اور معاونت میں حضرت مولانا درخواستیؒ پیش پیش تھے۔ انہوں نے پورے ملک میں اس مقصد کے لیے جہاد کی آواز لگائی اور قبائلی علاقوں کے مسلسل دورے کر کے وہاں کے مسلمانوں اور علماء کرام کو جہاد افغانستان کی حمایت اور پشت پناہی کے لیے تیار کیا۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ روسی جارحیت کے خلاف جہاد افغانستان کی کامیابی میں جہاں افغانستان، پاکستان اور دنیا بھر کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی قربانیاں اور محنت کار فرما ہے وہاں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبد الحق اکوڑہ خٹک، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی مساعی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور کوئی مؤرخ جہاد افغانستان کی تاریخ کو ان بزرگوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام نے قرارداد مقاصد، ۲۲ دستوری نکات اور تحریک ختم نبوت کی صورت میں نفاذِ اسلام کے جو دائرے متفقہ طور پر طے کیے تھے، حضرت درخواستیؒ نے دینی جدوجہد کے اس طریقہ کار اور حدود کا زندگی بھر پہرہ دیا۔ اور ان کی راہنمائی و سرپرستی میں نہ صرف قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخی فیصلہ ہوا بلکہ دستور پاکستان میں نفاذِ اسلام کی اصولی بنیادیں ہمیشہ کے لیے طے پاگئیں جو بلاشبہ وطن عزیز میں نفاذِ شریعت کی مضبوط اساس ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مسلم ممالک اور حکومتوں کے لیے نفاذِ اسلام کے حوالہ سے مشعل راہ ہیں۔ ملک کے اندر انہوں نے ہمیشہ پرامن اور قانونی جدوجہد کا طریقہ اپنایا اور اہل دین کو اسی کی تلقین کرتے رہے۔ وہ ہر موقع پر فرماتے کہ ہمارے اکابر نے دینی جدوجہد کا جو طریق کار طے کیا ہے اور جس انداز میں انہوں نے محنت کی ہے ہمیں اس کے مطابق چلنا ہوگا، اس سے ہٹ کر ہم اگر دینی جدوجہد کا کوئی اور راستہ اختیار کریں گے تو وہ ہمارے لیے کامیابی کا راستہ نہیں ہوگا۔

حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے زندگی بھر قرآن و سنت اور دینی علوم کی مسلسل تعلیم دی، وہ اس کے ساتھ دینی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے، روحانی مجالس آباد کرتے رہے، دین کی دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھانے اور باطل تحریکات کے مقابلہ کرنے کے لیے علماء کرام، طلبہ اور دینی کارکنوں

کو تیار کرتے رہے اور ان کی سرپرستی فرماتے رہے۔ آج دینی جدوجہد کے حوالے سے فکری خلفشار کی جو فضا پیدا کی جارہی ہے اور طرح طرح کے فتنے ابھر رہے ہیں اس میں حضرت درخواستیؒ کے ذوق، فکر اور فیض کو عام کرنے اور نئی نسل کو ان بزرگوں سے متعارف کرانے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ اپنے بزرگوں کا بار بار تذکرہ کریں اور ان کے فکر و ذوق کو عام کر کے نئی نسل کی صحیح راہنمائی کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۶ جنوری ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا انعام الحسنؒ

تبلیغی جماعت کے امیر حضرت مولانا انعام الحسن ۹ جون کو دہلی میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات کی خبر آناً فاناً دنیا بھر کے تبلیغی مراکز میں پہنچ گئی اور دنیا کے کونے کونے میں دعوت و تبلیغ کے عمل سے وابستہ لاکھوں مسلمان رنج و غم کی تصویر بن گئے۔ مولانا انعام الحسن کو تقریباً تیس برس پہلے تبلیغی جماعت کے دوسرے امیر حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی وفات کے بعد عالمگیر تبلیغی جماعت کا امیر منتخب کیا گیا تھا۔ ان کی امارت میں دعوت و تبلیغ کے عمل کو عالمی سطح پر جو وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہوئی وہ ان کے خلوص و محنت کی علامت ہے۔

دعوت و تبلیغ کا یہ عمل جو حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے کم و بیش پون صدی قبل میوات کے سادہ اور دین سے بے بہرہ مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آراستہ کرنے کے لیے شروع کیا تھا، آج عالم اسلام میں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دین کی بنیادی باتوں کی دعوت کی سب سے بڑی اور منظم جدوجہد کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اور اس میں مولانا انعام الحسنؒ کی پرخلوص محنت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ جدوجہد سادہ اور فطری طریق کار پر مبنی ہے جس میں اعتقادی، فکری اور فقہی مباحث سے مکمل طور پر گریز کرتے ہوئے عام مسلمان کو کلمہ طیبہ، نماز، قرآن کریم اور سنت نبویؐ کے ساتھ جوڑنے کی فکر کی جاتی ہے۔ اور اس بات کی محنت کی جاتی ہے کہ آج کے مسلمانوں میں قرون اولیٰ والے مسلمانوں کے اوصاف و اعمال کو زندہ کیا جائے۔ تبلیغی جماعت کے اکابرین کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے اندر قرونِ اولیٰ والے اعمال اور اوصاف زندہ ہو جائیں تو آج بھی انسانیت کو نجات کے راستے پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ مولانا انعام الحسنؒ بھی انہی تعلیمات کے داعی تھے اور تبلیغی جماعت کے دیگر اکابرین کی طرح کوئی الگ اور امتیازی بات کرنے کی

بجائے وہی اجتماعی بات کرتے تھے جو سب تبلیغی اکابر عام طور پر کرتے ہیں۔ لیکن ان کا خلوص، تقویٰ اور لہجہ کی سادگی اس قدر پرکشش تھی کہ عام لوگ ان کی گفتگو سننے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے اور دین دار مسلمان ان کی زیارت اور ان کے ساتھ دعا میں شرکت کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔

مولانا انعام الحسنؒ کو تبلیغی حلقوں میں ”حضرت جی“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ رائے ونڈ میں نومبر کے دوران ہر سال منعقد ہونے والے عالمی تبلیغی اجتماع میں حضرت جی کی نصیحتیں سننے اور ان کے ساتھ دعا میں شریک ہونے کے لیے عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بڑے علماء اور اہل اللہ بھی موجود ہوتے تھے اور دعا میں ان کے سادہ جملوں پر لاکھوں آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ رائے ونڈ کے عالمی تبلیغی اجتماع کو یہ وسعت اور قبول عام بھی انہی کے دور میں حاصل ہوا کہ اسے حج بیت اللہ اور حرمین شریفین میں آخری عشرۂ رمضان المبارک کی حاضری کے بعد عالم اسلام کا سب سے بڑا سالانہ اجتماع شمار کیا جاتا ہے۔ اور اس اجتماع میں دنیا کے ہر خطہ اور براعظم سے تعلق رکھنے والے مسلمان نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان میں سے ہزاروں جماعتیں تشکیل پا کر دنیا بھر میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہیں جو کسی حکومت یا ادارے پر بوجھ بنے بغیر اپنے ذاتی خرچہ پر دین سیکھنے اور دین پر عمل کی دعوت دینے کے جذبہ کے ساتھ قریہ قریہ بستی بستی گھومتی ہیں۔

راقم الحروف کو رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر حضرت مولانا انعام الحسنؒ کے ارشادات سننے اور ان کے ساتھ دعا میں شرکت کا موقع کئی بار ملا لیکن زیارت نہ کر سکا۔ کیونکہ اتنے بڑے ہجوم میں اس قدر آگے گھسنا اور دھکم پیل کرنا میرے مزاج کے خلاف ہے، البتہ گزشتہ سال رب العزت نے یہ موقع بھی عنایت فرما دیا جب حضرت جیؒ ڈیوزبری برطانیہ میں یورپ کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ اس اجتماع میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا جو بلاشبہ مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع تھا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق چالیس سے پچاس ہزار تک افراد اس میں شریک تھے۔ اجتماع کے بعد دہلی واپسی کے لیے ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچے تو رخصت کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ حضرت جیؒ معذوروں کی کرسی پر بیٹھے تھے، جسم پر کمزوری اور نقاہت کے آثار تھے مگر چہرے کا نور دیکھ کر خدا یاد آرہا تھا۔ اس موقع پر رخصت کرنے کے لیے آنے والے سینکڑوں مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے مختصر دعا کرائی۔ کیا خبر تھی کہ اس مرد درویش کی یہ پہلی زیارت ہی آخری زیارت ثابت ہوگی۔

آج حضرت جیؒ اپنے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں عقیدت مندوں، بلکہ کروڑوں بھی کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو، داغِ مفارقت دے کر اپنے خالق و مالک کے پاس جا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں

اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۱۹۹۵ء)

حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ

(۱)

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند و جانشین اور مجلس احرار اسلام کے قائد حضرت مولانا سید ابوذر عطاء المنعم شاہ بخاریؒ طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں ملتان میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم حضرت امیر شریعتؒ کے علمی وفکری جانشین تھے اور بلند پایہ عالم دین، دانشور، صاحب قلم اور منجھے ہوئے خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عظیم باپ کی وضعداری، فقر و استغناء اور حق گوئی کی روایات کے بھی امین تھے جو کہ کساد بازاری کے اس دور میں جنس نایاب ہوتی جا رہی ہے۔

مولانا سید ابوذر بخاریؒ، جو حافظ جی کے نام سے معروف تھے، مطالعہ اور معلومات کے حوالے سے اپنے دور کے چند گنے چنے افراد میں شمار ہوتے تھے۔ وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو گھنٹوں بے تکان بولتے چلے جاتے اور مستند معلومات کا انبار لگا دیتے۔ کبھی ان کی مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھنے کا اتفاق ہوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی بڑی لائبریری میں کچھ وقت گزار کر آئے ہیں۔ بے رحم سیاست کی آکاس بیل ان کی شخصیت کے گرد حصار قائم نہ کر لیتی تو قحط الرجال کے اس دور میں وہ اہل علم کے لیے استفادہ اور راہنمائی کا ایک بڑا مرکز اور مرجع ہوتے مگر حوادث زمانہ کے تسلسل نے انہیں گوشہ نشینی اور علالت کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

حافظ جیؒ کی وفات صرف بخاری خاندان اور مجلس احرار اسلام کے کارکنوں کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے باعث رنج وغم ہے جو علم دوستی، وضعداری اور بے باکی کی قدروں سے شناسائی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، اور ان کے اہل خاندان و عقیدت مندوں کو صبر و حوصلہ عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۱۹۹۵ء)

(۲)

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سب سے بڑے فرزند اور جانشین مولانا سید ابوذر عطاء المنعم شاہ بخاری طویل علالت کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو ملتان میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کئی

برسوں سے بسترِ علالت پر تھے۔ پہلے ایک حادثہ میں زخمی ہوئے اور طویل عرصہ علالت پر رہے، پھر فالج کے حملہ کا شکار ہوئے اور بالآخر دنیا میں اپنا مقررہ وقت پورا کرنے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا سید عطاء المنعم شاہ بخاری جو سید ابوذر بخاری اور حافظ جی کے نام سے معروف تھے، اپنے وقت کے جید اور وسیع المطالعہ علماء میں شمار ہوتے تھے۔ خطابت انہیں اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں ملی تھی، کتاب بینی کا ذوق جنون کی حد تک رکھتے تھے، سخن فہمی اور شعروادب کا ذوق اعلیٰ درجے کا تھا اور گفتگو کے سلیقہ سے بھی بہرہ ور تھے۔ اس لیے جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو گھنٹوں بے تکان بولتے چلے جاتے اور مستند معلومات کے ساتھ ساتھ کتابوں کے حوالوں کا انبار لگا دیتے۔ بلاشبہ ان کی مجلس میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بڑی لائبریری میں وقت گزار کر آئے ہیں۔ وہ سیاست میں اپنے مرحوم والد گرامی امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و نظریات، ان کی وضع داری اور حق گوئی کی روایات کے امین تھے۔ مولانا مرحوم مجلس احرارِ اسلام کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام نے انتخابی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور اپنی سرگرمیاں تحفظ ختم نبوت کے شعبہ تک محدود کر کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے خواہشمند احرار کارکنوں کو دوسری سیاسی جماعتوں میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس سلسلہ میں حافظ جی مرحوم کا موقف یہ تھا کہ

"حضرت امیر شریعتؒ اور قائدینِ احرار نے جنوری ۱۹۴۹ء میں معروضی حالات کے تحت مروجہ انتخابی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی تھی اور قادیانیوں اور دیگر لادین قوتوں کی طرف سے پاکستان اور پاکستان کی دینی قوتوں کے خلاف وسیع سازش اور منصوبہ بندی کو ناکام بنانے کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی۔ مجلس احرار کے نزدیک انتخابات ملکی و قومی مسائل کا حل نہیں بلکہ ملک و دین دشمن قوتوں کو عوامی محاذ پر شکست دینا تھا۔ مرزائی پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، چنانچہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت برپا کی گئی اور مرزائیوں کو سیاسی و دینی محاذ پر تاریخ ساز شکست سے دوچار کیا۔ مجلس احرارِ اسلام آج بھی اسی موقف پر قائم ہے اور انتخابی سیاست کو دینی قوتوں کی تباہی و انتشار کا سب سے بڑا سبب سمجھتی ہے۔ مجلس احرار کے نزدیک جمہوریت عصرِ حاضر میں اسلام کے خلاف سب سے بڑا فتنہ ہے۔ وہ بعض حضرات کے اس موقف کو سراسر غلط قرار دیتے کہ امیر شریعت نے مجلس احرار کو ختم کر دیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ انہوں نے جماعت کو ختم نہیں کیا تھا بلکہ انتخابی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی تھی"۔

مولانا ابوذر بخاریؒ علالت کے ہاتھوں بے بس ہوجانے سے پہلے تمام زندگی احرار کارکنوں کو منظم کرنے اور مجلس احرارِ اسلام کو ایک متحرک سیاسی قوت کے طور پر سامنے لانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد سیاسی جماعتوں کی بحالی کا اعلان ہوا، مولانا سید عطاء المنعم شاہ بخاریؒ نے مجلس احرارِ اسلام کو از سر نو منظم کرنے کے لیے ملک گیر دورہ کیا اور متعدّد شہروں میں بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ اس وقت ان کی پر جوش خطابت کی گھن گرج اور عوامی جلسوں میں پذیرائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجلس احرار اسلام کو ایک بار پھر قومی سیاست کے دھارے میں شامل کرنے کی کوششوں میں شاید کامیاب ہوجائیں۔ لیکن وقت اور اس کے تقاضے خاصا سفر طے کر چکے تھے اور اس فاصلے کو کم کرنے میں کامیابی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ مولانا سید ابوذر بخاریؒ دراصل علم و مطالعہ کے شعبہ کے آدمی تھے لیکن بے رحم سیاست نے ان کے اور ان کے معاصرین کے درمیان حجابات اور ترجیحات کی ایسی لکیریں کھینچ دیں کہ ان کی علمی و دینی شخصیت سے وہ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا جو ان کا اور ان سے زیادہ ان کے اہل زمانہ کا حق تھا۔ ورنہ وہ اگر عملی سیاست کے جھمیلوں میں الجھ کر نہ رہ جاتے تو علمی و فکری محاذ پر اہل علم و دانش کے لیے رہنمائی اور استفادہ کا ایک مضبوط مرکز اور مرجع ہوتے۔

حافظ جی مرحوم ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے، ان کی متعدّد نگارشات مختلف جریدوں اور کتابچوں کی شکل میں چھپ چکی ہیں جو ان کے علمی و ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ انہیں اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی قدرت حاصل تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے والد مرحوم کی طرح مجلسی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ مجلس آرائی کے فن سے آشنا تھے اور ان کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو اپنا حصہ مل جاتا تھا۔

موت ہر ذی روح کے لیے مقدر ہے اور ہر شخص نے اپنے وقت پر اس دنیا سے بہرحال چلے جانا ہے لیکن بعض اموات کی کسک حساس دلوں کو بہت دیر تک اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ سید ابوذر بخاریؒ جیسے عالم دین، دانشور، ادیب، شاعر، خطیب اور وضعدار رہنما کی یاد بھی ان کی موت کے بعد ایک عرصہ تک ان کے دوستوں کے دلوں میں تازہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان واحباب کو صبر جمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(مجلہ نامعلوم۔ دسمبر ۱۹۹۵ء)

(۳)

جانشین امیر شریعت حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ کا نام تو سن رکھا تھا کہ ''شاہ جی'' امیر شریعتؒ کے بڑے بیٹے ہیں اور بہت بڑے عالم ہیں لیکن دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب ایوب خان مرحوم نے ۱۹۶۲ء

میں مارشل لاء ختم کر کے ملک میں سیاسی سرگرمیاں بحال کیں اور مجلس احرار اسلام نے ملک کے مختلف شہروں میں جلسے منعقد کر کے جماعتی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ انہی دنوں گوجرانوالہ کے شیرانوالہ باغ میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ تھا اور مولانا سید ابوذر بخاریؒ اس جلسہ کے مرکزی مقرر تھے۔

یہ میرا طالب علمی کا دور تھا، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں پڑھتا تھا اور جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ ذہنی وابستگی ہو چکی تھی لیکن مجلس احرار اسلام کے ماضی اور کارناموں سے بھی بے خبر نہ تھا۔ اس لیے کہ چودھری افضل حق مرحوم کی ''تاریخ احرار''، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم کی ''دنیا کی بساط سیاست'' اور ''تحریک مدح صحابہؓ'' اور آغا شورش کاشمیری مرحوم کی ''خطبات احرار'' نظر سے گزر چکی تھیں۔ بلکہ سیاسیات کے حوالہ سے میں نے زندگی میں سب سے پہلے جن کتابوں کا مطالعہ کیا وہ یہی چار کتابیں ہیں۔ انہیں میں نے نہ صرف پڑھا بلکہ بار بار پڑھا اور اپنے ذہن وفکر پر ان کے اثرات ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے جماعتی معاصرت کے فطری جذبے کے باوجود احرار رہنماؤں کے ساتھ قلبی تعلق قائم رہا اور اب بھی الحمدللہ قائم ہے۔ حافظ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کو سب سے پہلے اس جلسہ میں دیکھا اور سنا، سرخ کرتا پہنے، ہاتھ میں کلہاڑی پکڑے ہزاروں کے اجتماع میں وہ ملک کے مسائل پر پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے بے باک خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ علم اور خطابت کا حسین امتزاج تھا اور اس پر جرأت و بے باکی اور خلوص ووفا کے جذبات کا اضافہ بھی۔ اس لیے متاثر نہ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جلسہ کے بعد اپنے طالب علم ساتھیوں کے سامنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ شخص اگر اسی طرح پورے ملک میں چلتا رہا تو اس کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکے گا۔ لیکن مجلس احرار اسلام قیادت کی صف بندی اور اس کی ترجیحات کے تعین میں ایسی الجھی کہ وقت اس کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا اور پھر اس خلاء کو پر کرنے کے لیے جمعیۃ علماء اسلام آگے بڑھی اور بڑھتی چلی گئی۔

حافظ جیؒ کے ساتھ اس کے بعد بے شمار ملاقاتیں ہوئیں، عام جلسوں میں ان کے طویل خطابات سنے اور نجی محفلوں کی بے تکلفانہ گپ شپ کا حظ بھی اٹھایا۔ مجھے ان کے مطالعہ کی وسعت اور معلومات کے استحضار نے سب سے زیادہ متاثر کیا حتیٰ کہ بسا اوقات میں صرف اس لیے ان سے ملاقات و مجلس کے مواقع تلاش کرتا تھا کہ بہت سی مستند معلومات کسی لمبے چوڑے مطالعہ کی کلفت اٹھائے بغیر ان کے ہاں مل جایا کرتی تھیں۔

حافظ جیؒ کو جمعیۃ علماء اسلام کی سیاسی پالیسیوں سے ہمیشہ اختلاف رہا اور مجھے ایک عرصہ تک سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے جمعیۃ کے ترجمان کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اپنے اختلاف کا کھل کر اظہار کرتے

تھے اور لگی لپٹی رکھے بغیر کرتے تھے، اور میں ایک صاحب علم اور صاحب رائے کے طور پر ان کا یہ حق سمجھتا تھا اس لیے اختلافات اور ان کے اظہار میں ایک گونہ شدت کے باوجود میری عقیدت اور ان کی شفقت کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ریکارڈ میں آجائے تو شاید نامناسب نہ ہو۔ ایک دور میں جمعیۃ علماء اسلام کے امیر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے دیوبندی مکتب فکر کے سرکردہ علماء کو جامعہ مخزن العلوم خانپور میں جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ عمومی جلسہ بھی تھا اور مختلف دیوبندی جماعتوں کے رہنماؤں کے مشترکہ خصوصی اجلاس کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ اور حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ سمیت بیشتر دیوبندی علماء جمع تھے۔ مولانا ابوذر بخاریؒ کا خطاب ظہر کے بعد کی نشست میں تھا جبکہ مولانا مفتی محمودؒ نے رات کی نشست میں خطاب کرنا تھا۔ معاملہ خاصا نازک تھا، حافظ جیؒ نے اپنے تفصیلی خطاب میں روئے سخن مفتی صاحبؒ ہی کی طرف رکھا اور اپنے مخصوص اندازِ خطابت کے دائرہ میں وہ جو کچھ کہہ سکتے تھے کہہ گئے۔ اسٹیج پر میں بھی موجود تھا بلکہ حافظ جیؒ کی کرسی کے بالکل ساتھ فرشی نشست پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنی جماعت کی پالیسیوں کے خلاف ان کی خطیبانہ گھن گرج سے محظوظ ہو رہا تھا۔ نشست ختم ہوئی تو پتہ چلا کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ تشریف لے آئے ہیں، ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو انہیں حافظ جیؒ کے خطاب کی رپورٹ مل چکی تھی۔ صورتحال کی نزاکت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحبؒ جمعیۃ علماء اسلام کے سیکرٹری جنرل تھے اور میں سیکرٹری اطلاعات، جبکہ جمعیۃ ہی کے امیر کے طلب کردہ جلسہ میں جمعیۃ کی پالیسیوں اور قیادت کے خلاف ٹھیک ٹھاک قسم کی تقریر ہوئی تھی۔

مفتی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے پوچھا تم نے تقریر سنی؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر پوچھا تم کہاں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ اسٹیج پر۔ پھر دریافت کیا سن لی؟ میں نے عرض کیا جی ہاں سن لی! اس کے بعد مفتی صاحبؒ نے پوچھا پھر کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ تقریر یہاں نہیں بلکہ کل کے مشترکہ اجلاس میں ہونی چاہیئے تھی۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے چہرے پر کچھ برہمی سی نمودار ہوئی اور فرمایا کیا مطلب، تمہیں باتوں سے اختلاف نہیں صرف جگہ سے اختلاف ہے؟ میں نے گزارش کی کہ ہاں مجھے جگہ سے اختلاف ہے اس لیے کہ اس قسم کی باتیں آمنے سامنے ہو جائیں تو زیادہ بہتر رہتی ہیں۔ مفتی صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ اب میں کیا کروں؟ میں نے عرض کیا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے خطاب میں اس بات کا اشارہ بھی نہ دیں کہ آپ کے خلاف اس اسٹیج پر کوئی تقریر ہوئی ہے۔ یہی بات بعد میں حضرت درخواستیؒ نے بھی ان سے فرمائی، چنانچہ مفتی صاحبؒ نے ایسا ہی کیا اور ایک نیا محاذ گرم

ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک دفعہ جمعہ کے روز ایسا ہوا کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جمعہ کی نماز پڑھا کر مسجد کے ہال سے باہر نکلا تو اچانک دیکھا کہ دیوار کی اوٹ میں مولانا سید ابوذر بخاریؒ تشریف فرما ہیں۔ اللہ اکبر! یہ کیا ہوا! آگے بڑھا اور مصافحہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت آپ نے یہ کیا ظلم کیا! فرمایا کہ میں جمعہ کے آغاز میں ہی آ گیا تھا مگر جان بوجھ کر چھپا رہا کہ تم نے دیکھ لیا تو پیچھا نہیں چھوڑو گے۔ سچی بات ہے بہت صدمہ ہوا کہ میں اور جامع مسجد کے نمازی ان کے خطاب سے محروم رہ گئے۔ فرمانے لگے کہ گکھڑ جانے کے ارادے سے آیا ہوں، حضرت شیخ الحدیث صاحب (والد محترم مولانا سرفراز خان صفدر) سے ملنے کی خواہش ہے اور آپ کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ عرض کیا کہ چائے وغیرہ ہو جائے پھر چلتے ہیں۔ فرمایا کہ نہیں سب کچھ وہیں ہو گا آپ ساتھ چلیں۔ میں ساتھ ہو لیا، گکھڑ پہنچے، حضرت والد صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی، کچھ دیر گفتگو رہی، تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو کہنے لگے کہ صرف ملاقات و زیارت کے لیے آیا ہوں۔ چائے سے فارغ ہو کر رخصت ہونے لگے تو پلیٹوں میں پڑی ہوئی مٹھائی کی طرف دیکھ کر حضرت والد صاحب سے کہا کہ حضرت! اگر اجازت ہو تو یہ تبرک ساتھ رکھ لوں؟۔ اور پھر وہ تبرک سنبھالے جس محبت کی فضا میں رخصت ہوئے اس کا منظر ابھی تک نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

حضرت حافظ جی رحمہ اللہ تعالیٰ سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ بستر علالت پر تھے۔ میں ملتان گیا ہوا تھا، بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوا تو بہت خوش ہوئے۔ حضرت والد صاحب کی صحت کے بارے میں بار بار پوچھتے رہے۔ میرے حوالہ سے انہوں نے کوئی بات سن رکھی تھی اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ تم سے براہ راست سننا چاہتا ہوں تاکہ سند متّصل ہو جائے اور "رواہ البخاری" کہہ سکوں۔ وہ بات انہیں جس انداز سے پہنچی اس میں کچھ مبالغہ آمیزی بھی شامل تھی، میں نے اصل بات عرض کی تو شکریہ ادا کیا اور دعا دی۔

مولانا سید ابوذر بخاریؒ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند تھے مگر ان کا صرف یہی تعارف نہیں تھا بلکہ وہ اپنے علم و فضل، وضعداری، وسعت مطالعہ اور بہت سے معاملات میں اپنی مستقل رائے کے حوالہ سے جداگانہ تشخص بھی رکھتے تھے۔ اے کاش کہ یہ "تشخص" حالات کی نامساعدت کی نذر نہ ہو جاتا اور اہل حق کا قافلہ وسیع تر دائرے اور تناظر میں ان کی صلاحیتوں اور علم و فضل سے فائدہ اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں، ان کی حسنات کو قبولیت سے نوازیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ

(۱)

عالم اسلام کی ممتاز علمی شخصیت اور اخوان المسلمین شام کے سابق مرشد عام الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃ گزشتہ دنوں سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ کا تعلق شام سے تھا اور وہ شام کے معروف حنفی محدث الاستاذ محمد زاہد الکوثریؒ کے تلمیذ خاص اور ان کے علمی جانشین تھے۔ عرب دنیا میں حنفی مسلک کے تعارف اور اس کی ترویج و اشاعت میں ان دونوں بزرگوں کا بہت بڑا حصہ ہے اور یہ بزرگ گزشتہ پون صدی کے دوران عالم عرب میں حنفیت کے علمی ترجمان کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔

الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ بنیادی طور پر ایک علمی شخصیت تھے، حدیث وفقہ ان کے خاص موضوعات تھے، تمام زندگی درس و تدریس میں گزاری اور ان کی متعدّد علمی تصنیفات اہل علم کی راہنمائی کے لیے منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ظلم و جور اور الحاد و زندقہ کے خلاف اہل حق کی قیادت بھی کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ انہیں جلاوطن ہونا پڑا اور ان کی وفات جلاوطنی کے عالم میں ریاض میں ہوئی ہے۔ شام کے موجودہ حکمران حافظ الاسد کا تعلق بعث پارٹی سے ہے جو عرب نیشنلزم اور سیکولرازم کی علمبردار ہے اور مذہبی طور پر وہ نصیری فرقہ سے وابستہ ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ الاسد کے دور حکومت میں اہل دین بالخصوص علماء اہل سنت شام میں مسلسل ابتلاء اور آزمائش سے دوچار ہیں۔ ہزاروں علماء اور دینی کارکن جیلوں میں ہیں اور ریاستی جبر کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنے والوں کی تعداد بھی ہزاروں میں بیان کی جاتی ہے۔ حماہ نامی ایک بڑا قصبہ جس کی طرف بعض اہل علم ''حموی'' نسبت رکھتے ہیں اہل دین کا مرکز ہونے کی وجہ سے بلڈوزروں کے ساتھ مسمار کیا جا چکا ہے اور لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے ایک شامی عالم دین الشیخ عمر بکری محمد الشافعی کے بقول جہاں کسی زمانہ میں ''حماہ'' نامی بستی ہوا کرتی تھی اب وہاں چٹیل میدان ہے۔

الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ اس ریاستی جبر کے مقابلہ میں ایک عرصہ تک اخوان المسلمین کے سربراہ کی حیثیت سے اہل دین کی قیادت کرتے رہے اور بالآخر جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا پاکستان کے اہل علم کے ساتھ خصوصی تعلق تھا، محدث جلیل حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے قریبی دوستوں میں سے تھے، والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم سے بھی

متعارف اور ان کے مداح تھے۔ گزشتہ برس حرمین شریفین میں دونوں بزرگوں کی ملاقات بھی ہوئی۔

راقم الحروف کو الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ سے شرف ملاقات و تلمذ حاصل ہے۔ ان سے پہلی ملاقات چار سال قبل ریاض میں ہوئی جبکہ دوسری اور آخری ملاقات کا شرف گزشتہ سال لندن میں حاصل ہوا، وہ اس طرح کہ محترم مولانا محمد عیسیٰ منصوری نے بتایا کہ الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ لندن آئے ہوئے ہیں اور ایک دو روز میں واپس جانے والے ہیں۔ ان کے میزبانوں سے پروگرام معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ روانگی کے لیے پابہ رکاب ہیں۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری، مولانا محمد اکرم ندوی اور راقم الحروف بھاگم بھاگ ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچے کہ وہیں ملاقات ہو جائے گی۔ امام بخاریؒ کی ''الادب المفرد'' ساتھ لے لی کہ موقع ملا تو ایک دو حدیثیں سنا کر روایت حدیث کی اجازت کی درخواست کروں گا۔ ایئرپورٹ پہنچے تو وہ بورڈنگ کارڈ وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہو کر روانگی کے ہال کی طرف جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ سلام عرض کر کے ''الادب المفرد'' سامنے کی تو وہیں بے تکلفی سے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور فرمایا ''اقرا''۔ ابتدائی چند احادیث پڑھیں تو اپنی تمام اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی عمومی اجازت مرحمت فرمائی اور دعا سے نوازا۔

اس ملاقات کا منظر ابھی تک نگاہوں کے سامنے ہے، ہمارے سیڑھیوں پر بیٹھ جانے کی وجہ سے اردگرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا لیکن وہ اردگرد سے بے نیاز ''الادب المفرد'' پر نظریں جمائے بڑے اطمینان کے ساتھ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۹۷ء)

(۲)

شام کے بزرگ عالم دین الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کا نام کافی عرصہ سے سن رکھا تھا اور محدث کبیر حضرت الشیخ زاہد الکوثری الحنفیؒ کے مایہ ناز شاگرد اور علمی جانشین کے طور پر ان کا غائبانہ تعارف ذہن میں محفوظ تھا۔ خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے حوالہ سے علامہ کوثریؒ اور الشیخ ابو غدۃ مدظلہ کا تذکرہ ایک مدت سے علمی مجالس میں سننے میں آرہا تھا اور ملاقات کا اشتیاق تھا۔ کئی بار خواہش ہوئی کہ لندن کا سفر براستہ دمشق ہو جائے تو شاید ملاقات و زیارت کی کوئی صورت نکل آئے مگر ہر کام کا ایک وقت قدرت الٰہی کی طرف سے مقرر ہے اس لیے ایسی کوئی شکل عمل میں نہ آسکی۔

چند برسوں سے شام میں علماء اور دینی حلقوں کے خلاف ریاستی جبر کی خبریں مسلسل سننے میں آرہی ہیں، شام کے صدر حافظ الاسد کا تعلق مذہبی طور پر اہل تشیع کے نصیری فرقہ سے ہے جس کے عقیدہ میں حضرت علیؓ کو (معاذ اللہ) الوہیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور سیاسی طور پر وہ بعث پارٹی کے راہ نماؤں میں شمار ہوتے ہیں جو عرب نیشنلزم کی داعی ہے اور اجتماعی زندگی کے ساتھ مذہب کے تعلق کی نفی کرتی ہے۔ گویا سیاسی اصطلاح میں وہ سیکولر ہیں اس لیے شام میں علماء اور دینی حلقوں کی سرگرمیوں کو برداشت کرنا ان کے فکر اور پروگرام کے خلاف ہے۔ چنانچہ شام کے دینی حلقوں بالخصوص اہل سنت حافظ الاسد کی نظر عتاب کا مدت سے نشانہ ہیں، سینکڑوں افراد جام شہادت نوش کر چکے ہیں، ہزاروں لوگ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں اور ایک دور میں ''حماہ'' نامی بستی مذہبی حلقوں کا مرکز ہونے کے جرم میں بلڈوزروں کے ساتھ مسمار کی جا چکی ہے۔ گزشتہ سال معلوم ہوا کہ شامی حکومت کے اس جبر و تشدد کے خلاف دینی حلقوں کی جدوجہد کی قیادت الاستاذ ابو غدۃ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس وقت سعودی عرب میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، پھر یہ علم میں آیا کہ الاستاذ ابو غدۃ شام کی اخوان المسلمون کے مرشد عام کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان باتوں سے نہ صرف یہ کہ ملاقات و زیارت کے اشتیاق میں اضافہ ہوا بلکہ اشتیاق سے بڑھ کر یہ ملاقات فرائض کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ اس لیے لندن سے پاکستان واپسی کے موقع پر سعودی عرب کے سفر کے اہداف میں یہ ملاقات بھی شامل تھی۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران جمعیۃ علماء اسلام ریاض کے امیر مولانا شبیر احمد صاحب کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ الشیخ ابو غدۃ ریاض میں ہی قیام پذیر ہیں اور وہ ان سے رابطہ کر کے ملاقات کا اہتمام کریں گے۔ چنانچہ محترم مولانا شبیر احمد صاحب کی مساعی سے ۲۸ جنوری کو اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا سامان فراہم ہوا، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ یہ ملاقات ریاض کے محلہ ''الربوۃ'' میں الاستاذ ابو غدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کی قیام گاہ پر مغرب کے بعد ہوئی اور اس میں مولانا شبیر احمد موصوف کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام ریاض کے سرپرست مولانا قاری تقی الاسلام اور نائب امیر اول مولانا قاری جمیل الرحمان سلیم بھی شریک تھے۔

الاستاذ ابو غدۃ مدظلہ العالی جس محبت و شفقت اور تواضع و انکساری کے ساتھ پیش آئے وہ اہل علم کی روایتی شان ہے اور ان کی کرم فرمائی اور ذرہ نوازی نے اسلاف کی یاد تازہ کر دی، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ ان سے ''ورلڈ اسلامک فورم'' کے پروگرام اور مقاصد کے حوالے سے مسلم ممالک میں کام کرنے والی دینی تحریکات کے درمیان مشاورت اور مسلسل رابطہ کی ضرورت پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے اس سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ۱۸ جولائی کو لندن میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول فرمائی۔

ہماری طرح حضرت الشیخ مدظلہ بھی اسی امر کے شاکی ہیں کہ عالم اسلام کے مذہبی حلقوں، علماء کرام اور دینی تحریکات کی جدوجہد کی ترجیحات درست نہیں ہیں، فکری اور نظریاتی کام کا فقدان ہے، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے اور باہمی ارتباط و مشاورت کی ضرورت کا احساس موجود نہیں ہے۔ حضرت الشیخ مدظلہ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ مسلم حکومتیں اپنی پالیسیوں اور عمل میں آزاد نہیں ہیں اس لیے دینی تحریکات کو ان پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی راہیں خود تلاش کرنی چاہییں۔

الغرض حضرت الاستاذ عبدالفتاح ابوغدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ ملاقات بے حد مفید اور حوصلہ افزا رہی اور ہم اسے ورلڈ اسلامک فورم کے عملی کام میں بابرکت پیشرفت اور نیک فال سمجھتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت حضرت الشیخ مدظلہ کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں اور ہمیں ان سے اور ان جیسی دیگر علمی و دینی شخصیت سے استفادہ کے مواقع اور توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ مارچ ۱۹۹۳ء)

حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ

(۱)

حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ (وفات: اپریل ۱۹۹۸ء) کو پہلی بار اس دور میں دیکھا جب میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں صرف ونحو کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ اس قافلہ کے سرگرم رکن تھے جو جمعیۃ علماء اسلام کو منظم کرنے کے لیے قریہ قریہ، بستی بستی متحرک تھا۔ شمالی پنجاب میں جمعیۃ علماء اسلام کو ایک فعال اور متحرک جماعت بنانے میں مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو جن بے لوث اور ان تھک رفقاء کا تعاون حاصل تھا، ان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی، حضرت مولانا قاضی مظہر حسین مدظلہ، حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ اور حضرت مولانا حکیم شریف الدین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین مدظلہ اور حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب وقتاً فوقتاً مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تشریف لایا کرتے تھے اور عم مکرم حضرت صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ کے مہمان ہوتے تھے۔ گھر سے کھانا وغیرہ لانا اور اس نوعیت کی دیگر خدمت کی سعادت اکثر مجھے حاصل ہوتی تھی اور سچی بات ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے خلوص، نیکی، تقویٰ اور حق گوئی کا اسی دور سے معترف چلا آرہا ہوں۔

میرا وہ دور طالب علمی کا تھا اس لیے کسی بات سے اختلاف کا کوئی محل اور موقع ہی نہ تھا اور نہ ہی اس کی کوئی گنجائش تھی۔ بس ایک نیاز مندانہ سا تعلق تھا جو عقیدت اور استفادہ کے ماحول میں آگے بڑھتا رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا بلکہ جن گنے چنے بزرگوں سے سیکھی ہوئی باتیں آج عملی زندگی میں مشعل راہ کا کام دے رہی ہیں اور بہت سے مشکل مقامات میں حصار اور پناہ گاہ بن جاتی ہیں، ان میں یہ دو بزرگ بھی شامل ہیں۔ مگر بعد میں جب جماعتی معاملات میں مجھے بھی عملاً شریک ہونے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جماعتی راہیں الگ ہوگئیں، تب بھی بعض امور پر اختلاف رائے کے باوجود ان کی عقیدت و محبت میں کبھی سرمو بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔

آج جب ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو تعلقات اور تجربات کی ایک وسیع دنیا آباد دکھائی دیتی ہے اور تیس پینتیس سال کے طویل عرصہ پر محیط دور کی بہت سی یادیں ذہن کی اسکرین پر باری باری جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آرہا ہے جب حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے قریب محلہ گوبند گڑھ کی ایک گلی میں جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ برادرم قاری خبیب احمد عمر بھی ان کے ساتھ تھے۔ قاری صاحب پہلی بار گوجرانوالہ آئے تھے اور میری ان سے ابتدائی ملاقات تھی جو بعد میں دوستانہ پھر برادرانہ تعلقات اور باہم تعلق داری کے خوشگوار نتیجہ تک پہنچی۔ جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر تھا۔ غالباً ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء کا قصہ ہے۔ تقریر کا مضمون تو اب یاد نہیں رہا لیکن جلسہ کا منظر، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ذکر اور مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ کا والہانہ انداز ابھی تک نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ حضرت نبی اکرمؐ کی شان و منقبت میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نعت کے کچھ اشعار انہوں نے ترنم سے پڑھے۔ اب اسے ان کے جذب وکیف کا کرشمہ سمجھیے یا پہلی بار یہ اشعار سننے کا نتیجہ قرار دیجیے کہ وہ آواز اب بھی کانوں میں گونجتی اور رس گھولتی محسوس ہورہی ہے۔

حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ کا تعلق جس قافلہ حق وصداقت سے تھا، اس نے ہر دور میں باطل کے خلاف مختلف محاذوں پر چومکھی جنگ لڑی ہے، بلکہ اہل حق کو ہر دور میں باطل کے خلاف جتنے محاذوں پر بیک وقت برسرپیکار رہنا پڑتا ہے، اس کی تعبیر کے لیے چومکھی جنگ کا محاورہ بھی کوتاہی اور تنگ دامنی کی شکایت کرتا رہ جاتا ہے۔ وہ اہل سنت کے قافلہ عزم واستقامت سے وابستہ تھے اور سنی کہلاتے تھے۔ اس پر اصرار اور فخر کرتے تھے اور بلا خوف لومۃ لائم اس کا پرچار کرتے تھے۔ ان کے ہاں سنیت کا ایک متعیّن دائرہ تھا جس سے باہر نکلنا بلکہ اس دائرہ سے باہر دیکھنا بھی ان کے نزدیک گناہ تھا۔ اس پر ان کی

استقامت کا یہ عالم تھا کہ اسے پہاڑ جیسی استقامت قرار دیتے ہوئے بھی یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی محاورہ نہیں بولا جارہا بلکہ ایک حقیقت واقعہ کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ان کے ”دائرہ سنیت“ کو میں اور میرے جیسے وہ کارکن، جن کی تگ و تاز کا دائرہ دین وسیاست کے بہت سے شعبوں تک وسیع ہے، ہمیشہ محدود دائرہ کہتے رہے ہیں اور اس نقطۂ نظر سے اب بھی وہ دائرہ محدود ہی دکھائی دیتا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب چاروں طرف نظر دوڑا کر ایمان کی سلامتی کے حوالے سے کوئی گوشہ عافیت تلاش کرنے کا خیال ذہن میں آتا ہے تو بارش کی طرح برسنے والے فتنوں اور ان کی حشر سامانیوں کے اس دور میں اس ”محدود دائرہ“ کے سوا کوئی اور جائے پناہ بھی دکھائی نہیں دیتی۔

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین مدظلہ اور حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ دونوں لازم وملزوم تھے۔ دونوں ہمیشہ اسی دائرہ میں سرگرم عمل رہے اور باہمی اعتماد وتعاون کی ایک قابل تقلید مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ ان کی ترجیحات، ذہنی تحفظات اور حد درجہ احتیاط کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جو حدیث کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار جنوں کے ایک اجتماع سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے تو ایک صحابی (غالباً حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ یا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ) ان کے ہمراہ تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں راستے میں ایک جگہ ٹھہرا دیا اور ان کے گرد زمین کا دائرہ کھینچ کر فرمایا کہ میری واپسی تک اس دائرہ کے اندر رہنا، باہر سے تمہیں بہت سی شکلیں نظر آئیں گی جو تمھیں باہر بلانا چاہیں گی اور وہ تمہیں خوف زدہ بھی کریں گی، لیکن اگر تم اس دائرہ سے باہر نہ نکلے تو وہ تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ آنحضرتؐ کی واپسی تک تمام تر تخویف وتحریص اور طرح طرح کی ڈراؤنی شکلوں کے نظر آنے کے باوجود اپنے دائرہ کے اندر ڈٹے رہے اور اسی وجہ سے محفوظ بھی رہے۔

ہمارے ان بزرگوں نے بھی اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر اس پر استقامت کا حق ادا کر دیا۔ ہم باہر والوں کو وہ دائرہ کتنا ہی محدود دکھائی دے لیکن ایک سبق ہم سب کے لیے اس میں موجود ہے کہ حق اور اس کی خاطر جدوجہد کے جو خطوط ذہن وقلب میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ قائم ہو جائیں، ان پر پختگی اور استقامت کا معیار ایسا ہی ہونا چاہیے اور پھر ان کے بارے میں کسی طعن وملامت کے خوف سے بالاتر ہو جانا چاہیے۔

حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ کے ساتھ عقیدت اور نیاز مندی کا تعلق تو شروع سے تھا، بعد میں رشتہ داری کا تعلق بھی استوار ہو گیا کہ ان کے بڑے بیٹے قاری خبیب احمد میرے بہنوئی ہیں۔ میری چھوٹی ہمشیرہ ان کے گھر میں جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے شعبہ بنات میں درس نظامی کی تدریس کی ذمہ

داریاں سال ہا سال سے نباہ رہی ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت بخاری شریف سمیت دورۂ حدیث کے اسباق پڑھا رہی ہیں۔ اس مناسبت سے جہلم حاضری ہوتی رہتی ہے اور اسی وجہ سے حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ سے ملاقات وزیارت کا کوئی نہ کوئی موقع ملتا رہتا تھا۔ جماعتی دائرے الگ الگ تھے، وہ تحریک خدام اہل سنت کے ذمہ دار تھے اور میں جمعیۃ علماء اسلام اور اس کے حوالے سے پاکستان قومی اتحاد، مجلس عمل ختم نبوت اور اس طرح کے مشترکہ محاذوں میں ہمیشہ پیش پیش رہا، مگر اس کے باوجود ان کی شفقت اور میری نیاز مندی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو میرا کوئی نہ کوئی اخباری بیان انہیں ضرور یاد ہوتا بلکہ بسا اوقات کٹنگ بھی محفوظ ہوتی جو ان کے نزدیک قابل اعتراض ہوتا۔ وہ اس پر بزرگانہ شفقت کے ساتھ نصیحت فرماتے اور جو بات ان کے نزدیک غلط ہوتی اس کی نشان دہی کرتے۔ میرا معمول یہ تھا کہ اگر کوئی بات وضاحت کے قابل ہوتی تو دھیمے لہجے میں وضاحت کر دیتا، ورنہ ان کا بزرگانہ حق سمجھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ ان کی بات سنتا اور دعا کی درخواست کے ساتھ رخصت ہو جاتا۔

میری ہمیشہ سے یہ کمزوری رہی ہے کہ کام وہی کرتا ہوں جسے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح اور اپنی جدوجہد کے حوالے سے ضروری سمجھتا ہوں اور حضرت والد محترم مدظلہ اور عم مکرم مدظلہ سمیت کوئی بھی بزرگ کسی بات پر ٹوکتے ہیں تو ان کی بات توجہ سے سنتا ہوں اور اسے ان کا بزرگانہ حق سمجھتا ہوں، کوئی بات وضاحت کے قابل ہوتی ہے تو وضاحت کر دیتا ہوں، ورنہ خاموش ہو جاتا ہوں اور کوئی ردوکد نہیں کرتا، البتہ بعد میں ایک بار پھر ان کے ارشاد اور اپنے طرز عمل کا جائزہ لیتا ہوں اور اگر پھر بھی اپنے کام پر شرح صدر قائم رہے تو پورے اطمینان کے ساتھ کام میں مگن رہتا ہوں۔

حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ کی جدوجہد کا بنیادی میدان اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب وعقائد کا تحفظ تھا اور اس کے لیے انہوں نے ساری عمر محنت کی۔ اہل سنت کے عقائد ونظریات کو وہ سلف صالحین کی تعبیرات بالخصوص دار العلوم دیوبند کے اکابر فضلاء کی تشریحات کی روشنی میں دیکھتے اور ان کی ترویج واشاعت میں مسلسل مصروف رہتے۔ اس سے ہٹ کر جو بات بھی انہیں محسوس ہوتی، اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جاتے۔ ان کا موقف اور طریق کار ہمیشہ بے لچک ہوتا اور اس کے لیے وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اہل سنت کے عقائد ونظریات کے تحفظ وترویج کے ساتھ ساتھ ملک میں اہل سنت کے حقوق ومفادات کی حفاظت بھی ان کی تگ وتاز کا ہدف رہی ہے۔ انہوں نے جہاں بھی اہل سنت کے مذہبی حقوق پر زد پڑتے دیکھی، اس کے خلاف آواز بلند کی اور اہل سنت کے موقف کی ترجمانی میں پیش

پیش رہے۔

ذاتی زندگی میں سادگی، قناعت اور جفاکشی میں وہ اپنے اسلاف کی روایات پر عامل تھے۔ وہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھے جو آخرت کو ہی اپنا اصل گھر سمجھتے ہوئے اس کی تیاری میں دنیا کی زندگی گزار دیتے ہیں اور دنیا اپنی تمام تر کشش اور رنگینیوں کے باوجود ان سے ایک گزر گاہ سے زیادہ توجہ حاصل نہیں کرپاتی۔ اس وضع کے لوگ اب دنیا میں کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے عظیم اکابر واسلاف کی زندگی اور ان کے کردار وتقویٰ اور عزیمت واستقامت کے بارے میں کتابوں میں تو ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں، مگر عملی زندگی میں گنتی کے کچھ افراد نگاہوں کے سامنے تھے جنہیں دیکھ کر پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، جن سے مل کر دل کو اطمینان ہوتا تھا کہ کسی نیک آدمی کی مجلس نصیب ہوئی ہے۔ حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ کا شمار بھی انہی بزرگوں میں ہوتا تھا مگر اب وہ ایک ایک کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔ جو چند بزرگ باقی ہیں، وہ چراغ سحری ہیں اور ان کے بعد قیامت کی نشانیوں کے سوا دور دور تک کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی۔

اللہ تعالیٰ حضرت کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فتنہ اور آزمائش کے اس دور میں اپنے ایمان اور اکابر اہل سنت کی جدوجہد کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ حق چاریار، اشاعت خاص بیاد
مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ، جولائی تا نومبر ۱۹۹۸ء)

(۲)

۱۰/ اکتوبر کو ڈومیلی ضلع جہلم کی ایک بامقصد تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ ڈومیلی کا نام زبان پر آتے ہی حضرت مولانا حکیم سید علی شاہؒ کا سراپا نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے جنہوں نے اس علاقہ میں توحید و سنت کے فروغ اور رفض وبدعت کے تعاقب میں مسلسل جدوجہد کی۔ اور آج ان کی اس جدوجہد کے آثار پورے خطے میں دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے شاگرد اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے روحانی سلوک و تربیت کا تعلق رکھتے تھے۔

جامعہ صدیقیہ قادریہ ڈومیلی کے مہتمم مولانا قاری محمد اسحاق فاروقی نے اپنے علاقہ کے چند بزرگوں کے حالات اور دینی خدمات پر ایک کتاب ”سرزمین ضلع جہلم کے حضرات اولیاء کاملین کا اجمالی تعارف“ کے

نام سے لکھی ہے۔ اس کی رونمائی جامعہ صدیقیہ میں ۱۰ اکتوبر کو منعقد ہونے والی ''رحمۃ للعالمین کانفرنس'' میں ہوئی۔ کتاب میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا امت رسولؒ آف جکر، حضرت مولانا حکیم سید علی شاہؒ، حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ، حضرت مولانا فضل الٰہیؒ، حضرت مولانا قاضی غلام محمدؒ، حضرت مولانا عبد الحلیمؒ، حضرت مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ، حضرت مولانا سید منظور احمدؒ، حضرت مولانا قاضی نذیر حسینؒ، اور حضرت مولانا فتح محمدؒ کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی دینی جدوجہد کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ تقریب میں ان بزرگوں کے عقیدت مندوں اور خوشہ چینوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ان کے علمی و نسبی ورثاء بھی شریک تھے جن میں تحریک خدام اہل سنت پاکستان کے امیر حضرت مولانا قاضی ظہور الحسین اظہر، جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے مہتمم مولانا قاری محمد ابو بکر صدیق، جامعہ عثمانیہ جکر کے مہتمم مولانا مفتی رشید احمد ارشد، اور مولانا حکیم سید علی شاہؒ کے فرزند مولانا حکیم سید عابد گیلانی نمایاں ہیں۔ اس طرح یہ ''رحمۃ للعالمین کانفرنس'' چکوال، جہلم، ڈومیلی اور جکر کے ان اکابر کے متوسلین کا ایک نمائندہ اجتماع بن گئی۔ خود مولانا قاری محمد اسحاق فاروقی حضرت مولانا امت رسولؒ فاضل دیوبند کے نواسے اور مفتی رشید احمد ارشد کے بھانجے ہیں۔ میرے لیے اس کانفرنس میں حاضری ہی سعادت کی بات تھی مگر ان بزرگوں نے مجھے ''مہمان خصوصی'' کے اعزاز سے نوازا اور کتاب کی رونمائی کا حکم دے کر اس اعزاز کو دوچند کر دیا۔

میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اپنے بزرگوں کے ناموں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات زندگی اور جہد مسلسل سے آگاہی کا ذوق بھی اس کتاب اور تقریب سے جھلک رہا تھا۔ ورنہ میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم عام طور پر اپنے بزرگوں کے ناموں سے تو واقف ہوتے ہیں، ان کے ساتھ محبت و عقیدت رکھتے ہیں، اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے ذوق کے مطابق ان کے کچھ کارناموں کا ذکر بھی کرتے رہتے ہیں، مگر اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کے مجموعی حالات زندگی کیا ہیں، انہوں نے کن حالات میں کام کیا ہے، ان کی جدوجہد کے دائرے کون کون سے تھے، انہیں کیسی مشکلات کا سامنا تھا، انہیں کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا، اور انہوں نے کس حوصلہ و عزم اور صبر و قناعت کے ساتھ اپنی جدوجہد کو زندگی بھر جاری رکھا۔

سہل پسندی کے اس دور میں ان اکابر کی جدوجہد، قربانیوں اور خدمات کا بار بار تذکرہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں ان سے راہ نمائی کے ساتھ ساتھ حوصلہ ملتا ہے اور خدمت و ایثار کی خفتہ صلاحیتیں بیداری سے آشنا ہوتی ہیں، جو شاید ہماری آج کی سب سے بڑی ضرورت بن چکی ہے۔

چکوال کچھ عرصہ پہلے تک ضلع جہلم کا حصہ تھا، اس دور میں مندرجہ بالا بزرگوں کی جدوجہد اس پورے علاقے تک وسیع تھی۔ ان کے ساتھ گجرات کے حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اہل حق کے ایک پر عزم کاروان کا تصور سامنے آتا ہے جس کی قیادت حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کر رہے تھے۔ اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی علمی راہ نمائی اور سرپرستی بھی اس قافلہ کے ساتھ تھی۔ یہ سب بزرگ توحید و سنت کے پرچار، رفض و بدعات کے تعاقب، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، اہل سنت کے عقائد و حقوق کی پاسداری اور ملک میں نفاذ شریعت کے نفاذ کے لیے متحرک رہے۔ کارکنوں کے لیے ایسے بزرگوں کے کارناموں کا تذکرہ یقیناً ”حدی خوانی“ کا درجہ رکھتا ہے اور دینی جدوجہد کی راہ میں روز افزوں مشکلات کے ماحول میں ”حدی را تیز تر می خواں“ کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے رہنے کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔

مجھے ان میں سے اکثر بزرگوں کے ساتھ عقیدت و محبت اور خوشہ چینی کا شرف حاصل رہا ہے جس کا مختلف بہانوں سے وقتاً فوقتاً تذکرہ کرتا رہتا ہوں۔ مولانا قاری محمد اسحاق فاروقی کی مذکورہ بالا تصنیف اسی قسم کے جذبات اور تاثرات پر مشتمل ہے اور انہوں نے ان بزرگوں کے حوالہ سے معلومات کا اچھا خاصہ مواد اس میں جمع کر دیا ہے۔

میں نے اس تقریب کے دوران اپنی گفتگو میں اس بات کو ایک بار پھر دہرایا کہ پورے شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے ہے کہ اہل سنت کے عقائد و حقوق کے تحفظ کے لیے آج کے ماحول اور آنے والے مخدوش حالات میں اسی حکمت عملی کو زندہ کرنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جو حضرت مولانا عبد الستار تونسویؒ، حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ اور ان کے رفقاء نے اختیار کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ملک بھر میں اس ذوق کو عام کرنا چاہیے کہ اصحاب ہمت اپنے اپنے علاقہ کے بزرگوں کے حالات و واقعات، خدمات اور جدوجہد کو اسی طرح مرتب کر کے سامنے لائیں۔ ہمارے ہاں صف اول کے چند بزرگوں کا تذکرہ تو بار بار ہوتا رہتا ہے لیکن علاقائی سطح پر کام کرنے والے ایسے بزرگوں کا اس طرح تذکرہ نہیں ہوتا جو دینی جدوجہد کی اصل بنیاد ہوتے ہیں اور جن کی قربانیوں پر تحریکات کی عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ مربوط، منظم اور مرتب تذکرہ نہ سہی، حقائق و واقعات کا جذبات و عقیدت کے رنگ میں غیر مرتب اظہار بھی افادیت سے خالی نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات زیادہ کام دے جاتا ہے۔ اس لیے ڈومیلی کے قاری محمد اسحاق فاروقی کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے توقع رکھتا ہوں کہ ملک کے باقی حصوں کے باذوق حضرات بھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں دل چسپی لیں گے۔

(روزنامہ اسلام۔۱۵اکتوبر ۲۰۱۵ء)

حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوریؒ

(مولانا سید محمد ایوب جان بنوریؒ (تاریخ وفات: ۱۲/اگست ۱۹۹۸ء) سے ایک ملاقات کی روداد جو ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع ہوئی)

جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سرحد کے امیر شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوری دامت برکاتہم ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ کو پشاور میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم کا اسم گرامی مولانا سید فضل خانؒ ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی اور دورہ حدیث دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی سے ۱۳۵۲ھ میں کیا۔ طالب علمی کے دور میں دارالعلوم میں طلبہ کی انجمن اصلاح الکلام کے ناظم رہے جبکہ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ ایم این اے اکوڑہ خٹک اس انجمن کے صدر تھے۔ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد پشاور میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر کام کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو صوبہ سرحد جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلیٰ چن لیا گیا اور آپ مسلسل سات برس تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ صاحب جب دورہ سے فارغ ہوکر آئے تو ان کی حسن کارکردگی اور اخلاص کے پیش نظر آپ نے ہی ان کا نام صوبہ سرحد جمعیۃ کی صدارت کے لیے پیش کیا جو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ حضرت مولانا گل بادشاہؒ کی شرط پر آپ ناظم اعلیٰ کے عہدہ پر کچھ عرصہ رہے اس کے بعد جماعتی کارکردگی سے مطمئن ہوکر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ مولانا ہر سال شعبان میں شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کی خدمت میں کچھ عرصہ کے لیے جاتے رہے۔

مولانا سید محمد ایوب جان بنوری نے آزادی کی تحریک میں جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر نمایاں جدوجہد کی۔ ۱۳۷۰ھ میں انہوں نے پشاور میں دارالعلوم سرحد کی بنیاد رکھی جس کی تقریب میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غور غشتیؒ اور مجاہد جلیل حضرت مولانا عزیر گل مدظلہ بھی شریک ہوئے۔ ناظم اعلیٰ کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی جمعیۃ سے مسلسل وابستہ رہے اور مجلس شوریٰ کے بدستور رکن رہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ بھی تشکیل نو کے بعد سے مسلسل وابستہ اور رکن شوریٰ ہیں۔ حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ کی وفات کے بعد احباب کے اصرار اور اکابر کے ارشاد کے باعث دارالعلوم سرحد کے اہتمام اور دورۂ حدیث پڑھانے کی ذمہ داریوں کے باوجود جمعیۃ علماء اسلام سرحد کی امارت قبول فرمالی اور اب صوبہ میں جمعیۃ کی تنظیمی و سیاسی کارگزاری کی وہ بذات خود نگرانی فرماتے ہیں۔ ۲۲ سال سے دارالعلوم سرحد میں

آپ بخاری شریف خود پڑھا رہے ہیں اور اس طرح آپ کے بالواسطہ اور بلاواسطہ شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ گزشتہ دنوں آپ لاہور میں جمعیۃ کے مرکزی اجلاس کے موقع پر تشریف لائے تو ایک ملاقات میں راقم الحروف نے ان سے صوبہ سرحد کے متعلق لوگوں میں پائے جانے والے شبہات کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ آپ نے پورے اطمینان واعتماد کے ساتھ جو جوابات لکھوائے ان جوابات کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ NAP (نیشنل عوامی پارٹی) کے ساتھ جمعیۃ کا معاہدہ ۵ نکات کی بنیاد پر طے پایا تھا اور دس ماہ کے مختصر دور وزارت میں اس معاہدہ پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوششوں میں نیپ نے جمعیۃ کے ساتھ پورا تعاون کیا ہے۔ مفتی صاحب نے جو اصلاحات نافذ کیں نیپ نے ان کو قبول کیا اور علماء اور قانون دانوں کے کمیشن میں بھی نیپ تعاون کرتی رہی، مگر ابھی یہ کمیشن رپورٹ تیار کر رہا تھا کہ مرکز کے ناروا رویہ کے خلاف حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔

مولانا نے بتایا کہ سرحد میں پاکستان سے علیحدگی کی کوئی تحریک نہیں ہے، ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان میں رہیں گے۔ صرف صوبہ سرحد کا نام تبدیل کر کے پختونستان رکھنے کا بعض لوگ ذکر کرتے ہیں جس کا مطلب ہرگز ملک سے علیحدگی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک دور میں مسلم لیگ کے صوبائی صدر ثمین جان خان نے بھی کہا تھا کہ سرحد کا نام پختونستان رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

مولانا بنوری نے فرمایا کہ مولانا مفتی محمودؒ نے دورِ وزارت میں اسلام اور ملک کی بہترین خدمت کی ہے۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے ان کے کام میں مسلسل رکاوٹیں ڈالیں مگر مفتی صاحب ثابت قدمی سے اپنے موقف پر قائم رہے اور انہوں نے اسلامی اصلاحات اور اسلامی قانون کی تیاری کے سلسلے میں کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا۔

مولانا نے بتایا کہ میں جنوبی اضلاع کا تنظیمی دورہ کر چکا ہوں، جلد ہی باقی ماندہ حصہ کا دورہ کر کے تنظیمی صورتحال کا جائزہ لوں گا۔ سرحد میں جمعیۃ کے کارکنوں نے وسائل کے فقدان کے باوجود بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کو شکست دی ہے اور آئندہ بھی جمعیۃ سیاسی میدان میں وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی مضبوط کردار ادا کرے گی۔

مولانا محمد ایوب بنوری نے مولانا ہزاروی کے رویہ پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ انہوں نے آخری عمر میں بہت غلط قدم اٹھایا ہے۔ جمعیۃ کے کارکن اصول کی حمایت کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مولانا ہزاروی بے حد کوشش کے باوجود جمعیۃ کے کارکنوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے۔

آخر میں مولانا نے ملک بھر میں جمعیۃ کے کارکنوں کو پیغام دیا کہ وہ دل جمعی، اعتماد اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھیں، ان شاء اللہ دشمن کا ہر حربہ ناکام ہوگا اور جمعیۃ علماء اسلام اپنے عظیم اکابر کی تابندہ روایات کا پرچم ہمیشہ سربلند رکھے گی۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء)

حضرت مولانا محمد طاسینؒ

(۱)

حضرت مولانا محمد طاسینؒ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ پاکستان کی علمی دنیا کی معروف شخصیت تھے، حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز کے داماد اور مجلس علمی کے سربراہ تھے۔ متبحر اور محقق عالم دین تھے، اسلامی معاشیات پر ان کی گہری نظر تھی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ان کے گراں قدر مقالات مختلف دینی وعلمی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اہم علمی مجالس میں انہیں اہتمام کے ساتھ بلایا جاتا اور ان کے مطالعہ و تحقیق سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ مجلس علمی کے بہت بڑے کتب خانہ کے امین تھے اور ہر وقت کتابوں کی دنیا میں مگن رہتے تھے۔ افسوس کہ اس وضع کے لوگ اب ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں اور کوئی ان کی جگہ لینے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۱۹۹۹ء)

(۲)

حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی زیارت و ملاقات سے تو صرف ایک بار مجلس علمی کی لائبریری میں شاد کام ہوا ہوں مگر ان کا قاری ایک عرصے سے ہوں اور ان کے افکار وارشادات سے مسلسل مستفید ہوتا رہا ہوں۔ ابتدا میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی نسبت اور ماہنامہ "بینات" اس دل چسپی کا باعث تھے مگر رفتہ رفتہ ذوق وفکر کی مناسبت اس کا رنگ گہرا ہوتا گیا اور میں باقاعدہ ان کے خوش چینوں میں شامل ہو گیا۔ ذوق وفکر کی ہم آہنگی اللہ تعالیٰ کی ایسی عجیب نعمت ہے کہ اس کے سامنے جسمانی اور جغرافیائی فاصلے ہیچ ہوتے ہیں اور ان دیکھے رابطے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد طاسینؒ کے ساتھ میرا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا کہ ملاقات اور خط وکتابت کی نوبت ایک آدھ بار کے سوا زندگی بھر نہیں آئی مگر فکر ونظر کے رابطوں کا عالم یہ تھا کہ جب کوئی مشترکہ ذوق کا مسئلہ کھڑا ہوتا تو میرے ذہن کی

سکرین پر حضرت مولانا محمد طاسین صاحب کا نام نمودار ہوتا اور میں اپنے ذہن میں تانے بانے بننے لگتا کہ اب حضرت مولانا صاحب اس کے بارے میں لکھیں گے اور یہ یہ لکھیں گے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا۔

میرے نزدیک حضرت مولانا طاسینؒ کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیاز یہ تھا کہ وہ آج کے دور میں معیشت واقتصاد کی اہمیت اور نسل انسانی کے ارتقاء اور انسانی سوسائٹی میں رونما ہونے والے انقلابات میں اس کی کارفرمائی کا پوری طرح ادراک رکھتے تھے۔ اس حوالے سے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی پر ان کی گہری اور ماہرانہ نظر تھی۔ اقتصاد ومعیشت کے جدید تصورات وافکار اور انسانی معاشرہ کی جدلیت میں ان کے کردار سے آگاہ تھے۔ وہ ان معاملات میں وسعت مطالعہ اور دقت نظر کے ساتھ ساتھ مجتہدانہ بصیرت سے بھی بہرہ ور تھے، مگر ان کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ جس طبقہ سے وہ مخاطب تھے اور جن احباب وافراد کو وہ وقت کی اس سب سے بڑی ضرورت کی تکمیل کے لیے آگاہ کرنا چاہتے تھے، وہ سرے سے اس کی ضرورت واہمیت سے ہی ناآشنا تھے۔ اور مسائل واحکام کے مباحثہ میں شریک کرنے سے پہلے انہیں اس کی اہمیت اور افادیت کا قائل کرنا ہی بجائے خود ایک مسئلہ بن کر رہ جاتا تھا۔ اقتصاد ومعیشت کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور ہمارے فقہاء نے ہر زمانے میں اس دور کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں اسلامی احکام وقوانین کو پیش کیا ہے اور زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا ہے۔ لیکن گزشتہ دو صدیوں میں صورت حال قدرے مختلف رہی ہے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب، سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار پیش رفت، اور فاصلوں کے تیزی کے ساتھ سمٹتے چلے جانے سے انسانی سوسائٹی میں اقتصاد ومعیشت کے ارتقا کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی، جبکہ اجتہادی عمل کی رفتار وہی رہی بلکہ مزید کمزوری اور سستی کا شکار ہوتی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم وقت کا ساتھ نہ دے سکے اور اقتصاد ومعیشت کے جدید عالمی بحث ومباحثہ میں کارنر ہوتے چلے گئے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے عراق کی زمینوں کے بارے میں بہت بڑا اجتہادی فیصلہ صادر فرما کر امت کے لیے مثال قائم کردی کہ وقت اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ امت کے اجتماعی مفاد وضرورت کو ہم آہنگ رکھنے کے لیے چوکنا رہنے اور اجتہادی صلاحیتوں کو بروقت بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ لیکن گزشتہ دو صدیوں میں ہم ایسا نہیں کر سکے اور میری طالب علمانہ رائے میں ہمارے اس خطہ یعنی جنوبی ایشیا میں حضرت امام شاہ ولی

اللہؒ کے بعد ابھی تک علمی حلقوں میں اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی کہ سیاست، معیشت واقتصاد اور معاشرت وعمرانیات کے شعبوں میں احکام ومسائل کی اجتماعی نوعیت پر از سرِ نو غور کیا جائے اور زمانے کی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے کم از کم شاہ ولی اللہؒ کے بیان کردہ اصولوں پر ہی نئے فقہی ڈھانچے کی بنیاد رکھ لی جائے۔

ہمارے ہاں فتویٰ اور قانون سازی میں سب سے بڑی بنیاد فتاویٰ شامیہ اور فتاویٰ عالمگیریہ ہیں۔ ہم انہی کی جزئیات کے دائرے میں محصور ہیں۔ ان دونوں علمی ذخیروں کی اہمیت وضرورت سے کسی درجہ میں انکار کی گنجائش نہیں مگر ہم افتا اور بیان حکم میں انہی کو حتمی معیار قرار دیتے وقت دو باتیں بالکل بھول جاتے ہیں کہ یہ دونوں فتاویٰ اپنے اپنے دور کے اجتہادی عمل کا نتیجہ ہیں اور اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ پہلے سے موجود فقہی ذخیروں اور احکام ومسائل پر نظر ثانی کی ضرورت ہر زمانے میں موجود اور تسلیم شدہ رہی ہے۔ ان دو عظیم الشان علمی وفقہی ذخیروں کے وجود میں آنے کے بعد بھی حالات میں تبدیلی رونما ہوئی ہے، وقت کی رفتار تھم نہیں گئی اور انسانی معاشرت کے ارتقا کو بریک نہیں لگی۔ بلکہ اپنی رفتار، تنوع اور وسعت کے حوالہ سے ان کا موزانہ سابقہ تبدیلیوں سے کیا جائے تو گزشتہ ایک صدی کی تبدیلیاں اس سے قبل کے ایک ہزار سال کی تبدیلیوں پر بھاری ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ہمارے فقہاء نے اس کے بعد اجتہادی عمل جاری رکھا ہے اور ہمارے علمی مراکز کے دارالافتاء اس اجتہادی عمل سے کلیتًا لاتعلق نہیں ہوئے مگر یہ عمل عبادات، خاندانی احکام اور اخلاقیات ومعاملات کے شعبوں تک محدود ہے جبکہ عمرانیات، سیاسیات اور اقتصاد ومعیشت کے شعبوں کو اس کارِ خیر سے ان کا حصہ نہیں ملا اور ان کا قرض ابھی تک اہل علم کے ذمہ باقی ہے۔

میرے خیال میں حضرت مولانا محمد طاسینؒ نے اقتصاد ومعیشت کے باب میں اسی خلا کی طرف توجہ دلانے کی زندگی بھر محنت کی ہے اور مختلف مسائل کو چھیڑ کر اس خلاء کے احساس کو اجاگر کرنے کے لیے وہ مصروف عمل رہے ہیں۔ اس ذوق میں اس حد تک ایک خوشہ چین اور طالب علم کے طور پر میں بھی شریک رہا ہوں اور اب بھی ہوں کہ مسائل کی طرف توجہ دلائی جائے اور علمی خلاء کا احساس دلاتے ہوئے اہل علم کو اسے پر کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس سے آگے خود مسائل پر بحث کرنا اور علم وتحقیق کے سمندر میں غوطہ زنی کرنا اہلیت اور مصروفیت دونوں حوالوں سے میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر حضرت مولانا محمد طاسینؒ نے ان مراحل کو بھی خوبی سے طے کیا ہے، مختلف مسائل پر علمی بحث کی ہے، تجزیہ وتحلیل اور نکتہ رسی کے جوہر دکھائے ہیں اور اقتصاد ومعیشت کے مسائل پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بحث

ومباحثہ اور استنباط واستخراج کے دائروں کی طرف اہل علم کی راہ نمائی کی ہے۔

حضرت مولانا محمد طاسینؒ کی کسی رائے اور ان کی علمی تگ ودو کے کسی نتیجہ سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اصولی جدوجہد اور علمی محنت آج کے دور کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائیں اور اہل علم ودانش کو ان کے مشن کا تسلسل قائم رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ تعمیر افکار کراچی، مولانا محمد طاسینؒ نمبر)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

(۱)

۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو برطانیہ کے شہر برنلے میں مولانا عزیز الحق ہزاروی کے ہاں تھا کہ جامعہ الہدیٰ ٹونگھم کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے ٹیلی فون پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال کی روح فرسا خبر دیتے ہوئے بتایا کہ حضرت مولانا ندویؒ آج صبح رائے بریلی (انڈیا) میں اپنا دنیا کا سفر مکمل کر کے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ایک عرصہ سے علیل تھے مگر ضعف وعلالت کے باوجود اپنے مشن کے حوالہ سے ان کی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں۔ الشریعہ کے گزشتہ شمارہ میں قارئین نے بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سالانہ اجلاس میں حضرت مولاناؒ کا خطبہ صدارت ملاحظہ کیا ہے جو وہ علالت کی وجہ سے خود وہاں تشریف لے جا کر نہیں پڑھ سکے تھے اور ان کی طرف سے مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے شرکائے کانفرنس کو سنایا تھا۔ اس خطبہ صدارت میں حضرت مولاناؒ نے پرسنل لاء کے مسئلہ پر مسلمانانِ ہند کی جس جرأت اور حوصلہ کے ساتھ ترجمانی کی ہے وہ اکابر علماء حق اور ارباب عزیمت کی روایات کی آئینہ دار ہے۔

حضرت ندویؒ کا تعلق امیر المجاہدین حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تھا، ان کی ولادت ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور اس طرح انہوں نے عیسوی سن کے لحاظ سے پچاسی برس کی عمر پائی۔ انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ماحول میں تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے اور اپنے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے جانشین کے طور پر ندوہ کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہوں نے ندوہ کے اکابر مولانا سید علی مونگیریؒ، علامہ شبلیؒ نعمانی، مولانا عبد الحئی حسنیؒ، اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی علمی روایات اور ملی خدمات کے پرچم کو نہ صرف بلند سے بلند تر کیا بلکہ ان کے دور میں ندوہ کے تعارف وخدمات کا دائرہ پورے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب تک پھیلتا چلا گیا۔ اردو ان کے گھر کی زبان تھی جبکہ عربی میں انہیں بے تکلف گفتگو اور تحریر کا

ملکہ حاصل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فصاحت و سلاست کے جس کمال سے نوازا تھا اس نے خود عرب دانشوروں اور ارباب علم میں انہیں نمایاں اور ممتاز مقام دے دیا تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ خاندانی اعتبار سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم و تربیت اور تگ و تاز میں انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ورثہ کو سنبھالا جبکہ روحانی طور پر انہیں حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، اور حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی جیسے عظیم اکابر سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ اس طرح وہ مختلف عظیم الشان نسبتوں کا مجمع البحار بن گئے تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مغربی ثقافت اور اس کے پیدا کردہ نظریاتی و علمی فتنوں کے تعاقب کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ اس دور میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور تاریخ و روایات کے بے باک نقیب تھے۔ انہوں نے اس حوالہ سے دنیائے اسلام کے اربابِ فکر و دانش کے ایک بڑے حصے کو ادراک و شعور کی منزل سے ہمکنار کیا اور مغرب کے سیکولر فلسفہ اور فری سوسائٹی کے تار و پود بکھیر کر ذہنی مرعوبیت کی فضا کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

راقم الحروف کو ایک عرصہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے نیاز حاصل تھے۔ ۱۹۸۴ء میں مکہ مکرمہ میں حضرت ندویؒ اور حضرت مولانا منظور احمدؒ نعمانی کی پہلی بار زیارت ہوئی اور اس کے بعد آکسفورڈ اور لاہور میں حضرت ندویؒ سے کئی بار ملاقات و استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دو بار کوشش کی کہ ان سے ان کی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت حاصل کی جائے مگر موقع نہ ملا۔ چند ماہ قبل حضرتؒ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا کہ میرا بیعت کا تعلق حضرت مولانا عبید اللہ انور قدس اللہ سرہ العزیز سے تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفاء میں سے آپ کے ساتھ طبیعت زیادہ مانوس ہے اس لیے بیعت کے تعلق اور روایت حدیث کی اجازت کی درخواست کر رہا ہوں۔ اس کے جواب میں ابھی دو ماہ قبل ان کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں دونوں گزارشات کی قبولیت کی اطلاع تھی۔

اس کے بعد میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رمضان المبارک کے بعد کسی بہانے انڈیا جانے کا پروگرام بنا کر استاذ اور شیخ کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت و ملاقات کا شرف ایک بار پھر حاصل کیا جائے مگر تقدیر کا فیصلہ غالب آگیا اور حضرت مرحوم میرے جیسے ہزاروں عقیدت مندوں کی امیدوں کو حسرتوں میں تبدیل کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور اہل خاندان، تلامذہ، منتسبین، احباب اور عقیدت مندوں کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۰ء)

(۲)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت و ملاقات سب سے پہلے ۱۹۸۴ء میں ہوئی تھی جب وہ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ گئے ہوئے تھے اور راقم الحروف بھی عمرہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں حرم پاک میں تھا۔ حضرت مولانا ندویؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ محترم سعدی صاحب مرحوم کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے جبکہ میں اپنے خالو محترم مفتی محمد اویس خان ایوبیؒ کا مہمان تھا جو اُن دنوں جامعہ ام القریٰ میں زیر تعلیم تھے اور اب وہ میرپور آزاد کشمیر کے ضلع مفتی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا علی میاںؒ (مولانا ندویؒ) کو زندگی میں پہلی بار وہاں دیکھا بلکہ مولانا ندویؒ کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کا موقع بھی ملا اور ان کے بڑھاپے اور ضعف کے پیش نظر انہیں بازوؤں کے حصار میں رکھتے ہوئے ہجوم سے بچانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اور پھر سعدی صاحب مرحوم کے مکان پر دونوں بزرگوں کے ساتھ ملاقات و گفتگو کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس دور میں پاکستان کی صورت حال یہ تھی کہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا اقتدار عروج پر تھا اور جمعیۃ علماء اسلام MRD میں شرکت کے سوال پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اپنا تعارف جمعیۃ علماء اسلام کے حوالہ سے کروایا جس سے مولانا ندویؒ ذہنی تحفظات کا شکار ہوگئے اور پھر پاکستان کے حوالہ سے بہت سے امور کا تذکرہ ہونے کے باوجود ان کی زبان سے کوئی تبصرہ سننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتابوں اور تحریرات سے تعارف بہت پرانا تھا اور طالب علمی کے دور میں ہی ان کی بہت سی تحریروں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ایک دور ایسا بھی گزرا کہ وہ عرب نیشنلزم کے سخت ترین ناقدوں میں سے تھے اور عرب نیشنلزم اور ترک نیشنلزم کی تحریکوں کو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا باعث قرار دیتے ہوئے نیشنلزم کے علمبردار بالخصوص مصر کے جمال عبد الناصر مرحوم اور ترکی کے مصطفیٰ کمال اتاترک کو تنقید کا بطور خاص نشانہ بناتے تھے۔ جبکہ میرا تعلق اس طبقہ سے تھا جو نہر سویز کی جنگ اور برطانوی استعمار کے خلاف معرکہ آرائی کی وجہ سے جمال عبدالناصر مرحوم کا مداح تھا اور ان کی فکری تحریک

کو عالمی استعمار سے عربوں کی آزادی کا ذریعہ تصور کرتا تھا۔ مگر اس فکری اختلاف کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ عقیدت اوران کی تحریروں کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔

مغربی ثقافت اور جدید کلچر کی نقاب کشائی اور اسلامی تہذیب وثقافت کے تعارف کے حوالہ سے ان کی تحریریں میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث تھیں۔ اور کئی جلدوں پر محیط ان کی ضخیم تصنیف ''کاروان دعوت وعزیمت'' نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا جس میں انہوں نے امت مسلمہ کے ان ارباب عزیمت واستقامت کی جدوجہد سے نئی نسل کو متعارف کرایا ہے جو ہر دور میں ارباب اقتدار کی ناراضگی اور غیظ و غضب کی پروا کیے بغیر حق اور اہل حق کی نمائندگی کرتے رہے ہیں، اور حق گوئی کی پاداش میں انہیں بے پناہ مصائب اور مشکلات کا شکار ہونا پڑا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھارت کے معروف علمی ادارہ ''ندوۃ العلماء لکھنو'' کے سربراہ تھے۔ اور ندوہ صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک علمی وفکری تحریک کا نام ہے جس نے برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش پر برطانوی استعمار کے تسلط کے بعد ملت اسلامیہ کو بیدار رکھنے اور اس کے دینی وثقافتی تشخص کی حفاظت کے لیے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اور اس حوالہ سے ہماری ملی تاریخ میں علی گڑھ یونیورسٹی اور دارالعلوم دیوبند کے ساتھ جو تیسرا نام ناقابل فراموش حصہ بن چکا ہے وہ ندوۃ العلماء لکھنو ہے جس کی بنیاد وقت کے ایک باخدا شخص مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے رکھی جبکہ مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسی عبقری شخصیتوں نے اسے پروان چڑھایا۔

ندوہ نے علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے درمیان توازن اور جامعیت کی ایک نئی راہ اپنائی اور اسلامی تاریخ کو ثقاہت واستناد کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھال کر نئی نسل کا رشتہ اپنے شاندار ماضی کے ساتھ استوار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پاکستان چلے آنے کے بعد ندوہ کی سیادت سنبھالی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس فکر کا دائرہ برصغیر سے نکل کر پورے عالم اسلام تک پھیلتا چلا گیا۔ اردو تو مولانا ندویؒ کی گھر کی زبان تھی مگر عربی کو بھی ان سے کبھی اجنبیت کی شکایت نہ ہوئی۔ وہ عربی ایسی قدرت اور روانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے کہ خود عربوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے بعض عرب دانشوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خطاب اس لیے سنا کرتے تھے کہ ان کی زبان کی چاشنی اور سلاست وفصاحت کا حظ اٹھا سکیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ صرف ندوۃ العلماء کے سربراہ اور نمائندہ نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق جہاد بالاکوٹ کے عظیم جرنیل سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے بھی تھا۔

گزشتہ سال دل میں ایک جذبہ ابھرا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت کی درخواست کی جائے اور ان سے ان کی سند کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت حاصل کی جائے۔ میرا بیعت کا تعلق شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے فرزند و جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تھا جنہوں نے زندگی بھر شفقت و اعتماد سے نوازا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت لاہوریؒ کے خلفاء میں سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ فکری ہم آہنگی اور طبعی مناسبت سب سے زیادہ تھی اس لیے ان سے یہ تعلق قائم کرنے کا ارادہ بن گیا۔ مگر دو تین برس سے وہ علالت کی وجہ سے لندن تشریف نہ لے جاسکے جبکہ ایک سال قبل لاہور تشریف لائے اور ملاقات بھی ہوئی مگر رش کی وجہ سے عرض مدعا نہ کرسکا۔ چنانچہ عریضہ لکھ کر دونوں امور کی درخواست کی جس کے جواب میں ابھی چند ماہ قبل ان کا گرامی نامہ گوجرانوالہ میں موصول ہوا جس میں انہوں نے درخواست بیعت قبول کرتے ہوئے بیعت کے دائرہ میں شامل کرنے کے علاوہ اپنی اسناد کے ساتھ حدیث نبویؐ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام کی روایت کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔

اس طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ عقیدت و محبت اور فکری استفادہ کے تعلق کے ساتھ تلمذ و ارادت کا شرف بھی شامل ہوگیا۔ البتہ اس سے اگلا مرحلہ مقدر میں نہیں تھا اور میں ابھی اس پروگرام کا تانابانا بن رہا تھا کہ کسی بہانے بھارت کا ویزا ملے تو شیخ و استاذ کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک بار پھر زیارت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ مگر بیسویں صدی کے آخری روز برطانیہ کے شہر برنلی کی جامع مسجد فاروق اعظم میں ایک روزہ قیام کے دوران حضرت مولانا علی میاںؒ کی سرپرستی میں چلنے والے جامعۃ الہدیٰ ٹونگھم کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے فون پر یہ جانکاہ خبر دی کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ آج صبح رائے بریلی انڈیا میں زندگی کا سفر مکمل کر کے خالق حقیقی کے حضور پیش ہو چکے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، اور ان کے علم و فکر کے گلشن کو تاقیامت آباد رکھیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۴ جنوری ۲۰۰۰ء)

(۳)

مولانا علی میاںؒ صرف گفتگو اور تحریر کی دنیا کے بزرگ نہیں تھے بلکہ عملی میدان میں بھی انہوں نے مسلمانان ہند کی مجاہدانہ راہنمائی کی اور وہ مسلسل ہندو جارحیت کا شکار بھارت کی مسلم اقلیت کا بہت بڑا سہارا تھے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے مذہبی خاندانی قوانین کے تحفظ کی جدوجہد کی آخر وقت تک

جرأت مندانہ قیادت کی اور اپنی وفات سے صرف دو ماہ قبل مذہبی احکام سے دستبرداری اور مشترک خاندانی قوانین (کامن سول کوڈ) قبول کرنے کی دعوت کو ارتداد کی دعوت قرار دے کر مسترد کرنے کا اعلان کیا بلکہ یوپی کے مسلمانوں کے مذہبی تعلیم کے نظام کو بچانے اور مستحکم کرنے کے لیے بھی موثر کردار ادا کیا۔ اور یہ مولانا ندویؒ ہی کی شخصیت تھی کہ جب یوپی کے سرکاری سکولوں میں بی جے پی کی حکومت نے "بندے ماترم" کا ترانہ روزانہ صبح تعلیم کے آغاز پر گانے کو لازمی قرار دیا تو اس ترانے کے بعض شرکیہ اشعار کی وجہ سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اس ترانے کے کچھ اشعار شرکیہ ہیں اور ہم ابراہیمیؑ ہیں اس لیے ہم موت تو قبول کر سکتے ہیں مگر ہمارے بچے یہ ترانہ نہیں پڑھیں گے۔ چنانچہ مولانا ندویؒ کے اس شدید احتجاج پر یوپی حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہمارے علمی اور فکری راہنما تھے اور ان کی زندگی اور تگ و تاز رہتی دنیا تک علماء اور اہل دانش کے لیے علمی و فکری سرچشمہ اور مشعل راہ رہے گی۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے بزرگوں کی خدمات سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۶ مارچ ۲۰۰۰ء)

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید سے پرانی یاد اللہ تھی اور میں ان کا بہت پرانا قاری ہوں۔ جب صدر محمد ایوب خان مرحوم نے معروف سکالر ڈاکٹر فضل الرحمان کو ادارہ تحقیقات اسلامی کا سربراہ مقرر کیا اور اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحب کے افکار و خیالات منظر عام پر آنا شروع ہوئے تو ملک کے دینی حلقوں میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر فضل الرحمان لاہور کے ایک بزرگ عالم دین مولانا شہاب الدین مرحوم کے فرزند تھے جو فاضل دیوبند تھے اور چوبرجی کے علاقہ میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب نے دین و دنیا دونوں کی تعلیم حاصل کی اور اپنی ذہانت و صلاحیت کی بنا پر بہت آگے نکل گئے۔ شکاگو یونیورسٹی ان کی اعلیٰ تعلیم اور پھر عملی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ یہ مستشرقین کے عروج کا دور تھا اور ڈاکٹر صاحب کو واسطہ بھی زیادہ تر انہی سے پیش آیا، اس لیے ان سے متاثر ہونا فطری بات تھی۔

چنانچہ اسلامی تعلیمات پر مستشرقین کے افکار و تربیت کا رنگ چڑھا تو اس سے ڈاکٹر صاحب کی فکری شخصیت تشکیل پائی۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے سرکاری ادارہ تحقیقات اسلامی کی سربراہی سنبھالتے

ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ اسلام کے روایتی ڈھانچے اور اسلامی تعلیمات کی اب تک چلی آنے والی اجماعی تعبیر کو رد کرتے ہوئے اسلام کی نئی تعبیر و تشریح کا طبل بجا دیا۔ جس کی ایک چھوٹی سی مثال صرف معاملہ سمجھانے کے لیے یہ ہے کہ ان کے خیال میں نمازیں اصل میں پانچ نہیں بلکہ صرف تین تھیں مگر مولوی صاحبان نے بڑھا کر انہیں پانچ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قسم کے خیالات سے ملک کے علماء کو اتفاق نہیں تھا اور چونکہ یہ خیالات سرکاری فورم سے پیش کیے جا رہے تھے اس لیے ان کے خلاف احتجاجی انداز میں اظہار خیال شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے صدر محمد ایوب خان کے خلاف دینی حلقوں کی عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ملک بھر میں لوگ اس نئے اسلام کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن ضلع فیصل آباد میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمان کے افکار و خیالات پر ملک کے دینی جرائد میں لکھنا شروع کیا۔ انداز تحقیق علمی اور سنجیدہ تھا اور گرفت مضبوط تھی، اس لیے ان کی تحریروں نے بہت جلد ملک کے دینی حلقوں کی توجہات کو اپنی سمت مبذول کر لیا۔ انہی تحریرات کے حوالہ سے وہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی روشناس نگاہوں میں آئے اور مولانا بنوریؒ کی فرمائش پر ضلع فیصل آباد کے ایک دور افتادہ قصبہ کو خیرباد کہہ کر کراچی جیسے مرکزی شہر کو انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ کچھ عرصہ یہ معمول رہا کہ ہر ماہ کے بیس دن وہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں دینی علوم کی تدریس کی خدمت سرانجام دیتے اور دس دن کراچی میں رہتے۔ پھر بیس دن ملتان دفتر ختم نبوت میں اور دس دن کراچی میں رہنے کا معمول بھی رہا۔ اور اس کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ہی ان کی مستقل قرارگاہ بن گیا۔

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے اپنے علمی و دینی جریدہ ماہنامہ بینات کراچی کی ادارت ان کے سپرد کی جو آخر وقت تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ جبکہ ہفت روزہ ختم نبوت کراچی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ روزنامہ جنگ کے مستقل دینی کالموں کے ذریعہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے سالہا سال تک ان کے افکار و خیالات سے استفادہ کیا اور ان سے رہنمائی حاصل کی۔

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ بنیادی طور پر ایک مدرس عالم دین تھے جنہوں نے خداداد ذوق اور صلاحیتوں کے باعث اپنی سرگرمیوں کا دائرہ اس قدر وسیع کر لیا تھا کہ آج دینی جدوجہد کا کوئی شعبہ بھی ان کی تگ و تاز سے خالی نظر نہیں آتا۔ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ ہو، ناموس صحابہ کرامؓ کا دفاع ہو، دینی مدارس کی سرپرستی ہو، تعلیم و تدریس کا میدان ہو، اصلاح و سلوک کی روحانی جولانگاہ ہو، جہادی تحریکات کی حوصلہ افزائی ہو، دینی تحریکات کی پشت پناہی ہو، یا عام مسلمانوں کی دینی رہنمائی ہو، کسی محاذ پر بھی وہ اپنے معاصرین

سے پیچھے نہیں تھے۔ اور ہر مقام پر وہ پورے امتیاز اور اختصاص کے ساتھ صف اول میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

مگر میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا امتیاز و اختصاص یہ تھا کہ وہ قومی صحافت کے اتنے بڑے نقار خانے میں اہل حق کی نمائندگی کرنے والی ایک مضبوط اور توانا آواز کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا یہی امتیاز مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ جیسے عظیم محدث کے نزدیک انہیں ماموں کانجن سے اٹھا کر کراچی میں لا بٹھانے کا باعث بنا تھا۔ اور یہی امتیاز میرے جیسے کارکن کے لیے ان کے مرثیہ کا سب سے بڑا عنوان ہے۔

وہ آج کی صحافتی زبان کو سمجھتے تھے، اس کی کاٹ کو محسوس کرتے تھے، اس کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور ان کے جوابی وار میں جھنجلاہٹ کی بجائے زیر لب تبسم کے ساتھ چٹکی لینے اور اس سے حظ اٹھانے کا انداز نمایاں ہوتا تھا۔ اس لیے جب اس حوالہ سے مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے المناک قتل اور شہادت پر غور کرتا ہوں تو ان کی جدائی سے پیدا ہونے ولے خلاء کی وسعتوں اور پھر ان میں اپنی تنہائی کو محسوس کر کے طبیعت میں گھبراہٹ سی پیدا ہونے لگتی ہے۔

مولانا لدھیانویؒ کو ملک کے ہر طبقہ کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے اور یہ ان کا حق بھی ہے کہ ملک کا کوئی طبقہ ان کے فیض سے محروم نہیں رہا۔ مگر مولانا لدھیانویؒ کا سب سے بڑا حق علماء پر ہے کہ وہ ان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے سب سے زیادہ خدمت بھی اسی خاندان کی کی ہے۔ اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے مؤثر اور صحیح طریقہ ان کی پیروی ہے اور ان کے نقش قدم کو اپنانا ہے۔ اور میں اپنی تنہائی کو ایک بار پھر یاد کرتے ہوئے نوجوان علماء سے گزارش کروں گا کہ وہ مولانا لدھیانویؒ کے اس اختصاص و امتیاز کو ضرور پیش نظر رکھیں جس نے دور افتادہ علاقے کے ایک مدرسہ کے مدرس مولوی کو جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فقیہ العصر محدث کے منصب تک پہنچا دیا تھا۔ اس لیے کہ یہ امتیاز و اختصاص مولانا لدھیانوی شہیدؒ کے ایک قابل تقلید وصف کے ساتھ دینی جدوجہد کے حوالہ سے وقت کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱ جون ۲۰۰۰ء)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ

(۱)

بزرگ عالم دین اور مایہ ناز مفتی حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال

فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے دورۂ حدیث کے ساتھیوں میں سے تھے اور برصغیر پاک وہند کے بلند پایہ علماء کرام اور مفتیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی دینی علوم کی تدریس واشاعت اور عامۃ المسلمین کی دینی راہ نمائی میں بسر کی اور ان کی سرپرستی میں "الرشید ٹرسٹ" نے افغانستان اور دیگر مظلوم خطوں کے مظلوم و بے سہارا مسلمانوں کی کفالت وخدمت کی وقیع خدمات انجام دیں۔ ہزاروں علماء کرام نے ان سے علمی وروحانی فیض حاصل کیا اور ان کی تعلیمات وارشادات سے لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح ہوئی۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ اپریل ۲۰۰۲ء)

(۲)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے اور میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے دورۂ حدیث کے ساتھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے کراچی کو اپنی علمی ودینی جولان گاہ بنایا اور بہت جلد ملک کے بڑے مفتیان کرام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ بلند پایہ مفتی تھے، اپنے معاصر مفتیان کرام سے بعض مسائل میں علمی بنیاد پر اختلاف بھی رکھتے تھے جیسا کہ ہر عالم اور مفتی کا حق ہے، ان کے کچھ تفردات بھی تھے جو علمی حلقوں میں موضوع بحث بنے رہتے تھے، لیکن ان کا علمی مقام اور ثقاہت ہمیشہ علمی حلقوں میں مسلم رہی اور ان کی علمی تحقیقات کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوئے اہل علم ان سے مسلسل استفادہ کرتے تھے۔ مگر مجھے ان کی جس ادا نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا ذوقِ تربیت تھا اور اس کے ساتھ خدمت خلق کے جذبے کو عام کرنے کا اسلوب جس نے انہیں اپنے معاصر علماء کرام میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے ساتھ میری عقیدت دو حوالوں سے ہے:

- ایک حوالہ تو مشترک ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نامور مفتیان کرام میں سے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ ایک دور میں ایسے مفتیان کرام میں تیسرا بڑا نام مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کا سامنے آتا تھا، جن سے مسائل معلوم کرنے کے لیے عامۃ الناس کی ایک بڑی تعداد تو رجوع کرتی ہی تھی مگر ان بزرگوں کو ملک بھر کے علماء کرام میں بھی مراجع کی حیثیت حاصل تھی کہ علماء کرام اور مفتیان کرام اپنی الجھنوں اور علمی اشکالات کو دور کرنے کے لیے انہی سے رجوع کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

- جبکہ دوسرا حوالہ یہ ہے کہ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ دورۂ حدیث کے ساتھی تھے اور دونوں نے غالباً سن ۱۹۴۱ء/۱۹۴۲ء میں دار العلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور دیگر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اکٹھے سند فراغت حاصل کی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ فقہ وافتاء کے شعبہ میں بلند پایہ استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر اور تجربہ کار روحانی مربی بھی تھے اور وہ اپنے تلامذہ کے تعلیمی معیار پر نظر رکھنے کے علاوہ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تربیت کا نظام بہت سخت تھا، وہ اپنے مرید کی دینی یا دنیاوی وجاہت کا لحاظ رکھے بغیر اور اس کی رعایت کرنے کی بجائے تربیت کے قواعد وضوابط کی پابندی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اسی طرح کی جھلک حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے نظام تربیت میں بھی نظر آتی تھی۔

مفتی صاحب مرحوم نے جس جرأت و حوصلہ کے ساتھ جہاد افغانستان کو سپورٹ کیا، مجاہدین کی سرپرستی اور پشت پناہی کی، طالبان کی اسلامی حکومت کی حمایت وامداد کا اہتمام کیا اور علماء اور دینی حلقوں کو حق کی حمایت کی طرف متوجہ کرنے میں مسلسل محنت کی، اس نے خیر القرون کے مجاہد علماء کرام کی یاد تازہ کر دی۔ اور ان کے قائم کردہ ''الرشید ٹرسٹ'' نے رفاہی میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے ......

ہمارے دینی حلقوں میں دینی مدارس کی محنت اگرچہ خود ایک بہت بڑی سماجی اور تعلیمی خدمت کا درجہ رکھتی ہے، جس کا اعتراف صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی نشری تقریر میں ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا کہ یہ دینی مدارس سب سے بڑی این جی اوز ہیں جو لاکھوں طلبہ کو نہ صرف مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں بلکہ لاکھوں نادار افراد کو رہائش، خوراک اور علاج معالجہ کی سہولتیں بھی مہیا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تعلیم سے ہٹ کر دوسرے شعبوں میں سماجی خدمات کا دینی حلقوں میں جو خلا نظر آتا تھا جو غیر ملکی این جی اوز کے سماجی خدمات کے نیٹ ورک اور خاص طور پر پاکستان میں مسیحی مشنریوں کی سماجی سرگرمیوں کے پس منظر میں بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس خلا کو پر کرنے کی خدمت حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ سے لی اور مفتی صاحب نے ''الرشید ٹرسٹ'' کے ذریعے سماجی خدمات کے ان تمام شعبوں کی طرف اصحاب خیر کی توجہ دلائی جن کا تذکرہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی خدمات کے حوالے سے بخاری شریف کی روایت میں کیا ہے۔

مجھے گزشتہ دنوں لندن جاتے ہوئے کراچی میں ایک دن رکنے کا موقع ملا اور جامعہ انوار القرآن آدم

ٹاؤن نارتھ کراچی میں بخاری شریف کے اختتام کی سالانہ تقریب میں شرکت کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے قائم کردہ اداروں میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی...... سب سے زیادہ مسرت ”الرشید ٹرسٹ“ سے متّصل بلڈ بینک دیکھ کر ہوئی جس کا حال ہی میں افتتاح ہوا ہے اور جس میں خون کے حصول، ٹیسٹ، حفاظت اور نادار افراد کو اس کی صحیح حالت میں مفت فراہمی کا نظم ونسق دیکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ کے لیے بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔ میں نے مغربی ممالک کے جدید ترین ہسپتال دیکھے ہیں لیکن جدید ترین مشینری، مہارت اور کارکردگی کے لحاظ سے مجھے ان کے مقابلہ میں اس بلڈ بینک میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ملک کے دیگر دینی اداروں اور شخصیات کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء و ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ

خطیب اسلام حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ بھی ہم سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کافی عرصہ سے بیمار تھے، شوگر کے ساتھ ساتھ دل اور دمہ کی تکلیف بھی تھی اور کم وبیش ۷۰ برس عمر پاکر وہ دارِفانی سے رحلت کر گئے۔ ان کا تعلق ہزارہ کے علاقہ ہری پور سے تھا اور انہوں نے اس دور میں لاہور میں خطابت کا آغاز کیا جب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ حیات تھے اور مولانا اجمل خان کو ان کی بھرپور شفقت اور رہنمائی میسر تھی۔ مولانا محمد اجمل خان کا شمار اپنے دور کے بڑے خطیبوں میں ہوتا تھا اور انہیں خطیب اسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ”خطیب اسلام“ کا لقب سب سے پہلے حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال ہوا تھا جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ خطیب کی حیثیت سے مختلف محافل میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں خطیب الانصار اور خطیب رسول کریمؐ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا اور سب سے پہلے انہی کو خطیب الاسلام کا لقب ملا۔ اس کے بعد ہر دور میں متعدّد بڑے بڑے خطباء کو اس لقب سے یاد کیا جاتا رہا جبکہ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں اس لقب کے ساتھ سب سے زیادہ معروف ہونے والے بزرگ مولانا محمد اجمل خانؒ تھے۔

مولانا محمد اجمل خانؒ کی خطابت میں جوش وجذبہ کے ساتھ ساتھ وافر معلومات اور علمی نکات بھی ہوتے تھے۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے جناب نبی اکرمؐ کی خطابت کی

کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہؐ جب خطاب فرماتے تو آپؐ کی آواز بلند ہو جاتی تھی، سخت غصے کی کیفیت میں نظر آتے اور آنکھیں سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ مولانا محمد اجمل خانؒ کی خطابت میں بھی اکثر اوقات اسی کیفیت کی جھلک نظر آیا کرتی تھی۔ جوانی کے دور میں پھیپھڑوں کے پورے زور کے ساتھ تین تین چار چار گھنٹے مسلسل بولتے چلے جاتے تھے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے ایک بار میرے سامنے مولانا محمد اجمل خانؒ کو خبردار کیا کہ اتنے زور سے مت بولا کرو اور اتنی لمبی تقریر نہ کیا کرو، بڑھاپے میں تنگ ہو گے اور پھیپھڑے جواب دے جائیں گے۔ مگر جوانی کے جوش اور حق گوئی کے جذبے میں مولانا محمد اجمل خانؒ اس خطرے کو پوری طرح محسوس نہ کر سکے اور ان کا انداز خطابت جوش و جذبے کی پوری جولانیوں کے ساتھ مسلسل جاری رہا۔

مولانا محمد اجملؒ ساری زندگی جمعیۃ علماء اسلام میں رہے، جمعیۃ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، اور وفات کے وقت انہیں جمعیۃ کے سرپرست اعلیٰ اور بزرگ رہنما کا مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بعد انہوں نے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی رفاقت میں سالہا سال تک کام کیا اور دینی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور مختلف اضلاع میں داخلہ کی پابندیوں اور زبان بندیوں کے ایک طویل سلسلہ کا ہدف بھی رہے۔ عام اجتماعات میں ان کی تقاریر کم و بیش یکساں نوعیت کی ہوتی تھیں لیکن جب انہیں کسی متعیّن موضوع پر بولنے کے لیے کہا جاتا یا علماء اور کارکنوں کی کوئی خصوصی نشست ہوتی تو ان کا انداز مختلف ہو جاتا تھا اور وہ معلومات کا ایسا انبار لگا دیتے کہ سننے والوں کے لیے ان معلومات کو سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔

مولانا محمد اجمل خانؒ کے ساتھ میرا تعلق کم و بیش تیس برس سے تھا۔ وہ میرے مشفق اور دعاگو بزرگ تھے کہ ہمیشہ شفقت اور دعاؤں سے نوازتے۔ وہ جماعتی کاموں میں سرپرستی فرماتے اور مجھے ان کے ساتھ ایک کارکن کے طور پر کوئی خدمت سرانجام دے کر دلی خوشی میسر آتی۔ مجھے ان کی تین باتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

1. ایک ان کا مطالعہ اور وسعت معلومات کہ وہ مسلسل اور بہت زیادہ مطالعہ کرنے والے خطیب تھے۔ ان کے عمومی خطابات سننے والوں کو اس کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن خصوصی مجالس اور علمی نشستوں میں ان کے بیانات سننے والے جانتے ہیں کہ مطالعہ، معلومات اور علمی نکات میں انہیں اپنے معاصر خطباء پر فوقیت حاصل تھی۔ ہمارے دور میں عوامی خطباء میں

مطالعہ و تحقیق اور صحیح معلومات تک رسائی کا ذوق بہت کم ہے جو بدقسمتی سے مزید کم ہوتا جارہا ہے۔ مگر حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ کا ذوق بہت بلند تھا اور میں اس حوالے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، اور خطیب پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے ساتھ اسی صف میں حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ کو بھی شمار کرتا ہوں۔

2. دوسری بات ان کی نیکی اور تقویٰ تھا۔ وہ مزاج کی بعض نزاکتوں کے باوجود قناعت پسند بزرگ تھے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ دین و جماعتی ترجیحات رہیں اور انہوں نے خطابت کے اس اعلیٰ مقام کو کبھی دنیوی مفادات کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش چار عشروں تک خطابت کی دنیا میں حکمرانی کرنے کے بعد بھی ان کا جنازہ مسجد کے مکان سے اٹھا۔ وہ شب زندہ دار تھے اور صرف اسٹیج کے نہیں بلکہ مصلیٰ اور ذکر و فکر کی دنیا کے بھی بزرگ تھے۔

3. تیسری بات ان کی حمیت و غیرت کی ہے کہ وہ دینی شعائر اور اپنے بزرگوں کے حوالے سے سخت غیور تھے۔ دینی شعائر اور اپنے بزرگوں کی ادنیٰ سی بے حرمتی بھی برداشت نہیں کرپاتے تھے اور ایسے وقت میں ان کا غصہ اور جوش قابل دید ہوتا تھا۔

بھٹو حکومت کے خلاف ”پاکستان قومی اتحاد“ کی تحریک کا دور تھا، لاہور میں مارشل لاء نافذ تھا اور پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی جنرل کونسل پی این اے ہاؤس میں اپنا اجلاس منعقد کرنے پر مارشل لاء کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار ہوگئی تھی۔ ان میں میاں محمود علی قصوری مرحوم، اقبال احمد خان مرحوم، ملک محمد اکبر ساقی مرحوم، جناب محمد اسلم سلیمی، فرید پراچہ، اور پچاس سے زائد دیگر رہنماؤں کے ساتھ مولانا اجمل خان مرحوم اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ کیمپ جیل لاہور میں آرمی ایکٹ کے تحت کورٹ قائم ہوئی جس میں کرنل نصیر احمد ہمارے مقدمہ کی سماعت کرتے تھے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک پولیس افسر نے گواہی دیتے ہوئے تھانہ کے روزنامچہ کے بارے میں یہ جملہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے تو یہ قرآن کریم کی طرح ہے۔ یہ جملہ سنتے ہی مولانا محمد اجمل خان بے تابی سے اپنی نشست پر کھڑے ہوگئے اور عدالت سے مخاطب ہوکر کہا کہ اس پولیس افسر نے قرآن کریم کی توہین کی ہے اس کو روکا جائے اور اس کے خلاف کاروائی کی جائے۔ کرنل نصیر احمد نے بہت توجہ دلانے کی کوشش کی کہ آپ عدالت میں کھڑے ہیں مگر مولانا محمد اجمل خان کے جوش و جذبہ میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی۔ وہ بدستور کھڑے رہے اور پکارتے رہے کہ اس پولیس افسر کے خلاف کاروائی کے بغیر وہ نہیں بیٹھیں گے اور عدالت کا معاملہ آگے نہیں چلے گا۔

تھوڑی دیر میں عدالت جلسہ گاہ کی صورت اختیار کر چکی تھی، مولانا محمد اجمل خانؒ نے عظمت قرآن کریم پر چند جملے اس انداز سے کہے کہ عدالت میں کہرام مچ گیا، رونے اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں، کچھ نوجوانوں نے جذبات سے مغلوب ہوکر دیواروں سے سر ٹکرانا شروع کر دیے جس پر کرنل موصوف کو مذکورہ افسر کے خلاف کاروائی کے وعدے کے ساتھ عدالت فوری طور پر برخاست کرنا پڑی کہ اس کے بعد عدالتی کاروائی آگے نہ چل سکی۔ اس کے ایک دوروز کے بعد لاہور ہائی کورٹ نے مارشل لاء کو خلاف دستور قرار دے کر ہم سب کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔

دوسرا واقعہ بھی پاکستان قومی اتحاد کے حوالہ سے ہے۔ قومی اتحاد کی جنرل کونسل میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ اکثر مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ جایا کرتے تھے، اور مولانا مفتی محمودؒ قومی اتحاد کے سربراہ تھے۔ ایک اجلاس میں بزرگ مسلم لیگی رہنما خواجہ محمد صفدر مرحوم نے مفتی صاحبؒ کے کسی بیان پر اعتراض کیا اور کہا کہ پالیسی سے متعلقہ معاملات پر بیان دینے سے پہلے مفتی صاحبؒ کو ہمیں یعنی پاکستان قومی اتحاد میں شریک دیگر جماعتوں کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا موقف اصولاً درست تھا مگر لہجہ کچھ تلخ ہوگیا۔ خواجہ صاحب مرحوم خود بھی مسلم لیگ کے سینئر رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور مفتی صاحب کے معاصرین میں سے تھے اس لیے انہوں نے شاید اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے لہجے میں تلخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی شامل کر لیا جسے مولانا محمد اجمل خانؒ برداشت نہ کر سکے۔ وہ فوراً کھڑے ہوگئے اور خواجہ صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ آپ صرف ایک سیاسی رہنما سے بات نہیں کر رہے بلکہ جس سے مخاطب ہیں وہ بزرگ عالم دین، بلند پایہ مفتی، اور وقت کے محدث بھی ہیں اس لیے محتاط ہوکر گفتگو کریں۔

خواجہ صاحب نے بہت صفائی پیش کرنا چاہی کہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مفتی صاحب کے بیان کا نوٹس لینا اور تنقید کرنا ہمارا حق ہے مگر مولانا محمد اجمل خان نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور آخر خواجہ صاحب کو معذرت کرنا پڑی۔ بعد میں خواجہ محمد صفدر مرحوم نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں اس بات کا شکوہ کیا اور کہا کہ ایک عالم دین اور مفتی کی حیثیت سے مولانا مفتی محمودؒ کا میں بھی احترام کرتا ہوں لیکن سیاست میں یہ باتیں نہیں چلتیں اور ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف اور تنقید کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ خواجہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں مولانا محمد اجمل خانؒ سے بات کروں اور ان کے سامنے اس شکوے کا تذکرہ کروں مگر میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد اجمل خانؒ سے اس معاملے میں بات کرنے سے بے بس ہوں اس لیے ان سے عرض کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا محمد اجمل خانؒ اپنے دور کے ایک نیک دل، حق گو، اور غیور عالم دین تھے جنہوں نے زندگی بھر حق اور اہل حق کا ساتھ دیا۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، اور ان کے پسماندگان اور متوسلین بالخصوص ان کے جانشین مولانا محمد امجد خان کو ان کی دینی جدوجہد اور جذبہ وحمیت کی روایات کو زندہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ضرب مومن، کراچی۔ ۲۱ جون ۲۰۰۲ء)

حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ

حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ پاکستان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے آخری خلفاء میں سے تھے اور ان کے بعد ہمارے علم کے مطابق پاکستان میں اب ایسے کوئی بزرگ باقی نہیں رہے جنہیں حضرت مدنی نے اپنے روحانی سلسلہ میں خلافت سے نوازا ہو۔ بنگلہ دیش میں دو تین بزرگ ابھی موجود ہیں جن میں سے ایک بزرگ حضرت مولانا عبد الحق صاحب آف درگاپور ضلع سونام گنج کا میں ایک کالم میں تذکرہ کر چکا ہوں۔

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین ۱۹۱۴ء کے دوران ضلع چکوال کے گاؤں بھیں میں پیدا ہوئے۔ عیسوی حساب سے شمار کیا جائے تو وفات کے وقت ان کی عمر نوے برس بنتی ہے، لیکن اگر ہجری سن کا اعتبار کیا جائے تو دو اڑھائی برس بڑھ جائیں گے اور ان کی عمر ترانوے برس شمار ہو گی۔ حضرت قاضی صاحب کے والد محترم حضرت مولانا کرم الدین دبیرؒ اپنے دور کے بڑے علماء میں سے تھے اور ان کی شہرت دور دراز تک تھی۔ انہوں نے قادیانیت اور روافض کے خلاف اہل سنت کے موقف کے دفاع میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ قادیانیوں کے ساتھ ان کی عدالتی معرکہ آرائی ''تازیانۂ عبرت'' کے نام سے چھپ چکی ہے جبکہ روافض پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب ''آفتابِ ہدایت'' نے خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اپنے دور کے معروف مناظر اور واعظ تھے اور انہوں نے بہت سے مناظروں اور مباحثوں میں حصہ لیا۔

مولانا قاضی مظہر حسینؒ نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کیا، اس کے بعد دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ میں درس نظامی کی تعلیم پائی اور ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث مکمل کر کے سندِ فراغت حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے علاوہ علامہ شمس الحقؒ افغانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

دیوبندیؒ اور حضرت مولانا پیر مبارک شاہؒ جیسے اکابر شامل ہیں۔ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کا سن ولادت بھی ۱۹۱۴ء ہے جبکہ انہوں نے دارالعلوم میں دورۂ حدیث ۱۹۴۱ء میں کیا، ان کے بخاری شریف کے استاذ بھی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی ہیں۔ حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کا دینی، تعلیمی اور مسلکی امور میں ابتداء سے ہی ساتھ رہا۔ تینوں فضلائے دیوبند تھے اور حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کے شاگرد تھے، اس لیے ذوق و مشرب مشترک تھا اور علماء دیوبند کے مسلک کی ترویج اور دینی تعلیمات کے فروغ کے لیے تینوں بزرگوں کا باہمی تعاون واعتماد اور اشتراک و رابطہ اس حد تک آگے بڑھا کہ خاندانی تعلقات اور رشتہ داریاں بھی قائم ہوگئیں۔ میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحق خان بشیر جو گجرات کی امام ابوحنیفہؒ کے خطیب ہیں، حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے داماد ہیں۔ جبکہ مولانا عبداللطیف جہلمیؒ کے بڑے فرزند مولانا قاری خبیب احمد عمر جوان کے جانشین بھی ہیں، میرے بہنوئی ہیں۔ حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے فرزند مولانا قاضی ظہور حسین صاحب اور مولانا قاری خبیب احمد عمر مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل اور والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے شاگرد ہیں۔ اس طرح مسلکی رفاقت اور تعلیمی ربط و مشاورت نے تینوں خاندانوں کو باہمی رشتوں سے منسلک کر دیا اور بحمد اللہ تعالیٰ یہ باہمی ربط واعتماد مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔

ہمارے طالب علمی کے دور میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ اکثر مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تشریف لایا کرتے تھے اور ہمیں ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا کرتا تھا، بلکہ مجھے اپنی تربیت و اصلاح میں بھی ان سے بہت استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا تذکرہ مناسب ہوگا، طالب علمی کے ابتدائی ایام میں ''صاحبزدگی'' کے جراثیم چند برس تک میرے دماغ پر بھی مسلط رہے کہ میرے کپڑے عام درزی سے نہیں سلتے تھے، استری کیے بغیر رومال کندھے پر رکھنے کا روادار نہیں ہوتا تھا، نمائشی چشمہ ہر وقت آنکھوں پر ہوتا تھا، حسب موقع سر پر قراقلی اور ہاتھ میں چھڑی کا تکلف بھی پال رکھا تھا، اور دوسری طرف تحریر و تقریر اور تنظیمی کاموں کا ذوق بھی تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں طلبہ کی پہلی یونین ۱۹۶۳ء میں بنی جس کے صدر مولانا سید عطاء اللہ شیرازیؒ تھے جو نصرۃ العلوم کے فاضل ہوئے اور مدرسہ کے سکول میں ایک عرصہ تک ٹیچر رہنے کے بعد گزشتہ سال وفات پا گئے ہیں۔ میں اس یونین کا سیکرٹری تھا۔ ہم ہر جمعرات کو عشاء کے بعد طلبہ کا اجتماع منعقد کر کے تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ جمعرات کو ہمارے تشریف لائے ہوئے تھے، ہم نے ان سے طلبہ کے ہفتہ وار اجلاس

میں شرکت کی درخواست کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ میں نے اس محفل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جدوجہد کے حوالہ سے تقریر کی۔ اگلے روز صبح ناشتہ کے وقت میں حضرت قاضی صاحبؒ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ انہوں نے رات کی میری تقریر کا ذکر چھیڑ دیا اور تعریف کی کہ تمہارا ذوق اچھا ہے، لیکن ساتھ میرے لباس اور ہیئت کذائیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ ایسے نہیں رہتے تھے۔

قاضی صاحبؒ نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل سے کوئی چیز نکل کر اڑ گئی ہے۔ اس کے بعد سے آج تک صورتحال یہ ہے کہ گھر والے اپنی طرف سے ہر طرح کے تکلفات کا اہتمام کرتے ہیں لیکن میرے دل میں بحمد اللہ تعالیٰ کبھی کسی تکلف کا داعیہ پیدا نہیں ہوا اور صاحبزدگی کا وہ بت جو میرے قلب و دماغ میں اس سے قبل خاصی جگہ گھیرے ہوئے تھا، اس مرد درویش کی ایک ہی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان میں میری عملی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ اور حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ دونوں بزرگ جمعیۃ میں شامل تھے جمعیۃ کے اہم رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد میں دونوں بزرگ یکے بعد دیگرے جمعیۃ سے الگ ہو گئے اور جمعیۃ کی سیاسی پالیسیوں کے ساتھ ان کا بعد بڑھتا گیا۔ جبکہ میں جمعیۃ کی پالیسیوں کے ساتھ مسلسل پیش رفت کی حالت میں تھا، لیکن اس کے باوجود میری نیاز مندی اور ان کی شفقت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ میں کبھی کبھی زیارت اور دعاء کے لیے حضرت قاضی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور مجھے اس بات کا ڈر بھی ہوتا تھا کہ حضرت قاضی صاحبؒ نے میرا کوئی نہ کوئی بیان سنبھال رکھا ہو گا جس پر مجھ سے جواب طلبی ہو سکتی ہے۔ اور اکثر ایسا ہو جاتا تھا کہ ان کے ریکارڈ میں سے میرا کوئی بیان یا تحریر ملاقات کے وقت اچانک نکل آتی اور مجھے اس کی وضاحت کرنا پڑتی۔ بزرگوں کے حوالہ سے میرا معمول یہ ہے کہ بحث سے گریز کرتا ہوں، اگر ایک آدھ مرتبہ کی وضاحت سے غلط فہمی دور کر سکوں تو کوشش کر لیتا ہوں لیکن اگر اس سے بات نہ بنے تو خاموشی سے ان کی بات سنتا رہتا ہوں اور اسے ان کی شفقت اور محبت کے باعث ان کا حق سمجھتا ہوں۔ حضرت قاضی صاحبؒ کے ساتھ بھی میرا معاملہ ایسا ہی تھا۔ ان کی خدمت میں حاضری پر میں بہت کچھ سنتا تھا اور کچھ نہ کچھ عرض بھی کر دیا کرتا تھا۔ ہمیشہ شفقت فرماتے، دعاؤں اور نصیحتوں سے نوازتے اور ایمان و زندگی کی حفاظت کے لیے وظائف کی تلقین بھی فرماتے تھے۔

حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کی جدوجہد دین کے ہر شعبے میں تھی لیکن دو باتوں کو ان کے نزدیک

سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ان کی تگ و دو کا اکثر و بیشتر حصہ انہی دو امور کے گرد گھومتا تھا۔ ایک اہل سنت کے مذہب و عقائد کی ترویج اور دوسرا علماء دیوبند کے مسلک کا تحفظ۔ ان دو حوالوں سے وہ کسی مصلحت یا لچک کے روادار نہیں تھے اور کسی کو رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک عقائد اور ان کی تعبیرات کے باب میں اکابر علماء دیوبند کی تصریحات ہی فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کسی بھی حلقہ یا شخصیت کی طرف سے اس سے ہٹ کر کوئی بات سامنے آتی تو کسی جھجک کے بغیر اس کی تردید کر دیتے اور اس معاملہ میں ان کے ہاں کوئی ترجیحات یا پروٹوکول نہیں تھا۔

ایک بار انہوں نے مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ کی زندگی میں ان کی کسی تقریر یا تحریر پر گرفت کرتے ہوئے ایک پمفلٹ شائع کر دیا۔ اس کے بعد کسی مرحلہ پر میری ان کے ہاں حاضری ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! ضیاء الرحمان فاروقی یا میرے جیسے لوگوں کے خلاف آپ پمفلٹ شائع نہ کیا کریں۔ ہم آپ کے بچے ہیں، ہماری کسی بات میں غلطی دیکھیں تو خود بلا کر ڈانٹ دیا کریں اور سمجھا دیا کریں۔ ہم اس سطح کے لوگ نہیں ہیں کہ آپ ہمیں اپنے خلاف حریف بنائیں، یہ آپ کی شخصیت اور مقام کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک جملہ فرمایا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ ”میں اپنی شخصیت کو دیکھوں یا مسلک کی حفاظت کروں؟“

آج حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں تو میں اس حوالہ سے بھی غمزدہ ہوں کہ اب ہم سے جواب طلبی کرنے والا کون ہو گا، ہماری غلطیوں کی نشاندہی کون کرے گا، اور کس کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت ہمارے دل میں ڈر ہو گا کہ فلاں بات کے بارے میں اگر انہوں نے پوچھ لیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟ اللہ تعالیٰ اپنی جوارِ رحمت میں ان کے درجات بلند فرمائیں اور ہمیں انکے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم فروری ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ

(۱)

حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہوں نے ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی اور آخری چار سال بستر علالت پر گزارے۔ چند ماہ قبل میں نے ان کے ہاں حاضری دی تو گفتگو فرماتے تھے لیکن شناخت اور پہچان کی قوت کمزور پڑ چکی تھی۔ مولانا حکیم عبد الرحیم

اشرفؒ کی بھی آخری عمر میں یہی کیفیت تھی، ان کی بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوا تو بہت باتیں کیں مگر پہچان نہ پائے، حالانکہ ان کے ساتھ طویل محفلوں کی رفاقت رہی ہے۔ مولانا مفتی زین العابدینؒ اور مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ فیصل آباد کی دینی شناخت تھے۔ ان کے ساتھ مولانا تاج محمودؒ کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ تکون مکمل ہو جاتی ہے جس کے ہاتھ میں طویل عرصے تک فیصل آباد کی دینی تحریکوں کی قیادت رہی ہے۔ فیصل آباد جو کبھی ''لائل پور'' تھا، فیصل آباد بھی انہی کی مساعی کے نتیجے میں بنا۔

مولانا مفتی زین العابدینؒ کا آبائی تعلق میانوالی سے تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے کسب فیض کیا اور فیصل آباد میں کچہری بازار والی مرکزی جامع مسجد کے خطیب کی حیثیت سے وہاں آئے۔ ایک عرصے تک خطابت کا جادو جگایا، سنجیدہ گفتگو کی پشت پر علم کا سمندر ہوتا تھا، اور خلوص وللٰہیت کی چاشنی اس کا مزہ دوچند کر دیا کرتی تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ان کے جوہر کھلے جس میں انہوں نے قائدانہ کردار ادا کیا اور قید وبند کے مراحل سے بھی گزرے۔ ذہن سیاسی تھا اور سیاست کے داؤ پیچ خوب سمجھتے تھے مگر مزاج کو اس سے ہم آہنگ نہ کر سکے ورنہ وہ سیاست میں ہوتے تو بہت آگے جاتے۔ انہوں نے اپنی عملی تگ و تاز کے لیے دعوت و تبلیغ کے میدان کو منتخب کیا اور امیر التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ کی رفاقت میں اس میدان میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ مولانا محمد یوسف دہلویؒ سے ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے سب بیٹوں کا نام یوسف رکھا، جو مولانا محمد یوسف اول، مولانا محمد یوسف ثانی، مولانا محمد یوسف ثالث، اور مولانا محمد یوسف رابع کہلاتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کی جدوجہد کا میدان عالمی ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی شروع کردہ یہ تحریک عام مسلمانوں کو دین سے وابستہ رکھنے اور دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم کو مسلم معاشرے میں عام کرنے کے لیے پوری دنیا میں سرگرم عمل ہے۔ اور یہ معاملہ صرف تعلیم و معلومات فراہم کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے مطابق عملی تربیت دینے اور اس کے رنگ میں رنگنے کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ مولانا مفتی زین العابدینؒ نے بھی اسی میدان کو منتخب کیا اور دین کی بنیادی باتیں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا، لاکھوں لوگوں نے ان کے خطابات کو سنا، ہزاروں افراد کی زندگیاں ان کی صحبت میں بدلیں، اور علماء کرام کی ایک بڑی جماعت نے ان سے دعوت و تبلیغ کا سلیقہ سیکھا۔ علماء کرام کے اجتماعات میں ان کے خطابات کا رنگ ہی اور ہوتا تھا کہ وہ علمی نکات بیان کرتے، عملی تجربات کا ذکر کرتے، اور منطقی نتائج کی منظر کشی کرتے ہوئے علماء کرام کو دین کی دعوت و تبلیغ کے کام میں شریک ہونے کے لیے تیار کرتے۔ چنانچہ مولانا مفتی زین العابدینؒ کی جدوجہد کا بنیادی میدان دعوت و تبلیغ

تھا اور وہ خود پر اس کے علاوہ کسی اور کام کی چھاپ نہیں لگنے دیتے تھے۔ البتہ دینی جدوجہد کے دیگر شعبوں سے لاتعلق بھی نہیں رہتے تھے بلکہ مشورے اور رہنمائی کی حد تک اس میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ فیصل آباد میں دینی تحریکات کو ہمیشہ ان کی سرپرستی اور راہنمائی حاصل رہی ہے۔ خود مجھے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے متعدّد بار ان کی شفقتوں اور مشوروں سے حصہ ملا ہے بلکہ بعض اوقات ان کی سرزنش کے مراحل سے بھی گزرا ہوں۔ وہ ہمارے کام پر نظر رکھتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے مشورہ دیتے تھے، اہم معاملات میں رہنمائی کرتے تھے، کہیں غلطی دیکھتے توٹوکتے اور تنبیہ بھی کرتے تھے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامائزیشن کے جو دستوری اور قانونی اقدامات ہوئے، ان میں حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ اور حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ کی طویل محنت اور جنرل صاحبؒ سے ان کے مسلسل رابطوں کا بڑا حصہ ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جنرل ضیاء الحق مرحوم بھی سب سے زیادہ انہی کے مشوروں پر اعتماد کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامائزیشن کے جو دستوری اور قانونی اقدامات ہوئے وہ اگرچہ عملی مراحل سے تو نہیں گزرے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کو ختم کرنے اور اسے سیکولر ریاست کی حیثیت دینے میں وہی اقدامات اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان اقدامات کے پیچھے حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ اور حضرت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ جیسے بزرگوں کا خلوص اور دعائیں کارفرما رہی ہیں۔ بلکہ میں ان کے ساتھ حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ کو بھی شامل کرنا چاہوں گا کہ ان کے بغیر یہ تذکرہ شاید مکمل نہ ہو پائے کیونکہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی ان معاملات میں مشاورت اور رابطوں کے سرکل کا وہ بھی مسلسل حصہ رہے ہیں۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ نے ایک مرحلے پر مجھے بھی اس دائرے میں لانے کی کوشش کی مگر میں اپنے سیاسی مزاج، افتادِ طبع، اور جماعتی پس منظر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔

مولانا مفتی زین العابدینؒ نے جہاں دعوت وتبلیغ کے عمل کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں دن رات ایک کیا اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچے، وہاں انہوں نے فیصل آباد میں ایک معیاری دینی درسگاہ بھی قائم کی جو پیپلز کالونی میں دارالعلوم فیصل آباد کے نام سے دینی تعلیم کے لیے مصروف کار ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کے صدقات جاریہ میں سے ہے۔ گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ تبلیغی جماعت کے بزرگ راہنماؤں میں سے تھے۔ انہوں نے بیک وقت دو محاذ سنبھال رکھے

تھے کہ وہ تبلیغی جماعت کے بڑوں میں بھی شمار ہوتے تھے اور جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی قیادت کا حصہ بھی تھے۔ ان کا حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ مجھے طویل عرصے تک مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی خدمت و نیابت کا شرف حاصل رہا ہے اور اب میں انہی کی جگہ پر خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کو پہلی بار مولانا مفتی عبدالواحدؒ کے ہاں دیکھا تھا۔

مولانا مفتی زین العابدینؒ کا صدقہ جاریہ ان کی اولاد بھی ہے جو انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دینی و تعلیمی اور تبلیغی و دعوتی خدمات میں مصروف ہے۔ ان کے داماد مولانا مفتی محمد ضیاء الحق مرکزی جامع مسجد فیصل آباد کا محاذ سنبھالے ہوئے ہیں جبکہ فرزندان گرامی دارالعلوم کی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ گزشتہ ہفتے فیصل آباد میں سرگودھا روڈ پر واقع نواز ٹاؤن کی ایک دینی درسگاہ جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا تو وہاں مولانا مفتی ضیاء الحق اور مولانا محمد یوسف ثالث سے ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس درسگاہ کے منتظم مولانا حفظ الرحمان بنوری ہیں جو مولانا مفتی ضیاء الحق کے داماد ہیں اور ان کی اہلیہ حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کی نواسی ہیں۔ دینی خدمات کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی تیسری پشت تک وسیع ہونے کی یہ بات اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کی نشانیوں میں سے ہے۔

مفتی صاحبؒ یقیناً آج کے دور کے آدمی نہیں تھے، جس دور سے ان کا تعلق تھا اس کی چند ہی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ورنہ زمانہ تبدیل ہو چکا ہے، اقدار بدل گئی ہیں، روایات نے پلٹا کھا لیا ہے، ماحول نے اجنبیت اختیار کر لی ہے، اور شرافت و وضعداری کا دور بھی لد گیا ہے کہ اب ان کی جگہ تصنع، بناوٹ اور تکلفات نے لے لی ہے۔ حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کی وفات نے اس تبدیلی کے احساس کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول کرتے ہوئے سیئات سے درگزر فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، اور ہم خوشہ چینوں کو ان کی حسنات و روایات کا تسلسل جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۷ مئی ۲۰۰۴ء)

(۲)

چندماہ قبل فیصل آباد حاضری کے موقع پر حضرت مفتی صاحبؒ کے فرزند اکبر مولانا محمد یوسف اول کے ہمراہ زیارت کے لیے ان کے گھر گیا، تھوڑی دیر ان کی خدمت میں بیٹھا، باتیں سنیں اور دعا کی درخواست

کی۔ نسیان کے مسلسل مرض کی وجہ سے پہچان نہیں پا رہے تھے، مگر گفتگو میں شفقت و نصیحت کا پہلو بدستور غالب تھا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد ان کی زیارت کے لیے حاضری کا اتفاق نہ ہو سکا۔ مجھے یاد نہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو پہلی بار کب دیکھا مگر یہ یاد ہے کہ بہت دیکھا اور بار بار دیکھا، نجی مجلسوں میں ان کی باتیں سنیں، ذاتی ملاقاتوں میں ان کی راہنمائی اور شفقتوں سے بہرہ ور ہوا اور عام اجتماعات میں ان کے خطابات سنے۔ میرے لیے وہ استاد اور راہ نما کا درجہ رکھتے تھے، اس لیے جب بھی ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، استفادہ کی نیت سے حاضر ہوا اور بحمد اللہ تعالیٰ ہر بار اس کا پھل بھی پایا۔

حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ دار العلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے نامور فضلاء میں سے تھے جنہوں نے دنیا بھر میں دیوبند اور ڈابھیل کے فیض کو عام کیا اور بلا شبہ لاکھوں انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔ گذشتہ عیسوی صدی کی چھٹی دہائی کے آغاز میں وہ فیصل آباد میں تشریف لائے اور مرکزی جامع مسجد کی خطابت سنبھالی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کا مرحلہ درپیش ہوا اور حضرت مفتی صاحبؒ اس میں قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ فیصل آباد میں ختم نبوت اور دیگر دینی تحریکات میں ہمیشہ حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ، حضرت مولانا تاج محمود اور حضرت مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کی تکون مشہور تھی، اس دور میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ یہ تینوں بزرگ کسی جگہ اکٹھے بیٹھے ہیں تو کسی نہ کسی تحریک کی شروعات ہونے والی ہے اور اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔

مفتی صاحبؒ غضب کا سیاسی اور تحریکی ذہن رکھتے تھے۔ کسی سیاسی یا تحریکی جماعت میں شامل نہیں ہوتے تھے مگر مشورہ اور راہ نمائی کے میدان میں ان کی خدمات کسی سے کم نہیں ہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے طور پر کئی بار اتفاق ہوا کہ ان کی خدمت میں نفاذ شریعت، تحفظ ختم نبوت اور کسی دیگر دینی تحریک کے حوالے سے حاضری دی تو انہوں نے بھرپور دلچسپی کا اظہار کیا، راہ نمائی کی، مشوروں سے نوازا اور بعض اوقات تحریکی تجربات اور داؤ پیچ بھی بتائے۔ خاص طور پر جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے دور میں نفاذ شریعت کے جو متعدّد اقدامات ہوئے ان کے پیچھے حضرت مولانا مفتی زین العابدین اور حضرت مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف کی کاوشوں کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ انتہائی خاموشی کے ساتھ یہ دونوں بزرگ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ مسلسل رابطہ میں تھے اور نفاذ شریعت کے اقدامات میں ان کے اہم مشیر تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا سیاسی ذہن تو کمال کا تھا مگر سیاسی مزاج نہیں تھا۔ میرا تاثر یہ

ہے کہ اگر حضرت مفتی صاحبؒ عملی سیاست میں متحرک ہو جاتے تو حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی صف میں ایک سینئر قائد کے طور پر ان کی جگہ ہوتی۔ اور اگر وہ تدریس و تعلیم کی لائن اختیار کرتے تو حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ کھڑے ہوتے۔ مگر انہوں نے اپنی عملی تگ و تاز کے لیے دعوت و تبلیغ کا میدان منتخب کیا اور اس میں ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ امیر التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ کی محبت و رفاقت انہیں ایسی راس آئی کہ پھر پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے سب بیٹوں کا نام یوسف رکھا۔ یوسف اول، یوسف ثانی، یوسف ثالث اور یوسف رابع کے نام سے ان کے فرزندگان متعارف ہیں اور اپنے عظیم باپ کے دینی و دعوتی مشن کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ کے ساتھ ان کی محبت کا عملی اظہار ہے۔

دعوت و تبلیغ کا یہ میدان آج کی ملی ضروریات کے تناظر میں سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ وسیع میدان ہے بلکہ بعض "نیک لوگ" تو اس کی اہمیت بیان کرتے کرتے دینی جدوجہد کے دوسرے شعبوں کی نفی اور استخفاف کے مراحل سے بھی گزر جاتے ہیں، اور دینی جدوجہد کے دوسرے شعبوں اور میدانوں کے رجال کار ایسے "تبلیغی دوستوں" کے بارے میں شکوہ کناں ہونے لگتے ہیں۔ مگر حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کی بھاری بھرکم علمی شخصیت کی موجودگی میں علماء کرام اور دینی کارکنوں کو ہمیشہ اعتماد رہا کہ بات ایک حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔ اب اس حوالہ سے دیکھتا ہوں تو پاکستان میں حضرت مفتی صاحبؒ کا کوئی متبادل دور دور تک دکھائی نہیں دیتا اور میرے نزدیک حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات سے پیدا ہونے والے وسیع خلا کا یہ پہلو سب سے زیادہ فکر انگیز ہے۔

حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کی عملی سرگرمیوں کا میدان پوری دنیا تک پھیلا ہوا تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والے بڑے بڑے تبلیغی اجتماعات میں ان کے خطابات، علماء کے اجتماعات میں ان کی گفتگو اور مشاورت کے اجلاسوں میں ان کی نکتہ رسی ان محافل واجتماعات کی جان ہوتی تھی۔ وہ مختصر گفتگو کرتے تھے جو استدلال سے بھرپور ہوتی تھی، ٹو دی پوائنٹ ہوتی تھی اور "از دل خیز بر دل ریزد" کا مصداق ہوتی تھی۔ میں نے مختلف مواقع پر ان کے خطابات سنے ہیں مگر ایک مختصر سے خطاب کا نقشہ اب تک ذہن میں تازہ ہے۔ سال ہا سال پہلے کی بات ہے، چنیوٹ میں حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کی بیٹی کا نکاح تھا، میں بھی مدعو تھا۔ حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ نے نکاح پڑھایا اور مختصر خطاب میں نکاح شادی کے معاملات میں سادگی کی تلقین کرتے ہوئے سیدہ فاطمہؓ کے نکاح کا واقعہ ایسے انداز سے بیان کیا کہ

ایک ایک لفظ دلوں میں اترتا چلا گیا۔ مجھے جب بھی کسی نکاح کے موقع پر کچھ بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، اس محفل کا نقشہ بے ساختہ ذہن کی سکرین پر نمودار ہو جاتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک عرصہ فیصل آباد کی مرکزی جامع مسجد میں خطابت کے ذریعے فیصل آباد کے لوگوں کی دینی راہنمائی اور تربیت فرمائی۔ پھر ان کی تگ و تاز کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور یہ محاذ ان کے داماد حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق نے سنبھال لیا اور سال ہا سال سے وہ حضرت مفتی صاحب کی نیابت و نمائندگی کر رہے ہیں۔ پیپلز کالونی فیصل آباد کا دارالعلوم حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک اور حسین یادگار اور صدقہ جاریہ ہے جسے ان کے فرزندان حضرت مولانا محمد یوسف اول اور حضرت مولانا محمد یوسف ثانی کی راہ نمائی حاصل ہے اور جہاں دیگر بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ میرے ایک مشفق استاذ حضرت مولانا مفتی جمال احمد مدظلہ بھی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، ان کے تمام متوسلین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زندگی بھر دینی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالتے رہنے کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲ جون ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا نذیر احمدؒ

۴ جولائی کو رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ گھر پہنچا تو یہ غمناک خبر ملی کی شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد کا فیصل آباد میں انتقال ہو گیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کافی عرصہ سے بیمار تھے، چند ماہ قبل احوال پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضری ہوئی تھی، اس وقت طبیعت کچھ بہتر تھی مگر تقدیر الٰہی کے فیصلوں میں ہر شخص کا وقت مقرر ہے اور ہر ایک نے اپنے مقررہ وقت پر دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔ حضرت مولانا نذیر احمدؒ کا شمار ان چیدہ اور سرکردہ علماء کرام میں ہوتا تھا جنھوں نے زندگی بھر تعلیم و تدریس اور وعظ و نصیحت کا مشغلہ جاری رکھا اور اصلاح وارشاد کے ذریعہ ہزاروں افراد کو راہ حق پر لگا یا۔ وہ تدریس و تعلیم کے ساتھ ساتھ سلوک واحسان کے میدان کے شہسوار بھی تھے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اس عظیم روحانی سلسلہ سے وابستہ تھے جو جنوبی ایشیا کے اس خطے میں بلا مبالغہ لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنا ہے اور جس سے منسلک ہزاروں علماء کرام اور اہل اللہ مختلف ممالک میں دینی علوم کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ اصلاح نفس اور سلوک واحسان کے شعبہ میں گراں قدر خدمات سرانجام

دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا نذیر احمدؒ کا قائم کردہ دینی ادارہ ''جامعہ اسلامیہ امدادیہ'' نہ صرف فیصل آباد بلکہ ملک بھر میں بڑے تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ ہزاروں علماء کرام نے ان سے کسب فیض کیا، وہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے، اساتذہ کو تدریسی تجربات سے آگاہ کرتے اور کامیاب تدریس کے گر سکھاتے۔ نظم ونسق میں بھی ان کا ذوق اور طریق کار قابل تقلید تھا، کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور کام میں مزید آگے بڑھتے رہنے کے لیے ابھارتے تھے۔ مجھے ان کی شفقت اور دعاؤں سے ہمیشہ وافر حصہ ملتا رہا۔ جب ملاقات ہوتی دعاؤں سے نوازتے۔ گذشتہ سال جامعہ امدادیہ میں حاضری ہوئی تو حکم دیا کہ میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو اپنی سند حدیث کے ساتھ ایک حدیث نبویؐ پڑھاؤں۔ میرے لیے یہ بات اعزاز کے ساتھ ساتھ امتحان اور آزمائش کا درجہ بھی رکھتی تھی، چنانچہ حکم کی تعمیل اور خصوصی دعاؤں سے شادکام ہوا۔ میرے مضامین میں کوئی بات زیادہ پسند آجاتی تو اس کا ملاقات میں تذکرہ فرماتے اور حوصلہ بڑھاتے۔

مولانا نذیر احمدؒ ان بزرگوں میں سے تھے جن کے پاس میں کبھی کبھی بیٹری چارج کرنے کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر رخصت ہو گئے ہیں۔ چند ایک باقی ہیں جو چراغ سحری ہیں اور مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ خدانخواستہ یہ بھی جلد رخصت ہو گئے تو میں قلب وذہن کے لیے حرارت حاصل کرنے کس ''طور'' پر جایا کروں گا! حضرت مولانا نذیر احمدؒ بلاشبہ آج کے دور میں پرانے بزرگوں اور اسلاف کی زندگی اور طور طریقوں کا نمونہ تھے۔ اب اس نمونہ اور طرز کے لوگ خال خال رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور پس ماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۷ جولائی ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کے جانشین اور جمعیۃ علماء ہند کے سربراہ حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی گزشتہ روز انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے کومہ میں تھے اور کافی عرصہ بستر علالت پر رہنے کے بعد کم وبیش ۸۰ برس کی عمر میں اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی برصغیر پاک وہند بنگلہ دیش کی ممتاز شخصیات میں سے تھے جنہیں برطانوی استعمار

کے خلاف اس خطہ کے عوام کی تحریک حریت میں علامت کی حیثیت حاصل ہے اور جن کے تذکرہ کے بغیر جدوجہد آزادی کا کوئی باب مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ بیک وقت بلند پایہ محدث اور بلند نسبت روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی متحرک سیاسی راہ نما اور تحریک آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ اور انہیں یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے کم وبیش سترہ برس حرم نبویؐ میں بلکہ مسجد نبوی میں قال اللہ تعالی وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درس دیا اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے استاذ محترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز بڑھاپے میں اپنے وطن کی آزادی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے سرگرم عمل ہیں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے قافلہ عزیمت میں شامل ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی مالٹا جزیرہ میں محبوس ہوگئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے جب متحدہ ہندوستان کے علماء کرام کی اس وقت کی سب سے بڑی جماعت جمعیۃ علماء ہند کی قیادت سنبھالی تو استخلاص وطن اور حریت قومی کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوچکا تھا اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت تحریک آزادی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حضرت مدنی نے اس جرأت وحوصلہ اور عزیمت واستقامت کے ساتھ تحریک آزادی میں علماء حق کی قیادت کی کہ جمعیۃ علماء ہند نے حریت پسند جماعتوں کی صف اول میں نمایاں مقام حاصل کرلیا بلکہ ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے سب سے پہلے ایک سیاسی فورم سے ۱۹۲۶ء سے ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرکے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں آزادی کامل کو اپنا ہدف بنایا اور آل انڈیا مسلم لیگ کو اس مطالبہ اور مشن تک پہنچتے ہوئے مزید دس سال لگ گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اعزاز بلاشبہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور ان کے رفقاء کی فراست وبصیرت اور عزیمت واستقامت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کی قیادت میں جمعیۃ علماء ہند نے عملی سیاست سے کنارہ کشی کرلی اور تعلیمی، سماجی اور رفاہی کاموں میں مسلمانوں کی راہنمائی کو اپنا مشن بنالیا۔ تقسیم کے نتیجے میں بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کو جن شدید مشکلات اور سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کے حل اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے حضرت مدنی اور حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کی سربراہی میں جمعیۃ علماء ہند نے تاریخی کردار ادا کیا جو مسلمانان ہند کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کی وفات کے بعد بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے معاشرتی وقار، دینی اقدار کے تحفظ

اور ترقی کے لیے شب و روز مصروف عمل یہ محاذ شاید ٹھنڈا پڑ جائے گا اور اب اس سطح کی کوئی شخصیت سامنے نہیں آسکے گی جو ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ اور ان کی تعلیمی وسماجی ترقی کے لیے اس جرأت واستقامت کے ساتھ سرگرم عمل ہو۔ مگر حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کچھ اس شان سے اس میدان میں آگے بڑھے کہ امیدوں کی ٹمٹماتی شمعیں پھر سے روشن ہونے لگیں اور دم توڑتے حوصلوں میں ایک بار پھر زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک متحرک سیاسی راہنما تھے اور ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ سیاسی مذہبی اور مسلکی معاملات پر ان کی نظر یکساں رہتی تھی اور کسی اہم مسئلہ میں صرف نظر سے کام لینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھارت کے رہنے والے مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس مسئلہ کا سامنا تھا وہ فرقہ وارانہ فسادات کا تھا۔ کہیں بھی فرقہ وارانہ عصبیت کی چنگاری بھڑکتی تو اس علاقے میں مسلمانوں کے جان و مال خطرے میں پڑ جاتے۔ ایسے میں اس علاقے میں جانا، مسلمانوں کو حوصلہ دینا، ان کی امداد و بحالی کے کاموں کی نگرانی کرنا، فرقہ پرستوں کو لگام دینے کی جدوجہد کرنا اور حکام کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور کرنا، سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کا یہ کام ہوتا تھا کہ جہاں اس قسم کے فسادات ہوتے وہ تمام تر خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود وہاں پہنچ جاتے اور تمام متعلقہ امور اپنی نگرانی میں طے کراتے۔ پھر یہ جگہ حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی نے سنبھال لی اور خود کو ان کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ بھارت کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں پر کوئی گرفت آتی اور کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا، وہاں کے لوگوں کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اور کوئی آئے یا نہ آئے، ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی ضرور آئیں گے اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔

میں نے مختلف مواقع پر انہیں دیکھا ہے، دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر میں نے حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی کو خود ان کے دیوبند کے گھر میں دیکھا، پاکستان میں متعدّد بار تشریف آوری پر ان کی زیارت وملاقات شرف حاصل کیا، اور برطانیہ کے بہت سے اجتماعات میں ان کے ساتھ شرکت کی۔ سچی بات ہے کہ اپنے معمولات واوقات کا ان سے زیادہ پابند میں نے اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ وہ جب تک مصروفیات کے دائرے میں رہے اپنے معمولات واوقات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر حضرت والد صاحب کی مصروفیات کی جولانگاہ گکھڑ اور گوجرانوالہ تک محدود رہی ہے اور سفر کا موقع کبھی کبھی آتا تھا۔ جبکہ حضرت

مولانا سید اسعدؒ مدنی کی جولانگاہ میں بھارت، بنگلہ دیش، برطانیہ، امریکہ، جنوبی افریقہ اور پاکستان سمیت بہت سے دوسرے ممالک شامل تھے۔ اور شاید ہی کوئی سال ایسا ہوتا جب وہ ان ممالک کا دورہ نہ کرتے، ان طویل اسفار میں اپنے نظام الاوقات کی پابندی کرنا اور معمولات کو بلاناغہ نبھاہنا مولانا اسعدؒ مدنی کا ہی کام تھا۔

میں نے برطانیہ کے اسفار میں دیکھا کہ ان کے سفر کے آغاز سے قبل ہی ان کے سفر کا سارا شیڈول طے ہو جاتا تھا اور طبع ہو کر متعلقہ حضرات تک پہنچ جاتا تھا۔ پروگراموں کی گھنٹوں کے حساب سے تقسیم ہوتی، ایک دن میں درجنوں پروگرام ہوتے اور سارے پروگرام اپنے اپنے وقت پر نمٹ جاتے اور اس معاملہ میں وہ کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ اور ایسا ممکن نہیں ہوتا تھا کہ پروگرام کا وقت حرج ہو رہا ہو اور وہ کسی اور پروگرام میں میزبانوں کے ساتھ مروت کی وجہ سے وقت حرج کر رہے ہوں۔ گھڑی دیکھتے رہتے، وقت پر اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر انہیں کسی کام کے لیے روکنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اس عمل کا میں نے بارہا مشاہدہ کیا اور ہر بار اس حوالہ سے ان کے ساتھ عقیدت اور رشک کے جذبات میں اضافہ ہوا۔

ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسٰی منصوری بسا اوقات حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی کی بعض خصوصیات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، ایک بار کہنے لگے کہ میں نے مولانا اسعدؒ مدنی میں دو خوبیاں ایسی دیکھی ہیں جو کسی دوسرے دینی یا سیاسی راہ نما میں مجھے نظر نہیں آئیں۔

ایک یہ کہ ان کی خوراک انتہائی سادہ رہی ہے اور وہ اس معاملہ میں اکثر قناعت پسند رہتے ہیں، میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے ہیں اور پر تکلف ماکولات موجود ہیں مگر مولانا اسعدؒ مدنی اپنے سامنے پڑی ہوئی کوئی ڈش اٹھائیں گے اور اسی سے کھانے لگیں گے، اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔

مولانا منصوری کہتے ہیں کہ دوسری بات جو میں نے مولانا اسعدؒ مدنی میں بطور خاص محسوس کی وہ ان کی مستعدی اور چابک دستی ہے۔ وہ بروقت فیصلہ کرتے ہیں اور اس پر بروقت عمل بھی کر گزرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات اکیلے کئی جماعتوں پر بھاری ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ کسی علاقے میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے، دوسری جماعتیں اس کے بارے میں مشورہ کر رہی ہیں، پروگرام بنا رہی ہیں اور اپنے موقف کے منظم اظہار کی تیاریاں کر رہی ہیں کہ اچانک مولانا اسعدؒ مدنی کسی جانب سے وہاں پہنچ جاتے ہیں، اپنے حلقہ کا اجتماع یا پریس کانفرنس کر کے اپنا موقف اور پروگرام پیش کر کے آگے چل دیتے ہیں اور دوسری جماعتیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

مولانا سید اسعدؒ مدنی نے جمیعۃ علماء ہند کی تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور رفاہی جدوجہد میں جو نئے رنگ بھرے وہ بلاشبہ ان کے صدقات جاریہ ہیں۔ انہوں نے غریب مسلمانوں کو چھوٹے موٹے کاروبار اور شادی بیاہ جیسے معاملات میں ناگزیر ضروریات کے بلاسود قرضے فراہم کرنے کی غرض سے جمیعۃ علماء ہند کے زیراہتمام ایک فنڈ قائم کیا جس کے بعد اسی طرز کے بہت سے دیگر فنڈز بھی قائم ہوئے اور ایک وسیع کارِ خیر کا آغاز ہوگیا۔ انہوں نے دینی مدارس کے تحفظ و ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمان بچوں کو عصری تعلیم اور فنون سے آراستہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو توجہ دلائی اور بہت سے مقامات پر اس کا عملی اہتمام بھی کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی سماجی بہبود اور فلاح کے لیے متعدّد کام شروع کیے اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

حضرت مولانا سید اسعدؒ مدنی سیاست میں ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہے اور ان کی طرف سے ایوان بالا کے ممبر بھی رہے۔ وہ دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ بھارت کے معروضی حالات میں کانگریس مسلمانوں کے لیے بہتر پلیٹ فارم ہے اور وہ سیاسی معاملات میں کانگریس ہی کے فورم سے ہمیشہ متحرک رہے۔ مولانا اسعدؒ مدنی بھارت کے مسلمانوں کے لیے اپنے عظیم والد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے جانشین تو تھے ہی مگر میرے جیسے تاریخ کے طالب علم کے لیے وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ کے جانشین بھی تھے۔ اب یہ دونوں نسبتیں ہم سے رخصتیں ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ورثاء و متعلقین کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق دیں اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(فروری ۲۰۰۶ء)

حضرت مولانا حافظ نذیر احمدؒ

(۱)

شیخ الحدیث مولانا حافظ نذیر احمدؒ ہمارے بزرگوں میں سے تھے، ملک کے معروف مدرسہ جامعہ ربانیہ اڈہ پھلور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک تعلیم و تدریس کے فرائض سرانجام دینے کے بعد گزشتہ دنوں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھوں سے نابینا تھے لیکن ان کے دل کی بینائی نے پورے علاقے کو حق کی راہ پر لگا دیا تھا۔ کم و بیش پچاسی برس عمر پائی اور ساری زندگی پڑھنے پڑھانے اور مخلوقِ خدا کی راہنمائی میں بسر کر دی۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے شاگرد اور والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے دورۂ حدیث کے ساتھی تھے۔

کم وبیش ربع صدی قبل کی بات ہے کہ میں جامعہ ربانیہ کے سالانہ جلسہ میں حاضر ہوا تو مجھے بطور خاص ملاقات کے لیے بلایا اور فرمایا کہ تم میرے بھتیجے لگتے ہو۔ میں نے اس شفقت پر مسرت کا اظہار کیا کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے سارے شاگرد میرے چچا لگتے ہیں۔ لیکن فرمانے لگے کہ میں تمہارے والد صاحب کے ساتھ دورۂ حدیث میں شریک تھا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ پھر فرمایا کہ دوپہر کا کھانا تم نے میرے ساتھ کھانا ہے۔ میرے لیے یہ سعادت کی بات تھی، کھانے میں شریک ہوا، سادہ سا کھانا تھا لیکن اس کی لذت و برکات ابھی تک دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد متعدّد بار حاضری ہوئی، ہر بار شفقت و محبت کا نیا انداز ہوتا تھا، ہمیشہ دعاگو رہتے۔ جامعہ ربانیہ میں شیخ الحدیث تھے اور آخر عمر تک بخاری شریف پڑھاتے رہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ والد محترم کے دورۂ حدیث کے جن ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوئی ہے وہ یا تو شیخ الحدیث ہیں یا اسی کے لگ بھگ علمی سطح پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے شیخ الحدیث مولانا حافظ نذیر احمدؒ مجھے ختم بخاری شریف پر حاضری کا ضرور حکم دیتے تھے اور میں اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھ کر حاضر ہوتا۔ گزشتہ سال بھی حاضری دی، معذوری کی وجہ سے بیٹھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور اسٹیج پر لیٹے لیٹے جلسہ کی کارروائی میں شریک رہے۔ میں جامعہ ربانیہ میں حاضری دیتا تو میرے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری اور ان کی دعاؤں سے استفادہ ہوتا۔ مگر چند روز قبل تعزیتی جلسہ میں شریک ہوا تو اس نعمت کو نہ پاکر دل سے ہوک سی اٹھی اور یہ معلوم کرکے صدمہ اور زیادہ گہرا ہوگیا کہ حضرت شیخؒ کے پرانے رفیق اور جامعہ ربانیہ کے مہتمم حاجی شاہ محمد صاحبؒ بھی گزشتہ ماہ انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جامعہ کے ناظم اعلیٰ حضرت صوفی حسن محمدؒ اس سے قبل وفات پاچکے ہیں اس طرح یہ تکون جس نے اس بیابان میں علم کی شمع روشن کی اور پورے علاقے کو قرآن و سنت کے علوم سے سیراب کیا اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی مغفرت فرمائیں اور پسماندگان کو ان کی حسنات جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۵ اپریل ۲۰۰۷ء)

(۲)

گزشتہ دنوں ملک کے معروف دینی ادارہ جامعہ ربانیہ پھلور ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سالانہ تقریب میں حاضری کا موقع ملا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ نذیر احمد مدظلہ کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مولانا حافظ نذیر احمد میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے

دورۂ حدیث کے ساتھیوں میں سے ہیں اور تقریباً ساٹھ سال سے پھلور ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقہ میں دینی و تعلیمی خدمات میں مصروف ہیں۔ نابینا ہیں لیکن قرآن و حدیث کے علوم پر اس قدر دسترس رکھتے ہیں جو بڑے بڑے اساتذہ کے لیے قابل رشک ہے۔ ختم بخاری شریف کی تقریب تھی جس میں مجھے دینی مدارس کی اہمیت اور انہیں آج کے حالات میں درپیش مشکلات اور چیلنجز کے حوالے سے گفتگو کے لیے کہا گیا۔ جبکہ میرے علاوہ ملک کے معروف خطیب مولانا محمد عالم طارقؒ، مولانا عبید الرحمان ضیاء اور برمنگھم سے آئے ہوئے جمعیۃ علماء برطانیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا صاحبزادہ امداد الحسن نعمانی نے بھی خطاب کیا۔ لیکن میں آج کی محفل میں حضرت مولانا نذیر احمد مدظلہ کی گفتگو کا تذکرہ کروں گا جو انہوں نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو بخاری شریف کا آخری سبق پڑھاتے ہوئے فرمائی۔

ایک عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میں جامعہ ربانیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے حاضر ہوا تو ملاقات پر مجھے حضرت مولانا نذیر احمد مدظلہ نے سرگوشی کے انداز میں فرمایا کہ ”تم میرے بھتیجے لگتے ہو“۔ میں چونک سا گیا کہ دنیا میں میرے ایک ہی چچا حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم ہیں جو حضرت والد صاحب کی طرح علیل ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو صحت کاملہ عاجلہ سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔ مولانا نذیر احمد نے فرمایا کہ میں نے بھی اسی سال دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں شرکت کی تھی جس سال تمہارے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے دورۂ حدیث پڑھا تھا، اس لیے تم میرے بھتیجے لگتے ہو۔ مجھے اس سے قبل اس بات کا علم نہیں تھا اس لیے یہ جان کر خوشی ہوئی اور تب سے یہ چچا بھتیجے کا رشتہ قائم ہے۔ جب ملتا ہوں دعاؤں اور شفقتوں سے نوازتے ہیں جس سے میری بیٹری چارج ہو جاتی ہے۔

اس درس میں انہوں نے بخاری شریف کے آخری باب اور حدیث کے حوالہ سے کچھ ضروری باتوں کا تذکرہ کیا، قیامت کے دن اعمال کے تولے جانے کے بارے میں اہل سنت کے عقیدہ کی وضاحت کی اور معتزلہ وغیرہ کا رد کیا۔ انہوں نے علمی دلائل کے ساتھ ساتھ دل لگی کے انداز میں ایک بات یہ فرمائی کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اعمال تولنے کی ضرورت ہی کیا ہوگی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز کا علم ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اعمال کے تولے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان بے وقوفوں کو بتائیں گے کہ تم کہتے تھے کہ اعمال کا وزن نہیں ہو سکتا، دیکھو تل رہے ہیں یا نہیں؟

حضرت نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں وہی نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں جو ہمیں ہمارے دو اساتذہ نے دورۂ حدیث کے اختتام پر کی تھیں۔ ایک بزرگ دارالعلوم دیوبند کے شیخ

الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ تھے جنہوں نے ہمیں نصیحت کی کہ پڑھنے پڑھانے کا شغل جاری رکھنا اس لیے کہ علم کی پختگی پڑھنے پڑھانے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور تعلیم و تدریس میں اس بات کی طرف توجہ نہ دینا کہ ضرور بڑے درجے کی کتابیں ہی پڑھانی ہیں بلکہ جو کتاب بھی پڑھانے کا موقع ملے پوری توجہ سے پڑھائیں اور کسی کتاب کو چھوٹا نہ سمجھیں۔ علم میں اسی طرح ترقی نصیب ہوگی، استحکام حاصل ہوگا۔ دوسرے بزرگ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ تھے جنہوں نے ہمیں فرمایا کہ تم دورۂ حدیث مکمل کر کے فارغ ہو رہے ہو مگر یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے تمہیں عالم بنا دیا ہے، تم عالم نہیں بنے۔ اس غلط فہمی میں کبھی نہ پڑنا کہ دورۂ حدیث پڑھ کر تم عالم بن گئے ہو، ہم نے تمہیں صرف عالم بننے کا طریقہ سکھایا ہے اور تمہارے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا کی ہے کہ اگر تم چاہو تو عالم بن سکتے ہو۔ اب علم کا میدان تمہارے سامنے ہے اس صلاحیت و استعداد کو استعمال کرتے ہوئے تم جس درجہ کے عالم بننا چاہتے ہو بن سکتے ہو۔ پڑھنے پڑھانے کا شغل جاری رکھو گے اور مطالعہ کا معمول رکھو گے تو علم حاصل ہوگا۔

یہ کہہ کر حضرت مولانا نذیر احمد نے فرمایا کہ دیکھو میں نے ۱۹۴۴ء میں اس علاقہ میں دین کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ساٹھ سال سے مسلسل پڑھا رہا ہوں مگر میں تمہیں اپنے اس احساس سے ضرور آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک عالم نہیں بن سکا، میں خود کو ابھی تک طالب علم سمجھتا ہوں۔ عالم تو پرانے بزرگ تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں علم کی تعلیم و تدریس کے لیے کھپائیں اور ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ ''ہدایہ'' فقہ حنفی کی معروف کتاب ہے جو چار جلدوں میں ہے اور ہم اسے اپنے طلبہ کو تین یا چار سال میں پڑھاتے ہیں۔ مگر یہ صاحب ہدایہ نے اپنی اصل کتاب کے خلاصہ کے طور پر لکھی تھی، ان کی اصل کتاب اسی (۸۰) جلدوں میں تھی جس میں انہوں نے فقہ حنفی کے مسائل کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا تھا۔ مگر بعد میں خیال آیا کہ کتاب زیادہ لمبی ہوگئی ہے اور لوگوں کی ہمتیں کم ہوتی جا رہی ہیں اس لیے اس کی تلخیص کر دی اور اسے چار جلدوں میں مختصر کر دیا۔ مگر ہمارے لیے یہ مختصر بھی اتنی بڑی ہے کہ بمشکل تین سال میں اسے پڑھ پاتے ہیں۔ عالم لوگ وہ تھے اور علم ان کے پاس تھا۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ علامہ آلوسیؒ کی تفسیر ''روح المعانی'' آئی جو تیس جلدوں میں ہے تو مجھے شوق ہوا کہ کوئی اس کا مجھے مطالعہ کرا دے، خود نابینا ہوں پڑھ نہیں سکتا، کتابوں کا مطالعہ کسی معاون کی مدد سے کرتا ہوں۔ اس تفسیر کے لیے ایک ساتھی نے مجھ سے وعدہ کیا مگر مجھے تسلی نہ ہوئی، مجھے معلوم تھا کہ یہ کام مشکل ہے اور واقعی ایسا ہوا کہ نہ اس کو وقت ملا اور نہ ہی میں زیادہ وقت نکال سکا۔

اس لیے یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے جا رہا ہوں کہ ”روح المعانی“ کا مطالعہ بھی نہ کر سکا، اس لیے میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ خود کو کبھی عالم نہ سمجھنا اور علم کی طلب ہمیشہ زندہ رکھنا۔

حضرت مولانا حافظ نذیر احمد جب یہ بات فرما رہے تھے تو ان کا لہجہ گلوگیر تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، میں ان کے سامنے طلبہ کی صف میں بیٹھا ان کے ارشادات سے فیضیاب ہو رہا تھا اور ان کا حسرت بھرا لہجہ میرے دل و دماغ کو کچوکے دے رہا تھا کہ یہ مرد درویش بھی جس نے ساٹھ برس کا طویل عرصہ پڑھنے پڑھانے میں گزار دیا ہے اور تقریباً پون صدی کتابوں کے درمیان بسر کر دی ہے اگر یہ بھی عالم نہیں ہیں تو پھر عالم کہلانے کا اور کس کو حق حاصل ہے؟ یہ ان کی کسر نفسی تھی اور طلبہ کو نصیحت کا انداز تھا جس کا اظہار وہ گلوگیر آواز اور آنسوؤں کے ساتھ کر رہے تھے لیکن ان کی بات اس لحاظ سے ٹھیک تھی کہ طالب علمی کا دور بس یہی سیکھنے کا ہوتا ہے کہ انسان میں مطالعہ کا ذوق بیدار ہو جائے اور پڑھنے کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو جائے، باقی سارا کام تو بعد میں کرنے کا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کو سمندر میں تیرنے کی تربیت دی جائے اور اس کے ساتھ اسے سمندر کی گہرائی، وسعت اور اس میں پائے جانے والے جانوروں کے بارے میں ضروری امور سے آگاہ کر دیا جائے۔ اب اس کے بعد یہ اس کی اپنی ہمت کی بات ہے کہ وہ سمندر میں کتنی گہرائی تک اترتا ہے اور اس کی وسعتوں کو کہاں تک ماپتا ہے۔

اس مرد درویش کی زبان سے یہ باتیں سن کر میرا ذہن اس دور کی طرف واپس مڑ گیا جب ہم اساتذہ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر ان سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔ اور سچی بات ہے کہ اس مختصر سے درس میں بڑا مزہ آیا اور بہت کچھ حاصل ہوا۔ یہ چند درویش باقی رہ گئے ہیں جو اکابر و اسلاف کی پرانی روایتوں کے امین ہیں اور جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے پرانے بزرگ کیسے ہوا کرتے تھے۔ اب تو یہ نسل نایاب بلکہ رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ میں کبھی کبھی یہ سوچا کرتا ہوں کہ ہمیں تو چند بزرگ دیکھنے کو مل گئے ہیں جن کی صحبت و زیارت سے اسلاف کی زندگیوں کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے مگر ہماری اگلی نسلوں کا کیا بنے گا؟ اور کیا وہ اپنے ماضی کی حسین روایات و اقدار کی یہ جھلک دیکھنے سے بھی محروم رہیں گی؟ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۸ اگست ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا مفتی عبد الستارؒ

حضرت مولانا مفتی عبد الستارؒ سمندری فیصل آباد کے قریب ایک گاؤں کے زمیندار گھرانے سے تعلق

رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دل میں علم دین کے حصول کا شوق ڈالا تو خاندانی ماحول اور روایات کے علی الرغم گھر سے دینی تعلیم کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ذہانت اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرما رکھی تھی اس کے ساتھ شوق اور محنت کا جوڑ ہوا تو توفیقِ خداوندی نے چند سالوں میں رسمی اور دینی تعلیم کے حصول کے مراحل طے کرا کے جامعہ خیر المدارس ملتان کے دارالافتاء تک پہنچا دیا۔ اور پھر کم و بیش پینتیس برس تک اس مسند پر بیٹھ کر صرف عوام کی دینی رہنمائی اور انہیں شریعت کے احکام و مسائل سے آگاہ کرنے کا فریضہ ہی سر انجام نہیں دیا بلکہ دینی علوم بالخصوص تفقہ و افتاء میں علماء کرام اور مفتیان عظام کی رہنمائی و رہبری بھی فرماتے رہے۔ وہ ملک کے ان چند گنے چنے بزرگ مفتیان کرام میں سے تھے جن سے اہل علم رجوع کرتے تھے اور اہل افتاء اپنے فتاویٰ میں ان کی توثیق کا اشارہ پا کر مطمئن ہو جاتے تھے کہ ہم سے مسئلہ بتانے اور فتویٰ دینے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔

گزشتہ روز دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے جلسہ تقسیم اسناد کے لیے حاضری کے موقع پر مولانا مفتی عبد الستارؒ کی تعزیت کے لیے جامعہ خیر المدارس میں گیا اور جامعہ کے مہتمم برادرم قاری محمد حنیف جالندھری کے ساتھ مفتی صاحبؒ کے فرزند مولانا مفتی محمد عبداللہ سے بھی ملاقات ہوئی تو یہ دیکھ کر دل کو بے حد خوشی اور تسلی ہوئی کہ اسلاف کی روایات کا تسلسل ابھی قائم ہے اور وہ اگلی نسل تک بھی منتقل ہو رہا ہے۔ میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات سے سب سے زیادہ اہل علم کو نقصان ہوا ہے اور وہ ایک شفیق، مربی اور رہبر سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور اس دور میں جبکہ ملک بھر میں مفتی صاحبان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، مفتیوں کے مفتی دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ یعنی ایسے ثقہ عالم جن سے رجوع کر کے اہل علم اطمینان کی منزل حاصل کر سکیں، ان کا دائرہ سمٹ رہا ہے۔

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آ گیا جس کا حوالہ اس وقت ذہن میں نہیں ہے مگر غالباً اپنے کسی استاد محترم سے سنا تھا کہ جب شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا انتقال ہوا تو بہت سے علماء کرام صدمہ میں رو رہے تھے۔ سنا ہے کہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے علماء کرام سے خطاب کر کے فرمایا کہ آپ لوگ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ آپ لوگوں کے لیے تو ہم موجود ہیں، اصل نقصان تو ہمارا ہوا ہے کہ ہمارے لیے کوئی موجود نہیں رہا۔ مجھے مولانا مفتی عبد الستارؒ کی وفات پر اسی قسم کی صورتحال محسوس ہو رہی ہے کہ ملک میں علماء کرام اور علمی حلقوں کو جب کسی مسئلہ میں الجھن ہوتی تو اس کے حل کے لیے جن اصحاب علم کی طرف رجوع کا خیال ذہنوں میں آتا تھا ان میں ایک بزرگ حضرت مفتی عبد الستار صاحبؒ بھی ہوتے تھے مگر آج وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔

مجھے حضرت مفتی صاحبؒ سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوا مگر میں انہیں اپنے اساتذہ کی صف میں ہی شمار کرتا ہوں۔ وہ بھی ہمیشہ شفقت فرماتے اور نصائح اور دعاؤں سے نوازتے تھے۔ اس حوالے سے میں ان کی وفات کو اپنا ذاتی نقصان بھی تصور کرتا ہوں کہ ایک مشفق اور دعا گو بزرگ کے سائے سے محروم ہو گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے فرزند و جانشین مولانا مفتی محمد عبد اللہ کو اپنے نیک صفت اور صاحب دل والد کی روایات کا صحیح جانشین و امین بنائے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۸ جولائی ۲۰۰۶ء)

الشیخ عبد اللہ بن احمد الناخبیؒ

الشیخ عبد اللہ بن احمد الناخبیؒ کی وفات کی خبر مجھے پاکستان ہی میں مل گئی تھی اور میرے سعودی عرب کے سفر کے پروگرام میں ان کے تلامذہ سے ملاقات بھی شامل تھی۔ شیخ ناخبیؒ میرے حدیث کے شیوخِ اجازت میں سے ہیں اور اپنے دور کے امت کے بڑے محدثین میں شمار ہوتے تھے۔ تین سال قبل جدہ کے ایک سفر کے موقع پر ان کی خدمت میں حاضری ہوئی تھی اور انہوں نے حدیث مسلسل بالاولیۃ سنا کر اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت اور اس کے ساتھ اہم نصائح سے نوازا تھا۔ چند ماہ قبل قاری محمد رفیق نے مجھے فون پر بتایا کہ شیخ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جدہ حاضری کے موقع پر ان کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ ان کے عزیزوں میں علمی ذوق کے کوئی بزرگ باقی نہیں رہے البتہ قاری محمد رفیق کے بڑے فرزند قاری اسامہ رفیق نے شیخ ناخبیؒ کے چند تلامذہ کے ساتھ ملاقات کا اپنے ہاں چائے پر اہتمام کر دیا۔ چنانچہ ان سے تعزیت کے ساتھ ساتھ حضرت شیخؒ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

شیخ ناخبیؒ کا تعلق یمن کے علاقہ حضر موت سے تھا، ان کی ولادت ۱۳۱۷ھ میں بتائی جاتی ہے، اس لحاظ سے انہوں نے ایک سو گیارہ سال کی عمر میں وفات پائی ہے۔ اور دوستوں کا کہنا ہے کہ وفات سے چار ماہ قبل تک درس و تدریس میں مسلسل مصروف رہے، تین چار ماہ بیماری میں معذور ہوئے اور پھر ان کا وصال ہو گیا۔ تین سال قبل جب میں نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور انہوں نے حدیث مسلسل بالاولیۃ سنا کر روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی تو وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ قد لمبا ہونے کے باوجود سیدھے چل رہے تھے اور انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں عالمی تہذیبی کشمکش اور اس کے حوالہ سے

علماء کی ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا تھا جس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ ان کے ساتھ تلمذ کی نسبت کے علاوہ ذوق کی ہم آہنگی کا شرف بھی حاصل ہو رہا ہے۔

شیخ ناخبیؒ کے والد محترم حضر موت کے علاقہ میں سلطان غالب بن عوض قعیطی مرحوم کے دورِ حکومت میں فوج میں شامل تھے اور شیخ ناخبیؒ بھی ایک دور تک قعیطی سلطنت کی رضاکار فورس میں شامل رہے ہیں۔ اس دوران ایک مسجد میں امامت و تدریس کی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے مگر جب انہیں ان دونوں میں سے ایک کے انتخاب کے لیے کہا گیا تو انہوں نے امامت و تدریس کو ترجیح دی اور فوجی ملازمت کو ترک کر دیا۔ تعلیم و تدریس کی طرف شیخ ناخبیؒ کے رجحان کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کے والد مرحوم نے حضر موت کے شہر ''مکلا'' میں قیام کے دوران انہیں اس دور کے ایک بڑے عالم الشیخ سالم بن مبارک الکلالی الحمیریؒ کی خدمت میں تعلیم کے لیے پیش کر دیا تھا جو معروف محدث الشیخ عمر بادہؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور ساحل کے علاقہ میں انہیں استاذ الکل کا مقام حاصل تھا۔ شیخ سالمؒ کی مسلسل صحبت نے شیخ عبد اللہ کو نہ صرف علمی ذوق سے آراستہ کیا بلکہ ان کی ادب و شعر اور خطابت کی صلاحیتیں بھی ابھریں اور ایک خطیب اور شاعر کے طور پر انہوں نے قومی سطح پر شہرت پائی۔

شیخ ناخبیؒ کا تعلق معروف قبیلہ حمیری کی شاخ یافعی سے تھا اور وادئ ذی ناخب ان کا وطن تھا اس لیے وہ حمیری، یافعی اور ناخبی کی تینوں نسبتوں سے منسوب تھے۔ لیکن زیادہ شہرت ان کی علاقائی نسبت ناخبی نے پائی اور انہیں علم حدیث کے طلبہ اور اساتذہ میں الشیخ الناخبی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ شیخ ناخبیؒ نے جنوبی یمن میں قعیطی سلطنت کے تین حکمرانوں سلطان غالب بن عوض، سلطان عمر بن عوض اور سلطان صالح بن عوض کا زمانہ پایا ہے لیکن جب چودھویں صدی ہجری کے اواخر میں جنوبی یمن پر کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی اور اہل دین پر تنگی اور سختیوں کا سلسلہ بڑھنے لگا تو وہ جدہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

مکلا میں سلطان عمر بن عوض قعیطی نے ایک بڑی مسجد تعمیر کی جو حضر موت کے علاقہ کی اپنے دور میں سب سے بڑی مسجد بتائی جاتی ہے اور مسجد سلطان عمر کے نام سے موسوم ہے۔ شیخ ناخبیؒ نے ۱۳۵۱ھ سے ۱۳۸۸ھ تک مسلسل سینتیس برس تک وہاں خطابت و امامت کے فرائض انجام دیے اور سلطان صالح کے دور میں محکمۂ تعلیم میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے انسپکٹر اور نگران کے مناصب پر فائز رہے۔ تعلیم و تدریس ان کا خصوصی ذوق تھا اور بتایا جاتا ہے کہ مکلا میں بچیوں کی تعلیم کا سب سے پہلا مدرسہ انہوں نے قائم کیا جس میں ان کی اہلیہ محترمہ بھی تدریسی خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ سلطان صالح بن عوض مرحوم کے بارے میں تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت و پرورش حیدر آباد دکن میں عثمانی حکمرانوں کے

زیرسایہ ہوئی تھی اور وہ اردو بھی اچھی طرح جانتے تھے، وہ علم دوست حکمران تھے اور علماء وادباء کے قدر دان تھے۔

شیخ ناخبیؒ کو سلطان صالح بن عوض مرحوم کے دور میں ''شاعر الدولۃ'' کا لقب ملا اور اسی عنوان سے ان کا دیوان طبع ہوا جس میں ان کا تفصیلی سوانحی خاکہ بھی موجود ہے۔ سلطان صالح قعیطی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ جب حیدرآباد دکن سے آئے اور سلطان عمر کے بعد زمام اقتدار سنبھالی تو وہاں سے تین سو کے لگ بھگ کتابیں بھی ساتھ لائے تھے جن پر مشتمل ''مکتبہ سلطانیہ'' قائم کیا گیا اور شیخ عبداللہ بن ناخبیؒ کو اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اور جب شیخ ناخبیؒ نے ہجرت سے قبل اس کا چارج چھوڑا تو اس میں بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب عربوں کو ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا گیا اور شریفِ مکہ مکرمہ السید حسین نے بغاوت کر کے نہ صرف حجاز مقدس بلکہ پورے خطۂ عرب میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو جنوبی یمن کے اس خطہ میں قعیطی حکمران برسرِ اقتدار تھے۔ خود شریف مکہ شاہ حسین کو انگریزوں نے وعدہ کے باوجود عرب کی بادشاہت نہ دی البتہ اس کے ایک بیٹے کو اردن کی حکمرانی اور دوسرے بیٹے فیصل کو عراق کی بادشاہی عطا کر دی۔ عراق پر شاہ فیصل کی حکومت کے دور کی بات ہے کہ مکلا میں آل الدباغ نامی ایک خاندان کے مدرسہ الفلاح میں شیخ ناخبیؒ مدرس تھے۔ یہ ۱۳۴۵ھ کے لگ بھگ کی بات ہے۔ آل الدباغ سیاسی رجحانات رکھتے تھے اور عراق کے شاہ فیصل کے ساتھ رابطہ کر کے حضرموت کے علاقہ میں قعیطی حکومت کے خلاف بغاوت کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ شیخ ناخبیؒ کو جب ان کے ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے مدرسہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کی سرگرمیوں سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔

برطانوی حکومت نے ترکوں کے خلاف کامیاب بغاوت کی صورت میں عربوں کو ایک متحدہ حکومت دینے اور شریف مکہ حسین کو اس کا حکمران بنانے کا وعدہ کیا تھا اور اسی وعدہ پر شریف مکہ اتنے بڑے اقدام پر تیار ہوئے تھے۔ لیکن جب خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو عربوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا اور برطانوی استعمار نے عرب دنیا کے حصے بخرے کر کے ہر خطہ کے حکمران طبقات سے الگ الگ معاملہ طے کیا۔ مرکزیت سے محروم ہونے کے باعث عرب علاقوں کے حکمران طبقات برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے پر مجبور ہوئے جس سے برطانوی استعمار نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران جنوبی یمن کی قعیطی حکومت کو بھی برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا جو ۱۳ اگست ۱۹۳۷ء کو تحریر کیا گیا۔

''حضر موت عبر اربعۃ عشر قرناً'' (حضر موت چودھویں صدی میں) کے مصنف السید سقاف الکاف نے اس معاہدہ کی ایک دفعہ یوں نقل کی ہے کہ

> ''مملکۂ متحدہ (برطانیہ) میں شہنشاہ معظم کی حکومت اس بات کو قبول کرتی ہے کہ وہ سلطان کے لیے ایک مشیر کا تقرر کرے گی جو ان کے ساتھ مقیم رہے گا۔ اور سلطان (قعیطی) اس بات پر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مشیر کو اس کے شایان شان رہائش مہیا کریں گے اور ملک کے تمام معاملات میں اس کے مشوروں کو قبول کریں گے سوائے ان امور کے جو دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں۔''

اس معاہدہ کے تحت سب سے پہلے برطانوی مشیر انگریمز (Ingrams) آئے اور انہوں نے قعیطی سلطان کے مشیر کے عنوان سے کاروبار مملکت سنبھال لیا۔ شیخ ناخبیؒ اس وقت محکمۂ تعلیم میں خدمت سرانجام دے رہے تھے، چنانچہ مسٹر انگریمز نے ریاست میں تعلیمی اصلاحات کا جو سلسلہ شروع کیا شیخ ناخبیؒ اس میں شریک کار رہے اور ان اصلاحات کے دوران ''دین محمدیؐ'' سے تعلق رکھنے والے امور کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی افق پر مغربی کیمپ کی قیادت برطانیہ کی جگہ امریکہ نے سنبھال لی تھی اور اس کے مقابلہ میں سوویت یونین نے محاذ آرائی کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ اس سرد جنگ کا سب سے زیادہ نشانہ عرب علاقے بنے۔ بہت سے عرب ملک انقلابات کی زد میں آئے، بعض عرب ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگئے، پوری عرب دنیا امریکی اور روسی اثر ورسوخ کے دائروں میں بٹ گئی۔ سوویت یونین نے افریقہ اور عرب میں امریکی اثر ورسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے جارحانہ پیش قدمی کی۔ اس دوران یمن بھی دو حصوں میں بٹ گیا اور جنوبی یمن میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی جس نے دینی حلقوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ شیخ ناخبیؒ اس وقت مکتبہ سلطانیہ کے انچارج تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ عدن کے کمیونسٹ حکمران عبد الفتاح اسماعیل نے مکتبہ سلطانیہ میں موجود ایک اہم رپورٹ طلب کی جو سلطان غالب بن عوض قعیطی کے دور حکومت میں ان کی فرمائش پر جرمن ماہرین کے ایک گروپ نے حضر موت کے علاقے میں پائے جانے والے قدرتی اور معدنی وسائل کے بارے میں تیار کی تھی۔ شیخ ناخبیؒ کو وہ رپورٹ کمیونسٹ حکومت کے سپرد کرنے میں تامل تھا جس پر اختلاف کا آغاز ہوا۔ پہلے دھمکیوں سے کام لیا گیا مگر شیخ اس کے باوجود تیار نہ ہوئے تو انہیں مکتبہ کی نظامت اور اس کے خطابت وتدریس سے بھی معزول کر دیا گیا۔ پھر حکومت کی سخت گیر پالیسی اور اقدامات کو دیکھتے ہوئے شیخ ناخبیؒ نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور ۱۳۹۴ھ میں حضر موت کا علاقہ

چھوڑ کر جدہ میں آ گئے۔

جدہ میں ایک محلہ کی مسجد کی امامت ان کے سپرد کی گئی جہاں وہ عمر کے آخری حصے تک دینی و تعلیمی خدمات میں مصروف رہے۔ وہ اس مسجد میں روزانہ عصر کی نماز کے بعد صحاح ستہ میں سے حدیث کی کسی کتاب کا ترتیب سے درس دیتے تھے، ایک کتاب مکمل ہو جاتی تو دوسری شروع کر دیتے اور یہ سلسلہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ اس دوران بڑے بڑے علماء اور محدثین نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا، جن میں حضرت الاستاذ عبد الفتاح ابو غدہؒ اور الاستاذ محمد عوامہ حلبیؒ بھی شامل ہیں۔ شیخ ناخبیؒ روایت حدیث کی اجازت کے ساتھ اپنی مختصر ثبت مرحمت فرماتے تھے جو انہوں نے مجھے بھی عطا کی۔ میں نے اس ثبت میں بخاری شریف کی ایک عالی سند میں ان کے اور امام بخاریؒ کے درمیان سولہ واسطے شمار کیے ہیں جو بڑی سعادت کی بات ہے۔ مجھے بحمد اللہ مکۃ المکرمۃ میں ایک معمر بزرگ اور اپنے دور کے ایک بڑے محدث الشیخ المسند ابو الفیض محمد یاسین الفادانی الشافعیؒ کی خدمت میں حاضری اور مختلف مسلسلات کی سماعت کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت بھی حاصل ہے، ان کی ایک سند میں ان کے اور حضرت امام بخاریؒ کے درمیان پندرہ واسطے ہیں۔

بہر حال الشیخ الناخبیؒ ہمارے دور کے بڑے محدثین میں سے تھے اور انہیں اکابر محدثین اور شیوخ سے تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ ایسے بزرگوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا باعث ہوتا ہے مگر اب وہ خود اللہ کی رحمت کے سائے میں جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند فرمائیں اور ہمیں ان کے فیوض و برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی توفیق سے نوازیں۔

(روزنامہ اسلام۔ ۹ ستمبر ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا حسن جانؒ شہید

حضرت مولانا حسن جان کی شہادت کی المناک خبر میں نے دار الہدیٰ واشنگٹن ڈی سی میں سنی۔ پشاور سے تعلق رکھنے والے حافظ محمد عرفان قریشی صاحب واشنگٹن میں کنسٹرکشن کا کام کرتے ہیں اور اس سال دار الہدیٰ میں تراویح میں قرآن کریم سنا رہے ہیں۔ انہوں نے فون کر کے مجھے بتایا کہ ایک انتہائی افسوس ناک خبر سنا رہا ہوں کہ ابھی نصف گھنٹہ قبل پشاور میں حضرت مولانا حسن جان صاحب کو شہید کر دیا گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تھوڑی دیر کے بعد انٹرنیٹ پر پاکستانی اخبارات میں بھی یہ خبر آ گئی۔

ابھی چند ہفتے قبل ملتان میں وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی

اور فیصل آباد میں ختم بخاری شریف کی ایک تقریب میں بھی زیارت و مصافحہ کا موقع مل گیا تھا۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ ایسی مرنجاں مرنج اور خالصتاً علمی شخصیت کی جان لینے میں آخر کسی کو کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ رات کو تراویح کی نماز کے بعد دار الہدیٰ میں اپنے بیان کے آخر میں حضرت مرحوم کا تذکرہ کیا اور عرض کیا کہ وہ تو صرف اور صرف علمی دنیا کے آدمی تھے اور مطالعہ، تدریس، اصلاح اور خیر خواہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ علم حدیث کے مسلمہ اساتذہ میں سے تھے۔ میں نے دوستوں کو بتایا کہ میرے جیسے لوگوں کو بھی کچھ دوست شیخ الحدیث کہہ دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ ہم طلبہ کے سامنے بخاری شریف کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور قیامت کی نشانیاں پوری کرتے رہتے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں جن آٹھ دس بزرگوں کے اسماء گرامی کے ساتھ شیخ الحدیث کا لقب صحیح طور پر فٹ بیٹھتا ہے، ان میں حضرت مولانا حسن جان شہیدؒ بھی تھے۔

حضرت مولانا حسن جان شہیدؒ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ کی معذوری اور وفات کے بعد ان کی مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے اور پھر پشاور صدر کی درویش مسجد میں دینی درس گاہ قائم کر کے علوم حدیث کی ترویج و اشاعت کو زندگی بھر مشن بنائے رکھا۔ وہ سیاست میں بھی آئے اور خان عبد الولی خان مرحوم جیسی قدر آور شخصیت کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، لیکن سیاست انہیں راس نہیں آئی۔ وہ تو سیاست میں آئے لیکن سیاست ان میں آنے کا راستہ نہ پا سکی، بالآخر انھوں نے اسے طلاق بائنہ دے دی۔ وہ اس میدان کے بزرگ ہی نہیں تھے، ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی واحد جولان گاہ علم اور صرف علم تھا۔ اپنے مزاج کے حوالے سے وہ مرنجاں مرنج قسم کی شخصیت تھے۔ خدا جانے ان کے سفاک قاتلوں کو ان کی جان لینے میں کس پہلو سے دلچسپی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے اہل خاندان، تلامذہ اور عقیدت مندوں کو صبر و حوصلہ کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ اکتوبر ۲۰۰۷ء و اخبارات)

حضرت مولانا سید انور حسین نفیس الحسینیؒ

حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا تعلق رائے پور کی عظیم خانقاہ سے تھا اور وہ اپنی منفرد طرز کے باعث علمی و دینی حلقوں میں ایک امتیازی پہچان رکھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ضلع سیالکوٹ کے ایک خوشنویس خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس فن میں

انہوں نے ایسی پیش قدمی کی کہ ان کا شمار عالم اسلام کے ممتاز خطاطوں میں ہوا اور ان کی اجتہادی صلاحیتوں نے اس فن کو حسن و نزاکت کی نئی جہتوں سے متعارف کرایا۔ جبکہ دینی حلقوں میں وہ ایک حق پرست صوفی اور دینی تحریکات کے سرپرست اور مربی کے طور پر متعارف تھے اور انہوں نے زندگی بھر دینی جماعتوں اور تحریکوں کے راہ نماؤں اور کارکنوں میں شفقتیں بانٹیں۔

میری ان سے نیاز مندی اس دور سے تھی جب وہ میکلوڈ روڈ لاہور پر ہفت روزہ چٹان کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے اور ان کی سرپرستی میں جمعیۃ طلبہ اسلام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ مجھے اس جمعیۃ طلبہ اسلام کے ابتدائی ارکان میں سے ہونے کا شرف حاصل ہے اور میں نے بھی اپنی نوجوانی کا کچھ عرصہ طلبہ کی اس تنظیم کو پروان چڑھانے میں صرف کیا ہے۔ جب یہ جماعت تشکیل پا رہی تھی تو ہمارے دو بزرگوں نے اس کی سب سے زیادہ سرپرستی کی، ایک حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور دوسرے سید نفیس شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ۔ دینی مدارس اور کالجوں کے طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی اس طلبہ تنظیم نے ایک زمانے میں ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں اپنا حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا اور کالجوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹیوں کی سطح پر بڑی تنظیموں میں اپنا شمار کرا لیا تھا لیکن اسے کسی کی نظر بد کھا گئی۔ اپنے دور عروج میں یہ طلبہ تنظیم دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصے پر نظریاتی اور فکری رنگ نے ایسا غلبہ پایا کہ وہ سوسائٹی کے عملی مسائل اور معروضی ماحول سے لاتعلق ہو کر رہ گیا، اور دوسرے حصے کو معروضی حالات کی بھول بھلیوں نے گم کر دیا۔ بہرحال اس کا آغاز جن لوگوں کی سرپرستی میں ہوا تھا ان میں حضرت نفیس شاہ صاحبؒ سرفہرست ہیں اور مجھے اس دور میں بھی ان کی شفقتوں اور دعاؤں کا شرف حاصل رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تعلق حضرت امام زید بن علیؒ کے عظیم خانوادہ سے بتایا جاتا ہے اور وہ اسی نسبت سے زیدی بھی کہلاتے تھے۔ انہیں امت کے جن بزرگوں سے عشق کی حد تک محبت و عقیدت تھی ان میں حضرت امام زیدؒ کا نام سرفہرست ہے۔ اس فہرست میں تین اور بزرگوں کے نام بھی ہیں جن میں سے ایک حضرت خواجہ گیسو درازؒ، دوسرے امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ اور تیسرے ان کے اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ ہیں۔ حضرت رائے پوریؒ کی نظر التفات نے ہی انہیں انور سے نفیس اور زیدی سے الحسینی میں تبدیل کیا تھا۔ ان کا اصل نام انور حسین تھا اور حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کے دست اقدس پر بیعت ہونے سے قبل وہ سید انور زیدی کہلاتے تھے مگر ان کے قریبی حلقوں کی روایت کے مطابق حضرت رائے پوریؒ نے ان کی طبعی نزاکت و نفاست کو دیکھ کر انہیں نفیس کے نام سے پکارا اور پھر وہ نفیس الحسینی بن گئے۔

حضرت امام زید بن علیؒ سے انہیں بطور خاص عقیدت تھی، کچھ عرصہ قبل انہوں نے امام زیدؒ پر مصر کے نامور محقق الاستاذ ابوزہرہ کی تصنیف کو پاکستان میں شائع کرنے کا اہتمام کیا اور خانقاہ سید احمد شہیدؒ میں ایک حاضری کے موقع پر یہ گراں قدر کتاب انہوں نے مجھے اپنے دستخطوں کے ساتھ مرحمت فرمائی۔ جبکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں وہ حضرت امام زیدؒ کے مناقب وفضائل پر ایک علمی کتاب کی اشاعت کے لیے کوشاں تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے لاہور میں اپنی قائم کردہ خانقاہ کو بھی ''خانقاہ سید احمد شہید'' کے نام سے موسوم کر دیا۔ وہ تحریک مجاہدین کے حالات وواقعات کے حافظ تھے، ان کی مجلس میں اس تحریک کا کسی بھی حوالہ سے تذکرہ ہوتا تو وہ معلومات کے انبار لگا دیتے۔

میں حضرت شاہ صاحبؒ کو دو تین حوالوں سے انسائیکلو پیڈیا کہا کرتا تھا۔ ایک تحریک آزادی کی جدوجہد، دوسرا تحریک مجاہدین کے حالات و واقعات اور تیسرا تصوف اور صوفیاء کرامؒ کے حالات اور ان کا ذوق و محنت۔ ان میں سے کسی حوالے سے معلومات درکار ہوتیں تو اس بات کا ان کی مجلس میں تذکرہ کر دیا جاتا، پھر کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ایک دفعہ مجھے سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک کے ہمارے صوفیائے کرام کے ساتھ تعلق کے بارے میں معلومات درکار تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ ان دنوں لندن گئے ہوئے تھے، میں بھی وہیں تھا۔ میں نے ایک مجلس میں ان کے سامنے قصداً یہ ذکر چھیڑ دیا اور انہوں نے بابا گورونانک کی زندگی اور ہمارے صوفیاء کرام بالخصوص حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ساتھ ان کے تعلق کی پوری تاریخ بیان کر دی اور کسی لائبریری کا رخ کیے بغیر میرا مقصد پورا ہو گیا۔

کتاب کے ساتھ انہیں عشق تھا اور نادر و نایاب کتب کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان سے معلومات مل جایا کرتی تھیں بلکہ بہت سی نایاب کتابوں کی ان کے ہاں زیارت بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ ایک بار جب وہ لندن میں واقع انڈیا آفس لائبریری میں تشریف لے گئے تو میں اور ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس لائبریری میں برصغیر کے کتاب اور ریکارڈ سے تعلق رکھنے والے وہ نوادرات محفوظ ہیں جنہیں برصغیر پر استعماری تسلط کے بعد برطانوی حکمران وہاں (لندن) لے گئے تھے۔ ان میں وہ ''مصحف عثمانی'' بھی ہے جو حضرت عثمان بن عفانؓ کا تحریر کردہ قرآن کریم ہے اور بہت سے مغل بادشاہوں کے پاس رہا ہے، مجھے بھی اس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میں اس سے قبل بھی انڈیا آفس لائبریری جا چکا تھا لیکن جو لطف حضرت شاہ صاحبؒ کی معیت میں اس لائبریری کو دیکھنے میں ملا اس کی تازگی کئی برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک دل و دماغ میں موجود ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان میں کم و بیش پچیس برس تک مجھے ایک متحرک کردار کی حیثیت حاصل رہی ہے، اس دوران بہت سی تحریکات میں کام کرنے کا موقع ملا، ان تحریکات میں بزرگوں سے رابطہ اور ان سے راہ نمائی اور تعاون حاصل کرنا بھی میرے فرائض کا حصہ رہا ہے۔ وہ تحریک قومی مسائل کے حوالے سے ہو، کسی دینی معاملہ میں ہو یا مسلکی تحفظات کا کوئی مسئلہ درپیش ہو، حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی کسی تحریک کی سرپرستی سے گریز نہیں کیا اور وہ ان بزرگوں میں سے تھے جن کے پاس ہم پورے اعتماد کے ساتھ حاضر ہوتے تھے کہ تائید و حمایت بھی ملے گی، حوصلہ افزائی اور شفقت سے بھی بہرہ ور ہوں گے اور تعاون و سرپرستی سے بھی محروم نہیں رہیں گے۔

تحریک ختم نبوت کا تو وہ باقاعدہ حصہ تھے اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی نائب امیر تھے۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے بعد حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم اور حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ ہی دو ایسے بزرگ تھے جن کی سرپرستی اور دعاؤں کے سہارے یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ دونوں بزرگ خطاب نہیں فرماتے تھے اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے جلسوں میں گھنٹوں خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ بعض دوستوں کو احراری خطیبوں کی جماعت کی اس ''خاموش قیادت'' پر تعجب بھی ہوتا تھا لیکن اس ''خاموشی'' کے پیچھے توجہات اور دعاؤں کا جو طویل سلسلہ ہوتا تھا وہی اہل نظر کے نزدیک اس تحریک کی اصل قوت تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ رخصت ہو گئے ہیں اور حضرت خواجہ صاحب دامت برکاتہم بھی چراغ سحری ہیں۔

حضرت سید نفیس شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا ایک خصوصی ذوق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت بھی تھا۔ ان کا نعتیہ کلام نہ صرف عوامی جلسوں میں مختلف باذوق نعت خوانوں کی زبان پر عام مسلمانوں میں محبت رسولؐ کے ذوق کی مسلسل آبیاری کا ذریعہ بن رہا ہے بلکہ اصحاب فن اور اصحاب ذوق کے لیے بھی تسکین قلم و نظر کا سرمایہ ہے۔ مجھے گزشتہ روز برادرم مولانا عبد الحق خان بشیر سلمہ امیر پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے ہمراہ خانقاہ سید احمد شہید میں احباب سے تعزیت اور حضرت شاہ صاحبؒ کی قبر پر حاضری کا موقع ملا تو وہاں ایک دوست نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کردہ ایک نعت کی فوٹو کاپی دی جو انہوں نے طالب علمی کے دور میں جبکہ وہ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں فرسٹ ائیر کے طالب علم تھے، سید انور زیدی کے نام سے تحریر کی اور کالج کے جریدہ ''روشنی'' نے اگست ۱۹۴۷ء کے شمارے میں شائع کی۔ یہ نعت ۱۹۴۹ء کے دوران لکھی گئی جبکہ اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر غالباً سولہ سترہ برس تھی۔ یہ نعت ملاحظہ فرمائیے اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کو جنت الفردوس

میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور جملہ لواحقین و متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سلام اے شمعِ روشن، چشم عبد اللہ کی بینائی
زمانہ تجھ پہ قربان ہے، فرشتے تیرے شیدائی
ترانہ جھوم کے حوروں نے تیری حمد کا گایا
تری سیرت ہے لاثانی، ہے تیری شان یکتائی
تری آمد سے رونق آگئی گلزار ہستی میں
عنا دل چہچہا اٹھے، بہار آئی، بہار آئی
تھما ابرِ تشدد اور میرِ ضوفشاں نکلا
درخشاں ہو گیا عالم، اذانوں کی صدا آئی
ہوئے نخوت کے جھنڈے سرنگوں، غیرت بھی شرمائی
ہوئے باطل ترے دم سے خیالاتِ من ولائی
ہوئے بیدار غافل اور پھاڑا کفر کا دامن
بتوں کو توڑ ڈالا، شادمانی ہر طرف چھائی
ترے در سے کوئی سائل تہی دامن نہیں لوٹا
ترے رحمت کے آنچل کی ہے لامحدود پہنائی
سلام اس پر جو انور کی امیدوں کا سہارا ہے
سلام اس پر دل مسلم کے غم کا جو مداوا ہے

(سید انور زیدی)

(ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ مارچ ۲۰۰۸ء)

حضرت مولانا محمد نعیمؒ

(سن وفات: ۲۰۰۸ء)

جدہ سے ۲۳ اگست کو نیویارک پہنچا اور واشنگٹن ڈی سی کے نواح میں ایک دینی ادارہ دارالہدیٰ سپرنگ فیلڈ ورجینیا کے سربراہ مولانا عبد الحمید اصغر کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے یہ خبر سنائی کہ

ہمارے دور کے ایک بڑے محدث حضرت مولانا محمد نعیم صاحب کا شکاگو میں انتقال ہوگیا ہے اور آج ظہر کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی جارہی ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ کا تعلق دیوبند سے تھا، حکیم الامت حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے آخری دور میں جب دارالعلوم دیوبند کے انتظامی معاملات میں اختلافات رونما ہوئے اور حضرت قاری صاحبؒ کے فرزندان گرامی اور حلقۂ اثر کے احباب نے دارالعلوم دیوبند (وقف) کے نام سے الگ تعلیمی ادارہ قائم کیا تو حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ اس کے پہلے شیخ الحدیث تھے۔ انہوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ حدیث نبویؐ کی تدریس و تعلیم میں بسر کیا اور ان کا شمار برصغیر کی سطح پر حدیث نبویؐ کے نامور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند (وقف) بھی اب بھارت کے بڑے دینی مدارس میں سے ہے اور اس کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ ہیں جن سے اسی سفر کے دوران جدہ میں میری ملاقات ہوئی اور ایک کالم میں اس ملاقات کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

حضرت مولانا محمد نعیمؒ کے فرزند حضرت مولانا عبداللہ سلیمؒ ایک عرصہ سے شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہیں اور دینی تعلیم کے فروغ کے لیے مسلسل مصروف عمل ہیں۔ حضرت مولانا محمد نعیمؒ آخری عمر میں علالت و ضعف کے باعث اپنے فرزند گرامی کے پاس شکاگو میں منتقل ہوگئے تھے اور وہیں مقیم تھے کہ اجل کا بلاوا آگیا اور وہ کم و بیش چورانوے برس کی عمر میں اس بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اپنے مالک کے حضور پیش ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام)

ڈاکٹر محمد دین مرحوم

بدھ (۱۹ اپریل ۲۰۰۸ء) کے روز میرے خسر بزرگوار ڈاکٹر محمد دین بھی طویل علالت کے بعد کم و بیش ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا تعلق کھاریاں سے کوٹلہ جانے والے روڈ پر واقع قصبہ گلیانہ سے تھا اور انتہائی نیک دل اور ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ طب و علاج کے شعبہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں ڈاکٹر کہا جاتا تھا ورنہ وہ ڈسپنسر تھے، اسی حیثیت سے انہوں نے ریٹائرمنٹ کی عمر تک سرکاری ملازمت کی اور مختلف ہسپتالوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

ان کا بیعت کا تعلق حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تھا۔ حضرت لاہوریؒ کی زندگی تک وہ ان کی

مجالس کے حاضر باش شریک رہے اور یہی تعلق ہماری باہمی رشتہ داری کا باعث بن گیا۔ وہ گلیانہ کی ارائیں فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور ہمارا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ اس تعارف اور رشتہ داری کا ذریعہ مدرسہ حیات النبی گجرات کے بانی فاضل دیوبند حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ بنے۔ ڈاکٹر محمد دین صاحب بنیادی طور پر انہی کے حلقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کی تحریک پر یہ رشتہ قائم ہوا۔ میری شادی کا قصہ بھی عجیب سا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے لیے انتخابی مہم جاری تھی، حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحبؒ اور حضرت علامہ محمد احمد لدھیانویؒ مختلف حلقوں سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے اور میں ان کی الیکشن مہم میں مصروف تھا۔ اس دوران گھر سے پیغام ملا کہ فلاں وقت تھوڑی دیر کے لیے گھر آنا، ضروری کام ہے۔ میں اس وقت گھر پہنچا تو حضرت والد صاحب مدظلہ کے کمرے میں ملاقاتیوں کی کرسی پر ایک باوقار سی خاتون بیٹھی تھیں۔ میری والدہ محترمہ نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اشارہ کیا کہ اس خاتون کو سلام کرنا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا، انہوں نے اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرانے لگیں۔ مجھے اس خلاف معمول بات پر تعجب سا ہوا تو میری چھوٹی والدہ محترمہ نے باہر بلا کر بتایا کہ یہ تمہاری ساس محترمہ ہیں اور ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ فلاں دن اپنی ڈائری میں خالی رکھنا اس دن نکاح کے لیے جانا ہے۔

یہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کا دن تھا اور شعبان المعظم کی بھی اس روز ۲۵ تاریخ تھی۔ اس دن ہم ایک مختصر سی بارات کے ساتھ گلیانہ گئے۔ حضرت والد محترم مدظلہ تو تھے ہی، حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ بھی شریک مجلس تھے اور میں نے اس دن پہلی بار اپنا سسرالی گاؤں دیکھا اور اپنے خسر بزرگوار ڈاکٹر محمد دین کی زیارت کی۔ میں بحمد اللہ تعالیٰ سادہ سے لباس میں تھا اور لوگوں کو بارات میں دولہا کو الگ طور پر پہچاننے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ پنجابی دیہات کی روایت کے مطابق عورتیں اور بچے بارات کے استقبال کے لیے گلیوں میں جمع تھے مگر انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ باراتیوں میں دولہا کون ہے؟ اس علاقہ میں دولہا کو ”مہاراج“ کہا جاتا ہے۔ میرے بڑے ماموں منشی بشیر احمد صاحب مرحوم بارات کے ساتھ تھے، انہوں نے ان عورتوں سے کہا کہ اگر تم ”مہاراج“ کو پہچان لو تو میں پانچ روپے انعام دوں گا۔ اس زمانے میں پانچ روپے بڑا انعام ہوتا تھا، مگر کوئی عورت بارات میں دولہا کو تلاش نہ کر سکی جبکہ میں ان سب کے سامنے موجود تھا۔

ڈاکٹر محمد دین مرحوم کا بیعت کا تعلق حضرت لاہوریؒ سے تھا اور یہ صرف تعلق نہیں تھا بلکہ وہ حضرت لاہوریؒ کے طریقہ پر زندگی بھر ذکر و اذکار کرتے رہے۔ جب تک معذور نہیں ہوئے، شاید ہی زندگی میں

کوئی دن ایسا آیا ہو کہ ان کی رات کا آخری حصہ اللہ اللہ کی ضربوں سے نہ گونج رہا ہو۔ بڑے اہتمام اور توجہ کے ساتھ ذکر کرتے تھے، شب زندہ دار بزرگ تھے۔ حضرت لاہوریؒ کی وفات کے بعد انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے ساتھ بیعت کا تعلق قائم کر لیا مگر غالباً حضرت شیخ الحدیث کی ہدایت پر ذکر واذکار کا معمول وہی حضرت لاہوریؒ والا رہا۔ عبادات میں فرائض ونوافل کے معمولات کی پابندی کے ساتھ ساتھ معاملات میں بھی اکل کھرے انسان تھے اور ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے تھے۔ وہ ڈسپنسر کے طور پر سرکاری ملازمت کے دوران ڈیوٹی کے لیے خود چن کر ایسے دور دراز ہسپتالوں کا انتخاب کرتے جہاں پیشہ ورانہ خیانت اور بدعنوانی کا امکان کم سے کم ہوتا اور ہر معاملہ میں پھونک کر قدم اٹھاتے۔

ہمارا خسر داماد کے طور پر اڑتیس سال ساتھ رہا ہے۔ اس دوران مجھے یاد نہیں کہ ان سے مجھے کوئی ایسی شکایت ہوئی ہو جسے واقعتاً شکایت کہا جا سکتا ہو اور میں نے بھی ان کے مکمل احترام کے ساتھ ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میرے ساتھ جب بھی ملاقات ہوتی، دینی تحریکات کے حوالے سے بات کرتے، مسئلہ مسائل کا ذکر ہوتا، کسی نہ کسی دینی معاملہ کا تذکرہ کرتے یا کسی بزرگ کا ذکر چھیڑ دیتے۔ ابھی چند روز قبل ہم دونوں میاں بیوی ان کی بیمار پرسی کے لیے گلیانہ گئے تو سخت تکلیف کے عالم میں تھے۔ تکلیف کی شدت سے منہ سے ہائے ہائے بھی نکل رہا تھا مگر ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

انہوں نے اپنی زمین کے ایک حصے میں چار کنال کے لگ بھگ رقبہ پر دینی مرکز کی بنیاد رکھی تھی جس میں ایک کنال کی مسجد اپنی نگرانی میں انہوں نے تعمیر کرا دی ہے جو مکی مسجد کے نام سے اس علاقہ کا تبلیغی مرکز ہے جبکہ باقی جگہ میں دینی مدرسہ کی تعمیر کا پروگرام ہے۔

رسم ورواج اور بدعات سے طبعی تنفر تھا۔ خاندان کے کسی ایسے فنکشن میں ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس کے بارے میں انہیں علم ہو جاتا کہ کوئی خلاف شرع بات وہاں ہوگی۔

بعض بزرگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آج کے زمانے کے لوگوں میں سے نہیں تھے اور ڈاکٹر محمد دین رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی تکلف کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع اس دور کے نہیں بلکہ پچھلے کسی زمانے کے بچھڑے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ مئی ۲۰۰۸ء)

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ

(۱)

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے بانی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی نور اللہ مرقدہ ۶ اپریل ۲۰۰۸ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے چھوٹے بھائی اور راقم الحروف کے چچا محترم تھے۔ انہوں نے ہجری اعتبار سے ۹۴ برس کے لگ بھگ عمر پائی اور تمام عمر علم کے حصول اور پھر اس کے فروغ میں بسر کر دی۔ وہ اس دور میں ماضی کے ان اہل علم و فضل کے جہد و عمل، زہد و قناعت اور علم و فضل کا نمونہ تھے جن کا تذکرہ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے اور جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب فراش تو کافی برسوں سے تھے مگر گذشتہ دو ماہ سے طبیعت زیادہ خراب تھی، گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، خوراک بھی نالی کے ذریعے معدے میں جا رہی تھی، کمزوری حد سے بڑھ گئی تھی مگر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ دعائیں بھی ہو رہی تھیں اور ڈاکٹر صاحبان بھی اپنی کوشش کر رہے تھے۔ چند روز قبل والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اپنی علالت اور ضعف کے باوجود صوفی صاحب کو دیکھنے کے لیے آ گئے اور ان کی حالت دیکھ کر خاصے پریشان ہو گئے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت اور جوڑ تھا۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے رفیق تھے۔ اکٹھے تعلیم حاصل کی، اکٹھے نصف صدی تک پڑھایا اور ایک ہی سال ضعف کی وجہ سے پڑھانا چھوڑا۔ میں عام طور پر جمعہ کے دن شام کو گکھڑ جایا کرتا ہوں، نماز مغرب کے بعد حضرت والد صاحب کی مسجد میں درس ہوتا ہے اور اس بہانے ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں جب بھی والد صاحب سے ملا، ان کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ ”صوفی کا کیا حال ہے؟“۔ مجھے یاد نہیں کہ ہماری کوئی ملاقات اس سوال کے بغیر شروع ہوئی ہو۔ اسی کیفیت میں وہ گذشتہ روز ہمیں داغ مفارقت دے کر خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اتوار کے روز جب حسب معمول مدرسہ نصرۃ العلوم میں اسباق سے فارغ ہو کر دس بجے کے لگ بھگ گھر جا رہا تھا، ابھی نصف راستہ طے کیا ہو گا کہ اردو بازار سے گزرتے ہوئے برادرم مولانا محمد ریاض خان سواتی کا فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا ”ابا جی کا انتقال ہو گیا ہے“۔ زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور میں وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ حضرت صوفی صاحب کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد عرباض خان

سواتی ان کی آنکھیں بند کر رہے تھے اور ٹانگیں سیدھی کر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ تھوڑی دیر قبل ان کے معالج ڈاکٹر صاحب آئے تھے اور انہوں نے چیک کر کے کہا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ گھر کے افراد کا اصرار تھا کہ ایک بار اور چیک کرا لیا جائے کیونکہ پہلے بھی ایک بار ایسی کیفیت ہو گئی تھی مگر وہ بے ہوشی تھی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا، انہوں نے بھی چیک کر کے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دیا جس سے امید کی ایک موہوم سی کرن بھی ختم ہو گئی اور ہم تجہیز و تکفین اور دوسرے معاملات کے لیے مشاورت میں مصروف ہو گئے۔

تدفین کے بارے میں طے پایا کہ ان کی اپنی خواہش عام قبرستان میں دفنائے جانے کی تھی، اس لیے شہر کے بڑے قبرستان میں قبر کی تیاری شروع کر دی گئی۔ جنازے کے بارے میں مشورہ ہوا کہ دن کے وقت مشکل ہے، اگلے روز تک رکھنا مناسب نہیں ہے اور رات کے وقت جنازے کے لیے سب سے مناسب اور محفوظ جگہ خود مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور ہے، اس لیے طے پایا کہ جنازہ رات کو نو بجے مدرسہ نصرۃ العلوم میں ادا کیا جائے گا اور اس کے بعد عام قبرستان میں تدفین ہو گی۔ یہ طے پانے کے بعد احباب کو اطلاعات دینے اور شہر میں اعلانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر طرف سے احباب جمع ہونے لگے، حضرت والد محترم کو اطلاع دی گئی تو وہ بھی شام کو تشریف لے آئے۔ انہیں کرسی پر بٹھا کر حضرت صوفی صاحبؒ کی چارپائی کے پاس لایا تو ان کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر رونے لگ گئے۔ میں چونکہ گذشتہ ساٹھ برس سے ان کے تعلق اور باہمی محبتوں کا گواہ ہوں، میں نے قریب ہو کر حضرت والد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ "آج آپ دونوں کی جوڑی ٹوٹ گئی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں اور مزید کوئی بات کہنا میرے بس میں نہ رہا۔

نماز عصر کے بعد سے جامعہ نصرۃ العلوم میں اجتماع اور خطابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف علماء کرام تشریف لا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے اور حضرت صوفی صاحبؒ کی دینی و علمی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ خطاب کرنے والوں میں حضرت مولانا قاری سعید الرحمن، حضرت مولانا محمد فیروز خان، حضرت صاحبزادہ پیر عبد الرحیم نقشبندی، حضرت مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری محمد نذیر فاروقی، مولانا ظہور احمد علوی، مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا میاں عبد الرحمن اور دیگر سرکردہ علماء کرام شامل تھے۔ رات نو بجے تک خطابات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ طے پایا کہ حضرت صوفی صاحبؒ کے بڑے فرزند اور جانشین مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی نو بجے نماز عشاء پڑھائیں گے اور فرض پڑھاتے ہی سنتوں سے قبل نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں

گے۔ چنانچہ نماز عشاء سے قبل میں نے اس کا اعلان کیا اور وہاں پر موجود سرکردہ علماء کرام سے گزارش کی کہ وہ حضرت صوفی صاحبؒ کے جانشین کے طور پر مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کی دستار بندی کر دیں۔ چنانچہ دستار بندی ہوئی اور اس کے بعد مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کی امامت میں نماز عشاء اور نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد حضرت صوفی صاحبؒ کے جسد خاکی کو بڑے قبرستان لے جایا گیا۔ ہزاروں افراد اپنے اس محبوب استاذ اور مربی کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ تھے جبکہ نماز جنازہ میں مذکورہ بالا علماء کرام، ہزاروں دیگر علماء کرام اور دینی کارکنوں کے علاوہ حضرت صاحبزادہ حافظ فضل الرحیم اشرفی، مولانا پیر سیف اللہ خالد، مولانا حافظ حسین احمد سابق ایم این اے، مولانا سیف الدین سیف، مولانا مفتی عبدالشکور کشمیری، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، مولانا حافظ منیر محمد میانوالی اور بہت سے دیگر سرکردہ علماء کرام بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ رات کو کم وبیش گیارہ بجے کے لگ بھگ علم وحکمت کے اس عظیم خزانے کو مادر زمین کی آغوش میں اتار دیا گیا۔

حضرت صوفی صاحبؒ میرے چچا تھے، استاذ تھے، مربی تھے، سرپرست تھے اور میرے سمدھی بھی تھے کہ ان کے بڑے فرزند اور جانشین مولانا محمد فیاض خان سواتی میرے داماد ہیں۔ ان رشتوں کے امتزاج نے جو کیفیت پیدا کر رکھی تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے، وہ صاحب فراش تو تھے لیکن تھوڑی بہت گفتگو کر لیتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو چچی محترمہ نے ان سے پوچھا کہ کون آیا ہے؟ غور سے دیکھ کر کہنے لگے کہ زاہد ہے۔ پوچھا کہ زاہد کون ہے؟ فرمانے لگے "میرا پتر ہے"۔ بس میرے لیے اتنی بات ہی کافی تھی اور اس کی سرشاری ابھی تک ذہن میں قائم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا وہ حصہ جو ذہن کی نشوونما اور شخصیت کی تشکیل کا ہوتا ہے، انہی کی سرپرستی اور تربیت میں گزارا ہے۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں بارہ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں چودہ سال کی عمر میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آ گیا تھا۔ پھر ۱۹۷۰ء یعنی دورۂ حدیث سے فراغت تک انہی کے پاس رہا اور ان کی تربیت اور فیضان سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ اس لیے کسی تکلف کے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں حضرت والد صاحب مدظلہ کے بعد سب سے بڑا اور کلیدی حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کا ہے۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی جس بات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی اور اس کے بعد اپنے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ حق

بات کہنے میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے، انہوں نے اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور مقدمات اور پابندیوں کے مراحل سے بھی کئی بار گزرے۔ جامع مسجد نور میں ان کا خطبہ جمعہ "اظہار حق" کا اعلیٰ نمونہ ہوتا تھا اور دور دراز سے لوگ ان کا نعرۂ حق سننے کے لیے مسجد نور میں آیا کرتے تھے۔ وہ بات دلیل کے ساتھ کرتے تھے لیکن دوٹوک کرتے تھے اور لہجے کی کاٹ بھی متاثر کن ہوتی تھی۔

ان کی یادوں کا تذکرہ کسی اور موقع کے لیے چھوڑتے ہوئے سردست قارئین کو ان کے سفر آخرت کی روداد سے آگاہ کر رہا ہوں۔ وہ اگرچہ تہہ خاک جا چکے ہیں لیکن ان کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں اور ان کا چلنا پھرنا ابھی تک نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے اس لیے ان کے لیے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرتے ہوئے اس موقع پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ

ع رفتید ولے نہ از دلِ ما

ایک صدی پہلے کا قصہ ہے، ہزارہ میں شاہراہ ابریشم پر واقع شنکیاری سے چند میل آگے کڑمنگ بالا کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا ڈیرہ تھا جسے "چیڑاں ڈھکی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ڈیرہ نور احمد خان مرحوم کا تھا جو سواتی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ بے اولاد تھے اور میاں بیوی کو فطری طور پر اس بات کی تمنا تھی کہ ان کے صحن میں پھول کھلیں مگر جب خاصے انتظار کے بعد امید بر نہ آئی تو بیوی کی خواہش اور کوشش پر دوسری شادی ہوئی جس سے نور احمد خان مرحوم کو اللہ نے دو بیٹیاں اور دو بیٹے دیے۔ بیٹوں میں سے ایک کا نام محمد سرفراز خان ہے جو ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اور دوسرے کا نام عبد الحمید خان جن کی ولادت ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ ابھی بچپن کے حصار میں ہی تھے کہ والدہ مرحومہ کا انتقال ہو گیا اور والد محترم نے ان دونوں بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے ان کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید فتح علی شاہ صاحبؒ کے سپرد کر دیا جو اسی علاقہ میں بٹل کے قریب ایک بستی "لمی" میں مقیم تھے، جبکہ طالب علمی کے ابتدائی مراحل کے دوران ہی والد محترم بھی رحلت کر گئے۔

ان دونوں بھائیوں نے ابتدائی تعلیم سید فتح علی شاہ صاحبؒ سے حاصل کی، پھر ملک پور اور کھکھو نامی مقامات میں کچھ دیر پڑھتے رہے اور بعد میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد یہ دونوں بھائی اس دور کے روایتی طلبہ کی طرح مختلف علاقوں کے دینی مدارس میں گھومتے رہے اور جن جگہوں میں انہوں نے تعلیم پائی، ان میں لاہور کا محلہ میراں شاہ، وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ، سرگودھا اور جہانیاں منڈی شامل ہیں۔ دورۂ حدیث سے پہلے آخری چند سال انہوں نے مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانولہ میں پڑھا اور پھر ۱۹۴۱ء میں دار العلوم دیوبند چلے گئے جہاں انہوں

نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بڑے بھائی نے گوجرانوالہ کے قریب گکھڑ میں ڈیرہ لگا لیا اور تعلیم و تدریس اور خطابت و امامت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور وہ آج کی دنیا میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے نام سے متعارف ہیں، جبکہ چھوٹے بھائی مزید تعلیم کے لیے لکھنو چلے گئے۔ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سے فن مناظرہ سیکھا اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں استفادہ کیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد دکن گئے اور طبیہ کالج میں چار سال کا کورس مکمل کر کے حکیم حاذق کی سند حاصل کی۔ یہ مولانا عبدالحمیدؒ سواتی ہیں جو اپنے نام کے ساتھ عبدالحمید خان اختر کا تخلص اور سواتی کی نسبت لکھتے تھے۔ وہ ایک مستند طبیب کے طور پر گوجرانولہ آئے اور چوک نیائیں کے قریب ایک دکان میں مطب کا آغاز کیا مگر انہیں مطب راس نہ آیا کہ قدرت انہیں کسی اور کام کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ چنانچہ ان کے بزرگوں اور دوستوں نے انہیں اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ گھنٹہ گھر چوک کے قریب محلہ طوطیانوالہ میں واقع ایک بڑے جوہڑ کے کنارے ڈیرہ لگائیں اور ایک دینی مدرسہ اور مسجد کی بنیاد رکھ کر اس جوہڑ کو بھرنا شروع کر دیں، چنانچہ وہ ۱۹۵۲ء میں دکانداری چھوڑ کر اس چھپڑ کے کنارے آبیٹھے اور ایک چھوٹی سی کچی مسجد اور اس کے ساتھ مدرسہ کے دو تین کمرے بنا کر دینی مرکز کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ یہ مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کا نقطۂ آغاز تھا جن کا شمار آج شہر نہیں بلکہ ملک کے بڑے دینی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، چین، وسطی ایشیا، برطانیہ، امریکہ، سعودی عرب اور دیگر ممالک میں مختلف حوالوں سے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

صوفی صاحبؒ کے بڑے بھائی مولانا محمد سرفراز خان صفدر بھی جو اس سے قبل گکھڑ کی جامع مسجد میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے تھے، اس کار خیر میں ان کے ساتھ شریک کار ہو گئے اور پھر ان دونوں بھائیوں نے نصف صدی تک اس گلشن علم کی ایسی آبیاری کی کہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو آج کی علمی دنیا میں بعض حوالوں سے سند اور مرجع کا مقام حاصل ہے اور دنیا بھر کے اہل علم راہ نمائی کے لیے اس مرکز سے رجوع کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحمیدؒ سواتی کی تدریس اہل علم اور علماء وطلبہ کے لیے تو تھی مگر گوجرانوالہ عوام بھی محروم نہیں رہے۔ ان کا نصف صدی تک معمول رہا کہ نماز فجر کے بعد ہفتہ میں چار دن قرآن کریم اور دو دن حدیث نبویؐ کا پابندی سے درس دیا کرتے تھے۔ ان کے قرآن کریم کے دروس کتابی شکل

میں مرتب ہو کر بیس ضخیم جلدوں میں "معالم العرفان" کے نام سے طبع ہو چکے ہیں اور انہیں اردو زبان میں قرآن کریم کی سب سے بڑی تفسیر کہا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ کرتے تھے اور تشریح میں شان نزول اور متعلقہ واقعات کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کے مسائل کی وضاحت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و حکمت کا خاص طور پر تذکرہ کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و حکمت اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے افکار کی جس طرح ترجمانی کی ہے، اس کی وجہ سے انہیں فلسفہ امام ولی اللہ دہلویؒ کا شارح اور ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی ایک بے باک عوامی خطیب بھی تھے، ان کا خطبۂ جمعہ علمی معلومات اور دینی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرہ کا حامل ہوتا تھا اور وہ لگی لپٹی رکھے بغیر مسائل حاضرہ پر دینی حوالے سے دوٹوک بات کیا کرتے تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں اسی حق گوئی کے باعث گرفتار ہوئے اور سات ماہ تک جیل میں رہے۔ اس کے بعد متعدّد بار پابندیوں، زبان بندی، ضلع بدری اور مقدمات کے مراحل سے گزرے حتیٰ کہ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں انہیں اشتہاری ملزم بھی قرار دے دیا گیا۔ وہ اپنے اساتذہ اور اکابر کے ساتھ عقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور کھلم کھلا اظہار کرتے تھے، مگر حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت سب سے زیادہ تھی اور ان کے انداز گفتگو سے ان بزرگوں کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت چھلکتی تھی۔

انہوں نے نصف صدی تک مدرسہ نصرۃ العلوم میں اہتمام و تدریس اور جامع مسجد نور میں خطاب کے فرائض سر انجام دیے۔ ان سے ہزاروں علماء کرام اور لاکھوں عام مسلمانوں نے استفادہ کیا۔ انہوں نے ساری زندگی مدرسہ نصرۃ العلوم کی چار دیواروں میں گزار دی، کسی شدید مجبوری کے بغیر مدرسہ سے باہر نہیں نکلتے تھے اور اس کا موقع بھی بمشکل سال میں ایک آدھ بار ہی آتا تھا۔ انہیں گوشہ نشین بزرگ سمجھا جاتا تھا مگر ان کے علوم و فیوض کی وسعت دنیا کے ہر براعظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کے حوالہ سے یادداشتوں کو ترتیب دینے کے لیے کئی بار قلم اٹھایا مگر اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا ہوں، اس لیے کہ جہاں اتنا قریبی تعلق ہو اور اتنا طویل عرصہ ہو، وہاں یادداشتوں کی ترتیب قائم کرنا، ان میں سے انتخاب کرنا اور پھر پوری طرح بیان کر دینا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ بہر حال حضرت صوفی صاحب نور اللہ مرقدہ کے بارے میں ماہنامہ "نصرۃ العلوم" کی خصوصی اشاعت کی مناسبت سے چند باتیں تحریر میں لا رہا ہوں جبکہ یہ سلسلہ تو ان شاء اللہ تعالیٰ

زندگی بھر چلتا رہے گا اور کسی نہ کسی حوالہ سے یہ یادداشتیں قلمبند ہوتی رہیں گی۔

میں نے اپنی طالب علمی کا زیادہ تر عرصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی سرپرستی اور شفقت میں گزارا ہے۔ جب قرآن کریم یاد کرتا تھا، تب بھی چند ماہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں رہا اور اٹھارہواں پارہ میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت قاری محمد یاسینؒ سے یاد کی۔ وہ صاحب فن اور صاحب ذوق استاذ تھے، میں نے تلفظ کی تصحیح اور تلاوت و قراءت کے آداب کی رعایت میں ان سے زیادہ باذوق اور کوئی استاذ نہیں دیکھا۔ ہزارہ کے دو بھائی مولانا محمد شفیق صاحب اور مولانا محمد رفیق صاحب اور ان کے بھتیجے مولانا محمد یوسف گلفام، جو آج کل کراچی میں ہوتے ہیں، ان دنوں مدرسہ میں زیر تعلیم تھے اور مولانا محمد شفیق صاحب جامع مسجد نور میں نمازیں پڑھانے پر مامور تھے۔ والد محترم مدظلہ نے میری نگرانی ان کے سپرد کر رکھی تھی جبکہ صبح کا ناشتہ میں حضرت صوفی صاحبؒ کے دستر خوان پر کیا کرتا تھا۔ اس وقت حضرت صوفی صاحبؒ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مدرسہ کے ایک کمرہ میں رہتے تھے اور ان کی خدمت میں صوفی محمد کریم صاحب، صوفی محمد عالم صاحب، مستری رشید احمد مرحوم اور مستری منیر احمد صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات کو حضرت صوفی صاحبؒ کے خصوصی خدام کی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں سے کوئی صاحب حضرت صوفی صاحبؒ کی صبح کی چائے بنایا کرتے تھے جو ان کے ذوق کے مطابق خاص چائے ہوتی تھی اور بیکری سے کیک رس منگوا کر چائے کے ساتھ استعمال ہوتے تھے۔ میرے لیے الگ کپ میں دودھ ڈال کر اس میں کیک رس بھگو دیے جاتے تھے اور میں چمچ کے ساتھ کھاتا۔ نصف صدی کے لگ بھگ وقت گزر گیا ہے مگر اس کا منظر اور ذائقہ اب تک یاد ہے۔

اس زمانے میں لوگ حج کے لیے بحری جہاز کے ذریعہ جاتے تھے اور کئی ماہ لگ جایا کرتے تھے۔ کراچی سے جانا ہوتا تھا، حاجی حضرات کو بڑے اہتمام کے ساتھ رخصت کیا جاتا تھا، خاندان کے لوگ حاجی صاحبان کو رخصت کرنے اور پھر واپسی پر وصول کرنے کے لیے کراچی جایا کرتے تھے اور باقاعدہ جشن کی کیفیت ہوتی تھی۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے جب حج کیا تو وہ بھی میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہی تھا۔ مجھے ان کے سفر حج کی دو تین باتیں یاد ہیں۔ ایک یہ کہ بڑی خاموشی کے ساتھ ٹرین پر سوار ہو کر کراچی گئے اور واپسی کا ہمیں تب پتہ چلا کہ اچانک کسی نے کہا کہ حضرت صوفی صاحبؒ تو آ بھی گئے ہیں۔ ہم دوڑتے دوڑتے دروازے کی طرف گئے تو وہ مسجد کی ٹوٹیوں پر سامان کی گٹھڑی ایک طرف رکھے وضو کر رہے تھے۔ وضو کے بعد انہوں نے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئے، ورنہ یہاں بعض دوستوں میں مشورہ ہو رہا تھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ کی واپسی کے پروگرام کا پتہ

چلے تو ایک دو ساتھی انہیں لانے کے لیے کراچی جائیں گے۔ مگر انہوں نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور خاموشی کے ساتھ واپس پہنچ گئے۔ اس سفر حج میں وہ میرے لیے ایک چھوٹا سا سنہری رومال لائے تھے جو پگڑی نما تھا اور کافی عرصہ میرے زیر استعمال رہا۔

مجھے غلطیوں اور کوتاہیوں بلکہ بعض اوقات حماقتوں پر حضرت صوفی صاحبؒ زیادہ تر سمجھانے کا طریقہ اختیار کرتے تھے، کبھی غصہ بھی ہوتے تھے اور ڈانٹ دیا کرتے تھے، مگر ان سے مار کھانے کی نوبت صرف ایک بار اور صرف ایک تھپڑ کی صورت میں پیش آئی جو ابھی تک یاد ہے۔ میں عصر کے بعد عام طور پر شیرانوالہ باغ کے سامنے پھاٹک کی دوسری جانب واقع محلہ رام بستی میں اپنے نانا مرحوم مولوی محمد اکبرؒ کے ہاں جایا کرتا تھا جو وہاں ایک مسجد میں امام تھے اور مسجد کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ میں وہاں جاکر ان سے اور نانی مرحومہ سے مل آیا کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیخوپورہ موڑ کے سامنے میدان میں ایک سرکس لگ گئی جو کئی روز جاری رہی۔ میں عصر کے بعد نانا مرحوم کے گھر جانے کی بجائے وہاں جانے لگ گیا۔ دو تین دن گھر نہیں گیا تو نانا مرحوم کو جنہیں ہم میاں جی کہا کرتے تھے، تشویش ہوئی اور وہ عصر کے بعد میرا پتہ کرنے کے لیے مدرسہ نصرۃ العلوم جا پہنچے۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے انہیں بتایا کہ وہ تو آپ ہی کی طرف گیا ہے، انہوں نے کہا کہ وہ دو تین روز سے نہیں آیا۔ اس کیفیت میں جب مغرب کے بعد میں مدرسہ واپس پہنچا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے پوچھا کہ کہاں گئے تھے؟ مجھے نانا مرحوم کی آمد کا کوئی علم نہیں تھا، میں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ میاں جی کے ہاں گیا تھا۔ اس پر اچانک ایک زوردار تھپڑ میری گال پر پڑا اور فرمایا کہ بکواس کرتے ہو؟ وہ تو ابھی تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے تھے، مجھے بتانا پڑا کہ میں سرکس دیکھنے لگ گیا تھا، چنانچہ انہوں نے مجھے سمجھایا بھی اور غصے کا اظہار بھی کیا، اس کے بعد پھر مجھے سرکس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت صوفی صاحبؒ سفر میں بہت کم جایا کرتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت مدرسہ کی چار دیواری میں ہی گزرتا تھا مگر ان کے ساتھ دو تین سفر مجھے یاد ہیں، ایک بار لاہور تشریف لے گئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ وہ صوفی کہلاتے تھے اور تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے وحدت الوجود پر مستقل مقالے بھی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے بارے میں مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ صوفی صاحبؒ نے کہا کہ جس کی سمجھ میں نہیں آئے گا وہ یہی کہے گا۔ تصوف کا عملی رنگ بھی صوفی صاحبؒ پر غالب تھا جس کی ایک جھلک میں نے یہ دیکھی کہ لاہور کے ایک سفر میں، جس میں وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، وہ حضرت سید علی ہجویریؒ

المعروف حضرت گنج بخشؒ کی قبر پر مراقب ہوئے اور کافی دیر مراقبہ کی کیفیت میں رہے۔ اس کے بعد وہ حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار پر گئے اور وہاں بھی ان کی قبر پر مراقبہ کیا۔ پھر ایک بار گجرات گئے، میں بھی ساتھ تھا، وہاں انہوں نے حضرت شاہ دولہؒ کی قبر پر مراقبہ کیا۔ مگر سب سے دلچسپ صورت حال دیوبند کے سفر میں پیش آئی۔

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ دونوں بزرگ گئے۔ میں کسی وجہ سے بروقت نہیں پہنچ سکا اور جب اجلاس کے آخری روز دیوبند پہنچا تو قاری محمد طیب صاحبؒ اختتامی خطاب فرما رہے تھے۔ والد صاحب اور صوفی صاحب مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گوجرانوالہ کے قافلے میں قاری محمد یوسف عثمانی، حاجی عبد المتین چوہان مرحوم، مولانا حکیم محمود سلفیؒ اور مولانا مفتی نعیم اللہ صاحب بھی تھے۔ یہ حضرات باہر برآمدے میں قیام پذیر تھے اور اندر کمرے میں دونوں بزرگوں یعنی والد صاحب اور صوفی صاحبؒ کے بستر لگائے گئے تھے۔ جب میں پہنچا تو میرا بستر دونوں بزرگوں کے درمیان لگا دیا گیا۔ میں نے حال احوال پوچھا تو والد صاحب نے کہا کہ کوئی حال نہیں، صوفی رات کو خراٹے لیتا ہے اور سونے نہیں دیتا۔ صوفی صاحبؒ کہنے لگے کہ خراٹے خود لیتے ہیں اور ذمے دوسروں کے لگا دیتے ہیں۔ اب جب رات ہوئی اور ہم بستر پر لیٹے تو میں نے دیکھا کہ دونوں بزرگ زور زور سے خراٹے لے رہے ہیں، میں نے منہ پر ہاتھ رکھا اور بھاگتا ہوا باہر آ گیا اور پھر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

صد سالہ اجلاس سے فارغ ہو کر ایک روز دونوں بزرگوں نے میرے بارے میں مشورہ کیا کہ اسے دیوبند کی سیر کرانی چاہیے، چنانچہ مجھے لے کر دونوں حضرات نے دیوبند کا چکر لگایا۔ میں نے ان کے ہمراہ حضرت حسین احمد مدنیؒ کا مکان اور مسجد دیکھی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے گھر حاضری دی جہاں ان کے فرزند مولانا محمد ازہر شاہ قیصرؒ اور داماد حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ سے ملاقات ہوئی۔ مسجد چھتہ میں انار کا وہ درخت دیکھا جس کے نیچے بیٹھ کر حضرت ملا محمودؒ نے مولانا محمود حسنؒ کو پہلا سبق پڑھایا تھا اور دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا تھا اور دیگر بہت سے مقامات مجھے دکھائے۔ چلتے چلتے والد صاحب نے پوچھا کہ ”مڑھیاں“ بھی دیکھنی ہیں؟ (یعنی قبرستان جانا ہے؟) میں نے کہا کہ جی۔ ہم قبرستان گئے تو بالکل دل کی بات کرتا ہوں کہ واقعتاً حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی کی قبروں پر، جو ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں، عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں، اس عظیم المرتبت استاذ اور جلیل القدر شاگرد کو اکٹھے آرام فرما دیکھ کر تاریخ کے کئی مناظر ایک تیز رفتار فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر گھوم گئے۔ حضرت صوفی

صاحبؒ کا شیخ الاسلام حضرت مدنی کے ساتھ شاگردی کے ساتھ ساتھ بیعت کا تعلق بھی تھا، وہ تو قبر کو دیکھ کر سیدھے وہاں پہنچے اور مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ اب منظر یہ تھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ مراقبہ میں بیٹھے ہیں، حضرت والد صاحبؒ تھوڑے فاصلے پر کھڑے کچھ پڑھ رہے ہیں اور میں درمیان میں کھڑا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی چچا جان کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جاؤں، مگر پیچھے کھڑے والد صاحب سے ڈر بھی رہا ہوں۔ تھوڑی دیر گزری تو حضرت والد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ”اٹھا ایس بدعتی نوں، جھنڈ مار کے بہہ گیا اے“۔ (اس بدعتی کو اٹھاؤ، یہ کیا چادر میں سر دے کر بیٹھ گیا ہے)۔ اب میں انہیں کیا اٹھاتا کہ میرا تو خود جی ان کے ساتھ بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کم و بیش دس بارہ منٹ تسلی سے مراقبہ میں بیٹھے رہے۔ پھر اٹھے اور کہا کہ ”چلیں، آپ کو ہر کام بدعت نظر آتا ہے“۔ اور پھر ہم تینوں کوئی اور بات کیے بغیر اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دیوبندیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے الگ الگ ذوقوں کے اجتماع اور امتزاج کا نام ہے۔ دونوں الگ الگ بلکہ بظاہر متضاد ذوق نظر آتے ہیں مگر حضرت قاری صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ ان دونوں ذوقوں کو جمع کیا جائے تو دیوبندیت تشکیل پا جاتی ہے۔ میں اس پر کہا کرتا تھا کہ ہمارے گھر میں دونوں ذوق موجود ہیں۔ والد محترم شیخ الاسلام حضرت ابن تیمیہؒ کے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں اور حضرت صوفی صاحبؒ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے ذوق کے نمائندہ ہیں، اس لیے ہمارا گھرانہ دیوبندیت کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے کئی بار اپنے دل و دماغ کو ٹٹولا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ میرا دل و دماغ ابن تیمیہؒ اور ابن عربیؒ میں سے کس کو ترجیح دیتا ہے؟ مگر آج تک فیصلہ نہیں کر پایا، مجھے دونوں سے یکساں دلی محبت ہے اور دونوں کے الگ الگ ذوق کو دین کا اہم اور ضروری حصہ سمجھتا ہوں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کے حالات اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات کی بہت تفصیلات ہیں جن میں سے کچھ ذہن میں تازہ ہیں جبکہ کچھ کو ذہن کی سکرین پر لانے کے لیے وقت لگے گا اور کسی نہ کسی بہانے وقتاً فوقتاً یہ سامنے آتی رہیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ، سردست ان چند باتوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت صوفی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ مفسر قرآن نمبر)

(۲)

۱۹۹۰ء کی بات ہے ایک دن ہمارے محترم دوست پروفیسر عبد اللہ جمال صاحب کا فون آیا کہ امریکہ سے ایک محترمہ خاتون جو پروفیسر ہیں اور نو مسلم ہیں، پاکستان آئی ہوئی ہیں اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی سے ملنا چاہتی ہیں مگر حضرت صوفی صاحبؒ نے معذرت کر دی ہے، آپ اس سلسلہ میں کچھ کریں۔ میں نے عرض کیا کہ اگرچہ یہ بات بہت مشکل ہے کہ حضرت صوفی صاحبؒ کے انکار کے بعد انہیں اس ملاقات کے لیے آمادہ کیا جا سکے مگر میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ چنانچہ میں حاضر خدمت ہوا اور گزارش کی کہ ملاقات میں کیا حرج ہے؟ پہلے تو یہی فرماتے رہے کہ میرے ساتھ ملاقات سے آخر اس کی کیا غرض ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ تو غرض ہو گی جو وہ ملنے پر اصرار کر رہی ہے تو تھوڑے رد و کد کے بعد وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ خاتون ڈاکٹر مارسیا کے ہرمینسن (Marcia K Hermansen) ہیں اور کیلی فورنیا کی سن ڈیگو یونیورسٹی میں اس وقت فلسفہ کے شعبہ میں استاذ تھیں۔ اصلاً کینیڈا کی رہنے والی ہیں۔ انہوں نے سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ کے مضمون میں ماسٹرز ڈگری لی، قرآن کریم کے مطالعہ نے مسلمان کر دیا، مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات و فلسفہ کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنایا اور ”مغربی دنیا میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کا تعارف“ کے عنوان پر سین ڈیگو یونیورسٹی سے ہی ڈاکٹریٹ کیا اور پھر اس کے تعلیمی شعبہ سے منسلک ہو گئیں۔ وزیر آباد سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد علوی صاحب سے ان کی شادی ہوئی، ان کے ساتھ ہی پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات پر ریسرچ بالخصوص پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری میں انہیں حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کی بعض تصنیفات سے استفادہ کا موقع ملا ہے، اس لیے وہ ان سے ملاقات کی خواہش مند ہیں اور بعض علمی اشکالات پر ان سے گفتگو بھی کرنا چاہتی ہیں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی طرف سے کلیئرنس ملنے کے بعد محترمہ ایم کے ہرمینسن اپنے خاوند کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائیں، تھوڑی دیر ٹھہریں اور ظہر کی نماز بھی انہوں نے ہمارے ہاں ادا کی۔ انہوں نے بتایا کہ گوجرانوالہ میں وہ دو کاموں کے لیے آئی ہیں۔ ایک تو وہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے ساتھ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحبؒ سواتی سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ ان دنوں گوجرانوالہ کے قریب جی ٹی روڈ پر اٹاوہ کے ساتھ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا جو دراصل حضرت صوفی صاحبؒ ہی کی توجہات کا ثمرہ تھا، مگر وہ بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی اور اس میں کسی بیرونی مہمان کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں تھا، اس لیے انہیں اس وقت ہونے والی پیش رفت اور آئندہ کے

عزائم سے آگاہ کیا گیا جس پر انہوں نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔

اس مرحلہ میں شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تھوڑی سی تاریخ بھی قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ گوجرانوالہ شہر میں دیوبندی مسلک کے مسائل بالخصوص مساجد پر مخالفانہ قبضوں کی مہم کے پس منظر میں اس دور میں ایک مسلکی تنظیم جمعیۃ اہل السنۃ والجماعت کے نام سے کام کر رہی تھی جس میں زیادہ تر حضرت صوفی صاحبؒ کے حلقہ درس کے لوگ شامل تھے اور اسی حلقہ درس سے وابستہ ایک مخیر صنعت کار الحاج میاں رفیق ان دنوں جمعیۃ کے صدر تھے اور راقم الحروف بھی اس میں شامل تھا۔ ایک مرحلہ میں جمعیۃ اہل السنۃ کے احباب نے مشورہ کیا کہ شہر سے باہر جی ٹی روڈ پر مسلکی بنیاد پر ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیے، چنانچہ اس کا فیصلہ کر کے جی ٹی روڈ پر لاہور کی جانب جاتے ہوئے ایمن آباد موڑ سے پہلے واقع گاؤں اٹاوہ میں ریلوے لائن کے ساتھ تقریباً بتیس ایکڑ جگہ خریدی گئی۔ ابتداء میں اس منصوبے کو ”نصرۃ العلوم اسلامی یونیورسٹی“ کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسی نام سے اس منصوبے کی تفصیلات جمعیۃ اہل السنۃ کی طرف سے شائع کی گئیں مگر بعد میں مشورہ ہوا کہ یہ ادارہ الگ نام سے ہونا چاہیے اور اس کا نام ”فاروق اعظمؓ اسلامی یونیورسٹی“ تجویز کیا گیا اور اس منصوبے کا دوسرا تعارف اس نام سے شائع ہوا۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی جمعیۃ اہل السنۃ کے سرپرست کی حیثیت سے اس منصوبے کے بھی سرپرست تھے اور صرف نام کے نہیں بلکہ عملی سرپرست تھے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن ہم چند دوست حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور اسی تعلیمی منصوبے پر گفتگو کر رہے تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ اس تعلیمی ادارے میں قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج ہونا چاہیے اور دینی علوم کے طلبہ کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون کے طلبہ کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کا پروگرام تشکیل دیا جانا چاہیے۔ گفتگو کے دوران تعلیمی ادارے کا نام بھی زیر بحث آیا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ جس کے ذہن اور فلسفہ کے مطابق کام کرنا چاہتے ہو، اس کا نام کیوں نہیں لیتے ہو؟ ان کی مراد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تھے۔ بات ہمارے ذہن میں بھی آ گئی، چنانچہ ہم نے دوبارہ مشاورت کا اہتمام کیا اور اس تعلیمی ادارے کو ”شاہ ولی اللہ یونیورسٹی“ کا نام دے کر اس کے لیے باقاعدہ ”شاہ ولی اللہ ٹرسٹ“ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کام کا آغاز کر دیا گیا۔ ”شاہ ولی اللہ ٹرسٹ“ جب قائم ہوا اور قانونی مراحل سے گزر کر اس نے باضابطہ ٹرسٹ کی شکل اختیار کی تو وہ چھ ارکان پر مشتمل تھا:

(۱) حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

(۲) حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ

(۳) محترم میاں محمد رفیق صاحب،

(۴) الحاج عزیز ذوالفقار صاحب،

(۵) شیخ محمد اشرف صاحب مرحوم (مسلم لیگی رہنما ایس، اے حمید کے بھائی)،

(۶) راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی،

اس کے ساتھ تعلیمی وانتظامی امور کے لئے شاہ ولی اللہ ایجوکیشنل سوسائٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر الحاج میاں محمد رفیق اور سیکرٹری جنرل شیخ محمد اشرف مرحوم تھے جبکہ ٹرسٹ کے باقی چاروں حضرات کو سرپرست کا درجہ دیا گیا اور سرپرست اعلیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قرار پائے۔ اس سوسائٹی کے تحت شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور اس کا آغاز شاہ ولی اللہ کالج سے کیا گیا جس کے لئے تعلیمی کمیٹی بنائی گئی اور راقم الحروف کو اس کا چیئرمین اور ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال لون صاحب کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

اس نظم کے ساتھ شاہ ولی اللہ کالج کا آغاز کیا گیا جس کے اہداف میں تھا کہ ایک کالج قائم کر کے عصری تعلیم کے طلبہ کو مروجہ عصری نصاب کے ساتھ ساتھ ضروری دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے اور دینی مدارس کے فضلاء کو جدید علوم کا ایک کورس پڑھا کر پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کرا دیا جائے، اس لیے کہ پنجاب یونیورسٹی نے دینی مدارس کے شہادۃ العالمیہ کی سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کرنے کے لیے شرط لگا رکھی تھی کہ وہ پانچ سو نمبر کا بی اے کریں۔ چنانچہ اس دائرہ میں دونوں کورس شروع کر دیے گئے اور کئی برس تک وہ جاری رہے مگر بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اس بی اے کو مزید تعلیم کے لیے بنیاد تسلیم نہ کیے جانے کی بنا پر اور یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کے حوالے سے خود ہمارے درمیان ہم آہنگی قائم نہ رہنے کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس سارے عمل میں دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی کی ہمیں مکمل اور عملی سرپرستی حاصل رہی، تمام معاملات کی مشاورت میں شریک رہے اور حوصلہ افزائی اور معاونت سے نوازتے رہے، مگر شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے اصل اہداف کے حوالہ سے اس نظام کے چلانے والے احباب کے درمیان ہم آہنگی قائم نہ رہنے پر جب راقم الحروف نے دوستوں سے مشاورت کی کہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے اصل اہداف و مقاصد کے لیے معاملات کو خود کنٹرول کرنے کی کوئی صورت اختیار کی جائے تو دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی نے مجھے سختی

کے ساتھ منع کر دیا اور میں خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ چنانچہ اب وہاں کیڈٹ کالج چل رہا ہے، ہسپتال بن چکا ہے اور میڈیکل کالج کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کے موجودہ ٹرسٹ میں راقم الحروف اور حضرت صوفی صاحبؒ کے فرزند مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی شامل ہیں مگر عملی طور پر اس کے معاملات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ ہمارے تحفظات بدستور قائم ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کا نام کہیں پڑھ لیا تھا اور وہ اسے دیکھنے کے شوق میں تشریف لائی تھیں مگر اس وقت وہ بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی اس لیے انہیں وہاں لے جانا مناسب نہ تھا، البتہ حضرت صوفی صاحبؒ کے ساتھ ان کی ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات مدرسہ نصرۃ العلوم کی لائبریری میں ہوئی جس میں محترمہ کے شوہر پروفیسر محمد علوی صاحب، پروفیسر محمد عبد اللہ جمال صاحب اور راقم الحروف بھی شریک تھے۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے حضرت صوفی صاحبؒ سے وحدت الوجود کے فلسفہ کے حوالہ سے کچھ سوالات کیے جن کی تفصیل اب مجھے یاد نہیں ہے، البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ اس مسئلہ پر اور کن حضرات سے بات کی جا سکتی ہے تو حضرت صوفی صاحبؒ نے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم کے نام لیے۔ اس موقع پر حضرت صوفی صاحبؒ نے محترمہ ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن سے ایک دلچسپ سوال کیا جو اس طرح تھا کہ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں اور ہم مسلمانوں میں اس وقت ایسی کوئی بات نہیں کہ کوئی ہمیں دیکھ کر متاثر ہو اور مسلمان ہو جائے۔ آپ آخر کیسے مسلمان ہوئی ہیں؟ ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن نے جواب دیا کہ وہ کسی مسلمان کی دعوت پر یا کسی مسلمان کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوئیں بلکہ ان کے قبول اسلام کی وجہ قرآن کریم بنا ہے اور قرآن کریم کا مطالعہ کر کے وہ مسلمان ہوئی ہیں۔ اس کی تفصیل انہوں نے یوں بیان کی کہ سین ڈیگو یونیورسٹی میں فلسفہ میں ماسٹرز ڈگری کرنے کے بعد وہ ایک مرحلہ میں اسپین کی کسی یونیورسٹی میں کوئی کورس کر رہی تھیں کہ ایک روز ہاسٹل میں صبح کے وقت ریڈیو کی سوئی گھماتے ہوئے ایک جگہ سے ایسی پرکشش آواز سنائی دی جس نے ان کی دلی توجہ حاصل کی اور انہیں کشش اور سکون محسوس ہونے لگا، مگر یہ پتہ نہ چلا کہ زبان کون سی ہے اور کلام کیا ہے؟ دو تین روز وہ تلاش کر کے یہ آواز سنتی رہیں جس سے انہیں روحانی سکون ملتا تھا۔ پھر کوشش کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ مراکش ریڈیو ہے اور اس سے مسلمانوں کی مقدس کتاب "قرآن کریم" کی تلاوت ہوتی ہے۔ چند روز وہ سنتی رہیں، پھر قرآن کریم کا انگلش ترجمہ حاصل کر کے اس کا مطالعہ شروع کر دیا، مگر خیال ہوا کہ اس کتاب کو اس کی اصل زبان میں اسٹڈی کرنا چاہیے، چنانچہ انہوں نے عربی زبان کا باقاعدہ کورس کیا اور

اس کے بعد قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو قرآن کریم نے انہیں مسلمان بنا دیا۔

مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ دی، ان کا کہنا ہے کہ انہیں سب سے زیادہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متاثر کیا۔ انہوں نے شاہ صاحبؒ کی تعلیمات پر کام شروع کیا اور انہی پر سین ڈیگو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ محترمہ ایم کے ہر مینسن کی اپنی زبان انگلش ہے مگر انہیں عربی، فارسی، اردو اور سنسکرت پر بھی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے سین ڈیگو یونیورسٹی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے "شاہ ولی اللہ چیئر" قائم کر رکھی ہے جس کی وہ چیئر پرسن ہیں اور انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا انگلش ترجمہ بھی کیا ہے جو چھپ چکا ہے۔

محترمہ نے ماہنامہ الشریعہ میں اشاعت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ پر لکھے گئے اپنے چند مضامین بھی دیے جو ہم نے ترجمہ کے لیے اپنے محترم دوست حافظ مقصود صاحب آف شیخوپورہ کے سپرد کیے، انہوں نے ایک مضمون کا ترجمہ کیا جو الشریعہ میں چھپ گیا مگر اس کے بعد ان کی وفات ہو گئی اور ان کے کاغذات میں باقی مضامین نہ مل سکے۔

ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن سے حضرت صوفی صاحبؒ نے ایک سوال اور کیا کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ منافقت بہت زیادہ ہے، قول اور عمل میں تضاد ہے اور اسلام کے احکام پر عمل کی فضا موجود نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کی عمومی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغرب سے اسلام کے حوالہ سے بات کرنے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فلسفہ و اسلوب سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ اس میں عقل و فکر بھی ہے اور روحانی سکون کا سامان بھی موجود ہے، اس لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم پر کام ہونا چاہیے اور ان کی زبان و اسلوب میں مغرب کو اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔

حضرت صوفی صاحبؒ نے مہمان خاتون کے قبول اسلام، اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے ان کی محنت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ و فکر پر ان کی جدوجہد کو سراہا اور ان کے لیے استقامت و ترقی کی دعا فرمائی۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ مفسر قرآن نمبر)

(۳)

میں نے ان دو بزرگوں کے زیر سایہ تعلیم و تدریس اور فکری و ذہنی تربیت کے ماحول میں چار عشروں سے زیادہ وقت گزارا ہے اور سب سے زیادہ انہی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جس خوبی نے مجھے سب سے

زیادہ متاثر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ علمی مسائل میں اختلاف کا حق دیتے تھے، اس اختلاف کو سنتے تھے برداشت کرتے تھے اور بڑے تحمل کے ساتھ دلیل اور منطق کے ساتھ اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اختلاف رائے کو اختلاف کے درجے میں رکھتے تھے، اسے مسئلہ نہیں بنا لیتے تھے اور بحث وتمحیص اور تجربہ ومشاہدہ کی بنا پر اگر اپنے کسی موقف اور رائے سے رجوع کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اس میں کسی تامل سے کام نہیں لیتے تھے۔

چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کی یہ بات میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا کہ جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو میں "درخواستی گروپ" کے متحرک ترین کارکنوں میں سے تھا اور حضرت درخواستیؒ کے موقف کے اظہار اور دفاع میں پیش پیش تھا۔ اس پر دوسرے گروپ کے بعض سرکردہ بزرگ میرے خلاف شکایت لے کر حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس آئے تو حضرت صوفی صاحبؒ نے میرے بارے میں فرمایا کہ اگر اس نے کوئی اخلاقی یا مالی بد دیانتی کی ہے یا کسی بزرگ کی توہین کی ہے تو ابھی اسے آپ حضرات کے پاس بلا کر ڈانٹوں گا۔ لیکن اگر صرف رائے کی بات ہے تو رائے کا حق جیسے آپ حضرات کو ہے، اسے بھی وہی حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ وہ اپنی رائے میں آزاد ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جنوری ۲۰۱۳ء)

(۴)

عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی قدس اللہ سرہ العزیز کا ذوق اس بارے میں یہ تھا کہ وہ درس نظامی کی تعلیم کے دوران جہاں خلا محسوس کرتے تھے، اسے پُر کرنے کی اپنے طور پر کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دورۂ حدیث کے طلبہ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" سبقاً سبقاً پڑھاتے تھے۔ صبح کا دو سالہ ترجمہ قرآن کریم اور "حجۃ اللہ البالغۃ" کی تدریس بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ نصرۃ العلوم کے نصاب تعلیم کے امتیازی شعبے ہیں جو ہمارے ان دو بزرگوں کے ذوق کی علامت اور ان کا صدقہ جاریہ ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ دورۂ حدیث کے نصاب میں اب بھی شامل ہے اور یہ خدمت بھی میرے سپرد ہے۔ البتہ اب اس کے چند ابواب پڑھائے جاتے ہیں اور مکمل تدریس کی حسرت ہی رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں میرا ذاتی ذوق اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ (۱) عصر حاضر کے مسائل کے تناظر میں احکام القرآن (۲) طحاوی شریف اور (۳) حجۃ اللہ البالغہ کی مکمل طور پر تدریس دورۂ حدیث سے قبل ہونی چاہیے کیونکہ اسی صورت میں دورۂ حدیث کے طلبہ احادیث نبویہ ؐ کے عظیم الشان ذخیرے سے صحیح طور پر استفادہ

کر سکتے ہیں۔ اور اگر پہلے نہ ہو سکے تو فضلاء درس نظامی کو فراغت کے بعد تکمیل یا تخصص کی صورت میں یہ کورس ضرور پڑھنا چاہیے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر باذوق فضلاء کی ایک مناسب تعداد ایک سال کا وقت فارغ کر سکے تو آج کی عالمی فکری و تہذیبی کشمکش کے تناظر میں احکام القرآن کے ساتھ ساتھ حجۃ اللہ البالغۃ اور طحاوی شریف کی مکمل تدریس کا موقع اور سعادت حاصل کر لوں، مگر ذوق و شوق، وسائل اور فکری و علمی استعداد میں مسلسل کمی کی وجہ سے اس کی کوئی صورت نہیں بن رہی۔ اپنے اس ذوق کی کسی حد تک تکمیل کے لیے میں نے دورۂ حدیث شریف میں حجۃ اللہ البالغۃ کے ساتھ ایک اور پیریڈ کے اضافے کی ''بدعت'' شروع کر رکھی ہے جو سالہا سال سے جاری ہے اور اس کے نصاب میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ تقابلی مطالعہ اور دور حاضر کے معاصر ادیان و مذاہب کا اجمالی تعارف شامل ہے۔ یہ ہر جمعرات کو ہوتا ہے اور سال بھر کی پچیس نشستوں میں ''خلاصۃ الخلاصۃ'' کے درجے میں ان دو موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔

حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں ایک ذوق یہ بھی تھا کہ وہ چند طلبہ کو منتخب کر کے انہیں نصاب سے ہٹ کر بعض کتابیں الگ طور پر پڑھاتے تھے۔ ان خوش نصیبوں میں میرا شمار بھی ہوتا ہے اور میں نے ملا علی القاریؒ کی شرح نقایہ، مقامات ہمدانی، کلیلہ و دمنہ، رسائل اخوان الصفاء، مصطفیٰ لطفی منفلوطیؒ کی العبرات اور الاستاذ محمد خضری بک کی کتاب نور الیقین ان سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ نور الیقین سیرت نبوی کی کتاب ہے، حضرت صوفی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے درس نظامی کے (اس وقت کے) نصاب میں سیرت النبیؐ اور سیرت الخلفاءؓ شامل نہیں ہے حالانکہ اس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال تک طلبہ کی متعدّد کلاسوں کو ''نور الیقین فی سیرت سید المرسلین'' پڑھائی۔ اس سلسلے میں لطیفہ کی بات یہ ہے کہ مدرسہ انوار العلوم میں تدریس کے دوران میں نے بعض طلبہ کو ''ورغلا کر'' سیرت النبیؐ کی ایک کتاب ''عین الیقین'' درساً پڑھائی جو مصری عالم عبد الحمید الخطیب کی تصنیف ہے اور مجھے وہ اس وقت اس مقصد کے لیے زیادہ موزوں محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امام سیوطیؒ کی ''تاریخ الخلفاء'' کی تدریس بھی شروع کر دی مگر بمشکل ایک سال ایسا کر سکا اور اگلے سال کسی طالب علم کو ''ورغلانے'' میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

یہاں ایک اہم وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے جب گوجرانوالہ میں جدید اور قدیم علوم کے امتزاج کے ٹائٹل کے ساتھ ایک نئے تعلیمی ادارے کے قیام کا پروگرام بنایا تو اس کا ابتدائی نام ''نصرۃ العلوم اسلامی یونیورسٹی'' تھا اور اس منصوبے کا پہلا تعارف پمفلٹ اور اشتہارات کی صورت میں اسی نام

سے شائع ہوا تھا، اس سے عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی نے اختلاف کیا، وہ جامعہ نصرۃ العلوم کے مہتمم تھے اور ہمارے اس نئے تعلیمی پروگرام کے سرپرست تھے، انہوں نے فرمایا کہ اس نئے تعلیمی نظام کے لیے الگ نام سے ادارہ بناؤ، یہ بہت ضروری کام ہے لیکن اس کے لیے جو تعلیمی نظام تسلسل کے ساتھ دینی مدارس میں چلا آرہا ہے اسے ڈسٹرب نہ کرو۔ ان کے اس اختلاف کی وجہ سے ہم نے اس کا نام تبدیل کر کے "فاروق اعظمؓ اسلامی یونیورسٹی" رکھا اور پروگرام کا دوسرا تعارف اس نام سے شائع ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اس سے بھی اختلاف کیا اور فرمایا کہ "بھائی! جس کے مشن پر کام کرنا چاہتے ہو اس کا نام تمہیں کیوں یاد نہیں آرہا؟" ان کا اشارہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی طرف تھا جن کے علوم کے وہ اپنے دور کے متخصصین میں شمار ہوتے تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات پر ان کی گہری نظر تھی، چنانچہ ہم نے اپنے اس نئے تعلیمی پروگرام کو شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کا نام دے دیا۔

حضرت صوفی صاحبؒ کا موقف یہ تھا اور خود میرا ذاتی موقف بھی یہ ہے کہ دینی مدارس کا جو روایتی تعلیمی نظام تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے اسے چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ عصری تقاضوں کے حوالہ سے ایک نئے تعلیمی تجربے کا اہتمام ضرور ہونا چاہیے جو بحمد اللہ تعالیٰ بہت سے اداروں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک جس طرح عصری تقاضوں کو محسوس کرنا اور انہیں پورا کرنے کی محنت کرنا ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعلیمی نظام کے روایتی تسلسل کو قائم رکھنا اور اس کا تحفظ کرنا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نصرۃ العلوم کا ذمہ دار فرد ہونے کے باوجود ایسے علمی و فکری مباحث کے لیے میں نے الشریعہ اکادمی اور ماہنامہ الشریعہ کے نام سے الگ فورم قائم کر رکھا ہے جن مباحث میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال اصحابِ فکر کا شریک ہونا مجھے ضروری محسوس ہوتا ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جنوری ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ

۱۲ اپریل کو ہم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی نور اللہ مرقدہ کی یاد میں تعزیتی جلسہ کی تیاریوں میں تھے کہ مجلس احرار اسلام پاکستان کے نومنتخب سیکرٹری جنرل عبد اللطیف خالد چیمہ نے فون پر اطلاع دی کہ خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اور دارالعلوم (وقف) دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ کا دہلی میں انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر ان سے تفصیلات معلوم کرنا چاہیں تو انہوں نے بتایا کہ سردست یہی خبر

آئی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ رحلت فرما گئے ہیں۔ رات کو حضرت صوفی صاحبؒ کے تعزیتی جلسہ کے اسٹیج پر بیٹھا تھا کہ حضرت انظر شاہ صاحبؒ کے خادم خاص جناب انس صاحب کا فون آیا اور پوچھا کیا آپ کو خبر مل گئی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ خبر تو مل گئی ہے مگر جنازے کا پتہ نہیں چل سکا کہ کس وقت ہے؟ معلوم ہوتا بھی تو حاضری نہیں ہو سکتی تھی مگر دل کی تسلی کے لیے دریافت کر لیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھی پاکستان میں ہیں اور جنازے میں شرکت سے محروم رہ گئے ہیں جبکہ نماز جنازہ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ابھی چند منٹ کے بعد ادا ہونے والی ہے۔

دوسرے روز حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزند جناب سید احمد خضر صاحب کا فون آیا، میرے پاس نمبر نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اہل خاندان سے تعزیت کر سکوں، ان کا فون آنے پر تعزیت کی اور بتایا کہ صبح نصرۃ العلوم کے طلبہ کے سامنے اس سانحے کا ذکر کر چکا ہوں اور حضرت شاہ صاحبؒ کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے سب نے دعا کی ہے۔ سید احمد خضر صاحب نے بتایا کہ انہوں نے فون اس لیے کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے دو روز قبل فون پر آپ (راقم الحروف) سے رابطہ کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر بات نہ ہو سکی تو انہوں نے احمد خضر صاحب کو تاکید کی وہ فون پر رابطہ کر کے ان کی طرف سے والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی خدمت میں سلام مسنون اور دعا کے لیے بطور خاص عرض کریں۔

مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ کے ساتھ ملاقاتوں اور نیاز مندی کا سلسلہ پرانا تھا اور مختلف مجالس اور پروگراموں میں ان کے ساتھ رفاقت کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامعہ قاسمیہ میں متعدّد بار تشریف لائے، جامعہ خیر المدارس ملتان اور کراچی کے بعض اجتماعات میں بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ اور چند سال قبل ڈھاکہ بنگلہ دیش کے نواحی علاقہ مادھوپور میں مولانا عبد الحمید صاحب کے دینی مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں بھی ان کے ساتھ رفاقت رہی، اس جلسہ میں والد محترم کے ساتھ مجھے بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا اور پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے بہت سے سرکردہ علماء کرام اس میں شریک تھے۔ مولانا عبد الحمید کے فرزند مولانا محمد عبد اللہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلاء میں سے ہیں اور انہی کے اصرار پر مدرسہ نصرۃ العلوم سے شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے ہمراہ مولانا قاری محمد عبد اللہ، مولانا قاری عبید اللہ عامر، اور راقم الحروف نے ڈھاکہ کا سفر کیا۔

اس سفر میں حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کے ساتھ بھی رفاقت رہی اور سفر کی جو خاص بات اس وقت تک ذہن میں محفوظ ہے وہ یہ کہ مادھوپور جانے کے لیے کشتی کے ذریعے ایک ندی عبور کرنا تھی،

کشتی کو جلسہ کے منتظمین نے گدے وغیرہ بچھا کر خوب آرام دہ بنا رکھا تھا۔ رات کا وقت تھا، ایک کشتی پر حضرت والد صاحب کے ساتھ ہم لوگ سوار تھے، یہ چند منٹ کا سفر تھا جو ہم نے آرام سے طے کر لیا۔ مگر دوسری کشتی جس میں حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ سوار تھے، نصف راستے میں کسی وجہ سے الٹ گئی اور انہیں خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جلسہ کی دوسری خاص بات یہ تھی کہ میں نے بنگلہ دیش کے دینی مدارس کے جلسوں کا یہ انداز پہلی بار دیکھا کہ جمعہ کے روز گیارہ بجے کے لگ بھگ جلسہ شروع ہوا اور صرف نمازوں کے وقفہ کے ساتھ ہفتہ کے روز صبح نماز فجر کے بعد تک مسلسل جاری رہا۔ میں نے عشاء کی نماز کے بعد عرض کیا کہ بڑے بڑے بزرگ تشریف لائے ہوئے ہیں اس لیے مجھے ابتداء میں تھوڑا سا وقت دے دیں تاکہ میں حاضری لگوا کر آرام سے سو جاؤں، مجھ سے کہا گیا کہ آپ آرام سے سو جائیں آپ کی باری آنے پر کچھ دیر پہلے آپ کو جگا لیا جائے گا۔ چنانچہ رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ مجھے بیدار کیا گیا اور میں نے وضو وغیرہ کر کے جلسہ میں کچھ معروضات پیش کیں۔

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی نور اللہ مرقدہ کے ہمراہ میں بھی دیوبند گیا تھا۔ اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد ایک روز دونوں بزرگوں نے مجھے دیوبند کے مختلف حصوں کی سیر کرائی، مسجد چھتہ میں گئے اور اس میں انار کا وہ درخت بھی دیکھا جس کے نیچے ملا محمودؒ نے مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو سبق پڑھا کر اس عظیم درسگاہ کا آغاز کیا تھا۔ دیگر بہت سے مقامات کے علاوہ دونوں بزرگ مجھے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے گھر میں بھی لے گئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزند حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اور داماد مولانا سید احمد رضا بجنوری سے ملاقات کرائی۔ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دارالعلوم کے قاری کی حیثیت سے مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر سے غائبانہ تعارف پہلے سے تھا کہ وہ اس جریدہ کے عرصہ تک مدیر رہے ہیں لیکن بالمشافہ ملاقات پہلی بار ہوئی۔ مولانا سید احمد رضا بجنوری اس سے قبل ایک بار ہمارے ہاں گکھڑ اور گوجرانوالہ تشریف لا چکے تھے۔ تب وہ حضرت سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے افادات پر مشتمل بخاری شریف کی اردو شرح ''انوار الباری'' کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے اور اسی سلسلہ میں گوجرانوالہ آئے تھے، وہ ایک دو روز ہمارے گھر میں رہے اور ان کی مہمان داری اور خدمت کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ جبکہ ان کے ساتھ دوسری ملاقات دیوبند کے اس سفر کے موقع پر ہوئی۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور ان کے خاندان کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق ایک تو اس حوالہ سے ہے کہ میں بحمد اللہ تعالیٰ ایک شعوری دیوبندی ہوں اور دیوبند کے جن چند اکابر کے ساتھ نسبت و

عقیدت سے ”دیوبندیت“ تشکیل پاتی ہے ان میں ایک بڑا نام علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے مخدوم حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحبؒ جو والد محترم کے اساتذہ میں سے تھے اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مجھے ان کی نیابت کا اعزاز حاصل رہا ہے، وہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ مفتی صاحبؒ نے ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا اور ان کی زبان سے ہم حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ اکثر سنتے رہتے تھے جس سے ہماری عقیدت و محبت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے چچا اور مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں قائم مدرسہ انوار العلوم کے بانی حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے رفقاء میں سے تھے۔ حضرت مولانا عبد العزیزؒ نے جب ۱۹۲۶ء میں مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں مدرسہ انوار العلوم کا آغاز کیا تو اس موقع پر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ بھی گوجرانوالہ تشریف لائے تھے جس کا ذکر حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور اس دور کے پرانے حضرات بڑے اہتمام اور فخر کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

اس پس منظر میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق شروع سے ہی تھا، اس لیے مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ سے جب ملاقات ہوتی تو یہ سارا تناظر ذہن میں ہوتا اور میں اس سے حظ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ گزشتہ چند ماہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ فون پر مسلسل رابطہ رہا، افسوس کہ وعدہ کے باوجود میں خود ایک بار بھی انہیں فون نہ کر سکا مگر انہوں نے کئی بار فون کیا۔ ایک بار فون پر دریافت کیا کہ دیوبند میں منعقد ہونے والے ایک مجوزہ سیمینار میں میری حاضری ہو سکے گی؟ میں نے عرض کیا کہ اگر ویزا آسانی سے لگ جائے تو خود میرا بھی دیوبند اور لکھنؤ میں حاضری کو جی چاہتا ہے، اس پر خوش ہوئے اور ویزے کے لیے پیش رفت کا وعدہ کیا۔ ایک بار دریافت کیا کہ میں روحانی سلسلہ میں کس سے مجاز ہوں؟ میں نے عرض کیا کہ اگرچہ اپنے ذوق کے حوالہ سے اس میدان کا راہی نہیں ہوں مگر میرا بیعت کا تعلق سلسلہ قادریہ میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے رہا ہے جبکہ والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر مدظلہ نے سلسلہ نقشبندیہ میں اپنے خلفاء مجازین میں میرا نام لکھ رکھا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں بھی آپ کو اپنے مجازین میں شامل کرتا ہوں اور اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت بھی دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے، آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۸ مئی ۲۰۰۸ء)

حضرت مولانا عبد الحقؒ (ظفروال، نارووال)

نارووال کے قریب پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کے قصبہ ظفروال میں ایک پرانے بزرگ مولانا عبد الحق ہوتے تھے جنہیں دیکھنے اور ان سے دعائیں لینے کے لیے کبھی کبھی وہاں حاضری ہو جایا کرتی تھی، وہ بھی گزشتہ ہفتہ کے دوران اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں کوشش کے باوجود جنازے پر تو نہ پہنچ سکا البتہ تدفین کے بعد دعا میں شرکت ہو گئی۔ وہ پرانے فضلائے دیوبند میں سے تھے۔ گزشتہ روز میں نے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم سے ان کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے ساتھیوں میں سے تھے اور دیوبند میں ہمارے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ مولانا عبد الحقؒ نے ۱۹۴۵ء میں ظفروال کی مرکزی جامع مسجد میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمدؒ عثمانی کی ہدایت پر ڈیرہ لگایا اور پھر ساری زندگی وہیں بسر کر دی۔ طبابت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اچھے حکیم تھے، جبکہ علاقے میں دین و مسلک کی مسلسل خدمت کرتے رہے۔ اب ان کے ایک بیٹے عنایت اللہ ان کے مطب پر ان کی جگہ خدمات سر انجام دے رہے ہیں جبکہ ان کے پوتے مفتی محمد عثمان جامعہ اشرفیہ لاہور کے دارالافتاء میں حضرت مولانا مفتی حمید اللہ جان اور حضرت مولانا مفتی شیر محمد علوی کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔

مولانا عبد الحقؒ کی ولادت اسی علاقہ کے گاؤں چک حکیم میں ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ جنازے کے موقع پر ہمارے ایک سرگرم ساتھی مولانا افتخار اللہ شاکر آف اونچا کلاں نے بتایا کہ اس دور میں اس علاقہ میں علی پور سیداں کے دو بزرگوں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوریؒ اور انہی کے ہم نام دوسرے بزرگ حضرت پیر سید جماعت علی شاہؒ ثانی کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ مولانا افتخار اللہ شاکر کے والد جنہیں سائیں میاں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، مولانا عبد الحقؒ کو ان کے لڑکپن میں ساتھ لے کر حضرت پیر سید جماعت علی شاہؒ ثانی کے پاس گئے اور ان کے تعلیمی شوق کا ذکر کیا تو انہوں نے دعا کے ساتھ انہیں دیوبند جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی اور اپنی طرف سے بیس روپے بطور خرچ بھی عطا کیے۔ چنانچہ ان کی ہدایت پر مولانا عبد الحقؒ دیوبند چلے گئے اور مسلسل چھ سال تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک نارووال اور شکرگڑھ کے اس علاقے میں فضلائے دیوبند کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، شکرگڑھ کے مدرسہ تعلیم القرآن چوک بخاری کے بانی حضرت مولانا عبد الرحیمؒ ہمارے متحرک اور بزرگ ساتھیوں میں سے تھے اور مجلس تحفظ ختم نبوت اور جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم راہ نماؤں

میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے دور میں کئی بار شکر گڑھ جانے کا اتفاق ہوا، وہ بتایا کرتے تھے کہ فلاں فلاں گاؤں میں دارالعلوم دیوبند کے فضلاء موجود ہیں اور بہت سے بزرگوں سے انہوں نے تعارف بھی کرایا۔ وہ فرماتے تھے کہ جتنے فضلائے دیوبند شکر گڑھ کے علاقے میں ہیں، قریب قریب اور کسی علاقے میں نہیں ہیں۔

مولانا عبد الحقؒ کے جنازے کے موقع پر میں نے ان دوستوں سے اس حوالے سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک دو فضلائے دیوبند بزرگ باقی ہیں باقی سب اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ انہی باقی ماندہ بزرگوں میں ہمارے ایک مخدوم و محترم بزرگ حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقب آف ڈسکہ بھی ہیں جو صرف فاضل دیوبند ہی نہیں بلکہ دیوبند کی جرأت و حمیت کا نمونہ بھی ہیں۔ مولانا عبد الحقؒ کا جنازہ انہوں نے پڑھایا۔ قریب قریب علاقے میں میری معلومات کے مطابق فضلائے دیوبند میں سے مولانا فیروز خان کے علاوہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور حافظ آباد میں مولانا لالہ عبد العزیز صاحب بقید حیات ہیں جو کسی دور میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے ناظم ہوا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کا سایہ تا دیر ہمارے سروں پر سلامت رکھیں، آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ جولائی ۲۰۰۸ء)

حاجی جمال دینؒ

جن دوستوں نے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی تصانیف کے ابتدائی ایڈیشن دیکھے ہیں انہیں ماسٹر اللہ دین مرحوم کا نام ضرور یاد ہوگا جو ہر کتاب پر ''ناظم انجمن اسلامیہ گکھڑ'' کے طور پر ناشر کی حیثیت سے درج ہوتا تھا۔ ایک عرصہ تک انہوں نے والد صاحب کی کتابوں کی طباعت اور تقسیم و ترسیل کی خدمت سرانجام دی ہے۔ نہایت سادہ اور متدین بزرگ تھے، قیام پاکستان کے وقت انبالہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور گکھڑ میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ ہمارا ان سے گھریلو قسم کا تعلق تھا۔ ان کی منجھلی بیٹی نے والد محترم مدظلہ سے درس نظامی کے ایک بڑے حصے کی تعلیم حاصل کی، وہ ملتان کے ایک محترم بزرگ انجینئر حاجی عبد الوحید صاحب کی اہلیہ ہیں، ملتان رہائش پذیر ہیں اور ان کی اولاد دینی تعلیم و تدریس میں مصروف ہے۔

حاجی جمال دین صاحب مرحوم ماسٹر اللہ دین صاحب مرحوم کے بڑے داماد تھے، ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ منڈھیالہ تیگہ کے قریب بلال پور میں ان کا قیام تھا، خود زمیندار تھے اور اپنی زمین میں ہی طالبات کا ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا جس میں سینکڑوں طالبات دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اب اسے توسیع

دے کر ایک بڑے قطعہ زمین میں مدرسہ کی تعمیر نو کا قصد کیا تھا کہ اچانک بلاوا آ گیا۔ ان کے بڑے بیٹے حافظ عبدالعزیز میرے حفظ کے ساتھیوں میں سے ہیں اور کویت میں ہوتے ہیں۔

حاجی جمال دین مرحوم ایک متدین زمیندار اور ایک اچھے دینی مدرسہ کے منتظم تو تھے ہی مگر ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی دینی حمیت اور مسلکی غیرت تھی جس کے لیے وہ ہر وقت مضطرب اور بے چین رہتے تھے۔ لال مسجد کے حوالہ سے ان کی بے چینی، اضطراب، اور مسلسل تگ و دو قابل رشک تھی۔ ان کا سب سے بڑا درد یہ تھا کہ دیوبندی علماء متحد کیوں نہیں ہوتے اور اس مقصد کے لیے وہ مختلف بہانوں سے علماء کرام کی بڑی بڑی دعوتیں کرتے تھے اور انہیں اپنے درد دل سے آگاہ کرتے تھے۔ حاجی جمال دین مرحوم کینسر کے مریض تھے اور انہیں اس کا علم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحبان اب مزید علاج کی افادیت محسوس نہیں کر رہے۔ انہوں نے اس حال میں عمرہ کا سفر کیا اور حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت حاصل کر کے چند روز قبل واپس آ گئے تھے۔ ان کی عمرہ سے واپسی پر ملاقات کے لیے گیا جو ہماری آخری ملاقات تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے، ان سے رخصت ہوتے وقت میرا تاثر تو تھا ہی لیکن ان کے چہرے سے بھی یوں لگ رہا تھا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ مجھے بتایا گیا کہ وفات سے چند لمحے قبل تین بار زور سے اللہ اللہ کہا اور ساتھ بیٹھے عزیز سے کہا کہ گواہ رہنا میں اللہ کو یاد کر رہا ہوں۔ اللہ رب العزت انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ جولائی ۲۰۰۸ء)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

(۱)

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میرے والد گرامی تھے، استاد محترم تھے، شیخ و مربی تھے اور ہمارے درمیان دوستی اور بے تکلفی کا وہ رشتہ بھی موجود تھا جو ہر باپ اور اس کے بڑے بیٹے کے مابین ہوتا ہے۔ ۵ مئی کو رات سوا ایک بجے کے لگ بھگ وہ کم و بیش ایک صدی اس دنیا میں گزار کر دارالقضاء کی طرف کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں خود ہجری اعتبار سے ۶۳ سال کا ہو چکا ہوں۔ میرے جذبات و تاثرات کا وہی عالم ہے جو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید محمد زکریا بنوریؒ کی وفات پر تھا۔ وہ مولانا سید یوسف بنوریؒ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل اس جہانِ فانی

سے رخصت ہوئے تھے۔ اپنے بزرگ باپ کی وفات پر مولانا بنوریؒ رو رہے تھے تو کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے والد بزرگوار نے ماشاء اللہ خاصی عمر پائی ہے اور بہت اچھی زندگی گزاری ہے، آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا کہ روتا اس لیے ہوں کہ اب مجھے "ابے یوسف" کہہ کر بلانے والا نہیں رہا۔ میری کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے اور سوچتا ہوں کہ اب "زاہد کو بلاؤ" کون کہے گا اور "زاہد! ادھر آؤ" کہہ کر بلانے والا کون ہو گا؟

وفات کے وقت ان کی عمر ہجری حساب سے اٹھانوے برس تھی کہ وہ اپنا سن ولادت ۱۳۳۲ھ بتایا کرتے تھے۔ ان کے والد محترم جناب نور احمد خان مرحوم شاہراہ ابریشم پر شنکیاری سے چند میل کے فاصلے پر واقع کڑمنگ کے قریب ایک پہاڑی چوٹی "چیڑاں ڈھکی" میں رہتے تھے، چھوٹے موٹے زمیندار تھے، ضلع مانسہرہ کے طول و عرض میں آباد سواتی قوم میں سے تھے اور سوات کے معروف روحانی پیشوا حضرت اخوند زادہ عبد الغفور سواتیؒ سے بیعت و عقیدت کا تعلق تھا۔ والد محترم نے دینی تعلیم اپنے چھوٹے بھائی مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کے ہمراہ، جن کا گزشتہ سال اپریل (۲۰۰۸ء) میں انتقال ہوا ہے، مانسہرہ، گوجرانوالہ، جہانیاں منڈی، وڈالہ سندھواں اور دوسرے علاقوں کے دینی مدارس میں حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں دار العلوم دیوبند پہنچے جہاں دونوں بھائیوں نے دورۂ حدیث کیا اور حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی سے شرف تلمذ کے ساتھ سند فراغت و فضیلت حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں وہ گکھڑ آ گئے اور جی ٹی روڈ پر ایک مسجد میں امامت و خطابت کا سلسلہ شروع کیا جو ۲۰۰۰ء تک مسلسل جاری رہا۔ پانچ وقت نمازوں کی امامت، نماز فجر کے بعد بلاناغہ درس قرآن و حدیث اور جمعہ و عیدین کے خطبوں کے علاوہ درس نظامی کے مختلف درجات کی تدریس کم و بیش ساٹھ برس تک ان کا روزمرہ کا معمول رہی۔

میں نے جب ہوش کے ناخن لینا شروع کیے تو ہم گکھڑ میں جی ٹی روڈ پر بٹ دری فیکٹریوں کے چوبارے میں رہتے تھے۔ ہماری والدہ مرحومہ گوجرانوالہ سے تھیں، شیرانوالہ باغ کے سامنے ریلوے پھاٹک سے دوسری طرف واقع پولیس تھانے کے عقب میں رام بستی نامی محلہ کی مسجد میں ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب امام مسجد تھے جو راجپوت جنجوعہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے باذوق بزرگ تھے، قرآن کریم معروف لہجے میں اور اچھے انداز میں پڑھا کرتے تھے جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن میں نے بہت سے معیاری علمی جرائد ان کے ہاں ڈاک سے باقاعدہ آتے دیکھے جن میں الفرقان، النجم، برہان، خدام الدین اور درس قرآن جیسے رسالے بھی شامل تھے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور اہتمام سے ان کی جلدیں بنواتے تھے۔ یہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ

وہ مسجد کے صحن میں ٹہلتے ہوئے قرآن کریم کی بلند آواز سے تلاوت کیا کرتے تھے یا عربی، فارسی کی کوئی مناجات ترنم سے پڑھتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے منسوب مناجات "خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل" سب سے پہلے میں نے ان سے سنی اور ان کے لہجے کا سوز ابھی تک کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

بٹ دری فیکٹری کی وہ پرانی عمارت تھی، نیچے کھڈیاں تھیں اور اوپر چوبارہ تھا جس میں ہماری رہائش تھی۔ حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم گکھڑ کے ان تین چار بزرگوں میں سے ہیں جو والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کو ۱۹۴۳ء میں گکھڑ لانے کا باعث بنے اور ان کے اولین ساتھی اور پشت پناہ ثابت ہوئے۔ دوسرے بزرگوں میں حاجی فخرالدین صاحب مرحوم، ماسٹر کرم دین مرحوم، چودھری غلام حسین چیمہ مرحوم، ملک محمد اقبال مرحوم اور چودھری محمد عبداللہ چیمہ مرحوم کے نام لیے جاتے ہیں۔ حضرت والد محترم دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر گوجرانوالہ آئے اور مدرسہ انوار العلوم میں تدریسی خدمات میں مصروف تھے کہ حاجی اللہ دتہ بٹ صاحب مرحوم اور ان کے رفقا کی فرمائش پر وہ گکھڑ آ گئے جہاں جی ٹی روڈ پر بوہڑ والی مسجد میں انہیں امامت و خطابت کے فرائض سپرد کیے گئے۔ جبکہ چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی قدس اللہ سرہ العزیز دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد لکھنو اور پھر حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں انہوں نے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سے مناظرہ کا دورہ کیا اور عثمانیہ طبیہ کالج حیدر آباد دکن میں حکیم حاذق کا باقاعدہ کورس کیا۔

حاجی اللہ دتہ بٹ صاحب مرحوم کو ہمارے خاندان کے بزرگ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ بھی ہمارے ساتھ بہت شفقت فرماتے تھے، شادی غمی میں خاندانی بزرگ کی طرح شریک ہوتے۔ ان کی اہلیہ مرحومہ کو ہم دادی سمجھا کرتے تھے اور وہ "بے جی بٹنی" کے نام سے ہمارے ہاں معروف تھی۔ بٹ صاحب مرحوم کے خاندان کے ساتھ ہمارا گھریلو میل جول اس حد تک رہا ہے کہ ہم ان کے بیٹوں کو چچا اور بیٹیوں کو پھوپھی کہا کرتے تھے اور اب بھی انہیں ہمارے خاندانی ماحول میں وہی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیری مرحوم کے خاندان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ اسی طرح کی تھی۔ ان کے بڑے بھائی صوفی نذیر احمد صاحب ہمارے گھر میں تایا جی کہلاتے تھے، ان کی والدہ محترمہ کو بے جی کا مقام حاصل تھا جبکہ ان کی بہنیں ہماری پھوپھیاں کہلاتی ہیں، اور انہی میں سے ایک پھوپھی میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالقدوس قارن کی خوش دامن ہیں۔

گکھڑ کی یہ مسجد جس میں والد صاحب تشریف لائے، چیمہ برادری کے ایک پرانے بزرگ مولوی غلام

حیدر چیمہ مرحوم نے بنوائی تھی۔ ان کی قبر مسجد کے ایک کونے میں نیچے کمرے میں موجود ہے جہاں مسجد کی شب و روز کی دینی اور تعلیمی سرگرمیوں کی برکات اور اجر و ثواب کا فیضان جاری رہتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ گکھڑ آئے تو مسجد میں امامت و خطابت کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جو گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے قیام اور اس میں ان کی تدریس کے سلسلہ کے آغاز تک جاری رہا۔ پرانے رواج اور طرز کے مطابق مختلف علاقوں سے طلبہ جمع ہو جاتے تھے جن کا قیام مسجد میں ہوتا تھا اور گاؤں کے لوگ کھانا دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح کے طلبہ خود مختلف گھروں سے جا کر کھانا لے آتے تھے اور مسجد میں شب و روز تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اسباق کی درجہ بندی نہیں ہوتی تھی اور طلبہ اپنی اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق اسباق پڑھتے تھے۔ اس دوران صبح سے شام تک اسباق چلتے رہتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ سے ایک بار سنا کہ بسا اوقات دن میں تیس تیس اسباق بھی پڑھانے میں آجاتے تھے۔ سینکڑوں علماء کرام نے اس دور میں استفادہ کیا۔ ان کے بہت سے پرانے شاگرد جب ملتے ہیں تو اس زمانے کے واقعات سناتے رہتے ہیں۔

میری ولادت ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی جب بٹ دری فیکٹری کا چوبارہ ہمارا مسکن تھا، وہاں کی کچھ کچھ باتیں ذہن کی اسکرین پر جھلملاتی رہتی ہیں۔ والد محترم اور والدہ محترمہ کے علاوہ ایک بزرگ خاتون کا ہیولیٰ سا ذہن میں موجود ہے، شکل یاد نہیں، لگتا ہے کہ وہ ہماری دادی مرحومہ یعنی والد محترمہ کی سوتیلی والدہ تھیں جنہیں گکھڑ میں مقیم ہونے کے بعد وہ ہزارہ سے جا کر لے آئے تھے۔ ان کا انتقال گکھڑ میں ہوا اور بٹ دری فیکٹری کے عقب کے قبرستان میں ان کی قبر موجود ہے۔ جب تک میں عید کی نماز گکھڑ میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ پڑھتا رہا، ان کا معمول تھا کہ عید کی نماز کے بعد دادی مرحومہ کی قبر پر جاتے، ان کے لیے دعا کرتے اور ہمیں بتاتے کہ یہ تمہاری دادی کی قبر ہے اور میں بھی دعا میں شریک ہو جاتا۔ پھر اسی قبرستان میں ہمارے خاندان کے وہ سب افراد مدفون ہوئے جن کا گکھڑ میں انتقال ہوا۔ ان میں ہماری دونوں مرحومہ مائیں، ہمارے چھوٹے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم، ہمارے دو چھوٹے بھائی عبدالرشید اور عبدالکریم جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور قاری ماجد مرحوم کے دو بیٹے محمد اکرم اور محمد اکمل شامل ہیں اور اب خاندان کے سربراہ حضرت والد محترمؒ کو بھی اسی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔

بٹ دری فیکٹری والے مکان سے مجھے حضرت والد محترمؒ کا جیل جانا یاد ہے۔ یہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی بات ہے، اس کی دو باتیں ذہن میں ہیں۔ ایک یہ کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے گلیوں میں ٹولیوں کی صورت میں مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف ٹھیٹھ پنجابی میں مخصوص نعرے لگایا کرتے تھے۔ دوسری بات

یہ کہ حضرت والد محترمؒ نے پولیس چوکی خود جاکر گرفتاری پیش کی۔ اس دن صبح والدہ مرحومہ نے حلوہ پکایا تھا اور ایک طالب علم جس کا نام غالباً عزیز الرحمن تھا، والد صاحب کا بستر اٹھا کر ساتھ لے گئے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کا سیڑھیوں سے اترنے کا منظر میرے ذہن میں اب تک محفوظ چلا آرہا ہے۔

وہ تقریباً دس ماہ تک ملتان جیل میں رہے اور اس دوران ہم نے مکان تبدیل کیا، بٹ دری فیکٹری کے چوبارے سے ہم مسجد ٹھیکداراں والی گلی میں ایک مکان میں منتقل ہوگئے جو کرائے کا تھا اور اس میں کئی سال بسر کیے۔ اس سے قبل ہماری چھوٹی والدہ مرحومہ بھی آچکی تھیں اور ہم سب نے نئے مکان میں بسیرا کیا۔ ٹھیکیداروں والی مسجد کی گلی والے مکان میں آنے کے چند سال بعد ہم جی ٹی روڈ پر ماسٹر خوشی محمد مرحوم کے مکان میں منتقل ہوگئے جس کا دروازہ عقبی گلی میں تھا اور نیچے اوپر دو منزلیں تھیں۔ ہم رہتے اوپر تھے مگر سامان وغیرہ نیچے ہوتا تھا، یہ بھی کرائے کا مکان تھا۔ ایک دفعہ سیلاب آیا تو نچلی منزل میں پڑا سامان جس میں کتابیں بھی تھیں، بھیگ گیا اور اسے خشک کرنے میں خاصے دن لگ گئے۔

والد محترمؒ نے دو شادیاں کی تھیں جن سے ہم بارہ بھائی اور تین بہنیں پیدا ہوئے۔ تین بھائی بچپن میں ہی فوت ہوگئے، نو بھائی جوان ہوئے جو سب کے سب دینی تعلیم سے آراستہ ہیں، عالم ہیں، حافظ ہیں۔ تینوں بیٹیوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کیا، وہ قرآن کریم کی حافظہ اور درس نظامی کی تعلیم سے فیض یافتہ ہیں اور دینی علوم کی تدریس میں مصروف ہیں۔ والد محترمؒ خود حافظ قرآن نہیں تھے مگر سب بیٹوں اور بیٹیوں کو قرآن کریم حفظ کرایا۔ ان سے کوئی پوچھتا کہ حضرت! آپ حافظ ہیں؟ تو جواب میں کہتے کہ ”میں حافظوں کا باپ ہوں“۔

چھوٹی والدہ مرحومہ حضرت والد محترمؒ کے چچا جناب محمد فیروز خان مرحوم کی بیٹی تھیں جن کی رہائش شنکیاری سے آگے حاجی آباد اڈے سے مغرب کی جانب واقع بستی ”کورے“ میں تھی اور اب وہاں ان کے ایک فرزند اور ہمارے ماموں قاری سخی سلطان صاحب رہتے ہیں۔ ہماری دونوں ماؤں نے ایک ہی گھر میں اکٹھے زندگی گزاری، دونوں کے مزاج میں نیکی اور خیر کا غلبہ تھا۔ حضرت والد محترمؒ کے مزاج میں اصول پرستی اور سخت ڈسپلن کا رجحان غالب تھا، اس لیے کبھی کبھار چھوٹے موٹے اختلافات اور ان کے اظہار کے باوجود مجموعی طور پر گھر کا ماحول اتحاد و اتفاق ہی کا تھا۔ گھر کے کاموں میں تقسیم تھی اور نظام بخوبی چلتا رہا۔ کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا اور سب مل کر کھاتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں میں بھی سوتیلے پن کا احساس واضح نہ تھا، ایک دوسرے کے ساتھ محبت پیار اور اعتماد و سلوک کی فضا میں ہم سب جوان ہوئے اور یہ فضا بحمد اللہ تعالیٰ اب بھی قائم ہے۔ لوگوں کے پوچھنے پر ہمیں بتانا پڑتا ہے کہ دونوں ماؤں سے اولاد کی تقسیم کیا ہے

ورنہ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

ہم سب کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم یعنی قرآن کریم حفظ و ناظرہ کا مدرسہ بعد میں قائم ہوا مگر ہمارے گھر میں اس سے بہت عرصہ پہلے سے درسگاہ قائم تھی جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے کے استاذ حضرت والد محترمؒ تھے۔ ان سے گکھڑ کے مختلف گھرانوں کی بچیاں قرآن کریم کا ترجمہ، عربی گرائمر اور درس نظامی کی کتابیں کسی باقاعدہ درجہ بندی کے بغیر پڑھتی تھیں۔ ہماری بہنوں نے درس نظامی کا کم و بیش پورا نصاب ان سے پڑھا۔ ان کے ساتھ بیسیوں دیگر لڑکیوں نے بھی تعلیم حاصل کی۔ ہماری دونوں ماؤں نے قرآن کریم کا ترجمہ ان سے پڑھا۔ میں نے حفظ قرآن کریم کے بعد صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں یعنی میزان الصرف، نحو میر، علم الصیغہ وغیرہ حضرت والد صاحبؒ سے ہی گھر میں پڑھیں بلکہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک تعلیم کے دوران سالانہ چھٹیوں میں وہ گزشتہ سال پڑھی ہوئی کتابوں میں سے ایک دو کا انتخاب کر کے مجھ سے سنتے بھی تھے۔ کم و بیش ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ ان کا اسی طرح کا معاملہ تھا۔ گھر میں ان کا یہ تدریسی سلسلہ اگرچہ دن کے مختلف اوقات میں متفرق ہوتا تھا مگر یہ پوری ایک درسگاہ کا کام تھا جو وہ خاموشی کے ساتھ کرتے جاتے تھے۔

ہماری گھریلو درس گاہ کا دوسرا حصہ وہ تھا جس کی صدر معلمہ ہماری بڑی والدہ مرحومہ تھیں اور ہماری چھوٹی امی مرحومہ بھی اس میں ان کے ساتھ شریک کار رہتی تھیں۔ مختلف گھرانوں کے بچے اور بچیاں ان سے قرآن کریم ناظرہ و حفظ اور قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے تھے۔ والدہ مرحومہ خود حافظہ نہیں تھیں لیکن بہت سی بچیوں نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا۔ ایک بار میں نے ان سے حفظ قرآن کریم کرنے والی طالبات کی مجموعی تعداد پوچھی تو اندازے سے بائیس تیئس کے لگ بھگ بتائی۔ خود میری اہلیہ ام عمار نے، جو چودہ برس کی عمر میں میرے نکاح میں آئیں، قرآن کریم والدہ مرحومہ سے ہی حفظ کیا۔ وقتاً فوقتاً ہم بہن بھائیوں کی منزلیں سننا بھی ہماری دونوں ماؤں کی ڈیوٹی میں شامل تھا، جب کہ بیسیوں بچیوں نے والدہ مرحومہ سے قرآن کریم کا لفظی ترجمہ پڑھا۔ اس درس گاہ میں گکھڑ کے سینکڑوں بچوں اور بچیوں نے والدہ مرحومہ سے فیض حاصل کیا جن میں سابق صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ، سابق آئی جی پنجاب پولیس جناب احمد نسیم چودھری، پاک آرمی ایجوکیشن کور کے سابق بریگیڈیئر جناب محمد علی چغتائی اور وزارت خارجہ کے ایک سابق آفیسر محمد شعبان اپل جیسے نامور حضرات بھی شامل ہیں۔

گکھڑ کی مسجد میں حفظ قرآن کریم کا باقاعدہ مدرسہ محترم الحاج سیٹھی محمد یوسفؒ کی توجہ سے قائم ہوا، وہ گکھڑ سے تین چار میل کے فاصلہ پر گتہ فیکٹری کے مالک تھے اور ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق عطا فرمایا تھا کہ قرآن کریم حفظ و ناظرہ اور تجوید و قراءت کے باقاعدہ مدارس قائم ہوں اور حفظ کے ساتھ ساتھ تجوید کا ذوق بھی عام ہو۔ انہوں نے اس کے لیے ایک باقاعدہ ٹرسٹ قائم کر رکھا تھا اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس پر خرچ کرتے تھے۔ وہ مختلف مقامات پر جاکر خود ترغیب دیتے تھے کہ مسجد میں قرآن کریم کی درس گاہ قائم کر کے استاد رکھا جائے اور استاد کی تنخواہ کا ایک حصہ، نصف، یا تیسرا حصہ، جیسے طے ہوجائے اپنی طرف سے دیا کرتے تھے جب تک کہ وہ مدرسہ خود کفیل نہ ہوجاتا۔ میں ایک زمانے میں گتہ فیکٹری کی کالونی کی مسجد میں جمعہ پڑھایا کرتا تھا۔ اس دور میں اس شعبہ کے انچارج سے میں نے ایسے مدرسوں کی تعداد دریافت کی تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے بتایا کہ ملک بھر میں گیارہ سو کے لگ بھگ مدارس ایسے ہیں جنہیں اس طرح امداد دی جاتی ہے۔ بلکہ یہ اعزاز بھی گکھڑ کے علاقہ کے اس نومسلم خاندان کے اس فرزند (شیخ سیٹھی محمد یوسفؒ) کو حاصل ہوا کہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے بہت سے دیگر علاقوں میں بھی تحفیظ القرآن کے مدارس کا آغاز انہی کی کوشش سے ہوا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک وہاں ایسے مدارس چلائے، بعد میں سعودی حکومت نے ان مدارس کا نظم سنبھال لیا اور اب وہ پوری دنیا میں ایک مثال ہیں۔

مجھے وہ منظر یاد ہے کہ سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے حضرت والد محترمؒ کی مسجد میں جمعہ کے اجتماع کے موقع پر مختصر خطاب میں حفظ قرآن کریم کا مدرسہ قائم کرنے کی ترغیب دی اور اس میں اپنا حصہ شامل کرنے کی پیشکش کی جس پر مدرسہ تجوید القرآن قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور ہمارے پہلے استاد محترم قاری اعزاز الحق امروہیؒ گکھڑ تشریف لائے جنہوں نے اس مسجد میں قرآن کریم کی باقاعدہ کلاس کا آغاز کیا۔ میں اس پہلی کلاس کا طالب علم تھا۔ اس وقت میں پرائمری اسکول میں چوتھی کلاس میں زیر تعلیم تھا اور گھر میں تھوڑی بہت دینی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ مدرسہ قائم ہونے کے بعد میری اسکول کی تعلیم چھڑوا دی گئی اور میں حفظ قرآن کریم کے باقاعدہ طلبہ میں شامل ہوگیا۔ اس مدرسہ میں بعد میں فیصل آباد کے محترم قاری محمد اشرف صاحب، جھنگ کے محترم قاری عبدالرزاق صاحب، گکھڑ کے محترم حافظ احمد حسن مرحوم اور دیگر اساتذہ نے تحفیظ القرآن کی خدمات سرانجام دیں اور ان سب کے بعد ہمارے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب تشریف لائے جنہوں نے ایک عرصہ تک اس درس گاہ کو آباد رکھا اور گکھڑ کے سینکڑوں خاندانوں کے طلبہ اور طالبات کو حفظ قرآن کریم کے زیور سے آراستہ کیا۔ خود میں نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ان سے قرآن کریم پڑھا، اب ربع صدی سے وہ مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور تحفیظ القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب گکھڑ کی مسجد میں رمضان المبارک کے دوران تراویح میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ باہر کے علاقوں سے درآمد کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار رمضان المبارک کا آغاز ہونے پر پہلی رات تراویح سے پہلے حضرت والد محترمؒ نے نمازیوں سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے بہت کوشش کی ہے مگر کہیں سے قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ صاحب دستیاب نہیں ہوئے اس لیے مجبوراً اس سال تراویح آخری دس سورتوں سے پڑھنی پڑے گی۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے خود ہی آخری سورتوں کے ساتھ پورا رمضان المبارک تراویح پڑھائیں اس لیے کہ وہ حافظ نہیں تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ایک دفعہ ہم چند بھائیوں نے اپنے خاندان کے حافظوں کا شمار کیا تو حضرت والد محترمؒ کے بیٹوں، بیٹیوں، نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں میں حفاظ کی تعداد چالیس سے متجاوز نکلی جو اسی مذکورہ مدرسہ کا فیضان ہے۔ بعد میں اس کے ساتھ تجوید وقراءت کا مدرسہ بھی ''قاری کلاس'' کے نام سے قائم ہوا جس کے اولین استاد حضرت مولانا قاری عبدالحلیم سواتی مدظلہ اور حضرت مولانا غلام علیؒ تھے۔ یہ دونوں بزرگ میرے اساتذہ میں شامل ہیں اور مولانا قاری عبدالحلیم سواتی اب خلیجی ریاست بحرین میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

حضرت والد محترمؒ خود حافظ نہیں تھے مگر ان کے آگے کھڑے ہو کر قرآن کریم سنانا سب سے مشکل کام ہوتا تھا۔ وہ حافظ نہ ہونے کے باوجود چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی چھوٹنے نہیں دیتے تھے اور نہ صرف یہ کہ فوری گرفت کرتے تھے بلکہ بعد میں ڈانٹا بھی کرتے تھے۔ مجھے کئی بار بحمد اللہ تعالیٰ انہیں تراویح میں اور تہجد کے نوافل میں قرآن کریم سنانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس وقت رعب و خوف کی جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ دوسرے بھائیوں کو بھی یہ موقع کئی بار ملا ہے کیونکہ حضرت والد محترمؒ، جب تک صحت نے اجازت دی، رمضان المبارک میں سحری کے وقت نوافل میں بھی قرآن کریم سنا کرتے تھے۔

ان کی صحت کے زمانے میں شب و روز کا نظام کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ

- سحری کے وقت اٹھ کر بلاناغہ غسل کرتے تھے اور تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ اس وقت ہماری والدہ مرحومہ بھی بیدار ہو کر تہجد پڑھتی تھیں اور ناشتہ تیار کرتی تھیں۔ اذان فجر کے بعد حضرت والد محترمؒ ناشتہ کرتے تھے جو پراٹھے اور چائے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد مسجد میں چلے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ والدہ مرحومہ بھی مسجد میں چلی جاتی تھیں، اس لیے کہ فجر کی نماز اور درس میں خواتین بھی باقاعدہ شریک ہوا کرتی تھیں اور خواتین کے لیے مسجد میں الگ انتظام

موجود تھا، چنانچہ خواتین فجر کی نماز اور درس کے علاوہ جمعہ کے اجتماع اور تراویح میں بھی کثیر تعداد میں شریک ہوا کرتی تھیں۔

- نماز فجر پڑھانے کے بعد حضرت والد محترمؒ درس دیتے تھے جو تین دن قرآن کریم اور تین دن حدیث کا ہوتا تھا۔ درس عام طور پر نصف سے پون گھنٹے کا ہوتا تھا۔
- اس کے بعد وہ گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھانے کے لیے چلے جاتے تھے جہاں سے دوپہر سے کچھ پہلے واپسی ہوتی تھی۔ کھانا کھا کر اور اخبار پڑھ کر سو جاتے تھے۔ ظہر تک آرام ہوتا تھا۔
- ظہر سے عصر تک اپنی چارپائی پر بیٹھے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے اور اسی دوران بچیاں مختلف اسباق کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔
- عصر کی نماز کے بعد قرآن کریم کی منزل پڑھتے تھے جو عام طور پر روزانہ ایک پارہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی، لیمپ اور لالٹین کے شیشے صاف کرنا، چارپائی کی ڈھیلی ادوائن کو کسنا، پیڑھی وغیرہ اگر قابل مرمت ہے تو اسے ٹھیک کرنا اور اس طرح کے دیگر چھوٹے موٹے کام کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔
- نماز مغرب کے بعد کھانا کھاتے اور مطالعہ کرتے تھے،
- اور عشا کے بعد سردیوں میں مطالعہ کرتے اور گرمیوں میں جلد سونے کی کوشش کرتے تھے۔ نیند سے پہلے انہیں جسم دبوانے کی عادت تھی۔ عام طور پر ہماری والدہ محترمہ دونوں انہیں دبایا کرتی تھیں۔ کبھی ہمیں بھی بلا لیا کرتے تھے اور ہم سب بھائیوں اور بہنوں کو بھی خدمت کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ ہم سے اس دوران قرآن کریم کا کوئی رکوع سن کر اس کے صیغے اور نحوی ترکیبیں پوچھا کرتے تھے۔
- سونے سے پہلے چار معمولات مجھے اچھی طرح یاد ہیں جو ایک عرصہ تک جاری رہے۔ ڈائری میں اس دن کی کوئی نہ کوئی یادداشت تحریر کرتے تھے، پین میں سیاہی بھرتے تھے، ٹائم پیس کا الارم سیٹ کرتے تھے اور جیب کی گھڑی کو چابی دیا کرتے تھے۔
- اس دوران کا ایک اور مستقل معمول بھی تھا کہ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ یعنی نارمل اسکول میں اساتذہ کی جے وی، ایس وی وغیرہ کی کلاس کے شرکا کو گرمیوں میں عصر اور سردیوں میں

عشا کے بعد قرآن کریم کا ترجمہ پڑھاتے تھے۔ یہ اسکول ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جہاں روزانہ پیدل آنے جانے کا ان کا معمول تھا۔ ان کورسز کے شرکا کو روزانہ درس کی صورت میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر سے بہرہ ور کرنے کا سلسلہ بھی کم وبیش ربع صدی تک جاری رہا۔

ایک بار ہم نے ان اداروں سے تعلیم پانے والے حضرات کے اعداد و شمار کا محتاط اندازے سے حساب لگانا چاہا تو خاصی احتیاط کے ساتھ کیے گئے اندازے میں یہ نتیجہ سامنے آیا کہ حضرت مرحوم کے براہ راست شاگردوں کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہوگی جو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی شعبے میں دینی اور تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے دنیا کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً جانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ امریکہ، یورپ، افریقہ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا کا کوئی علاقہ ایسا نہیں دیکھا جہاں ان کا کوئی نہ کوئی شاگرد موجود نہ ہو اور دینی خدمات سرانجام نہ دے رہا ہو۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی زمانے میں ملک کے بعض حصوں سے کچھ دینی اداروں سے فرمائشیں آنا شروع ہوگئیں کہ حضرت والد محترمؒ گکھڑ کو چھوڑ کر کسی بڑے شہر کے تعلیمی ادارے میں منتقل ہو جائیں۔ بڑی تنخواہ اور سہولیات کی پیشکش بھی تھی اور ترقی کے ظاہری مواقع بھی موجود تھے مگر حضرت والد محترمؒ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ وہ دنیوی ترقی اور مفاد کے لیے جگہ تبدیل کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے اور گکھڑ سے انہیں کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ آخر دم تک وہ وہاں سے منتقل ہونے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ شاید اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے بعض دوستوں میں اس بات کی تحریک ہوئی کہ ان کا گکھڑ میں ذاتی مکان ہونا چاہیے اور ۱۹۶۰ء میں یہ مکان تعمیر ہوا جہاں حضرت والد محترمؒ آخر وقت تک مقیم رہے۔ اس مکان کے دو حصے تھے اور دونوں کے دروازے الگ الگ رکھے گئے تھے۔ ایک حصہ والد صاحبؒ نے اپنے لیے بنوایا تھا اور دوسرا حصہ چچا محترم حضرت صوفی صاحبؒ کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس حصے میں صرف ایک بیٹھک اور ڈیوڑھی تعمیر ہوئی اور باقی حصہ چھوڑ دیا گیا کہ جب حضرت صوفی صاحبؒ کی شادی ہوگی تو اس موقع پر ان کے لیے تعمیر کیا جائے گا۔

والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں گکھڑ آ گئے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا قیام ۱۹۵۲ء کے دوران عمل میں لایا گیا۔ اس سے قبل حضرت والد صاحب گکھڑ کی مرکزی جامع مسجد میں، جو اس وقت مسجد بوہڑ والی کہلاتی تھی، طلباء کو پڑھاتے تھے۔ پرانے مدرسوں کی طرز پر طلباء کی ایک تعداد مختلف علاقوں سے جمع

ہوجاتی تھی اور والد صاحب انہیں صبح سے شام تک درس نظامی کے اسباق پڑھاتے تھے۔ اس دور میں درجہ بندی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی آج کے مدارس کی طرح کوئی باقاعدہ نظم ہوتا تھا، طلباء آجاتے تھے، مسجد سے متعلقہ نمازی انہیں گھروں سے اس طرح کھانا مہیا کر دیتے تھے کہ کچھ طلباء خود ان کے گھروں سے کھانا لاتے تھے اور سب مل کر کھالیتے تھے۔ مسجد جائے قیام ہوتی تھی اور استاذ محترم پڑھا دیا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کا عام سطح کے مدارس کا نظم ہوتا تھا اور جس مسجد میں بھی کوئی تدریسی مزاج اور صلاحیت رکھنے والے صاحب خطیب وامام ہوتے تھے، وہاں ان کے اردگرد طلباء کی ایک جماعت موجود ہوجاتی تھی۔

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے باقاعدہ قیام کے بعد گکھڑ کا یہ درس ختم ہوگیا اور حضرت والد محترم مدظلہ نے اسباق کے لیے گوجرانوالہ جانا شروع کر دیا جہاں وہ ۲۰۰۰ء تک مسلسل تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں الحاج سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم آف گتہ مل راہ والی کی توجہ اور تعاون سے تجوید القرآن کے نام سے حفظ قرآن کریم کا مدرسہ گکھڑ کی مذکورہ مسجد میں قائم ہوا جس میں قرآن کریم حفظ وناظرہ کی باقاعدہ کلاس شروع ہوئی اور مقامی بچوں اور بچیوں کے ساتھ کچھ مسافر طلباء بھی رہنے لگے۔ اس مدرسہ کی سب سے پہلی کلاس میں میرا نام بھی شامل ہے، میں نے حفظ قرآن کریم اسی مدرسہ میں اکتوبر ۱۹۶۰ء میں مکمل کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد "قاری کلاس" کے نام سے تجوید وقراءت کا کورس شروع ہوا۔ میں اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم میں درس نظامی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اس لیے قاری کلاس سے استفادہ نہ کر سکا، البتہ اس کلاس کے دو استاذوں سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ حضرت مولانا غلام علی صاحبؒ سے میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم کی تعطیلات کے دوران گلستان سعدی اور فصول اکبری پڑھی اور حضرت مولانا قاری عبدالحلیم سواتی صاحب سے، جو آج کل بحرین میں ہوتے ہیں، کچھ روز قراءت میں مشق کی۔ طلباء کی تعداد زیادہ ہونے پر اس کلاس کے لیے ایک الگ مکان کرایے پر لیا گیا اور بعد میں نت کلاں روڈ پر، جسے اب بلدیہ گکھڑ نے "مولانا سرفراز خان روڈ" کا نام دے دیا ہے، عیدگاہ کے ساتھ مدرسہ کی باقاعدہ عمارت تعمیر کی گئی جہاں تجوید وقراءت اور اس کے بعد درس نظامی کے مختلف درجات کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت والد صاحب مدظلہ کی صحت نے جب تک اجازت دی، مدرسہ کے معاملات کی خود نگرانی کرتے رہے اور ان کی معذوری کے بعد ہمارے چھوٹے بھائی مولانا حماد الزہراوی سلمہ اس ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہیں جو اچھے تعلیمی، اصلاحی اور تربیتی ذوق سے بہرہ ور ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ دونوں میرے بزرگ تھے، استاد تھے، مربی تھے،

مشفق تھے اور دعاگو تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کے مزاج میں سختی تھی، رعب تھا اور دبدبہ تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے انداز میں نرمی، بے پروائی اور چشم پوشی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ ان دونوں رویوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے اپنے موقع پر دونوں کام دکھاتے ہیں۔ میں اپنے دورِ طالب علمی کے چند واقعات یاد کرتا ہوں تو سختی اور نرمی کے یہ دونوں رویے میری شخصیت کی تشکیل میں کار فرما دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے لکھنے پڑھنے کی عادت طالب علمی کے زمانہ میں ہی تھی۔ مضامین لکھنا، خبریں بنانا اور اخبارات میں پہنچانا اور پھر ان کی اشاعت پر خوش ہونا اسی دور سے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ اس زمانہ میں پاکستان کے قومی اخبارات میں نسیم حجازی مرحوم کا روزنامہ کوہستان خاصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک بار میرا ایک مضمون روزنامہ کوہستان میں ادارتی صفحہ پر شائع ہوا جس نے میرا دماغ خراب کر دیا اور میں نے دماغ کی اس خرابی میں ایک تعلیمی سال ضائع کر دیا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میرے مضامین ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع ہوتے تھے اور میں روزنامہ وفاق لاہور کا باقاعدہ نامہ نگار بن گیا تھا۔ ''کوہستان'' کے ادارتی صفحے پر مضمون کی اشاعت نے میرے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی کہ میرا اصل میدان صحافت ہے، اس لیے تعلیم و تعلم میں میری توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ حضرت والد صاحبؒ یہ دیکھ کر مجھے مدرسہ سے اٹھا کر گکھڑ میں گھر لے آئے اور وہاں اپنی نگرانی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں گکھڑ کے مدرسہ میں استاذ حضرت مولانا غلام علی صاحبؒ سے میں نے فصول اکبری اور گلستان کا کچھ حصہ پڑھا اور حضرت مولانا قاری عبد الحلیم سواتی مدظلہ سے قرآن کریم کے کچھ حصے کی مشق کی۔ حضرت والد صاحب کا انداز سختی کا ہوتا تھا اور سختی کے سارے حربے وہ اختیار کیا کرتے تھے جس سے میں بے بسی کے عالم میں ایک روبوٹ کی طرح تعمیل حکم تو کر لیا کرتا تھا مگر سوچ سمجھ کے دروازے اکثر بند ہی رہتے تھے، اس لیے یہ سختی مجھ پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس دوران ایک روز گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آیا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے پاس بٹھا کر مجھے بڑی شفقت سے سمجھایا اور ان کی یہ بات میرے دل و دماغ میں نقش ہو گئی کہ بیٹا! صحافت اور خطابت لوگوں تک کوئی بات پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ضرور آدمی کے پاس ہونا چاہیے لیکن پہنچانے کے لیے کوئی چیز بھی پاس موجود ہونی چاہیے۔ اگر اپنے پاس کچھ ہوگا تو دوسروں تک پہنچاؤ گے اور اگر اپنا سینہ علم سے خالی ہوگا تو دوسروں کو کیا دو گے؟ ٹونٹی کتنی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہی چیز باہر نکالے گی جو ٹینکی میں ہوگی اور اگر ٹینکی میں کچھ نہیں ہوگا تو ''شاں شاں'' کرے گی۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے اس محبت بھرے لہجہ اور

"شاں شاں" کی مثال نے ایک لمحے میں دل و دماغ کا کانٹا بدل دیا۔

دوسری طرف سختی کی کار فرمائی بھی دیکھ لیجئے کہ غالباً ہمارا کافیہ کا سال تھا، میرے ایک ہم سبق ذہین ساتھی نے میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کرلی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی میٹرک کا امتحان دینے کا شوق ہوا۔ میں نے سوچا کہ امتحان دے کر باقی مضامین تو نکال ہی لوں گا، انگریزی اور حساب میں کمپارٹ آجائے گی تو ان کے لیے تیاری کر کے اگلے سال امتحان دے دوں گا۔ میں نے ذہنی طور پر تیار ہو کر امتحان کے فارم حاصل کیے۔ حضرت والد صاحبؒ کو کسی ذریعے سے پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھے بلا کر سختی سے ڈانٹ دیا بلکہ امتحان دینے کی صورت میں لاتعلقی کی دھمکی دے دی۔ میں نے امتحان کا ارادہ ترک کر دیا مگر دل میں غصہ ضرور باقی رہا۔ میرے اس ساتھی نے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مدرسہ کی لائن چھوڑ دی اور عصری تعلیم کی طرف منتقل ہو گئے اور ایک عرصہ بعد ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر ملے تو حسرت اور پشیمانی کے ساتھ کہنے لگے کہ کاش! میں نے میٹرک کا امتحان نہ دیا ہوتا تو آج آپ کی طرح دینی خدمات سرانجام دے رہا ہوتا۔ ان کی اس حسرت نے میرے اس حساس اور سوچ کو پختگی دی جو میرے ذہن میں پہلے سے آچکی تھی کہ حضرت والد صاحبؒ کی سختی میرے کام آگئی کہ اگر وہ مجھے میٹرک کے امتحان سے سختی کے ساتھ نہ روکتے تو میں عصری تعلیم میں ضرور آگے نکل چکا ہوتا مگر دینی تعلیم کی لائن سے نکل جاتا اور دینی علوم کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کا جو موقع مل رہا ہے، عالم اسباب میں اس سے محروم ہو جاتا۔ میں دینی علم کے ساتھ میٹرک، ایف اے وغیرہ کا مخالف نہیں ہوں بلکہ اس بات کا داعی ہوں۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم بھی ضروری ہیں کیونکہ ان کے بغیر آج کے دور میں دین کی صحیح خدمت ممکن نہیں ہے لیکن اگر عصری تعلیم دینی تعلیم چھوڑنے کا باعث اور ذہانت و صلاحیت کے دوسری طرف منتقل ہو جانے کا ذریعہ بن جائے تو اس کے حق میں بہرحال نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے حضرت والد صاحبؒ کی یہ سختی مجھے اچھی لگی اور اس پر ان کے لیے ہمیشہ دعاگو رہوں گا۔

حضرت والد صاحبؒ کی سختی کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۶۹ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے فراغت حاصل کی۔ اس سے قبل ہی میں مرکزی جامع مسجد میں حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی نیابت کے لیے منتقل ہو چکا تھا اور اس وقت میرا شمار جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم حضرات میں ہوتا تھا۔ ضلعی بلکہ ڈویژنل سطح پر میری سرگرمیاں جاری تھیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس کے بعد کچھ عرصہ (کم و بیش دس سال) تک مجھ پر دو باتوں کی سختی قائم رکھی۔ ایک یہ کہ میں رمضان المبارک میں تراویح میں

قرآن کریم سنا رہا ہوں یا نہیں۔ ایک دو ماہ قبل ہی پوچھنا شروع کر دیتے کہ کہاں سنا رہے ہو؟ منزل دہرا رہے ہو یا نہیں؟ کتنے پارے دہرائے ہیں؟ پھر رمضان المبارک کے دوران متعدّد بار پوچھتے کہ کتنے پارے ہوئے ہیں؟ کب ختم کر رہے ہو؟ کتنی غلطیاں آتی ہیں؟ یہ اسی سختی کی برکت ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ میں نے تیس سال تراویح میں قرآن کریم سنایا ہے اور کم وبیش سات یا آٹھ دفعہ سحری میں حضرت والد صاحبؒ کو نوافل میں سنانے کی سعادت حاصل کی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سختی نہ ہوتی تو یہ سعادت بھی حاصل نہ ہوتی۔ اسی طرح مدرسہ نصرۃ العلوم سے فراغت کے بعد حضرت والد صاحبؒ کی کوشش تھی کہ میں مدرسہ انوار العلوم میں، جو ۱۹۲۶ء سے قائم ہے اور حضرت والد صاحبؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ نے ۱۹۳۷ ء سے ۱۹۴۰ء تک اسی میں تعلیم حاصل کی ہے، کچھ نہ کچھ ضرور پڑھاتا رہوں۔ چنانچہ ان کی اس خواہش بلکہ اصرار پر میں نے مدرسہ انوار العلوم میں تقریباً بیس سال اس طرح تدریس کی کہ میری یہ ڈیوٹی اعزازی ہوتی تھی اور اپنی مرضی کے دو تین سبق پڑھاتا تھا، مگر حضرت والد صاحبؒ کی طرف سے یہ لازمی ہوتی تھی اور اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً دریافت کرتے رہتے تھے۔ ابتداءً مجھے یہ سختی اچھی نہیں لگتی تھی اور بہت غصہ آتا تھا مگر آہستہ آہستہ مزاج بنتا گیا اور طبیعت عادی ہوگئی تو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ سختی ضروری تھی اور آج سوچتا ہوں کہ اگر یہ سختی نہ ہوتی اور میں اپنی آزادی پر قائم رہتا تو آج جو کچھ تھوڑا بہت تدریسی ذوق و مزاج ہے، یہ یقیناً نہ ہوتا۔

اس زمانے میں میرا معمول یہ تھا کہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مختصر درس دیتا اور اسی مصلے پر بیٹھا دو تین سبق پڑھا دیتا جو عام طور پر فقہ، اصول فقہ اور ادب کے ہوتے تھے۔ گھر سے چائے یا قہوہ کا ایک تھرموس آجاتا، میں اسے پیتا رہتا اور پڑھاتا رہتا۔ اس کے بعد میں اپنی جماعتی اور تحریکی سرگرمیوں کے لیے سارا دن فارغ ہوتا تھا۔ اس دور میں الحمد للہ یہ ہمت بھی تھی کہ رات کو کسی دور دراز شہر میں جلسہ میں شریک ہوتا، اس کے بعد سفر کر کے فجر سے قبل گوجرانوالہ پہنچتا، نماز سے قبل مطالعہ کرتا اور نماز کے بعد پڑھانے بیٹھ جاتا۔ ایسا سالہا سال تک ہوتا رہا ہے مگر اب ہمت نہیں رہی اور رات کو چار پانچ گھنٹے نیند نہ ملے تو صبح پڑھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہماری تعلیم و تربیت کے حوالہ سے حضرت والد صاحبؒ کے ذوق کے ایک اور پہلو کا ذکر بھی کر دوں تو مناسب رہے گا۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کی بات ہے، میرے ایک شاگرد اور ساتھی نے مجھے ورغلایا کہ مسجد کی تنخواہ پر کب تک گزارا ہوگا، کوئی کاروبار ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کی ترغیب پر میں نے کچھ دوستوں سے قرض لیا اور ہم نے مل کر جی ٹی روڈ پر دین پلازہ کے عقب میں ایک کرائے کی دوکان میں سلور کی تار بنانے کا اڈہ بنا

لیا۔ سلور کی موٹی تار لیتے، اس کو باریک کرتے اور دوکانداروں کو فروخت کرتے۔ اس کو ہم نے مدنی اسٹیل ورکس کا نام دیا۔ خیال تھا کہ آگے چل کر اسے ترقی دیں گے مگر ۱۹۷۵ء کے اواخر میں میری گرفتاری ہو گئی، اس لیے کہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے ملک گیر کنونشن کے موقع پر تقاریر کی بنیاد پر جمعیۃ کے اکثر رہنماؤں کے خلاف ۱۶ ایم پی او کے تحت مقدمات درج ہو گئے جن میں مقامی صرف میں تھا۔ اس وقت میں جمعیۃ کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا۔ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس مقدمہ میں قبل از گرفتاری ضمانت نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ باقی سب حضرات دور دراز کے تھے اور گرفتار نہ ہو سکے مگر میں مقامی تھا اس لیے مجھے سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنا پڑا اور کم و بیش ڈیڑھ ہفتہ گوجرانوالہ جیل میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہا ہوا۔ اسی کنونشن کی پاداش میں مدرسہ نصرۃ العلوم کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا سرکاری اعلان ہوا تو اس کے خلاف ہم نے مزاحمتی تحریک شروع کی اور میں سینکڑوں دیگر علما اور کارکنوں کے ہمراہ دوبارہ گرفتار ہو کر کم و بیش ساڑھے تین ماہ تک جیل میں رہا۔ بالآخر حکومت کو اپنا نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا۔

اس کے بعد ملکی سطح پر پاکستان قومی اتحاد بنا اور انتخابات کی مہم چل پڑی، میں قومی اتحاد کی صوبائی قیادت میں تھا۔ الیکشن ہوا، اس کے بعد حکومت کے خلاف تحریک چلی، اس میں بھی میری گرفتاری ہو گئی۔ پھر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو ہمیں کچھ سانس لینے کا موقع ملا۔ میرا سال ڈیڑھ سال اسی مصروفیت میں گزر گیا، فراغت ہوئی اور کاروبار کی طرف دیکھا تو وہ میرے ساتھی سمیت غائب ہو چکا تھا اور قرض میرے سر پر تھا۔ مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ گھر جا کر حضرت والد صاحبؒ سے بات کی اور صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی قدرے شکوہ کے انداز میں عرض کیا کہ میں نے کاروبار کے آغاز میں آپ کو وہاں تشریف آوری کی زحمت دی تھی اور دعا کی درخواست کی تھی۔ آپ تشریف بھی لائے تھے مگر میرا خیال ہے کہ آپ نے دعا نہیں کی تھی، اگر آپ دعا کرتے تو میرا یہ حشر نہ ہوتا۔ میری یہ بات سن کر فرمانے لگے تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں تمہارے کہنے پر آیا تھا اور مٹھائی بھی کھائی تھی مگر دعا نہیں کی تھی اس لیے کہ میں نے تمہیں سالہا سال تک تعلیم سلور کی تار بنانے کے لیے نہیں دلائی تھی بلکہ اس لیے پڑھایا تھا کہ کہیں آرام سے بیٹھ کر روکھی سوکھی کھاؤ اور اللہ کا دین پڑھاؤ۔ ان کی یہ بات سن کر میرے دل کا سارا بوجھ اتر گیا اور ذہن کو یکسوئی حاصل ہو گئی جو بحمد اللہ آج تک کام آ رہی ہے اور آخر دم تک ان شاء اللہ تعالیٰ مشعل راہ رہے گی۔

حضرت والد محترمؒ کی سرگرمیوں کا ایک بڑا دائرہ تصنیف و تالیف کا تھا۔ ان کی پچاس کے لگ بھگ علمی و تحقیقی تصانیف ہیں جو ملک بھر سے ہی نہیں، عالمی سطح پر بھی خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ باقی سارے

کاموں سے الگ کر کے صرف ان کے تصنیفی کام کو دیکھا جائے تو یہ ایک پورے ادارے اور اکادمی کا کام ہے جو تن تنہا انہوں نے سرانجام دیا ہے۔ ان کی تحقیق کا معیار یہ تھا کہ ایک ایک حوالے کے لیے کئی کئی لائبریریوں کا رخ کرتے اور جب تک خود دیکھ کر تسلی نہ کر لیتے، اس کا اندراج نہیں کرتے تھے۔ ایک ایک بات پر درجنوں حوالے دیتے جو بقید صفحات ہوتے۔ ان کا ذوق یہ تھا کہ اہل سنت، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، قادیانی، منکرین حدیث اور دیگر مذہبی گروہوں کے درمیان اختلافی مسائل پر انہوں نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بعض خاصی ضخیم بھی ہیں، لیکن انداز تحریر علمی، تحقیقی اور شستہ ہے۔ وہ دیوبندی مسلک کے علمی ترجمان تھے اس لیے مسلکی حوالے سے جو بھی اختلافی مسئلہ انہوں نے دیکھا، اس پر لکھا اور خوب لکھا۔ موقف میں پختگی ہوتی تھی اور اس کا بے لچک اظہار کرتے تھے لیکن لہجہ اور اسلوب بیان لچک دار اور نرم ہوتا تھا اور اس کی اپنے شاگردوں کو اکثر تلقین کیا کرتے تھے کہ موقف مضبوط رکھو اور اسلوب بیان، الفاظ اور انداز انتہائی نرم ہو۔ اپنے مخالفین کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ بات کا جواب دلیل سے دیتے تھے اور اس میں ذاتی مخالفت کا انداز پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ادیبانہ چھیڑ چھاڑ اور طنز و مزاح ضرور کرتے تھے جو ان کی تحریروں میں جابجا جھلکتا ہے لیکن طعن و تشنیع اور تمسخر و استہزا کے عادی نہیں تھے۔ وہ طنز و مزاح اور تمسخر و استہزا کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔

اس پر ایک تاریخی شہادت کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے معروف محقق اور دانش ور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم ایک دور میں منکرین حدیث میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے حدیث رسولؐ کے حجت ہونے کے خلاف ''دو اسلام'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں احادیث نبویہؐ پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں برصغیر کے بہت سے سرکردہ علما نے کتابیں لکھیں اور والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے بھی ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں گرفتاری کے بعد ملتان سنٹرل جیل میں اسارت کے دوران ''صرف ایک اسلام'' کے نام سے اس کا جواب تحریر کیا۔ ڈاکٹر برق مرحوم نے حضرت والد صاحبؒ کے نام اپنے خط میں اعتراف کیا کہ ان کی کتاب ''صرف ایک اسلام'' نے اپنے تحقیقی انداز اور شستگی کے باعث انہیں یعنی ڈاکٹر برق کو اپنی بہت سی باتوں پر از سر نو غور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ خیر اس کے بعد تو کایا ہی پلٹ گئی اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم بالآخر اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتے ہوئے حدیث کی تاریخ اور حجیت پر ایک مستقل کتاب ''تاریخ حدیث'' لکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے، اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین۔

اس سلسلے میں میرا اپنا واقعہ یوں ہے کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں ایک بار رؤیت ہلال میں شہادت کے مسئلہ پر علماء کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اخبارات و رسائل میں مضامین و بیانات شائع ہونے لگے۔ مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ اہل حدیث مکتب فکر کے بڑے علما میں سے تھے، بڑے مناظر تھے اور خالص مناظرانہ مزاج رکھتے تھے۔ بعد میں میری ان سے خاصا عرصہ نیاز مندی رہی ہے اور ان کی شفقت اور دعاؤں سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ اس زمانے میں ان کا ایک مضمون غالباً روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا جو ہمارے موقف کے برعکس تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کا جواب لکھا اور تصحیح کے لیے والد صاحب کو دکھایا جس پر مجھے ان کی سخت ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑا اور یوں یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا مگر بات صرف ہاتھ اٹھانے تک رہ گئی۔ میں نے اس جوابی مضمون میں مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ کے مضمون کا ایک جملہ اس انداز میں لکھا تھا کہ "حافظ عبد القادر لکھتا ہے"۔ والد صاحب نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ

"وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے؟ ہو سکتا ہے عمر میں تمہارے باپ سے بھی بڑا ہو۔ اس لیے اس طرح لکھو کہ مولانا حافظ عبد القادر روپڑی یوں لکھتے ہیں مگر مجھے ان کی اس بات سے اختلاف ہے۔"

اسی طرح یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلکی اختلافات زندگی بھر حضرت والد محترم کا موضوع گفتگو رہے ہیں۔ انہوں نے مسلک کے ہر پہلو پر لکھا ہے اور بیان بھی کیا ہے۔ دیوبندی بریلوی اختلافات ہوں، سنی شیعہ کشمکش ہو، حنفی اہل حدیث تنازعات ہوں، حجیت حدیث کا مسئلہ ہو یا حیات و ممات اور سماع اموات کا عنوان ہو، ان میں سے شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انہوں نے نہ لکھا ہو اور بیان نہ کیا ہو۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا بلکہ حق ادا کر دیا لیکن پبلک اجتماعات میں وہ ان موضوعات پر خطاب نہیں کرتے تھے۔ کسی بیان میں ضمناً کوئی بات آ گئی ہو تو مسئلہ کی وضاحت کی حد تک ان کا بیان دو ٹوک ہوتا تھا لیکن کسی اشد مجبوری کے بغیر کسی اختلافی مسئلہ کے موضوع پر عام اجتماعات میں وہ بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ اختلافی مسائل پر وہ کتابوں کی صورت میں اظہار خیال کرتے تھے، سبق میں تفصیل سے بحث کرتے تھے اور درس میں بھی مسائل کی وضاحت دلائل کے ساتھ کیا کرتے تھے لیکن عام اجتماعات میں، پبلک جلسوں میں حتیٰ کہ جمعۃ المبارک کے خطبات میں بھی ان کی گفتگو کے عنوانات اصلاحی ہوتے تھے۔ عقائد کی اصلاح، سنت کی اہمیت، دین کی اہمیت، حلال و حرام کا فرق اور عادات و اخلاق کی اصلاح ان کی پبلک تقریروں کے موضوعات ہوتے تھے اور اس دوران ضمناً کوئی اختلافی مسئلہ آ

جاتا تو اس کی وضاحت بھی کر دیا کرتے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ کے خلیفہ مجاز اور ہمارے محترم دوست حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری نے حضرت والد صاحبؒ کی وفات پر ماہنامہ ”بینات“ کراچی میں اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے عرض کیا کہ اپنے مسلک کے لیے آدمی کو متعصب ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ متعصب نہیں بلکہ متصلب ہونا چاہیے۔ پھر دونوں میں فرق یہ بیان کیا کہ متعصب کے نزدیک دوسری کوئی بات قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ متصلب اگرچہ اپنے اکابر کے موقف پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے لیکن اگر کوئی دوسری بات دلیل سے سمجھ میں آجائے تو اسے قبول کرنے میں اسے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو دونوں بزرگوں یعنی والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کی عملی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں حضرت والد صاحبؒ نے فاتحہ خلف الامام پر اپنی ضخیم کتاب ”احسن الکلام“ کی تلخیص مجھ سے اپنی نگرانی میں کرائی جو ”اطیب الکلام“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر دو تین صفحات کا پیش لفظ میں نے خود تحریر کیا جو کتابچہ میں موجود ہے اور مجھے یاد ہے کہ میرے لکھے ہوئے پیش لفظ میں حضرت والد صاحب نے صرف ایک جملہ کی اصلاح کی تھی۔ میں نے ایک جگہ ”بیک بندش چشم“ کی اصطلاح استعمال کی تھی جسے انہوں نے ”چشم زدن“ کے محاورہ سے بدل دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنی تصنیف ”فیوضات حسینی“ کی تسوید و ترتیب کے کام میں مجھے شریک کیا اور اس کا بیشتر حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی نگرانی میں ان کی ہدایات کے مطابق میں نے مرتب کیا جس پر مجھے انہوں نے پارکر کا ایک خوبصورت قلم انعام میں دیا۔ دونوں بزرگوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ میں ان کے تصنیف و تحقیق کے کام میں ان کا معاون اور دست راست بنوں مگر کسی شخص کے لیے اپنے ”خون کا گروپ“ خود اختیار کرنے کی سہولت اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی اور میرے خون کے جراثیم قدرے مختلف تھے، اس لیے اس فطری تنوع نے میری تحریر و تقریر کا میدان کسی حد تک ان سے مختلف کر دیا۔ جمعیۃ طلباء اسلام اور جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر سیاسی سرگرمیوں میں متحرک ہو جانے کے بعد میرے فکر و نظر کا زاویہ قدرے مختلف ہو چکا تھا اور میرے لکھنے پڑھنے کے موضوعات میں اسلامی نظام کی اہمیت و ضرورت، مغربی فلسفہ و ثقافت کی یلغار، اسلام پر مغرب کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات، آج کے عالمی تناظر میں اسلامی احکام و قوانین

کی تشریح، اسلامائزیشن کے علمی وفکری تقاضے، نفاذ اسلام کے حوالے سے دینی حلقوں کی ضروریات اور ذمہ داریاں، اسلام دشمن لابیوں کی نشان دہی اور تعاقب اور ان حوالوں سے طلبہ، دینی کارکنوں اور باشعور نوجوانوں کی راہ نمائی اور تیاری کو اولین ترجیح کا درجہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ گزشتہ پینتالیس برس سے انہی موضوعات پر مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ راسخ العقیدہ سنی، شعوری حنفی اور متصلب دیوبندی ہوں اور اپنے دائرہ کار کو کراس کیے بغیر ان مسائل پر سنجیدہ کام کرنے والوں سے حتی الوسع تعاون اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہتا ہوں، مگر میرا اپنا دائرۂ کار وہی ہے جس کا اوپر ذکر کر چکا ہوں اور اسی دائرے میں آخر وقت تک محنت کرتے رہنے کو اپنے لیے باعث سعادت ونجات سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہ بات خوشی کا باعث ہے کہ میرے چھوٹے بھائی اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے استاذ حدیث مولانا عبد القدوس خان قارن سلمہ نے حضرت والد محترم کے ذوق کا میدان سنبھال رکھا ہے اور وہ مسلسل اس خدمت کو پوری محنت اور ذوق کے ساتھ سرانجام دیتے چلے آ رہے ہیں، مگر اس کے باوجود اس بات کی خود مجھے شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ حضرت والد محترم کی تحقیقات وتصنیفات میں مختلف حوالوں سے علمی ابحاث اور معلومات کا جو ذخیرہ بکھرا ہوا ہے، اسے اختلافی مسائل کے تناظر سے ہٹ کر مثبت انداز میں بھی سامنے لایا جائے تاکہ وہ لوگ جو کسی بھی وجہ سے اختلافی مسائل کے حوالے سے مطالعہ کا ذوق نہیں رکھتے وہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ بلکہ میرے سامنے اس کی افادیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ مباحث اگر مثبت انداز میں از سر نو مرتب ہو جائیں تو نہ صرف دینی مدارس کے مدرسین بلکہ کالجوں میں اسلامیات کے اساتذہ کے لیے بھی بہت مفید ہوں گے بلکہ آج کے عمومی حالات کے تناظر میں دینی مدارس اور عصری کالجوں کے دینیات کے نصاب میں تبدیلی، اصلاح اور ترمیم واضافہ کے لیے جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس پر کسی درجے میں کام بھی ہو رہا ہے، اس میں یہ علمی ذخیرہ نئی نصاب سازی کے لیے ایک بہتر بنیاد بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب میرے بڑے بیٹے حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ وایم اے انگلش پنجاب یونیورسٹی) نے بتایا کہ وہ اپنے دادا محترم کی تصنیفات پر اس حوالے سے کام کر رہا ہے اور اس نے اس سلسلے میں چند مجموعوں کا نقشہ بھی تیار کر لیا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ چنانچہ ”فن حدیث کے اصول ومبادی“ کے عنوان پر ان مباحث کا ایک مسودہ میں خود لے کر حضرت والد محترمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور اس کام کی تکمیل اور کامیابی

کے لیے دعا فرمائی۔ بعد میں عزیزم عمار خان سلمہ بھی ان کی خدمت میں اس کی باقاعدہ اجازت کی درخواست کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے اجازت کے ساتھ دعاؤں سے نوازا۔

میرے دل میں ایک کسک شروع سے رہی ہے کہ میں اپنی علمی وفکری تگ وتاز کا میدان مختلف ہو جانے کے باعث حضرت والد محترم کا ان کی جدوجہد کے میدان میں معاون نہیں بن سکا۔ اس کسک کے ایک پہلو کی کسی حد تک تسکین برادرم مولانا عبد القدوس قارن سلمہ، عزیزم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی سلمہ، برادرم مولانا عبد الحق خان بشیر سلمہ اور برادرم مولانا قاری حماد الزہراوی سلمہ کی مسلکی سرگرمیاں دیکھ کر ہوتی رہتی ہے، جبکہ دوسرے پہلو کی تسکین کا سامان عزیزم عمار خان سلمہ نے فراہم کر دیا ہے اور میں پورے اطمینان اور خوشی کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے محفوظ رکھیں، اس کار خیر کی جلد از جلد تکمیل کی توفیق دیں اور اپنی صلاحیتوں کو دین حق کی خدمت کے لیے صرف کرتے رہنے کے مواقع، توفیق، اسباب اور پھر قبولیت و رضا سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت والد محترمؒ فروعی معاملات میں اختلاف کا حق خود بھی استعمال کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حق دیتے تھے۔ اس پر ایک پورا مضمون لکھا جا سکتا ہے مگر اس کی چند جھلکیاں ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

ان کا بیعت کا تعلق حضرت مولانا حسین علیؒ سے تھا جو تشہد میں رفع سبابہ کے قائل نہیں تھے، مگر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم ان کے سامنے رفع سبابہ "ٹکا کے کرتے تھے اور ایک دفعہ انہوں نے اپنے شیخؒ سے اس پر بحث بھی کی۔

وہ نماز عید سے قبل تقریر کو بدعت کہتے تھے اور زندگی میں کبھی نہیں کی۔ ان کا معمول تھا کہ عید گاہ میں جاتے ہی نماز پڑھاتے، پھر خطبہ پڑھتے اور اس کے بعد ٹھیٹھ پنجابی میں گھنٹہ پون گھنٹہ خطاب کرتے تھے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ان کا معمول یہی رہا ہے، جب کہ حضرت صوفی صاحبؒ سمیت ہم سب کا معمول عید سے پہلے تقریر کرنے کا ہے جو حضرت والد صاحبؒ کے علم میں تھا اور وہ کبھی کبھی ہمیں کہتے بھی تھے کہ یہ بدعت ہے لیکن بات کبھی اس سے آگے نہیں بڑھی۔ ابھی اسی سال عید الاضحی کی بات ہے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو نماز عید کے وقت کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں نے بتایا کہ میں نے اتنے وقت پر عید پڑھائی ہے۔ فرمایا، بہت دیر سے پڑھائی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم نے پہلے تقریر بھی کرنا ہوتی ہے۔ فرمانے لگے، یہ بدعت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نماز کے بعد تقریر سنتا کوئی نہیں ہے۔ فرمایا کہ مروان بن الحکمؒ نے بھی یہی عذر پیش کیا تھا۔ میں نے گزارش کی، اس نے عربی خطبہ کے بارے میں کہا

تھا اور ہم عربی خطبہ نماز کے بعد ہی پڑھتے ہیں۔ فرمانے لگے، لوگ تقریر کو بھی خطبے کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بس ہمارا اتنا ہی مکالمہ ہوا، اس کے بعد گفتگو کا رخ کسی اور طرف ہو گیا۔

حضرت والد صاحبؒ نماز تراویح کے بعد، وتر کے بعد یا نفلوں کے بعد کسی موقع پر بھی اجتماعی دعا کے قائل نہیں تھے اور اسے بدعت کہتے تھے۔ میں بھی جب تک گکھڑ میں رہا یہی معمول رہا، مگر جب گوجرانوالہ کی جامع مسجد میں قرآن کریم سنانا شروع کیا تو وہاں دعا کا معمول تھا۔ حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ حضرت والد صاحبؒ کے استاد تھے۔ ان سے پوچھا تو فرمایا کہ تراویح یا وتروں یا نفلوں کے بعد ایک دعا ضرور ہو جانی چاہیے۔ میں نے تینوں سے فراغت کے بعد یعنی نفلوں کے بعد ایک اجتماعی دعا کا معمول بنا لیا جو حضرت والد صاحبؒ کے نزدیک صریح بدعت تھی۔ حضرت والد صاحبؒ کو پتہ چلا تو پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کے استاد محترمؒ سے اجازت لے لی ہے۔ اس سلسلے میں لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد جب میری جگہ عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے قرآن کریم سنانا شروع کیا تو اس نے اپنے دادا محترم کے فتویٰ پر عمل شروع کر دیا اور نوافل کے بعد دعا مانگنا ترک کر دی۔ میں ان دنوں عمرے پر گیا ہوا تھا، نمازیوں میں خلفشار پیدا ہو گیا اور میری واپسی تک اچھی خاصی گہما گہمی ہو گئی۔ میں نے واپس آکر صورت حال دیکھی تو اس مسئلہ پر نمازیوں سے مستقل خطاب کیا کہ عمار خان ناصر اگر تراویح یا نوافل کے بعد دعا نہیں مانگتا تو یہ اس کے دادا محترمؒ کے فتویٰ کے مطابق ہے، اور میں مانگتا ہوں تو اپنے دادا استاد کے فتویٰ کے مطابق مانگتا ہوں، یہ بھی درست ہے۔ اس لیے وہ نماز پڑھائے گا تو دعا نہیں مانگے گا اور میں پڑھاؤں گا تو دعا مانگوں گا۔ اس میں کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہیے۔ بعض دوستوں نے کہا آپ عمار خان ناصر کو حکماً کہیں کہ وہ دعا ضرور مانگا کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایسے معاملات میں حکم اور جبر کو درست نہیں سمجھتا اور وہ بھی مولانا سرفراز خان کا خون ہے۔ بات صرف دلیل کی سنے گا، حکم کی بات شاید اس پر اثر انداز نہ ہو۔

مجھے بریلوی حضرات کی عمومی تکفیر میں تردد رہا ہے جو اب بھی ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ علم غیب، حاضر و ناظر، نور و بشر وغیرہ مسائل میں جو حضرات ایسی تاویل کر لیتے ہیں جو کفر کے دائرہ سے نکال سکتی ہو تو ان کے عقیدہ کو کفر کے دائرے میں شامل کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ تعبیر کی گمراہی قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ جو شخص کسی تاویل کے بغیر صراحتاً شرکیہ عقیدہ کا اظہار کرتا ہے اس کا معاملہ مختلف ہے۔ حضرت والد محترمؒ کو اس کا علم ہوا تو ایک بار انہوں نے مجھ سے اس مسئلہ پر باقاعدہ گفتگو کی مگر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے دلیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی اور علم غیب کے مسئلہ پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت

مولانا حسین علیؒ کے فتاویٰ مجھے پڑھائے۔ مگر وہ پڑھنے کے بعد بھی میں نے حضرت والد محترمؒ سے عرض کیا کہ اگر کوئی شخص ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے جو اس کو کفر کے دائرہ سے نکالتی ہو تو اس کو کفر کے فتوے سے بچانا ہی زیادہ مناسب ہے۔ ہماری یہ گفتگو اس سے آگے نہیں بڑھی اور اس کے بعد حضرت والد محترمؒ نے اس مسئلہ پر کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔

ایک اور پر لطف مکالمہ کا ذکر بھی شاید نامناسب نہ ہو۔ حضرت والد محترمؒ نقشبندی سلسلہ میں حضرت مولانا حسین علیؒ سے بیعت اور مجاز تھے اور میرا بیعت کا تعلق حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تھا جو قادری راشدی سلسلہ کے شیخ تھے۔ ان کے ہاں مجلس ذکر ہوتی تھی اور اس میں ذکر بالجہر بھی ہوتا تھا۔ حضرت والد محترمؒ کے نزدیک اجتماعی طور پر ذکر بالجہر بدعت شمار ہوتا ہے اور اس مسئلہ پر ان کی مستقل کتاب بھی ہے۔ وہ ذکر میں جہر کو بعض شرائط کے ساتھ تعلیماً تو جائز کہتے تھے مگر اس کے مستقل معمول کو وہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ میرا معمول یہ تھا کہ جب تک حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ حیات رہے، ان کی مجلس ذکر میں شرکت کے لیے شیرانوالہ لاہور بھی جاتا رہا اور وہ گوجرانوالہ میں کبھی تشریف لاتے تو یہاں بھی ان کی مجلس ذکر میں شریک ہوتا تھا۔ ایک بار اتفاق سے گکھڑ کی کسی مسجد میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ تشریف لائے اور مجلس ذکر ہوئی تو میں بھی شریک ہوا۔ اس سے ایک روز بعد اس مسئلہ پر حضرت والد محترمؒ سے میرا درج ذیل مکالمہ ہو گیا:

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ”تم بھی ہو ہو کرنے گئے تھے؟“

میں نے ہاں میں جواب دیا تو فرمایا کہ ”سر بھی ہلاتے رہے ہو؟“

میں نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا تو فرمایا کہ ”تم نے میری کتاب نہیں پڑھی؟“

میں نے عرض کیا کہ ”پڑھی ہے“ تو فرمایا کہ پھر تمہارا کیا خیال ہے؟

ظاہر بات ہے کہ میں ان سے کسی مباحثہ یا مناظرہ کی گستاخی نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے بات ٹالنے کے لیے یہ عرض کر دیا کہ ”آپ نقشبندی ہیں، ہم قادری ہیں۔ نقشبندیوں کے ہاں ذکر میں جہر نہیں ہے اور قادری جہر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں“۔ فرمایا

”بڑے بے وقوف ہو۔ کیا میں نے کتاب اس لیے لکھی ہے؟“

میں نے اس بحث کو آگے نہیں بڑھانا تھا، اس لیے پہلی بات کو ہی دوبارہ عرض کر کے خاموش ہو گیا اور حضرت والد محترمؒ نے بھی خاموشی اختیار فرما لی اور پھر کبھی اس موضوع پر مجھ سے کچھ نہیں فرمایا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جزوی اور فروعی مسائل میں بھی اپنے موقف کا بے لچک اور دو ٹوک

اظہار ضرور کرتے تھے مگر اختلاف کو سنتے تھے، برداشت کرتے تھے، اس کا حق دیتے تھے اور اپنے موقف کو منوانے میں جبر یا دباؤ کو استعمال کرنے کی بجائے دلیل اور افہام وتفہیم کا لہجہ اختیار کرتے تھے جو ہمیشہ سے اہل علم کا ذوق اور رویہ رہا ہے۔

حضرت والد محترمؒ کی تحریکی زندگی کا آغاز طالب علمی کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک مختلف مدارس میں پڑھتے رہے ہیں، انہوں نے خود اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ وہ مجلس احرار اسلام کے باقاعدہ رضا کار تھے اور اس کے جلسوں میں بطور رضا کار شریک ہوتے اور تحریک آزادی میں اس پلیٹ فارم سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کی اس دور کی دو یادگاریں ہمارے گھر میں ایک عرصہ تک موجود رہی ہیں۔ ایک لوہے کا سرخ ٹوپ جو وہ پریڈ کے وقت پہنا کرتے تھے اور دوسری کلہاڑی۔ لوہے کا سرخ ٹوپ تو اب موجود نہیں ہے لیکن ان کی کلہاڑی اب بھی موجود ہے اور ان کے احراری ہونے کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ اسی دوران وہ جمعیۃ علماء ہند کے کارکن بھی رہے اور جمعیۃ کے متعدّد اجلاسوں میں انہوں نے شرکت اور نمائندگی کی۔ وہ ۱۹۴۳ء میں گکھڑ آ گئے تھے اور یہاں مجلس احرار انہوں نے ہی بنائی۔ اس میں ان کے ساتھ حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم اور ملک محمد اقبال مرحوم شامل تھے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے ان کا یہ تذکرہ ان کے ریکارڈ میں ملتا ہے کہ قیام پاکستان کے موقع پر مقامی مسلم لیگی قیادت کی درخواست پر گکھڑ میں پاکستان کا پرچم سب سے پہلے انہوں نے لہرایا تھا۔

ان کے دور طالب علمی کا ایک اہم تحریکی واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جب وہ دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے تو دار العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی انگریزی اقتدار کے خلاف آزادی کی تحریک میں گرفتار ہو گئے جس پر دار العلوم کے طلبہ نے شدید احتجاج کیا، مظاہرے ہوئے، کلاسوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور ہنگاموں کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے نمائندوں پر مشتمل ایکشن کمیٹی قائم کی گئی جس میں سرحد اور افغانستان کے طلبہ نے اپنا نمائندہ حضرت والد محترم کو چنا اور پھر تمام نمائندوں نے مل کر ایکشن کمیٹی کا سربراہ بھی انہی کو منتخب کر لیا۔ اس طرح حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کی گرفتاری کے خلاف دار العلوم دیو بند کے طلبہ کی پرجوش احتجاجی تحریک کی قیادت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے کی۔ مظاہروں نے اس قدر شدت اختیار کی کہ دار العلوم دیو بند کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کے امکانات نظر آنے لگے۔ اس پر جمعیۃ علماء ہند کے قائدین حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی راہ نمائی میں دیو بند تشریف لائے اور طلبہ کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کیے تاکہ دار العلوم کے معاملات اور تعلیمی ماحول کو نقصان سے بچایا جا سکے۔ ان

مذاکرات میں بھی طلبہ کے نمائندوں نے مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی قیادت میں اپنے بزرگوں سے بات چیت کی۔ اس طرح پر جوش احتجاجی تحریک ختم کر کے دار العلوم کے طلبہ کلاسوں میں واپس گئے اور دار العلوم دیوبند کا تعلیمی ماحول بحال ہوا، مگر اس کے اثرات اس قدر وسیع تھے کہ اس سال دار العلوم دیوبند کے سالانہ امتحانات نہ ہو سکے۔ یہ پوری تاریخ میں پہلا واقعہ ہے۔ طلبہ دوران سال میں ہنگاموں میں رہے اور امتحان سے پہلے طلبہ نے مطالبہ کر دیا کہ چونکہ ہم ہنگاموں میں رہے ہیں اس لیے ہمیں بغیر امتحان کے پاس کیا جائے۔ دار العلوم دیوبند کے داخلہ کے امتحان اور سالانہ امتحان کا معیار بہت سخت تھا۔ دار العلوم دیوبند نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ دار العلوم دیوبند کو بند کر دیں لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ بغیر امتحان کے کسی کو پاس کر دیں۔ چنانچہ اس سال امتحان نہیں ہوئے اور دورۂ حدیث کے شرکا نے اگلے سال ۱۹۴۲ء میں دوبارہ وہاں جا کر امتحان دیا جن میں حضرت والد محترمؒ اور مولانا صوفی عبد الحمید خانؒ سواتی بھی شامل تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ان کی تحریکی زندگی کا ایک اہم واقعہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ان کی گرفتاری ہے۔ وہ تحریک میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور کم وبیش ساڑھے نو ماہ تک ملتان کی جیل میں رہے۔ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خانؒ سواتی بھی اس تحریک میں گرفتار ہوئے اور کئی ماہ تک جیل کاٹی۔ جیل میں والد محترم کا تدریسی سلسلہ جاری رہا اور حجیت حدیث پر ایک کتاب انہوں نے اسی دوران ”صرف ایک اسلام“ کے نام سے لکھی جو ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی کتاب ”دو اسلام“ کے جواب میں ہے اور اسی قید کے دوران انہیں خواب میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت ہوئی جس کی تعبیر میں ان کے استاذ محترم حضرت مولانا عبد القدیر صاحبؒ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کی زندگی میں آجائیں۔

تحریکی زندگی میں حضرت والد محترمؒ کا تیسرا دور جمعیۃ علماء اسلام میں ان کی شمولیت کا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل نو ہوئی تو مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی اس میں شامل ہو گئے اور کم وبیش پچیس برس تک جمعیۃ کے ضلعی امیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ان کی ابتدائی جماعتی سرگرمیوں میں سے مجھے دو واقعات یاد ہیں۔ ایک یہ کہ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں جب ملک میں عائلی قوانین نافذ ہوئے اور اس کی خلاف شریعت دفعات پر علماء کرام نے اعتراض کیا تو قومی اسمبلی کے ارکان کو علماء کرام کے موقف سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے پاس وفود بھیجنے کا

پروگرام بنایا گیا۔ تحصیل وزیر آباد سے اس وقت قومی اسمبلی کے رکن چودھری صلاح الدین چٹھہ مرحوم ہوا کرتے تھے جو چودھری حامد ناصر چٹھہ صاحب کے والد تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت والد محترمؒ اور مولانا احمد سعید ہزاروی زید مجدہم پر مشتمل وفد گکھڑ سے چودھری صلاح الدین مرحوم سے ملاقات کے لیے ان کے قصبہ احمد نگر گیا۔ یہ حضرات گکھڑ میں اکٹھے ہوئے، جامع مسجد میں باہمی مشاورت کی اور پھر تانگے پر احمد نگر روانہ ہوئے۔ مجھے مسجد میں ان کے مل بیٹھنے اور تانگے پر احمد نگر روانہ ہونے کا منظر یاد ہے۔

اس دور کی دوسری بات جو میری یادداشت میں محفوظ ہے، یہ ہے کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم نے دستور کی تشکیل کے لیے عوام سے سفارشات طلب کیں تو اس وقت جمعیۃ علماء اسلام نے، جو مارشل لا کی وجہ سے نظام العلماء پاکستان کے نام سے کام کر رہی تھی، عوامی سطح پر اسلامی دستور کے لیے محضر نامے بھجوانے کی مہم چلائی۔ یہ محضر نامے گکھڑ سے بھی بھجوائے گئے۔ حضرت والد محترمؒ کی ترغیب پر جن حضرات نے محضر نامے پر کروانے اور بھجوانے کے لیے محنت کی، ان میں ہمارے ایک محترم بزرگ ماسٹر بشیر احمد کشمیریؒ پیش پیش تھے اور ایک کارکن کے طور پر مجھے بھی ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

اس کے بعد حضرت والد محترمؒ کو ایک مرحلہ میں جمعیۃ علماء اسلام ضلع گوجرانوالہ کا امیر منتخب کیا گیا اور وہ کم وبیش ربع صدی تک اس حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جمعیۃ کے اجلاسوں کی صدارت، جماعتی دورے، تحریکات میں سرپرستی اور جمعیۃ کے زیر اہتمام عام جلسوں سے خطاب کے لیے وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود وقت نکالتے تھے اور جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وزیر آباد کی نشست کے لیے قومی اسمبلی کے امیدوار حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے لیے انتخابی مہم چلائی جوان کے استاذ محترم بھی تھے۔ اسی طرح حضرت والد صاحب نے ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی سرگرم حصہ لیا۔

۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام کا ملک گیر قومی نظام شریعت کنونشن مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جس میں جمعیۃ کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے پرائیویٹ سطح پر جمعیۃ علماء اسلام کے تحت شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے لیے وفاقی سطح پر شرعی عدالت مولانا مفتی محمودؒ کی سربراہی میں قائم کی گئی جس میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت مولانا عبد الکریم قریشیؒ آپ بیر شریف شامل تھے۔ اس کے بعد صوبائی اور ضلعی سطح پر شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔ مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب بھی اسی دور میں قاضی بنے۔ وہ گوجرانوالہ کے ضلعی قاضی مقرر ہوئے جبکہ حضرت مولانا

مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نائب قاضی تھے۔ انہوں نے بعض مقدمات کی سماعت بھی کی اور اسی وجہ سے مولانا حمید اللہ خان کے نام کے ساتھ قاضی کے لقب کا اضافہ ہوا۔ ان شرعی عدالتوں کے نظام اور طریق کار کے تعین کے لیے جامعہ مدنیہ لاہور اور مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں کنونشن منعقد ہوئے جن میں شرعی عدالتوں کا طریق کار اور نظام العمل وضع کیا گیا۔ ان میں سے ایک کنونشن کی صدارت حضرت والد محترمؒ نے کی اور ان کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، حضرت مولانا ایوب جان بنوریؒ، حضرت مولانا عبد الکریم قریشیؒ، حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ جیسے بزرگ اس کار خیر میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر وفاقی اور صوبائی سطح پر عدالتوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مقدمات کی سماعت اور فیصلوں کے طریق کار کا بھی تعین کیا گیا، مگر یہ سارا ہوم ورک ۱۹۷۷ء کی سیاسی گہما گہمی کی نذر ہو گیا اور عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

۱۹۷۶ء میں پنجاب کی پیپلز پارٹی کی حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور اس کے ساتھ ملحقہ جامع مسجد نور کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا جس کے خلاف احتجاج کے لیے گوجرانوالہ کے معروف وکیل جناب نوید انور نوید ایڈووکیٹ مرحوم کی قیادت میں احتجاجی تحریک چلی جس میں سینکڑوں علماء اور کارکنوں نے گرفتاری دی اور ہم تین بھائی راقم الحروف، مولانا عبد القدوس خان قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر بھی کئی ماہ تک جیل میں رہے۔ اس تحریک کے اصل سرپرست مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ تھے۔ اور والد محترمؒ نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے ساتھ مل کر مسجد نور کی واگزاری کی تحریک کی سرپرستی کی اور ضلع بھر کا دورہ کر کے دینی کارکنوں کو اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔

اس کے بعد انہوں نے جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیؐ میں سرگرم کردار ادا کیا۔ مختلف جلوسوں کی قیادت کی، جلسوں سے خطاب کیا اور احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہو کر کم وبیش ایک ماہ ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں رہے۔ اسی دوران وہ مشہور واقعہ بھی پیش آیا کہ گکھڑ کی جامع مسجد سے جمعہ کے بعد پاکستان قومی اتحاد کا احتجاجی جلوس نکلنا تھا جس کی قیادت حضرت والد محترمؒ نے کرنا تھی۔ فیڈرل سیکورٹی فورس کے کمانڈر نے جلوس پر پابندی لگا دی اور ایک لکیر سڑک پر کھینچ کر وارننگ دی کہ جس نے یہ لکیر عبور کی اسے گولی مار دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ایف ایس ایف کے جوانوں نے فائرنگ کے لیے پوزیشنیں سنبھال لیں مگر حضرت والد محترمؒ اپنے رفقا

سمیت، جن میں ہمارے حفظ قرآن کریم کے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب اور جے یو پی کے راہ نما حاجی سید ڈار مرحوم بھی شامل تھے، یہ کہتے ہوئے وہ لکیر عبور کر گئے کہ ۶۳ سال کی مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی آرزو رکھتا ہوں۔ ان کا یہ عزم دیکھتے ہوئے فیڈرل سیکورٹی فورسز کے جوانوں کی تنی ہوئی رائفلیں زمین کی طرف جھک گئیں اور احتجاجی جلوس پوری آب و تاب کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔

جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ حضرت والد محترم کے تعلق کے حوالے سے اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ وہ اگرچہ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے باضابطہ رکن نہیں تھے لیکن اہم اجلاسوں میں خصوصی دعوت پر کبھی کبھار شریک ہوا کرتے تھے۔ دراصل ضلع گوجرانوالہ سے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے جو جمعیۃ کے سینئر راہ نماوں میں شامل تھے اور حضرت والد محترمؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ پھر جمعیۃ کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات منتخب ہونے کے بعد میں بھی بلحاظ عہدہ مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن بن گیا تو گوجرانوالہ سے مرکزی مجلس شوریٰ میں دو رکن ہو گئے۔ ایک موقع پر قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کو بھی مرکزی شوریٰ کا ممبر ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ گوجرانوالہ سے ہم پہلے سے دو ممبر ہیں، تیسرا ممبر بنانے پر شاید کچھ علاقوں کو اعتراض ہو۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ تمہاری بات درست ہے مگر مولانا جیسی شخصیت کو مرکزی شوریٰ میں کبھی کبھی ضرور آنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات آپ ان سے خود فرما دیں۔ اس مقصد کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے گکھڑ کا سفر کیا، میں بھی ہمراہ تھا۔ انہوں نے جب حضرت والد صاحبؒ سے یہ بات کہی تو والد محترمؒ کا جواب بھی وہی تھا جو میں عرض کر چکا تھا کہ حضرت مولانا عبد الواحد صاحبؒ اور زاہد الراشدی پہلے سے رکن ہیں تو وہ میری نمائندگی ہی کرتے ہیں۔ الگ طور پر مجھے رکن بنانے میں مصلحت نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے فرمایا کہ یہ ساری باتیں درست ہیں لیکن آپ جیسے بزرگوں کا مجلس شوریٰ میں آنا جہاں عوام میں ہمارے اعتماد میں اضافے کا باعث بنے گا وہاں ہمیں بھی حوصلہ ہوگا کہ ہم صحیح کام کر رہے ہیں اور صحیح رخ پر جا رہے ہیں۔ اس لیے باضابطہ رکنیت کے بغیر بھی اہم اجلاسوں میں آپ کو اگر دعوت دی جائے تو تشریف لے آیا کریں۔ اس پر حضرت والد محترمؒ نے وعدہ کر لیا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے بہت سے اہم اجلاسوں کے موقع پر مجھے ہدایت کی کہ مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو بھی دعوت دینی ہے اور کئی اجلاسوں میں وہ تشریف بھی لائے۔ اس سے قبل متحدہ پاکستان کے دور میں بھی مجھے یاد ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کا ایک اہم اجلاس ڈھاکہ میں ہو رہا تھا جس کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت والد محترمؒ کو خصوصی دعوت دی اور وہ ان بزرگوں

کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔

حضرت والد محترمؒ جس عرصہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر رہے، اس دوران جمعیۃ علماء اسلام دو بار تقسیم ہوئی۔ ایک بار حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اپنے رفقا سمیت الگ ہو کر "ہزاروی گروپ" کے نام سے الگ جمعیۃ بنا لی اور دوسری بار حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمن گروپ میں تقسیم ہو گئی۔ دونوں بار حضرت والد محترمؒ جمعیۃ کے امیر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ رہے اور ان کی امارت میں مسلسل جماعتی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ البتہ جب ان دونوں گروپوں کے اتحاد کے بعد ایک نئی تقسیم فضل الرحمن گروپ اور سمیع الحق گروپ کی صورت میں عمل میں آئی تو حضرت والد محترمؒ نے جماعتی زندگی سے کنارہ کشی کر لی اور دونوں گروپوں میں مصالحت کے لیے کئی بار کوشاں ہوئے۔ ایک بار پشاور بھی تشریف لے گئے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا فقیر محمدؒ کے ہاں بعض دیگر اکابر علماء کرام کے ہمراہ چند روز قیام کر کے مولانا فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ جبکہ اس کے بعد ایک اور موقع پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم آف پلندری کے ساتھ مل کر جمعیۃ کے دونوں دھڑوں میں مصالحت کی سعی کی مگر انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ جمعیۃ علماء اسلام کے سب دھڑے متحد ہو کر کام کریں۔

اسی طرح ان کی یہ خواہش اور کوشش بھی رہی کہ علماء دیوبند سے تعلق رکھنے والی تمام جماعتوں کا کوئی متحدہ فورم تشکیل پائے اور ایک موقع پر ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المومن شاہ بخاری کی مساعی سے "کل جماعتی مجلس عمل علماء اسلام" کے نام سے ایک متحدہ محاذ قائم بھی ہوا جس کے لیے جامع مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک ملک گیر نمائندہ کنونشن منعقد ہوا جس میں حضرت والد محترمؒ کو اس متحدہ محاذ کا امیر منتخب کیا گیا اور ملک میں امریکی مداخلت سے آزادی اور نفاذ اسلام کے لیے عوامی تحریک منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ابن امیر شریعت کی تمام تر مساعی اور خلوص کے باوجود یہ مہم اس لیے آگے نہ بڑھ سکی کہ اس وقت دیوبندی مکتب فکر کی تین بڑی جماعتوں یعنی جمعیۃ علماء اسلام کے دونوں گروپوں اور اس کے ساتھ کالعدم سپاہ صحابہ کی قیادت کو عملاً ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ کیا جا سکا اور دو تین اجلاسوں کے بعد معاملہ آگے بڑھنے سے رک گیا۔

زندگی کے آخری ایام میں حضرت والد محترمؒ نے مولانا سمیع الحق کو بطور خاص گکھڑ بلا کر دیوبندی مکتب فکر کی تمام جماعتوں کا مشترکہ اجلاس بلانے اور متفقہ موقف اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر یہ خواہش

بھی تشنہ تکمیل رہی۔

حضرت والد محترمؒ کی سرگرمیوں کا ایک دائرہ دینی جماعتوں اور مدارس کے اجتماعات کا بھی تھا۔ وہ ان جلسوں میں جاتے اور خطاب کرتے تھے مگر عام طور پر ان کے پبلک خطابات کے موضوعات اختلافی مسائل سے ہٹ کر ہوتے تھے اور کسی اشد ضرورت کے بغیر اختلافی مسائل پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ان کے عوامی اجتماعات حدیث وسنت کی اہمیت، اصلاح عوام اور عام لوگوں سے متعلقہ جائز وناجائز، حلال وحرام کے مسائل ہوتے تھے۔ زبان سادہ استعمال کرتے تھے، لہجہ ناصحانہ اور اسلوب افہام وتفہیم کا ہوتا تھا۔ گکھڑ میں خطبہ جمعہ اور درس ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ہوتا تھا اور کوئی شخص ان کا بیان سن کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بزرگ پنجابی نہیں پٹھان ہیں۔ پنجابی محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں انہیں ازبریاد تھیں اور موقع ومحل کے مطابق ان کا استعمال اس خوبی سے کرتے تھے کہ سننے والا محسوس کرتا تھا کہ یہ کہاوت یا محاورہ شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔

جلسوں میں شرکت کے حوالے سے ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے جلسہ سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے، یہ میرے طالب علمی کے دور کی بات ہے۔ اس وقت جامعہ رشیدیہ کے ناظم حضرت مولانا حافظ مقبول احمدؒ تھے جو بعد میں گلاسگو (برطانیہ) کی مرکزی جامع مسجد کے بانی اور خطیب بنے۔ واپسی پر انہوں نے حضرت والد محترمؒ کو حسب معمول کرایہ وغیرہ کے لیے کچھ رقم دی۔ وہ غالباً تیس یا چالیس روپے دینا چاہتے تھے جو اس زمانے میں کرایہ وغیرہ کے لیے کافی تھی، لیکن رات اندھیرے کی وجہ سے دس دس کی بجائے سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔ واپسی پر حضرت والد محترمؒ نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ غلطی سے ہوا ہے۔ چنانچہ دس دس کے نوٹوں کے حساب سے رقم رکھ کر باقی رقم بذریعہ منی آرڈر واپس بھجوادی۔ بعد میں گلاسگو میں ایک ملاقات کے موقع پر حضرت مولانا مقبول احمدؒ نے اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے ٹھیک سمجھا تھا، ہم سے غلطی ہوگئی تھی۔ لیکن صبح اس کا علم ہونے پر ہم نے ذمہ دار حضرات کے مشورہ سے یہ ساری رقم حضرت والا کو ہدیہ کرنے کی نیت کرلی تھی مگر انہوں نے واپس بھجوادی۔

انہی جلسوں کے حوالے سے ایک اور واقعہ کا تذکرہ بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ ایک دفعہ ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ نوشہرہ ورکاں میں سیرت کا جلسہ تھا۔ حضرت والد محترمؒ کی خطاب تھی، میں ساتھ تھا، مجھے بھی تقریر کے لیے کہا گیا تو میں نے بھی مختصر تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں نے کوئی واقعہ بیان کیا جواب ذہن میں نہیں ہے۔ دوسرے دن شام کو میری طلبی ہوگئی۔ پوچھا، وہ واقعہ جو تم نے بیان کیا تھا کہاں پڑھا ہے؟

میں نے کہا، یاد نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ ویسے ہی بیان کر دیا تھا؟ میں نے عرض کی کہ شاید کسی سے سنا تھا۔ پوچھا کس سے سنا تھا؟ میں نے کہا، یہ بھی یاد نہیں ہے۔ اس پر مجھے ڈانٹا اور فرمایا کہ جب تک خود کسی مستند کتاب میں نہ پڑھو یا کسی ثقہ بزرگ سے نہ سنو، کوئی واقعہ اس طرح بیان نہ کرنا۔ ثقہ بزرگ کے حوالے سے تین چار نام بھی لیے جن میں حضرت مولانا مفتی شفیعؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شمس الحقؒ افغانی، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے نام مجھے یاد ہیں۔ اس کے بعد سے بحمد اللہ میرا معمول ہے کہ کوئی روایت یا واقعہ اپنے کسی بیان میں ذکر نہیں کرتا جب تک اس کا حوالہ ذہن میں نہ ہو اور کسی درجہ میں اس کے قابل بیان ہونے کی تسلی نہ ہو۔

حضرت والد محترمؒ کی دینی سرگرمیوں کا ایک دائرہ اصلاح و ارشاد کا بھی تھا۔ وہ امام الموحدین حضرت مولانا حسین علیؒ سے بیعت تھے اور نقشبندی سلسلے میں انہیں حضرت مرحومؒ سے خلافت حاصل تھی۔ پہلے وہ عام طور پر بیعت سے گریز کیا کرتے تھے اور اگر کوئی اصرار کرتا تو نقشبندی سلسلے میں اسے بیعت کر کے کچھ ذکر واذکار کی تلقین کرتے تھے، مگر آخری سالوں میں انہوں نے عام طور پر بیعت لینا شروع کر دی تھی۔ ان کی زیادہ تلقین سنت کی پیروی اور بدعات سے اجتناب تھا۔ اس کے ساتھ قرآن کریم کی باقاعدہ تلاوت کا کہتے تھے اور روز مرہ کچھ اذکار کی تلقین کیا کرتے تھے۔ بس اس سے زیادہ اس سلسلہ میں ان کا کوئی باقاعدہ معمول نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے متعلقین کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی جن میں علماء کرام بھی ہیں اور عام مسلمان بھی ہیں اور انہوں نے چند حضرات کو اپنی طرف سے خلافت بھی عطا کی جس میں انہوں نے مجھے بھی شامل کر لیا۔

حضرت والد محترمؒ بیعت کے ساتھ جن اعمال واذکار کی تلقین کرتے تھے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ توحید وسنت پر قائم رہتے ہوئے اور شرک وبدعت سے سختی کے ساتھ نفرت کرتے ہوئے اپنی ہمت کے مطابق نیکی کے دیگر اعمال کے ساتھ ۲۴ گھنٹے میں جب وقت ملے (وضو ہو تو نور علیٰ نور) اور بہتر ہوگا کہ ایک جگہ بیٹھ کر درج ذیل وظائف مکمل کرے، ورنہ چلتے پھرتے بھی پڑھ سکتا ہے:

۱۔ سبحان اللہ	۲۰۰ بار
۲۔ الحمد للہ	۲۰۰ بار
۳۔ لا الہ الا اللہ	۲۰۰ بار
۴۔ اللہ اکبر	۲۰۰ بار
۵۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم	۲۰۰ بار

۶۔ نماز والا درود شریف ۲۰۰ بار

۷۔ استغفراللہ الذی لاالہ الاھو ۲۰۰ بار
الحی القیوم واتوب الیہ

۸۔ ناظرہ خواں کے لیے قرآن پاک کی تلاوت روزانہ ایک پاؤ اور حافظ کے لیے کم از کم ایک پارہ۔

میرا بیعت کا تعلق سلسلہ قادریہ میں حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ سے تھا، ان کے بعد میں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت کا تعلق قائم کیا لیکن یہ بیعت محض نسبت اور تعلق ہی کے درجہ میں تھی۔ اس سلسلہ میں سلوک کے منازل طے کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ سے ایک بار سلوک کے اسباق کا تذکرہ کیا تو انہوں نے سرسری انداز میں فرمایا کہ تم جو دینی جدوجہد کر رہے ہو یہی تمہارے اسباق ہیں۔ میں نے اسے غنیمت سمجھا اور اس کے بعد کبھی دریافت ہی نہیں کیا۔ اب حضرت والد محترمؒ نے مجھے اپنے خلفاء کی فہرست میں شامل کیا ہے تو مجھے حجاب سا محسوس ہو رہا ہے کہ نہ میں اس لائن کا آدمی ہوں اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتا ہوں۔ حضرت والد محترمؒ کی وفات کے بعد بہت سے دوستوں نے تجدید بیعت کے لیے مجھ سے رجوع کیا ہے مگر میں مسلسل ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حضرت والد محترمؒ نے بیماری کے دنوں میں ایک بار مجھے بطور خاص فرمایا کہ میں تصوف وسلوک کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھ سکا، اب اس پر تم نے لکھنا ہے اور اس سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد منظورؒ نعمانی کی کتابیں ضرور پڑھ لینا۔ میں نے ان سے وعدہ تو کر لیا مگر وہی حجاب آڑے آ رہا ہے کہ میں اس دنیا کا شخص نہیں ہوں، میری سرگرمیوں کا میدان اور ہے۔ ایک رکاوٹ اور بھی ہے کہ کسی موضوع پر باقاعدہ کتاب لکھنے کا میرا ذوق نہیں ہے۔ گزشتہ چالیس برس سے مضامین ہی لکھ رہا ہوں اور یہ مزاج پختہ ہو گیا ہے کہ کوئی بھی موضوع ہو، اختصار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو تین قسطوں میں اسے نمٹا دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کسی موضوع پر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ ادھر حضرت والد محترمؒ کے ساتھ وعدہ بھی یاد ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ تصوف وسلوک کے بارے میں کسی بہانے آٹھ دس محاضرات کا سلسلہ کسی جگہ ہو جائے اور انہیں پھر کتابی شکل دے دی جائے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ میرے لیے خصوصی طور پر اس بات کی دعا فرمائیں کہ میں اس وعدہ کی جلد از جلد تکمیل کر سکوں، آمین یارب العالمین۔

حضرت والد محترمؒ کا دم اور تعویذ کا سلسلہ بھی تھا۔ گکھڑ اور گوجرانوالہ میں دم کرانے اور تعویذ لینے کے لیے لوگ ان سے رجوع کیا کرتے تھے، وہ اس کا معاوضہ نہیں لیتے تھے البتہ کوئی اپنی خوشی سے تنگی

محسوس کیے بغیر کچھ دے دیتا تو انکار پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے دم اور تعویذات کی اجازت مانگتے تھے جس پر وہ تین روزے رکھنے کی شرط پر اجازت دے دیتے تھے اور اپنے تجربات بھی لکھ دیتے تھے۔

والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ گزشتہ آٹھ نو برس سے صاحب فراش تھے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی یادداشت آخر وقت تک قائم رہی اور علمی دلچسپی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نظر کمزور ہوگئی تھی اور کسی کو ویسے نہیں پہچانتے تھے لیکن تعارف کرا دیا جاتا تو پھر ساری باتیں ان کو یاد آجاتیں اور وہ جزئیات تک دریافت کرتے تھے۔ مجھے جمعہ کے دن شام کو تھوڑی دیر کے لیے حاضری کا موقع ملتا، جب بھی طبیعت کچھ بحال ہوتی تو کسی نہ کسی کتاب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتے اور میں احادیث کی کسی کتاب میں سے چند احادیث سنا دیتا۔ ان کے سامنے پڑھتے ہوئے ڈر بھی رہتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ پاتی تھی۔ ایک بار ایک حدیث سناتے ہوئے ایک لفظ پر میں اٹک گیا، بعد میں حیرت بھی ہوئی کہ کئی دفعہ یہ حدیث پڑھنے پڑھانے میں آئی ہے، یہ اٹک درمیان میں کیسے آگئی؟ بہرحال میں جب اٹک گیا تو والد محترمؒ نے لفظ بھی بتایا اور اس کا مفہوم بھی بتایا۔ متعدّد بار ایسا ہوا کہ کسی حدیث کی تلاش میں ذہن کام نہیں کر رہا اور تلاش کے باوجود نہیں مل رہی تو وہ بتاتے کہ فلاں کتاب کے فلاں باب میں دیکھو، دیکھنے پر وہ حدیث وہیں مل جاتی۔ یہ باتیں ان کی صحت کے دور کی نہیں بلکہ اس بیماری کے دور کی ہیں جبکہ وہ اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں بدل سکتے تھے لیکن ذہنی استحضار کا یہ عالم تھا کہ ہمیں رشک آتا تھا۔

ایک موقع پر ہم تین چار بھائی حسب معمول جمعہ کی شام کو ان کے پاس موجود تھے تو طبیعت میں بشاشت تھی۔ مجھ سے قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون سی سورت میں ہے۔ میں نے بتا دیا۔ خیال تھا کہ کسی مسئلہ کے حوالہ سے پوچھ رہے ہیں لیکن جب اسی آیت کے بارے میں دوسرا سوال کیا تو اندازہ ہوا کہ ویسے نہیں پوچھ رہے، امتحان لے رہے ہیں۔ چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمن خان شاہد بھی موجود تھے جو جدہ میں رہتے ہیں اور ان دنوں گکھڑ آئے ہوئے ہیں۔ میں انہیں آگے کر کے ان کی اوٹ میں ہو گیا اور پھر ان کا امتحان شروع ہو گیا۔ ان سے متعدّد آیات کے بارے میں پوچھا اور جو آیت پوچھتے، اس کے ساتھ یہ کہتے کہ اس سے پہلے والی آیت بھی سناؤ۔ ہمیں اس بات پر خوشی تھی کہ آج طبیعت ہشاش بشاش ہے اور باباجی موڈ میں ہیں۔

میری حاضری پر وہ زیادہ تر ملکی حالات کے بارے میں دریافت کرتے۔ ان دنوں سوات کی صورت حال کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ اخبارات سننے کا معمول تھا، حالات سے واقف رہتے تھے اور

سوال و جواب بھی کرتے تھے۔ میرے کالم بھی اہتمام سے سنتے تھے اور ان کے بعض مندرجات کے بارے میں بات بھی کرتے تھے۔ میں نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ جناب نبی اکرمؐ اپنے امتیوں کے لیے آئیڈیل ہیں۔ اس کے بعد حاضری ہوئی تو پوچھنے لگے کہ یہ آئیڈیل کیا ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ اسوۂ حسنہ کا آزاد ترجمہ ہے۔

چند ماہ قبل فرمانے لگے کہ لغت کی کوئی مستند کتاب تمہارے پاس ہو تو مجھے لا دو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اسے اس حالت میں کیا کریں گے؟ فرمایا کہ کسی وقت ضرورت پڑ جاتی ہے۔ میں نے بازار سے ایک کتاب خرید کر پیش خدمت کر دی، بہت خوش ہوئے۔ پھر ایک دن فرمایا کہ "اللؤلؤ والمرجان" مل جائے گی؟ میں نے عرض کیا کہ مل جائے گی۔ وہ بھی میں نے بازار سے لا کر پیش کر دی۔ گزشتہ ماہ میں برطانیہ کے سفر پر جانے لگا اور عرض کیا کہ واپسی پر عمرہ کا ارادہ بھی ہے تو خوش ہوئے، دعا دی اور فرمایا کہ سنا ہے کہ "مسند ابی یعلی" چھپ گئی ہے، اگر مل جائے تو میرے لیے لیتے آنا۔ میں نے اسے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے متعدّد کتب خانوں میں تلاش کیا مگر نہ ملی۔ واپسی پر جدہ میں اپنے میزبان قاری محمد اسلم شہزاد صاحب سے، جو میرے ہم زلف ہیں، عرض کیا کہ کتاب لیے بغیر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا، حضرت والد صاحبؒ نے فرمائش کی ہے اور وہ مل نہیں رہی۔ ہم نے ایک راؤنڈ جدہ کے کتب خانوں کا لگایا تو دو تین کتاب خانوں کی چھان بین کے بعد ایک مکتبہ میں وہ مل گئی اور مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھ سے زیادہ قاری صاحب خوش ہوئے، قیمت بھی مجھے ادا نہیں کرنے دی اور کہا کہ یہ ہدیہ میری طرف سے پیش کر دیں۔

۱۴ اپریل سے ۲۶ اپریل تک میں برطانیہ میں تھا اور اس کے بعد حرمین شریفین حاضری دے کر وطن واپس آنے کا ارادہ تھا۔ جاتے ہوئے حضرت والد محترمؒ سے مل کر اور ان کی دعا لے کر گیا تھا مگر برطانیہ میں قیام کے دوران اس اطلاع نے پریشان کر دیا کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور خون کی قے آئی ہے۔ اضطراب کی وجہ واضح تھی کہ میں اس سے قبل یہ صدمہ دیکھ چکا تھا۔ ہماری چھوٹی والدہ مرحومہ کا جب انتقال ہوا تو میں شکاگو میں تھا اور آخری زیارت اور جنازے سے محرومی نے زندگی میں پہلی بار شدت کے ساتھ اس بات کا احساس دلایا تھا کہ بے بسی کسے کہتے ہیں۔ پریشانی اور بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت والد صاحبؒ نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ میرا جنازہ تم نے خود پڑھانا ہے۔ گھر فون کر کے معلوم کیا تو بتایا گیا کہ طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے۔ قدرے اطمینان ہوا مگر سفر کے اختتام تک پریشانی دل و دماغ پر سوار رہی۔ یکم مئی بروز جمعرات گھر واپس پہنچا تو حسب معمول اگلے روز جمعہ کی شام کو حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دی، طبیعت زیادہ خراب تھی۔ حضرت کے معالج ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب اور خادم

خصوصی حاجی محمد لقمان میر اور مولانا محمد نواز بلوچ موجود تھے، میں نے کتاب دکھائی تو دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہاں رکھ دو۔ کچھ دنوں سے مسلسل خاموشی تھی، کچھ کھا پی بھی نہیں رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ کوشش کریں کچھ کھا پی لیں اور باتیں بھی کریں۔ میں نے گزارش کی تو ایک آدھ گھونٹ پانی پیا اور پھر انکار کر دیا۔ میں نے سفر کے حالات کا تذکرہ شروع کر دیا تو ہلکا ہلکا اشارہ کرتے رہے۔ ہماری کوشش تھی کہ کچھ بولیں مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ان کی نواسیوں کا ذکر کیا جو برطانیہ میں رہتی ہیں۔ میں نے ان کا نام لیا اور بتایا کہ میں ان کے پاس بھی گیا تھا تو ہلکی سی توجہ کی اور اشارے سے ان کا حال پوچھا۔ بس میری یہ آخری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہم تین چار بھائی تھوڑی دیر کے لیے پھر ان کے پاس بیٹھے اور کچھ آپس کا حساب کتاب ان کے سامنے کیا۔ اس موقع پر ہم سب گھر والے یعنی میری اہلیہ، محمد عمار خان ناصر، اس کی اہلیہ اور دونوں بچے صحت کا حال معلوم کرنے کے لیے گکھڑ گئے تھے اور یہ آخری ملاقات ہم سب کی اکٹھی ہوئی۔

۴ مئی کو رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو دوسری طرف برادر عزیز قاری حماد الزہراوی صاحب تھے، دل دھڑکا کہ خدا خیر کرے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ حضرت والد صاحبؒ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور اب بظاہر کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی۔ زبان پر بے ساختہ دعا جاری ہو گئی، ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ برادرم قاری راشد خان کا فون آیا اور انہوں نے روتے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تو امید کی آخری کرن بھی گل ہو گئی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہوئے اہلیہ کو جگایا۔ وہ اچانک یہ خبر سن کر رونے لگ گئیں۔ تھوڑی دیر میں حاجی محمد فیاض خان سواتی صاحب کا فون آیا، ہم نے ایک دوسرے سے تعزیت کی اور پھر گکھڑ جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ اس سے چند گھنٹے پہلے میں نے عشا کی نماز تلونڈی موسیٰ خان کے قریب گاؤں پیرو چک میں پڑھائی اور اس کے بعد درس دیا تھا۔ درس کے دوران گفتگو اس مسئلہ پر آ گئی کہ اخبارات میں ”آپ کا ہفتہ کیسے گزرے گا؟“ کے عنوان سے کہانت کا جو کاروبار چل رہا ہے، یہ وہی کہانت ہے جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھی اور آپؐ نے جاہلیت کی دیگر بہت سی اقدار و روایات کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ تمہیں آنے والے کل کی خبر نہیں کہ تم کیا کرو گے اور آنے والا کل تو بہت دور ہے، آج رات کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں گے یا ہمارے ساتھ کیا ہو گا؟ اس کے صرف چند گھنٹے کے بعد ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو گیا جس کا صدمہ رہتی زندگی تک ہمارے ساتھ رہے گا۔

سچی بات ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کی تعزیت کے مستحق ہیں، حضرت والد صاحبؒ کا کوئی عقیدت

مسند تعزیت کے لیے آتا ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ اس سے تعزیت کروں، اس لیے کہ یہ اجتماعی صدمہ ہے، ملی صدمہ ہے اور عظیم دینی صدمہ ہے۔ مگر میں اس موقع پر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان خدام کو سب سے زیادہ تعزیت کا مستحق سمجھتا ہوں جنہوں نے ان کے صاحب فراش ہونے کے دوران سالہا سال تک ان کی خدمت کی۔ بالخصوص برادر عزیز قاری راشد جو ہمارے سب سے چھوٹے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمان، حاجی محمد لقمان میر، مولانا محمد نواز بلوچ، نعیم بٹ صاحب، ہمارے بھانجے مولانا داؤد خان نوید اور گھر کی وہ بچیاں جو مسلسل خدمت میں مصروف رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں۔

اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانیوں میں سے ایک یہ بھی ہوئی کہ ان کی وفات پر ہم سب بھائی خلاف معمول یہاں موجود تھے۔ میں سفر سے واپس پہنچ گیا تھا۔ ہمارے چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمن خان شاہد کئی سالوں سے جدہ میں مقیم ہیں اور تحفیظ القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، وہ گزشتہ ماہ بچوں سمیت آ گئے تھے۔ ہمارے ایک بھائی مولانا رشید الحق خان عابد سلمہ جنہیں ہم پیر عابد صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ بھی دو روز پہلے گکھڑ آ چکے تھے۔ بقیہ برادران مولانا عبد القدوس خان قارن، مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا قاری حماد الزہراوی، قاری عنایت الوہاب خان ساجد، قاری منہاج الحق خان راشد اور ہمارے مرحوم بھائی قاری محمد اشرف خان ماجدؒ کے فرزند حافظ انصر خان اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے۔ اس طرح ہم سب بھائی حضرت والد محترمؒ کے سفر آخرت کے وقت حاضر تھے۔ ہمشیرگان میں سے ایک مجھ سے بڑی ہیں جو آبائی علاقے اچھڑیاں شنکیاری میں ہیں، وہ اور ہمارے بڑے بہنوئی حاجی سلطان محمود خان بھی وقت پر پہنچ گئے۔ چھوٹی ہمشیرہ گوجرانوالہ میں ہیں، وہ بھی اپنے خاوند حافظ محمد شفیق صاحب، فرزند مولانا محمد داؤد خان نوید اور بچیوں کے ہمراہ موجود تھیں۔ ہماری منجھلی ہمشیرہ جو جہلم میں ہیں اور ان کے خاوند مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ کا گزشتہ ماہ انتقال ہوا ہے، ان کے لیے یہ صدمہ دہرا ہو گیا کہ خاوند کی وفات کے بعد والد محترم کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، وہ بھی جنازے کے دن پہنچ گئیں۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے روز ہم سب بھائی گکھڑ میں جمع ہوئے تو جنازے کے لیے موزوں جگہ اور تدفین کے مقام کے بارے میں باہمی مشورہ ہوا۔ گکھڑ میں سب سے بڑی گراؤنڈ ڈی سی ہائی اسکول کی ہے۔ ہم نے صبح اسے ایک بار دیکھا، اندازہ تھا کہ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد نماز جنازہ ادا کر سکیں گے۔ ہمارا خیال اسی کے لگ بھگ تھا مگر شام کو جنازے کے وقت دیکھا کہ ہمارا اندازہ درست نہیں تھا، گراؤنڈ اس قدر بھری ہوئی تھی کہ اندر مزید لوگوں کے آنے کی گنجائش نہیں تھی، جبکہ باہر جی ٹی روڈ اور اس

کے ساتھ ملحقہ دو روڈوں پر عوام کا بے پناہ ہجوم تھا اور جی ٹی روڈ ٹریفک کے رش کی وجہ سے خاصی دیر تک جام رہی۔ ایک دوست نے بتایا کہ وہ ایک کلو میٹر کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کر پائے۔ عوام کا ہجوم ہماری توقعات سے کئی گنا زیادہ تھا اور ہم اس کے مطابق انتظام نہیں کر پائے تھے۔ اس لیے ہوا یہ کہ جتنے حضرات نے نماز جنازہ پڑھی، کم و بیش اتنے ہی لوگ نماز جنازہ نہ پڑھ سکے اور ٹریفک کے ہجوم میں پھنسے رہے۔ رحیم یار خان سے پشاور تک کے شہروں سے قافلے آئے جن میں سے بہت سے راستے میں ہی رہ گئے اور جنازہ تک نہ پہنچ سکے۔

حضرت والد محترمؒ کی زندگی بھر یہ روایت رہی ہے کہ وقت کی پابندی میں ضرب المثل تھے، ان کے بارے میں اور مولانا ظفر علی خان مرحومؒ کے بارے میں واقف حال لوگوں کا کہنا ہے کہ لوگ ان کے معمولات دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کیا کرتے تھے۔ ہم نے جنازے کا اعلان یہ کر رکھا تھا کہ سوا پانچ بجے عصر کی نمازیں ارد گرد کی مساجد میں ہو جاتی ہیں اس لیے نماز پڑھتے ہی ساڑھے پانچ بجے نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ برادرم قاری حماد الزہراوی صاحب نے، جو حضرت والد محترمؒ کی جگہ گکھڑ میں مسجد و مدرسہ کے معاملات ان کی علالت کے بعد سے بحسن و خوبی چلا رہے ہیں، یہ کہا کہ نماز جنازہ میں تھوڑی تاخیر کر لی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم کم از کم ان کی ایک روایت کو تو قائم رکھیں کہ وہ جس وقت کا اعلان کرتے تھے اس سے ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ جنازے سے پہلے تشریف لانے والے ممتاز راہنماؤں کے خطاب کا سلسلہ جاری تھا۔ علامہ ڈاکٹر خالد محمود، حافظ حسین احمد، مولانا سمیع الحق، مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی، مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی اور دیگر بہت سے علماء خطاب کر چکے تھے اور بہت سے راہنما باقی تھے کہ عین وقت پر میں نے مائیک سنبھال لیا اور ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اعلان کے مطابق نماز جنازہ کے لیے اللہ اکبر کی صدا بلند کر دی۔ بہت سے دوستوں نے بعد میں شکوہ کیا کہ اگر بیس تیس منٹ نماز جنازہ میں تاخیر کر دی جاتی تو بے شمار مزید حضرات بھی جنازے میں شریک ہو سکتے تھے مگر میں مطمئن ہوں کہ ہم نے حضرت والد محترمؒ کی کسی ایک روایت پر تو عمل کر لیا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

تدفین کے بارے میں بات چلی تو میں نے عرض کیا کہ حضرت والد محترمؒ اس بارے میں کسی تخصیص کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے عام قبرستان ہی بہتر ہے۔ گکھڑ میں آپ جی ٹی روڈ پر آ جا رہے ہوں تو شہر کے وسط میں مشرق کی جانب بٹ دری فیکٹری کے عقب میں ایک قبرستان ہے جو جی ٹی روڈ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس قبرستان میں ہماری دادی مرحومہ، پھوپھی مرحومہ، ہماری دونوں مرحومہ مائیں،

ہمارے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم اور ان کے دو فرزند محمد اکرم اور محمد اکمل مدفون ہیں۔ طے ہوا کہ اسی میں تدفین ہوگی۔ کوشش کی گئی کہ دادی مرحومہ کے قریب جگہ مل جائے تو بیٹے کو ماں کی گود میں ہی سلا دیا جائے مگر اس کے اردگرد کوئی جگہ نہ ملی تو قبرستان کی عام گزرگاہ کے ساتھ پہلی لائن میں موجود ایک خالی جگہ کو غنیمت سمجھا گیا اور وہیں قبر کی کھدائی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

میں نے کچھ عرصہ قبل ایک خواب دیکھا تھا کہ گکھڑ میں حضرت والد محترمؒ کی مسجد کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بائیں جانب جی ٹی روڈ کے ساتھ جو کھلی جگہ ہے وہاں صاف ستھرے پانی کا ایک بڑا تالاب ہے، اس تالاب میں سے ایک بہت بڑی مچھلی اچھلی اور فضا میں تھوڑی دیر نظر آ کر دوبارہ اسی تالاب میں ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی۔ اس پر خواب میں، میں نے یا میرے ساتھ کھڑے ایک صاحب نے تعجب کا اظہار کیا کہ سمندر کی مچھلی تالاب میں کیسے آ گئی ہے؟ اس خواب کے بعد میرے دل میں یہ دھڑکا مسلسل لگا رہتا تھا کہ علم کے سمندر کی یہ بڑی مچھلی گکھڑ کے تالاب میں کسی بھی وقت ڈبکی لگا کر نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ۵ مئی بروز منگل عین اس وقت جب سورج غروب ہو رہا تھا، آسمان علم و معرفت کے اس سورج کو بھی لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر ساتھیوں سے عرض کیا کہ ہم ایک پوری لائبریری کو زمین میں دفن کر رہے ہیں۔

حضرت والد محترمؒ سے وابستہ یادوں کا یہ سلسلہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ان کے پرت یکے بعد دیگرے کھلتے ہی چلے جائیں گے اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی وفات پر لوگوں کو روتے ہوئے دیکھ کر مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے کہا تھا کہ تم کیوں روتے ہو؟ تمہارے لیے تو ہم ہیں، رونے کا حق تو ہمارا ہے کہ ہمارے لیے کوئی نہیں رہا۔ آج اہل علم یتیم ہو گئے ہیں کہ مشکل وقت میں راہنمائی کے لیے جن سے رجوع کیا کرتے تھے، وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اب ان کا یہ حق ہے کہ ان کی زندگی سے سبق حاصل کیا جائے، ان کی جدوجہد سے استفادہ کیا جائے، ان کے مشن کو زندہ رکھا جائے، ان کی حسنات کے تسلسل کو قائم رکھا جائے، ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے اور ان کے صدقات جاریہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ خصوصی اشاعت بیاد امام اہل سنتؒ ۲۰۰۹ء)

آج کی نشست میں، میں مسلکی اختلافات و معاملات کے حوالے سے والد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور ان کے دست راست حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہا اللہ کے ذوق وفکر اور طرز عمل کا ایک سرسری خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران پورے برصغیر میں حضرت والد محترمؒ کو علماء دیوبند کے مسلکی ترجمان کی حیثیت حاصل رہی ہے اور پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے دیوبندی علماء انہیں اپنا مسلکی اور علمی راہ نما سمجھتے آرہے ہیں۔

مسلکی اختلافات اور ان کے حوالے سے طرز فکر اور راہ عمل کے سلسلے میں حضرت والد محترم کے ذوق واسلوب کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا:

1. موجودہ معروضی حالات میں مسلکی اختلافات کے بارے میں ان کا اصولی موقف کیا تھا؟
2. دوسرے مسالک کے حضرات کے ساتھ ان کے معاشرتی تعلقات و معاملات کی نوعیت کیا تھی؟
3. مشترکہ ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کے میدان میں دوسرے مسالک کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں ان کا طریقہ اور ذوق کیا تھا؟

اس وقت کے موجودہ معروضی حالات میں مسلکی تقسیم کو مندرجہ ذیل دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) سنی شیعہ اختلافات، (۲) دیوبندی بریلوی اختلافات، (۳) حنفی اہل حدیث اختلافات، (۴) جماعت اسلامی کے ساتھ اختلافات، (۵) حیات النبیؐ اور سماع موتی کا تنازعہ۔

سنی شیعہ اختلافات کے حوالے سے حضرت والد محترم کا موقف یہ تھا کہ یہ اصولی اختلافات ہیں اور ان کا تعلق ایمان و عقیدہ سے ہے۔ انہوں نے اس پر ''ارشاد الشیعہ'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے اس موقف کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ وہ اہل تشیع کی اور ان میں سے خاص طور پر اثنا عشریہ کی تکفیر کرتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے موقف میں کوئی لچک نہیں تھی۔ جبکہ حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی اصولی طور پر اس موقف سے متفق ہوتے ہوئے بھی اس کے اظہار کے لیے الگ اسلوب رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لفظ شیعہ کو تکفیر کی بنیاد بنانے کی بجائے عقائد کی بنیاد پر تکفیر کرنی چاہیے۔ مثلاً یہ کہ جو شخص قرآن کریم میں تحریف کا قائل ہے یا صحابہ کرامؓ کی تکفیر کرتا ہے وغیر ذالک تو وہ کافر ہے۔ خود میرا ذوق بھی اس حوالے سے حضرت صوفی صاحبؒ والا ہے، اس لیے کہ عالم اسلام میں شیعہ کہلانے والے ایسے گروہ بھی موجود ہیں جن کی ائمہ اہل سنت نے تکفیر نہیں کی۔ مثلاً یمن میں زیدی فرقہ کے لوگوں کی تعداد پچیس فی صد سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو زیدی اور

شیعہ کہلانے کے باوجود اہل سنت جیسے عقائد رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ایسے بزرگ موجود ہیں جو متصلب سنی ہیں لیکن زیدی کہلاتے ہیں۔ حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ اپنے نام کے ساتھ زیدی لکھتے تھے، امام زید کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے، امام زید بن علی پر انہوں نے الاستاذ ابوزہرہ کی کتاب ''الامام زید بن علی'' بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی تھی۔ اپنے مکان کے قریب انہوں نے جو دینی مدرسہ قائم کیا، اس کا نام ''مدرسہ زید بن علی'' ہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری پسندیدہ ترین شخصیتیں تین ہیں۔ ایک امام زید بن علیؒ، دوسرے خواجہ گیسو درازؒ اور تیسرے سید احمد شہیدؒ۔

ایران کے اہل تشیع زیدیوں کو شیعہ کا فرقہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایران کے دستور میں زیدیوں کو شیعہ اکثریت کا حصہ تسلیم کرنے کی بجائے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے ساتھ اقلیتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے اثنا عشری شیعہ کی تکفیر میں کوئی کلام نہ ہونے کے باوجود عمومی تکفیر میں عالم اسلام کے مجموعی تناظر کو ملحوظ رکھنا بھی میرے نزدیک ضروری ہے، البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت والد محترمؒ کا موقف اس بارے میں بے لچک تھا اور جن تحفظات کا ہم اظہار کرتے ہیں، وہ ان کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے۔

دیوبندی بریلوی اختلافات کے حوالے سے بھی ان کا موقف یہ تھا کہ یہ عقائد کے اختلافات ہیں اور اصولی اختلافات ہیں۔ انہوں نے ان اختلافات کے ہر پہلو پر کتابیں لکھی ہیں اور تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں۔ ان اختلافات کی تنقیح و توضیح میں وہ جس گہرائی تک گئے ہیں وہ انہی کا امتیاز ہے اور یہی انہیں دیوبندیوں کا علمی ترجمان قرار دیے جانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔

دیوبندی بریلوی اختلافات کو کم کرنے اور باہمی مفاہمت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے مختلف مواقع پر کوششیں ہوئی ہیں اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا سید حامد میاںؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ جیسی شخصیات بھی ان مساعی کا حصہ رہی ہیں۔ عام طور پر اس سلسلے میں جب بات ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اصل تنازعہ اکابر علماء دیوبند کی چند مبینہ طور پر متنازعہ عبارات ہیں جن پر مولانا احمد رضا خانؒ اور ان کے رفقا نے علماء دیوبند کی تکفیر کی ہے۔ اگر ان عبارات کو حذف کر دیا جائے یا ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے یا ان کی فریقین کے اتفاق سے کوئی متفقہ تاویل و تعبیر کر دی جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت والد محترم کا موقف اس سے مختلف تھا، وہ یہ فرماتے تھے کہ

- تنازعہ صرف چند عبارات کا نہیں بلکہ عقائد اور ان کی تعبیرات کا بھی ہے، اس لیے عبارات کے ساتھ ساتھ متنازعہ عقائد اور ان کی تعبیرات پر بھی بات ہونی چاہیے۔

- عبارات میں یک طرفہ طور پر صرف علماء دیوبند کی عبارات مابہ النزاع نہیں ہیں، بلکہ اسی نوعیت کی بریلوی علماء کی بعض عبارات پر بھی اختلاف ہے، اس لیے عبارات کے حوالے سے گفتگو دوطرفہ بنیاد پر ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں مولانا عبد الستار خان نیازیؒ نے ایک بار دیوبندی بریلوی اتحاد کے لیے چار نکاتی فارمولا پیش کیا تھا جس پر میں نے حضرت والد محترمؒ سے بات کی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں خود ان کی مولانا عبد الستار خان نیازیؒ کے ساتھ حرم مکہ میں گفتگو ہوئی تھی اور انہوں نے نیازی صاحبؒ سے کہا تھا کہ معاملہ صرف ایک طرف کی عبارات کا نہیں بلکہ دوسری طرف کی عبارات بھی مابہ النزاع ہیں، اس لیے اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ علماء دیوبند کی متنازعہ عبارات کی نشان دہی کریں اور ہم بریلوی علماء کی متنازعہ عبارات کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان پر آپس میں بیٹھ کر خالص علمی ماحول میں گفتگو کر لیتے ہیں اور درمیان میں ہائی کورٹ کے جج صاحبان کا ایک پینل بٹھا لیتے ہیں۔ ہم جن عبارات پر اس پینل کی موجودگی میں آپ حضرات کو مطمئن نہ کر سکے ان پر ہم نظر ثانی کر لیں گے، اور جن عبارات پر آپ حضرات ہمیں مطمئن نہ کر سکے ان سے آپ کو براءت کرنا ہوگی۔ اس پر مولانا نیازیؒ نے وطن واپس پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کے بعد جواب دینے کا وعدہ کیا لیکن اس کی تکمیل کی نوبت نہ آسکی۔

یہ بات جو حضرت والد محترمؒ نے مجھے زبانی طور پر فرمائی تھی، بعد میں میرے نام ایک خط میں بھی انہوں نے لکھ دی جو ان کی یاد میں شائع ہونے والی ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کی خصوصی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

حنفی اہل حدیث اختلافات بھی حضرت والد محترمؒ کی تدریس وتصنیف کا مستقل موضوع رہے ہیں اور وہ نہ صرف ترمذی شریف کی تدریس میں ان مباحث پر باحوالہ تحقیقی گفتگو کرتے تھے بلکہ ان میں سے بہت سے مسائل پر انہوں نے مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ تنازعہ ان کے نزدیک دیوبندی بریلوی تنازعہ کی طرح اصولی نہیں تھا بلکہ وہ ان مسائل کو فروعی مسائل کا درجہ دیتے تھے۔ حضرت والد محترمؒ کے شاگرد مولانا حافظ محمد یوسف (الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ) نے اپنے ایک مضمون میں جو ”امام اہل سنت کی قرآنی خدمات اور تفسیری ذوق“ کے عنوان سے الشریعہ کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جامعہ نصرۃ العلوم میں سالانہ دورۂ تفسیر کے آغاز کے موقع پر حضرت امام اہل سنتؒ کے خطاب کا ایک پورا اقتباس یوں درج کیا ہے کہ:

”قرآن کریم کی تفسیر میں ہم ان مسائل کو نہیں چھیڑیں گے جو فروعی مسائل کہلاتے

ہیں، کیونکہ اتنا وقت نہیں ہوتا۔ اگر ہم یہ بحث شروع کر دیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی ہے یا نہیں پڑھنی، آمین جہر کے ساتھ ہے یا سر کے ساتھ تو مہینہ اسی میں گزر جائے گا۔"

یعنی اہل حدیث حضرات کے اعتراضات کے جواب میں وہ حنفی موقف کی مدلل وضاحت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے لیکن ان اختلافات کا درجہ ان کے نزدیک عقیدہ اور اصول کے اختلاف کا نہیں تھا اور وہ اسی درجے میں ان مسائل پر بات کرتے تھے۔

جماعت اسلامی کے ساتھ اختلافات میں وہ جمہور کے ساتھ تھے اور ہر ضروری موقع پر جمہور اہل سنت کے موقف کی ترجمانی اور وضاحت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمن گروپ کے نام سے دو دھڑوں میں تقسیم تھی۔ ایک دھڑے کے امیر حضرت درخواستیؒ اور دوسرے کے امیر حضرت مولانا سید حامد میاںؒ تھے۔ لاہور میں حضرت درخواستیؒ کے نائب امیر کے طور پر حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ جماعتی قیادت کی ذمہ داریاں سرانجام دیتے تھے، جبکہ قاضی حسین احمد صاحب جماعت اسلامی کے قیم (سیکرٹری جنرل) ہوا کرتے تھے۔ قاضی صاحب محترم نے حضرت مولانا سید حامد میاںؒ اور حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ سے رابطہ قائم کر کے یہ پیش کش کی کہ مولانا مودودیؒ کی جن عبارات پر علماء اہل سنت کو اعتراض ہے، ان کے بارے میں ہم جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ میں قرارداد منظور کر دیتے ہیں کہ یہ مولانا مودودیؒ کی ذاتی آرا ہیں، جماعت اسلامی کا بحیثیت جماعت یہ موقف نہیں ہے اور جماعت اسلامی اس حوالے سے وہی موقف رکھتی ہے جو جمہور اہل سنت کا ہے۔ اگر ہم یہ قرارداد کر دیں تو کیا جمعیۃ علماء اسلام ہمارے ساتھ مذہبی اختلاف ختم کرنے کا اعلان کر سکتی ہے؟

دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا سید حامد میاںؒ اور حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ نے باہمی مشورہ سے راقم الحروف کے ذمے لگایا کہ میں اس سلسلے میں تین بزرگوں یعنی حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ سے بات کر کے ان کا موقف معلوم کروں، اس کی روشنی میں ہم فیصلہ کریں گے۔ میں نے تینوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر بات کی۔ تینوں بزرگوں کا جواب مختلف تھا۔ حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ نے فرمایا کہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کو اپنی قرارداد میں مولانا مودودیؒ کی عبارات کے ساتھ ساتھ خود مولانا مودودیؒ کے بارے میں بھی اپنے موقف کا اظہار کرنا ہوگا۔ والد محترمؒ نے فرمایا کہ اگر جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ قرارداد منظور کر کے مولانا مودودیؒ کی متنازعہ عبارات سے براءت کا اعلان کر دیتی ہے تو ہمارے پاس اختلافات کو باقی رکھنے کا

کوئی شرعی اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہ جائے گا۔ جبکہ حضرت علامہ خالد محمود نے فرمایا کہ خالی قرارداد سے بات نہیں بنے گی، اس لیے کہ اصل تنازعہ جماعت اسلامی کے دستور کی اس دفعہ سے شروع ہوا تھا جس میں جماعت اسلامی کا رکن بننے کے لیے پر کیے جانے والے حلف نامے میں موجود یہ اقرار نامہ تھا کہ وہ

''رسول خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہیں سمجھے گا، کسی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھے گا اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہیں ہوگا۔''

اس اقرار نامے پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی نے اعتراض کیا تھا کہ اس میں صحابہ کرامؓ کے معیار حق ہونے اور ان کے تنقید سے بالاتر ہونے کی نفی کی گئی ہے اور ذہنی غلامی کے نام سے تقلید کو رد کیا گیا ہے جبکہ صحابہ کرامؓ کا معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہونا اہل سنت کے مسلمات میں سے ہے۔ علامہ خالد محمود صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ جب تک دستور میں یہ شق موجود ہے، جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی قرارداد کے باوجود اصل تنازعہ باقی رہے گا، اس لیے اگر جماعت اسلامی دینی حلقوں کے ساتھ مصالحت چاہتی ہے تو قرارداد کے ساتھ دستور کی اس شق میں بھی ترمیم کرے، ورنہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

میں نے یہ رپورٹ جمعیۃ علماء اسلام کے دونوں بزرگوں کو پیش کی تو انہوں نے حضرت علامہ خالد محمود صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور میری ہی ڈیوٹی لگائی کہ میں قاضی حسین احمد صاحب کو یہ بات پہنچادوں۔ قاضی صاحب محترمؒ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ میں مجلس شوریٰ میں قرارداد تو کروا سکتا ہوں مگر دستور میں ترمیم کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس پر یہ گفتگو اس وقت آگے نہ بڑھ سکی۔ بعد میں اس گفتگو کے اور مراحل بھی آئے جن کا ذکر کسی اور مضمون میں تفصیل سے کروں گا لیکن تازہ صورت حال یہ ہے کہ میری معلومات کے مطابق جماعت اسلامی کی موجودہ مجلس شوریٰ نے اس دستوری دفعہ میں ترمیم کا اصولی طور پر فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ کمیٹی بنا دی گئی ہے، خدا کرے کہ کوئی بہتر صورت نکل آئے، آمین یارب العالمین۔

جہاں تک سماع موتیٰ، حیات النبیؐ اور ان کے ساتھ چند دیگر مسائل کا تعلق ہے تو والد محترمؒ نے ان مسائل پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے بلکہ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے جماعتی موقف کا تعین حضرت والد محترمؒ کے ذمے لگایا تھا جس پر انہوں نے ''تسکین الصدور'' نامی کتاب لکھی اور اکابر جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا شمس الحقؒ افغانی نے اسے حرف بہ حرف سن کر اس کی تصدیق کی اور اسے جمعیۃ اسلام کا جماعتی موقف قرار دیا۔ حضرت والد محترمؒ کا موقف یہ تھا کہ عام اموات کے سماع میں امت کے اہل علم میں شروع سے اختلاف چلا آرہا ہے اور

دونوں طرف دلائل موجود ہیں، اس لیے جس کا جس موقف پر اطمینان ہو، وہ وہی موقف رکھے لیکن اسے دوسرے موقف والوں کی تکفیر، تضلیل اور تحقیر کا حق نہیں ہے۔ البتہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبر میں حیات پر اہل السنۃ والجماعۃ کا شروع سے اتفاق چلا آ رہا ہے، اس لیے اس کا انکار اہل السنۃ کے اجماعی موقف سے انحراف ہے۔

یہ میں نے ایک ہلکا سا خاکہ موجودہ معروضی صورت حال میں فرقہ وارانہ اختلافات کے حوالے سے حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے موقف کے بارے میں پیش کیا ہے اور کم وبیش یہی موقف ان مسائل کے بارے میں حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کا بھی تھا۔ لیکن مختلف سطح پر ان اختلافات کے باوجود دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم کے ساتھ ان کے معاشرتی تعلقات کی صورت حال یہ تھی کہ شیعہ اور بریلوی حضرات کے ساتھ کسی اشد مجبوری کے سوا ان کا رابطہ وتعلق نہیں ہوتا تھا جبکہ اہل حدیث حضرات کے ساتھ ان کے روابط رہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے جنازے میں یہ دونوں بزرگ شریک ہوئے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ حضرت مولانا حافظ محمد گوندلویؒ کی وفات کا حضرت والد محترمؒ کو دوسرے دن بتایا گیا تو انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے کل کیوں نہیں بتایا گیا، میں ان کے جنازے میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ کے جنازے میں بھی دونوں بزرگوں نے شرکت کی بلکہ حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات سے چند دن قبل حضرت والد محترمؒ ان کی عیادت کے لیے گئے تو میں اور عزیزم عمار ناصر بھی ہمراہ تھے۔ میں نے اس موقع پر قاضی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! تین پشتیں حاضر ہیں، تو حضرت قاضی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب مدظلہ حضرت والد محترمؒ کی عیادت کے لیے متعدد بار گکھڑ گئے ہیں اور علالت کے باوجود جنازے کے لیے بھی گکھڑ پہنچے ہیں۔ حضرت والد محترمؒ بھی ایک موقع پر قلعہ دیدار سنگھ کے ایک سفر میں قاضی صاحب محترم سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے ہیں۔ حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب کی والدہ محترمہ کا جنازہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے پڑھایا ہے۔ اور میرا تو معمول ہے کہ جب بھی قلعہ دیدار سنگھ کسی حوالے سے حاضری ہوتی ہے تو حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی بیمار پرسی کرتا ہوں اور ان سے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ حضرت والد محترمؒ کی وفات کے بعد ہمارے ارد گرد دو ہی بزرگ رہ گئے ہیں جن کی خدمت میں دعا اور استفادہ کے لیے حاضری کو جی چاہتا ہے۔ ایک ڈسکہ کے حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقب فاضل دیوبند اور دوسرے قلعہ دیدار سنگھ کے

حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو صحت وعافیت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حیات النبیؐ کے مسئلہ کے سلسلے میں ایک بات اور بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چند سال قبل علاقہ چھچھ کے علماء کرام نے حضرو کے حضرت مولانا عبد السلام صاحب مدظلہ کی راہ نمائی میں اس تنازعہ کے حل کے لیے کوشش کی اور اس کے لیے یہ راستہ اختیار کیا کہ ایک موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے پاکستان تشریف لاکر راولپنڈی میں دونوں طرف کے بزرگوں کو جمع کر کے ایک متفقہ تحریر لکھوائی تھی جس پر دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات نے دستخط کر دیے تھے لیکن بعد میں یہ اتفاق قائم نہ رہ سکا۔ مولانا عبد السلام صاحب اور ان کے رفقا نے اس تحریر پر دوبارہ دستخط کرانے کی مہم شروع کی۔ اس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری سعید الرحمن نے میری رائے دریافت کی کہ کیا اس تحریر پر دستخط سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ میں نے عرض کیا کہ ذاتی طور پر تو میرے نزدیک مسئلہ حل ہو جانا چاہیے لیکن حضرت والد محترم سے بات کرنے کے بعد ہی حتمی طور پر کچھ عرض کر سکوں گا۔ چنانچہ میں نے اس پر حضرت والد محترم سے بات کی تو انہوں نے کھلے دل سے فرمایا کہ جو حضرات، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ والی تحریر پر دستخط کر دیں گے، ان سے ہمارا کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ میں نے یہ بات مولانا قاری سعید الرحمن کو بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد مولانا عبد السلام کی قیادت میں علاقہ چھچھ کے بہت سے علماء کرام نے اس تحریر پر دستخط کر کے اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

آخر میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کے حوالے سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تمام تر اختلافات کے باوجود مشترکہ دینی مقاصد کے لیے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کی مشترکہ جماعتوں اور متحدہ محاذوں میں ہمارے یہ دونوں بزرگ شریک رہے ہیں اور ان میں عملی کردار ادا کیا ہے۔ حضرت والد محترمؒ نے اپنی خود نوشت سوانح میں جو "الشریعہ" کی خصوصی اشاعت میں چھپ چکی ہے، خود لکھا ہے کہ وہ قیام پاکستان سے پہلے دس سال تک مجلس احرار اسلام کے کارکن رہے ہیں اور یہ دور وہ تھا جب مجلس احرار اسلام کی مرکزی قیادت میں حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ اور امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساتھ ساتھ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، صاحب زادہ سید فیض الحسنؒ آف آلو مہار شریف اور مولانا مظہر علی اظہرؒ بھی شامل تھے اور اس مشترکہ قیادت کے تحت حضرت والد محترمؒ دس سال تک ایک کارکن کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ

دونوں نے حصہ لیا ہے، دونوں جیل میں گئے ہیں اور کئی ماہ تک جیل میں رہے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساتھ مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ اور حافظ کفایت حسین مجتہدؒ شامل تھے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر کی حیثیت سے حضرت والد محترمؒ مسلسل پچیس برس تک خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اس دوران جمعیۃ علماء اسلام نے متعدّد بار متحدہ محاذوں میں شرکت کی ہے اور ہر متحدہ محاذ میں والد محترمؒ نے بھی کردار ادا کیا ہے، حتیٰ کہ جمعیۃ علماء اسلام میں جب حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان اختلاف ہوا تو حضرت مولانا ہزارویؒ کا موقف یہ تھا کہ مفتی صاحبؒ نے مودودیوں سے اتحاد کر لیا ہے اور وزارت عظمیٰ کے انتخاب میں مسٹر ذوالفقار بھٹو کے مقابلے میں مولانا شاہ احمدؒ نورانی کو امیدوار بنا کر مسلکی حمیت سے انحراف کیا ہے۔ حضرت مولانا ہزارویؒ ہمارے ان دونوں بزرگوں کے استاذ تھے اور ایک استاذ کی حیثیت سے وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے لیکن جب مولانا ہزارویؒ ان دونوں شاگردوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے گوجرانوالہ آئے تو دونوں بزرگوں نے عرض کیا کہ آپ ہمارے مخدوم اور بزرگ ہیں لیکن ہم مولانا مفتی محمودؒ کے موقف کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے اس اختلاف میں ان کے ساتھ ہیں۔

حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ نے ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں کئی جلوسوں کی قیادت کی اور حضرت والد محترمؒ ایک ماہ تک جیل میں بھی رہے، حتیٰ کہ ایف ایس ایف کے کمانڈر کی طرف سے گولی مار دینے کی دھمکی کے باوجود کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے ریڈ لائن کراس کرنے کا واقعہ بھی اسی تحریک کا ہے۔

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت بھی مشترکہ قیادت کے تحت چلائی گئی تھی اور ان قیادتوں میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ ساتھ مولانا شاہ احمدؒ نورانی، مولانا عبد الستار خان نیازیؒ، مولانا معین الدین لکھویؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، قاضی حسین احمد، پروفیسر غفور احمد، سید مظفر علی شمسی مرحوم اور علامہ علی غضنفر کراروی مرحوم بھی شامل تھے۔ ہمارے ان دونوں بزرگوں یعنی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی نے ان تحریکات میں سرگرم کردار ادا کیا اور متعدّد جلوسوں کی قیادت کی، بلکہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر کی حیثیت سے ان متحدہ محاذوں کا باقاعدہ حصہ رہے اور ان کی حیات کے آخری دور میں تمام مکاتب فکر کے مشترکہ پلیٹ فارم ’’متحدہ مجلس

عمل ”کی بھی حضرت والد محترمؒ نے حمایت کی اور اس کے امیدواروں کو کھلم کھلا سپورٹ کیا۔ اس لیے مسلکی اختلافات اور فرقہ وارانہ ترجیحات میں واضح اور دوٹوک موقف اور رویہ رکھنے کے باوجود ملک میں نفاذ شریعت اور ختم نبوت کی تحریکات میں یہ دونوں بزرگ متحدہ محاذوں اور مشترکہ پلیٹ فارم کا آخر دم تک حصہ رہے ہیں۔

آخر میں ان دونوں بزرگوں کے حوالے سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مسلکی اختلافات کے اظہار میں ان دونوں بزرگوں نے ہمیشہ تصنیف اور تدریس کو ہی ذریعہ بنایا ہے اور ان دو دائروں سے ہٹ کر عام جلسوں، جمعۃ المبارک کے خطبات اور مسجد میں دیے جانے والے عام دروس میں مسلکی اختلافات پر، خواہ وہ دیوبندی بریلوی ہوں، حنفی اہل حدیث ہوں یا حیات النبیؐ کا مسئلہ ہو، گفتگو سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ جہاں ضروری ہوا ہے وہاں مسئلہ کی وضاحت ضرور کی ہے اور اس کے دلائل بھی پیش کیے ہیں، لیکن کسی اختلافی مسئلے کو موضوع بنا کر خطبہ جمعہ، پبلک اجتماع کی تقریر یا عمومی درس میں بات نہیں کی۔ اگر کوئی دوست ان بزرگوں کے طرز عمل کا جائزہ لینا چاہیں تو دونوں بزرگوں کے خطبات جمعہ اور عمومی دروس کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات اور دروس کے مرکزی اور ذیلی عنوانات کی فہرست پر نظر ڈال لیں۔ اختلافی مسائل کا تناسب شاید کھینچ تان کر بمشکل پانچ فی صد تک پہنچ جاتا ہو، ورنہ ان کے خطبات جمعہ اور عمومی درس کے موضوعات اصلاحی مضامین اور مثبت انداز میں عقائد و اعمال کی اصلاح کے حوالے سے ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ ایک سابقہ مضمون میں ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مجلس میں گکھڑ کے ایک جدید تعلیم یافتہ دوست نے حضرت والد محترمؒ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ فرقہ وارانہ اختلافات میں نہیں پڑتے تھے اور مثبت انداز میں لوگوں کی دینی راہ نمائی کرتے تھے۔ ان صاحب کے چلے جانے کے بعد حضرت کے ایک شاگرد نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ صاحب کیا کہہ رہے تھے؟ اگر حضرت امام اہل سنت فرقہ وارانہ اختلافات میں نہیں پڑتے تھے تو اور کون پڑتا تھا؟ ان کی ساری تصانیف فرقہ وارانہ اختلافات کے حوالے سے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں اور یہ صاحب بھی درست فرما رہے تھے، اس لیے کہ آپ نے حضرت کی کتابیں پڑھی ہیں اور ان سے حدیث کے اسباق پڑھے ہیں جن میں مسلکی اختلافات کی پورے دلائل کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے اور یہ صاحب حضرت کا مسجد کا عمومی درس اور جمعۃ المبارک کے خطابات سنتے رہے ہیں جن میں عام طور پر ایسے مسائل پر بحث نہیں ہوتی تھی۔ بس یہی توازن ہے جس کا حضرات شیخین کریمین کے حوالے سے لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ۔مارچ ۲۰۱۰ء)

(۳)

فقہی، علمی وفکری مسائل میں باہمی اختلاف ایک فطری عمل ہے اور ہر دور میں ارباب علم ودانش کا معمول رہا ہے کہ وہ اختلاف رائے کے حق کا احترام کرتے تھے اور دلیل ومنطق کے ساتھ اس اختلاف کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت امام اہل سنتؒ کا طرز عمل بھی یہ تھا کہ وہ اختلاف کو اختلاف کے دائرے میں رکھتے تھے اور طعن وتشنیع اور مخالفت کا رخ اختیار نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس کی بھی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں:

میں نے طالب علمی کے دور میں، جبکہ میں موقوف علیہ کے سال میں تھا، ہفت روزہ ترجمان اسلام میں ''مزارعت اور بٹائی'' پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ میں نے اس میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اس موقف کی وکالت کی کہ مزارعت جائز نہیں ہے۔ یہ معروف بات ہے کہ بٹائی یعنی حصے پر زمین دینا حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ احناف کا مفتی بہ قول صاحبین والا ہے، مگر میں نے اس تفصیلی مضمون میں یہ موقف اختیار کیا کہ حضرت ملا علی القاریؒ نے لکھا ہے کہ دلائل امام صاحبؒ کے مضبوط ہیں جبکہ مصلحت عامہ صاحبین کے موقف میں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ماضی میں صاحبین کا موقف مصلحت عامہ کی وجہ سے اختیار کیا گیا تھا تو آج اگر مصلحت عامہ امام صاحبؒ کا قول اختیار کرنے میں ہو تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ موقف جمہور احناف کے موقف اور مفتی بہ قول کے خلاف تھا اور اس پر مجھے کمیونسٹ اور سوشلسٹ مولوی ہونے کے طعنے بھی ملے، مگر حضرت امام اہل سنت نے جب یہ مضمون پڑھا تو اس پر صرف ایک جملہ کہا کہ ''احناف کا مفتی بہ قول یہ نہیں ہے''۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر ہمارے درمیان اس حوالے سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

حضرت امام اہل سنتؒ نماز عید سے قبل تقریر کو صراحتاً بدعت کہتے تھے، جبکہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت صوفی صاحبؒ کا اور عید گاہ گراونڈ گوجرانوالہ میں ہمارا معمول شروع سے نماز سے قبل تقریر کا چلا آ رہا ہے۔ یہ بات ان کو معلوم تھی اور کبھی کبھی ہمارے درمیان گفتگو بھی ہو جاتی تھی، مگر کبھی ہلکی پھلکی گفتگو سے بات آگے نہیں بڑھی۔

رمضان المبارک میں تراویح اور نوافل کے بعد اجتماعی دعا کو وہ بدعت کہتے تھے جبکہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ان کے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے ہاں اس دعا کا معمول تھا اور میں نے

اسی معمول کو اپنایا ہوا ہے۔ حضرت والد محترمؒ کو اس کا علم تھا اور وہ وقتاً فوقتاً بات بھی کرتے تھے لیکن بات صرف ہلکی پھلکی گفتگو تک رہتی تھی۔

اہل تشیع اور بریلوی حضرات کی علی الاطلاق تکفیر کے حوالے سے حضرت والد محترمؒ، حضرت عم مکرم مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی اور راقم الحروف کے نقطہ نظر کا فرق سب احباب کو معلوم ہے لیکن یہ مسئلہ کبھی ہمارے درمیان نزاع کا باعث نہیں بنا۔

حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی مدظلہ فارمی مرغی کو ''جلالہ'' کے دائرے میں شامل کرتے ہیں اور اسے حلال نہیں سمجھتے۔ حضرت والد محترمؒ کے علم میں یہ بات تھی اور وہ کبھی کبھی دل لگی میں کچھ کہہ بھی دیتے تھے لیکن یہ بات کبھی مسئلہ نہیں بنی، اور اس دور میں بھی نہیں بنی جب حضرت مفتی صاحب مدظلہ جامعہ نصرۃ العلوم کے دار الافتاء کے سربراہ تھے۔

کیمرے اور ٹی وی وغیرہ کی تصویر کے بارے میں حضرت امام اہل سنتؒ کا موقف عدم جواز کا تھا، جبکہ میرا طالب علمانہ رجحان ''موطا امام محمد'' میں حضرت امام محمدؒ کے قول کی روشنی میں اس کے جواز کی طرف ہے۔ میری یہ رائے حضرت والد محترم کے علم میں تھی لیکن انہوں نے کبھی اس پر ''حرام کو حلال کرنے'' کا فتویٰ نہیں لگایا اور نہ اس حوالے سے کبھی مجھ سے کوئی باز پرس کی۔

استاذ محترم حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ کا اپنا انداز فکر تھا اور ان کے بھی بعض تفردات ہوتے تھے جن کا وہ اپنے سبق کے دوران پوری شدت کے ساتھ اظہار بھی کرتے تھے لیکن ان کی کوئی اختلافی رائے کبھی مدرسے میں مسئلہ نہیں بنی۔

حضرت امام اہل سنتؒ کا مزاج، رویہ اور ذوق یہ تھا کہ وہ اختلاف رائے کا حق دیتے تھے، اس کا احترام کرتے تھے اور کسی اختلاف کو مسئلہ بنا لینے کی بجائے اسے اس کی حدود میں رکھتے تھے۔

حضرت والد محترمؒ سے تعلیم حاصل کرنے والے سب شاگرد جانتے ہیں کہ وہ اس بات کی اکثر تلقین کیا کرتے تھے کہ اپنا موقف مضبوط رکھو لیکن بیان کے لیے الفاظ نرم اختیار کرو اور خیر خواہانہ لہجہ اپناو۔ وہ سخت کلامی اور سخت بیانی سے نہ صرف خود گریز کرتے تھے بلکہ اسے برداشت بھی نہیں کرتے تھے اور ٹوک دیتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنے دو ذاتی واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

میرا طالب علمی کا ابتدائی دور تھا، گکھڑ میں حضرت مولانا قاری سید محمد حسن شاہؒ کا خطاب تھا۔ میرے استاذ محترم جناب قاری محمد انور صاحبؒ نے مجھے چند جملے رٹا کر ان سے پہلے تقریر کے لیے کھڑا کر دیا۔ میں نے مائیک کے سامنے کھڑے ہوتے ہی آو دیکھا نہ تاو، مرزا غلام احمد قادیانی کا نام لے کر بے نقط سنانا شروع

کر دیں۔ حضرت والد محترمؒ اسٹیج پر موجود تھے، انہوں نے مجھے گریبان سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور مائیک پر کھڑے ہو کر باقاعدہ معذرت کی کہ بچہ ہے، جوش میں غلط باتیں کر گیا ہے۔

اسی طرح ایک بار میں نے زمانہ طالب علمی میں بزرگ اہل حدیث عالم مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ کے کسی مضمون کا جواب لکھا جس میں یہ انداز اختیار کیا کہ ''حافظ عبد القادر یہ کہتا ہے''۔ حضرت والد محترمؒ کو یہ مضمون چیک کرنے کے لیے دیا تو الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ کی طرف اٹھایا کہ تمھارا چھوٹا بھائی ہے جو یوں لکھ رہے ہو؟ ہو سکتا ہے تمھارے باپ سے بھی بڑا ہو۔ یوں لکھو کہ مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ یوں لکھتے ہیں اور مجھے ان کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔

حضرت والد محترمؒ کا معاشرتی رویہ بھی ماضی کے اہل علم کی طرح مثالی اور آئیڈیل تھا۔ وہ مسلکی اور علمی اختلاف کی وجہ سے باہمی میل جول، ملاقات اور خوشی غمی میں شرکت ترک نہیں کر دیتے تھے۔ اس کی چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اہل حدیث مکتب فکر کے بزرگ عالم دین تھے، ان کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت عم مکرمؒ کے ساتھ میں نے بھی شرکت کی۔

ایک اور اہل حدیث بزرگ عالم دین حضرت مولانا حافظ محمد گوندلویؒ کی وفات پر حضرت والد محترمؒ کو بروقت اطلاع نہ مل سکی تو وہ دوستوں سے سخت ناراض ہوئے کہ انہوں نے بتایا کیوں نہیں، وہ ان کے جنازے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

مسئلہ حیات النبیؐ پر حضرت والد محترمؒ، حضرت صوفی صاحبؒ اور حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ کی ایک دوسرے کے جواب میں تصانیف سے کون واقف نہیں؟ لیکن اس کے باوجود ہمارا قاضی خاندان کے ساتھ میل جول کا تعلق شروع سے قائم ہے اور بحمد اللہ اب بھی ہے۔ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب فراش تھے تو والد محترم مجھے اور عمار خان کو ساتھ لے کر ان کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئے۔ اس موقع پر یہ عجیب سی بات ہوئی کہ میں نے حضرت قاضی صاحبؒ سے جب یہ عرض کیا کہ حضرت! تین پشتیں حاضر ہیں، تو وہ رونے لگ گئے۔

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحبؒ کے جنازے میں حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کے ساتھ راقم الحروف اور ہمارے خاندان کے دیگر افراد نے بھی شرکت کی۔

حضرت مولانا قاضی عصمت اللہؒ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو حضرت امام اہل سنتؒ نے نہ صرف ان کے جنازے میں شرکت کی بلکہ خود جنازہ پڑھایا۔

حضرت والد محترمؒ کی بیماری کے دوران حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ صاحبؒ کی بیمار پرسی کے لیے متعدّد بار تشریف لائے۔ حضرت قاضی صاحبؒ بیمار ہوئے تو میں ان کی بیمار پرسی کے لیے جاتا رہا اور بحمد اللہ تعالیٰ ان کے جنازے میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی۔ اب بھی ہم دونوں خاندان ایک دوسرے کی خوشی غمی میں حسب موقع شریک ہوتے ہیں اور اگر کہیں ملاقات ہو جائے تو ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر ادھر ادھر نہیں دیکھنے لگ جاتے بلکہ محبت واحترام کے ساتھ ملتے ہیں، ایک دوسرے کا حال پوچھتے ہیں اور ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں۔

خود ہمارے خالو محترم مولانا عبد الحمید قریشی مرحوم جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے سرگرم راہ نما تھے لیکن اس کے باوجود حضرت والد محترمؒ نے ان کے ساتھ خاندانی روابط میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، انہیں خوشی غمی کے ہر موقع پر شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور ان کے ہاں خوشی غمی کے مواقع پر حضرت والد محترمؒ اپنے اہل خانہ کی طرف سے نمائندگی کو یقینی بناتے تھے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اجتماعی دینی وقومی مسائل کے دائرے میں مختلف مکاتب فکر کی مشترکہ جدوجہد میں شریک رہے ہیں اور بھرپور تحریکی وسیاسی زندگی گزاری ہے جس کی چند جھلکیاں درج ذیل ہیں:

وہ تحریک پاکستان سے قبل جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے باقاعدہ کارکن تھے اور ان کی تحریکی سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہے۔ وہ اس دور میں مجلس احرار اسلام کے رکن بلکہ رضا کار رہے جب اس کی قیادت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کے ساتھ ساتھ مولانا سید محمد داود غزنویؒ، مولانا مظہر علی اظہرؒ اور صاحب زادہ سید فیض الحسنؒ بھی شامل تھے۔

وہ کم وبیش ربع صدی تک جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے ضلعی امیر رہے ہیں اور جمعیۃ کے مرکزی اجلاسوں میں شرکت کے لیے انہوں نے ڈھاکہ تک کے اسفار کیے ہیں۔ اس دوران جمعیۃ ملک کے جس سیاسی یا دینی متحدہ محاذ میں شامل رہی ہے، وہ اس کا حصہ اور متحرک کردار رہے ہیں۔ اس میں پاکستان قومی اتحاد، آل پارٹیز مجلس عمل تحفظ ختم نبوت اور متحدہ مجلس عمل بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں آل پارٹیز مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے خود گرفتاری پیش کی تھی اور کم وبیش دس ماہ جیل میں رہے تھے۔ اس وقت مجلس عمل کے صدر بریلوی مکتب فکر کے مقتدر راہ نما مولانا سید ابو الحسنات قادریؒ تھے۔

جب مجاہد اسلام حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ

نے متحدہ محاذوں میں شرکت سے اختلاف کرتے ہوئے الگ راستہ اختیار کیا تو امام اہل سنتؒ نے ان بزرگوں کے تمام تر احترام کے باوجود ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ تمام متحدہ محاذوں کا حصہ رہے اور تحریکوں میں کردار ادا کرتے رہے۔

انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کی اپنے علاقے میں قیادت کی اور فائرنگ کی ڈیڈ لائن کو عبور کرتے ہوئے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لیا اور پھر کم و بیش ایک ماہ جیل میں رہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ مسلسل بستر علالت پر تھے، انہوں نے متحدہ مجلس عمل کا ساتھ دیا اور گکھڑ سے قومی اسمبلی کے لیے ایم ایم اے کے امیدوار جناب بلال قدرت بٹ کی کھلم کھلا حمایت کی جو جماعت اسلامی کے ضلعی امیر تھے۔ بٹ صاحب الیکشن تو نہ جیت سکے لیکن حضرت امام اہل سنتؒ کی اس علانیہ حمایت کی وجہ سے گکھڑ میں انہوں نے سب سے زیادہ ووٹ لیے۔ اس کی صدائے بازگشت حالیہ انتخابات میں بھی سنی گئی۔ بلال قدرت بٹ اس بار جماعت اسلامی کی طرف سے قومی اسمبلی کے امیدوار تھے، ان کے حریف پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار جناب میاں طارق محمود نے گکھڑ میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بلال قدرت بٹ سے مخاطب ہو کر کہا کہ پچھلی بار تو تمھیں مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے یہاں سے ووٹ دلوا دیے تھے، اب دیکھتا ہوں تمھیں کون ووٹ دیتا ہے!

حضرت امام اہل سنتؒ کے حوالے سے یہ چند باتیں میں نے نکتہ واضح کرنے کے لیے تحریر کر دی ہیں کہ ان کا اسلوب گفتگو، طرز عمل اور ذوق و مزاج ہرگز وہ نہیں تھا جس کو ان کی طرف منسوب کرنے یا ان کے "زیر سایہ" اختیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی بات اپنی ذمہ داری پر کریں اور اپنی فائرنگ کے لیے حضرت امام اہل سنت کا کندھا استعمال کرنے سے گریز کریں۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جون ۲۰۱۳ء)

(۴)

ایک موقع پر بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے والد محترمؒ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موقف اور طرز عمل کیا تھا؟ خصوصاً اس پس منظر میں کہ انہوں نے اثناء عشری اہل تشیع کی تکفیر پر "ارشاد الشیعہ" کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔ میں نے گزارش کی کہ انہوں نے "ارشاد الشیعہ" تصنیف فرمائی اور اس میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ صرف ان کا موقف نہیں بلکہ یہ تو اہل سنت کا موقف ہے اور خود ہمارا موقف بھی اثناعشری اہل تشیع کی حد تک یہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام تحریکات کا حصہ رہے ہیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد

سرفراز خان صفدرؒ اور عم محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی اور دیگر بزرگ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں شریک ہوئے ہیں، جلوسوں کی قیادت کی، مشترکہ اجتماعات میں شرکت کرتے رہے ہیں اور دونوں گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کم و بیش دس ماہ، حضرت صوفی صاحبؒ نے تقریباً چھ ماہ اس تحریک میں جیل کاٹی ہے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں دونوں حضرات سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے رہے، مشترکہ اجتماعات میں خطاب کرتے رہے ہیں اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی صدارت میں منعقد ہونے والا وہ تاریخی جلسہ تحریکی تاریخ کا حصہ ہے جس میں دوسرے مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کے علاوہ شیعہ راہ نماؤں نے بھی خطاب کیا تھا۔ بلکہ یہ واقعہ بھی تاریخی اہمیت کا حاصل ہے کہ جلسہ کے بعد جب پولیس نے علامہ علی غضنفر کراروی مرحوم کو جلسہ گاہ سے نکلتے ہی گرفتار کرلیا تو آغا شورش کاشمیری مرحوم نے نہ صرف اپنے خطاب کے دوران شدید احتجاج کیا بلکہ پولیس چوکی کا لوگوں کے ہجوم کے ساتھ محاصرہ کرلیا اور کراروی صاحب کو رہا کر کے وہاں سے واپس ہوئے۔

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ میں گوجرانوالہ میں حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی نے مشترکہ عوامی جلوس کی قیادت کی اور گکھڑ میں حضرت والد محترمؒ جلوسوں کی قیادت کرتے رہے۔ اور ان کا یہ تاریخی واقعہ بھی اسی تحریک کا ہے کہ فیڈرل فورس کے کمانڈر نے اس کو روکنے کے لیے اس کے راستے میں لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ جو شخص اس لائن کو عبور کرے گا، اسے گولی مار دی جائے گی، یہ سن کر حضرت والد محترمؒ نے اپنے رفقاء استاذ محترم حضرت مولانا محمد انور صاحب مدظلہ اور حاجی سید ڈار صاحب مرحوم کے ہمراہ یہ کہہ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے لائن کراس کی کہ مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔ ان کا یہ جذبہ دیکھ کر فیڈرل سیکورٹی فورس کی رائفلیں سرنگوں ہوگئیں اور جلوس پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال وہ بستر علالت پر رہے لیکن اس دوران متحدہ مجلس عمل تشکیل پائی تو انہوں نے دونوں الیکشنوں میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کی حمایت کی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین فرمائی۔ بعض حضرات نے اس سلسلہ میں تحفظات کا بھی ان کے سامنے اظہار کیا، مگر ان کا موقف وہی رہا۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ مارچ ۲۰۱۱ء)

(۵)

یہ شکایت کہ تبلیغی جماعت کے بعض بزرگوں کے بیانات میں دین کے دیگر شعبوں کی نفی یا کم از کم ان

کی اہمیت کو کم کرنے کا تاثر پایا جاتا ہے، نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب سے چند برس قبل کی بات ہے کہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم، حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ، حضرت مولانا حسن جان شہیدؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ نے اس مسئلہ پر اور اس جیسی چند دیگر شکایات پر رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر انڈیا سے تشریف لانے والے بزرگوں سے باقاعدہ طور پر گفتگو کرنا ضروری سمجھا۔ اس ملاقات میں برادرم مولانا سعید احمد جلال پوری اور راقم الحروف بھی شریک تھے۔

بھارت سے تشریف لانے والے حضرات میں حضرت مولانا سعد صاحب، حضرت مولانا زبیر صاحب اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب سے علیحدگی میں گفتگو ہوئی اور مذکورہ بالا بزرگوں کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں جو شکایات پیش کی گئیں، ان میں یہ شکایت بھی شامل تھی کہ تبلیغی اجتماعات میں ہونے والے بعض بیانات میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اب صرف دعوت و تبلیغ کا یہ کام ہی دین کا کام رہ گیا ہے اور دیگر دینی شعبوں بالخصوص دینی مدارس اور جہاد کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ جبکہ دیگر شکایات میں یہ باتیں تھیں کہ اب فیصلوں میں مشاورت کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے اور کشف والہام کو زیادہ تر فیصلوں کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ تبلیغی جماعت کے اہتمام میں چلنے والے دینی مدارس میں نصاب کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی اور عام بیانات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؒ کے ظہور کا اس انداز سے تذکرہ کیا جانے لگا ہے کہ بس اب ان کا ظہور ہونے ہی والا ہے اور ہمارا کام صرف ان کا انتظار کرنا رہ گیا ہے۔ پاکستان کے ان ذمہ دار ترین علماء کرام نے ان امور کے بارے میں اپنا موقف یہ بیان کیا کہ یہ باتیں شرعاً درست نہیں ہیں، اس لیے ان کا سد باب کیا جانا چاہیے۔ انڈیا کے تبلیغی بزرگوں کی طرف سے حضرت مولانا سعد صاحب نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اصلاح احوال کی طرف پوری توجہ دیں گے۔

(برائے روزنامہ اسلام۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۷ء)

(۶)

امام مہدی کے ظہور کا تذکرہ ان دنوں ہماری مختلف محافل میں میرے والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے حوالے سے بھی ہو رہا ہے اور گزشتہ دو ماہ کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں خود مجھ سے اس سلسلے میں بہت سے دوستوں نے استفسار کیا ہے۔ اس بارے میں ایک روایت عام طور پر

چل رہی ہے کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اس سال بیت اللہ شریف کے حج کے لیے اس ارادہ سے جا رہے ہیں کہ ان کے خیال میں امام مہدی کا ظہور اسی سال ہونے والا ہے، وہ انہیں پہچانیں گے اور یہ ان کی بیعت کریں گے۔ ہمارے ایک محترم اور مکرم بزرگ مولانا عبد الرحمن اشرفی مدظلہ کو اس سلسلے میں خدا جانے کس ذریعے سے روایت پہنچی جس کا انہوں نے ایک اخباری انٹرویو میں تذکرہ فرما دیا اور ملک بھر میں اس حوالے سے چہ می گوئیوں اور استفسارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے علم میں پہلے سے یہ بات تھی کہ حضرت والد مدظلہ نے امام مہدی کے ظہور کے بارے میں اس طرح کی کوئی بات نہیں فرمائی لیکن اس کے باوجود احتیاطاً میں نے چند روز قبل ان کی خدمت میں پھر حاضر ہو کر دریافت کیا تو انہوں نے بھی تصدیق کر دی کہ انہوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں ہی اور نہ ہی اس سال ان کا حج کے لیے جانے کا کوئی پروگرام ہے۔ وہ اپنے گھر میں ہیں، بستر علالت پر ہیں، چلنے پھرنے سے معذور ہیں، اور سفر کے سرے متحمل ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اصل بات صرف اتنی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے خواب میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تین بار زیارت سے نوازا ہے اور ان میں سے ایک خواب کی تعبیر میں ان کے استاذ محترم حضرت مولانا عبد القدیر صاحبؒ نے یہ فرمایا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کی زندگی میں آجائیں۔ حضرت والد صاحب مدظلہ نے اپنے ان تینوں خوابوں کا تذکرہ اپنی کتاب "توضیح المرام" میں کر دیا ہے اور میرے خیال میں اسی سے بات بڑھتے بڑھتے اتنی دور تک چلی گئی ہے، جبکہ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ خواب حضرت والد محترم مدظلہ نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران دیکھا تھا جبکہ وہ ملتان جیل میں اسیر تھے......

خواب کی بات تو اسی قدر ہے، اس سے زیادہ اگر کچھ ہے تو وہ محض حاشیہ آرائی ہے۔ البتہ امام مہدی کے حوالے سے ایک اور بات کا تذکرہ شاید نامناسب نہ ہو کہ رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے موقع پر گزشتہ سال پاکستان کے سرکردہ علماء کرام نے، جن میں والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے علاوہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر مدظلہ، مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ، مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ، مولانا حسن جان مدظلہ اور دیگر حضرات شامل تھے، تبلیغی جماعت کے انڈیا سے تعلق رکھنے والے اکابر سے خصوصی ملاقات میں انہیں جن چند اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی تھی، ان میں امام مہدی کے ظہور کا مسئلہ بھی تھا۔ ان بزرگوں کا کہنا تھا کہ تبلیغی جماعت کے عام حلقوں میں امام مہدی کے ظہور کے بارے میں جس طرح تذکرہ ہو رہا ہے

اور یہ تاثر جنم لے رہا ہے کہ شاید امام مہدی کا بہت ہی جلد ظہور ہونے والا ہے اور لوگوں کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے، یہ مناسب نہیں ہے اور بے احتیاطی کی بات ہے جس کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ تبلیغی جماعت کے بزرگوں نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا اور اس سلسلے میں اصلاح احوال کی کوشش کا وعدہ فرمایا تھا۔

(روزنامہ اسلام، ۲۸ دسمبر ۲۰۰۵ء)

(۷)

دینی مدارس کے نصاب و نظام کے بارے میں بہت سے دوست مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اس حوالے سے آپ کے والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موقف اور طرز عمل کیا تھا؟ یہ سوال بہت سے ذہنوں میں آیا ہوگا، اس لیے والد محترمؒ کے تعلیمی رجحانات اور طریق کار کی بابت کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔

والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا اب سے نصف صدی قبل خیال تھا کہ درس نظامی کے مروّجہ نصاب میں قرآن کریم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ شامل نہیں ہے، صرف اوپر کے درجوں میں جلالین اور بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی ہے۔ اس لیے انہوں نے جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ترجمہ قرآن کریم مناسب تفسیر کے ساتھ مستقل طور پر پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا جس میں اس دور میں کافیہ کے درجہ سے اوپر تک کے طلبہ کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ با قاعدہ حاضری ہوتی تھی، غیر حاضری پر ہمارے طالب علمی کے دور میں جرمانہ ہوتا تھا جو چار آنے (پچیس پیسے) فی غیر حاضری ہوتا تھا اور مدرسہ میں تعلیم کا آغاز درس قرآن کریم کے اسی پیریڈ سے ہوتا تھا۔ بحمد اللہ تعالیٰ اب یہ سعادت میرے حصہ میں ہے اور ترجمہ قرآن کریم کے پون گھنٹے کے اس پیریڈ کے بعد باقی اسباق کی ترتیب شروع ہوتی ہے۔ مکمل ترجمہ قرآن کریم دو سال میں مکمل ہوتا ہے، پندرہ پارے ایک سال اور پندرہ پارے دوسرے سال میں پڑھائے جاتے ہیں۔ دورۂ حدیث اور اس کے بعد کے دو درجات کے طلبہ کی شرکت لازمی ہوتی ہے اور اس کی با قاعدہ حاضری لگتی ہے البتہ جرمانے کا سلسلہ اب نہیں ہے۔ جرمانے کے سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ میں نے یہ ترجمہ طالب علمی کے دور میں کم از کم تین بار حضرت والد محترمؒ سے پڑھا ہے۔ اس دوران غیر حاضریاں بھی ہوتی تھیں اور جرمانہ بھی دینا پڑتا تھا۔ حضرت والد محترمؒ جب جرمانے والوں کے نام پکار کر جرمانے کی رقم کا اعلان کرتے تو فہرست میں عام طور پر میرا نام بھی ہوتا تھا۔ میں اپنے نام کے ساتھ جرمانے کا اعلان سن کر حضرت

والدِ محترمؒ کے جیب کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا کہ ادا تو وہیں سے ہونا ہے۔ اس پر تھوڑی بہت ڈانٹ پلا کر وہ جرمانہ ادا کر دیتے تھے۔

بعد میں ۱۹۷۶ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم اور اس کی ملحقہ جامعہ مسجد نور کو محکمہ اوقات پنجاب نے سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو اس کے خلاف مزاحمتی تحریک کے دوران یہ ضرورت پیش آئی کہ شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات میں مدرسہ خالی نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر شروع کر دیا گیا جو اکیس برس تک (۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۶ء) مسلسل جاری رہا اور ہزاروں علماء کرام اور طلبہ نے اس سے استفادہ کیا۔ یہ دورۂ تفسیر حضرت والدِ محترمؒ کی آواز میں آڈیو سی ڈی کی صورت میں مکمل طور پر موجود و محفوظ ہے۔ برادرِ عزیز مولانا عبد القدوس خان قارن اسے تحریری صورت میں مرتب کر رہے ہیں اور یہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا ذوق رکھنے والے علماء کرام اور طلبہ کے لیے ایک عظیم علمی تحفہ ہو گا۔

کم و بیش اکیس سال تک مسلسل پڑھانے کے بعد یہ سلسلہ حضرت والد محترمؒ نے ترک کر دیا تو بہت سے دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ میں نے بھی ان سے عرض کیا کہ دورۂ تفسیر کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میں اب معذور ہو گیا ہوں اور مسلسل پڑھانا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے عرض کیا کہ چند پارے آپ پڑھا دیں، باقی میں اور قارن صاحب مکمل کر لیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو علماء اور طلبہ دورۂ تفسیر پڑھنے کے لیے آئیں گے، وہ اس اعتماد کے ساتھ آئیں گے کہ سارا قرآن کریم میں خود (یعنی حضرت شیخؒ) پڑھاؤں گا، اگر میں نے چند پارے پڑھا کر چھوڑ دیا تو ان کا اعتماد مجروح ہو گا جو دیانت کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ اب چونکہ وفاق المدارس نے مکمل ترجمہ قرآن کریم نصاب میں شامل کر دیا ہے جو مختلف مراحل میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے اس لیے اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ چنانچہ سالانہ دورۂ تفسیر کا سلسلہ موقوف ہو گیا جبکہ دو سال والا ترجمہ قرآن کریم وفاق المدارس کے ترجمہ قرآن کریم کے نصاب کے باوجود الگ طور پر اب بھی ہوتا ہے اور حضرت والدِ محترمؒ کی زندگی میں ہی ان کے حکم پر یہ سعادت میرے حصہ میں آگئی تھی جو مسلسل جاری ہے، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

میرے ساتھ ابتدائی سالوں میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے بھتیجے قاضی مشتاق احمد صاحب بھی شریک سبق رہے ہیں۔ غالباً شرح ملا جامی تک ہم نے اکٹھے پڑھا ہے۔ بڑے ذہین طالب علم تھے، بعض باتیں جو سبق کے دوران سمجھ میں نہیں آتی تھیں میں تکرار کے دوران ان سے سمجھا کرتا تھا۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی شوق

ہوا اور میں نے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔ خیال تھا کہ انگریزی اور حساب کے علاوہ دوسرے مضامین میں کچھ زیادہ محنت درکار نہیں ہوگی اس لیے پہلے مرحلہ میں انہیں کلیئر کر لیتا ہوں اور اگلے سال تیاری کر کے انگریزی اور حساب کا امتحان دے دوں گا۔ اس کے لیے میں نے داخلہ فارم حاصل کر لیا جس کا حضرت والد محترمؒ کو علم ہوا تو انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا حتیٰ کہ دھمکی دی کہ اگر تم نے امتحان دیا تو میں تم سے لاتعلقی اختیار کر لوں گا۔ چنانچہ میں نے ارادہ ترک کر دیا حتیٰ کہ جب میرے ساتھی قاضی مشتاق احمدؒ نے میٹرک کے امتحان میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے پر تعلیمی لائن بدل کر سکول و کالج کی لائن اختیار کر لی تو مجھے حضرت والدِ محترمؒ کے اس فیصلے پر اطمینان بھی ہو گیا کہ ان کی ناراضگی اور دھمکی فراست و بصیرت پر مبنی تھی۔

لیکن اس کے بعد دو عشروں کا وقفہ نہیں گزرا تھا کہ ہم نے گوجرانوالہ میں جمعیۃ اہل سنت کے زیر اہتمام ''شاہ ولی اللہ یونیورسٹی'' کے قیام کا پروگرام بنا لیا جس کا ٹائٹل ''دینی و عصری تعلیم کا حسین امتزاج'' تھا اور اہداف میں یہ بات شامل تھی کہ علماء اور فضلاء کو یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے باقاعدہ امتحانات دلوائے جائیں اور دو تین سال تک ہم نے بہت سے فضلاء کو بی اے اور ایم اے کے امتحانات دلوائے۔ اس سارے پروگرام کی سرپرستی حضرت والدِ محترمؒ اور حضرت عم مکرمؒ فرما رہے تھے، دونوں بزرگ شاہ ولی اللہ ٹرسٹ کے رکن بلکہ باقاعدہ سرپرست تھے، اس کے اجلاس عام طور پر مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہوتے تھے اور حضرت والد محترمؒ ان کی صدارت کیا کرتے تھے۔ اس دوران ایک بات یہ ہوئی کہ ۱۹۸۶ء میں جمعیۃ علماء برطانیہ کی دعوت پر حضرت والدِ محترمؒ اس کی ''سالانہ توحید و سنت کانفرنس'' میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تو تین ہفتے وہاں کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ ہمارے محترم دوست اور حضرت والد محترمؒ کے عزیز شاگرد مولانا عبد الرؤف ربانی خطیب مکی مسجد رحیم یار خان ان کے رفیق سفر تھے۔ اس سفر سے واپسی پر ایک مجلس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے فرمایا کہ 'او خبطی! تم ٹھیک کہتے تھے، انگریزی زبان اور جدید تعلیم بھی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے کسی پروگرام میں سب لوگوں کے سامنے فرما دیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی ایک عمومی طرز کی نشست میں حضرت والدِ محترمؒ نے نہ صرف یہ بات فرما دی بلکہ عصری تعلیم کی ضرورت پر پندرہ بیس منٹ تک گفتگو بھی فرمائی جو اس ادارے کی آئندہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد بنی۔

یہ ہمارے بزرگوں کا ذوق اور مزاج ہے کہ دینی اور قومی حوالے سے وہ جس چیز کی ضرورت محسوس کر لیتے تھے، اسے نظر انداز نہیں کرتے تھے اور انہیں اس کے لیے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنا پڑتا تو وہ

اس سے گریز نہیں کرتے تھے۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جنوری ۲۰۱۳ء)

قاری عبدالحلیمؒ

کراچی کے حالیہ سفر کے دوران جامعہ بنوریہ بھی جانا ہوا جو کراچی کے بڑے مدارس میں سے ہے اور اس کی دینی و تعلیمی سرگرمیوں کا دائرہ دنیا کے مختلف ممالک تک وسیع ہے۔ گزشتہ تین برس سے مجھے امریکا کی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن میں جانے کا موقع مل رہا ہے جہاں چشتیاں کے مولانا حافظ محمد اقبال صاحب ایک عرصہ سے تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کے تعلیمی و دعوتی پروگرام کا ایک حصہ مقامی ریڈیو پر دو گھنٹے کے ہفتہ وار پروگرام کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس پروگرام میں متعدّد بار شریک ہونے اور ہیوسٹن میں مقیم مسلمانوں کے سامنے مختلف موضوعات پر گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ اس ہفتہ وار پروگرام کا ایک حصہ جامعہ بنوریہ کراچی کے تعاون سے چلتا ہے۔ جامعہ بنوریہ سے ریڈیو کا آن لائن رابطہ ہوتا ہے، لوگ سوالات کرتے ہیں جن کے جوابات یہاں سے دیے جاتے ہیں، اور جامعہ کے کوئی استاذ کسی موضوع پر بیان بھی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ مجھے بہت پسند آیا ہے، اگر پاکستان کے بڑے تعلیمی ادارے اس طرز کے پروگرام منظم طور پر اور باہمی مشاورت و تقسیم کار کے ساتھ کریں تو اس کی افادیت بڑھ جائے گی اور غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی دینی راہنمائی اور تعلیم کا خلاء بہت حد تک کم کیا جا سکے گا۔

جامعہ بنوریہ کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم صاحب ہمارے پرانے دوست اور ساتھی ہیں اور ان کی تعلیمی سرگرمیاں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں ان کے والد محترم قاری عبدالحلیم صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور میں کراچی حاضری کے موقع پر ان کے پاس تعزیت کے لیے جانا چاہتا تھا۔ مولانا فداء الرحمان درخواستی سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں بھی گزشتہ دنوں بنگلہ دیش کے سفر پر تھا اور ابھی تک جامعہ بنوریہ نہیں جا سکا اس لیے اکٹھے چلتے ہیں۔ چنانچہ مولانا فداء الرحمان درخواستی اور راقم الحروف اکٹھے جامعہ بنوریہ گئے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جامعہ بنوریہ کے استاذ مولانا عبدالمجید صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام کاج میں مصروف تھے، جامعہ سے تھوڑی دیر کے لیے گھر گئے، واپسی پر سیڑھیاں اترتے ہوئے کچھ تکلیف محسوس ہوئی مگر ڈاکٹر کے پاس پہنچنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ کے حضور جا پہنچے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب اور جامعہ کے دیگر اساتذہ سے مفتی صاحب

کے والد قاری عبدالحلیمؒ اور مولانا عبدالمجیدؒ کے انتقال پر تعزیت کی اور کچھ دیر ان کے ساتھ ملاقات وگفتگو رہی۔

یہ بات اس سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی کہ مولانا مفتی محمد نعیم کا تعلق ایک نومسلم خاندان سے ہے۔ اس کی کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں تو مجھے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا خاندان یاد آگیا کہ یہ بھی نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت وتبلیغ اور دینی علوم کی نشر واشاعت کے ذریعہ کے طور پر انہیں قبول فرمالیا اور آج دنیا میں ان کا فیض عام ہے۔ مفتی محمد نعیم کے والد مرحوم قاری عبدالحلیم بھی ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے، ان کے بارے میں جو تفصیلات مجھے بتائی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۹۳۴ء میں قاری عبدالحلیمؒ کے والد محترم جمشید صاحب سوڈان میں کسٹم آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کیا کرتے تھے۔ انہیں سوڈان میں اسلام قبول کرنے کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے اسلام لانے سے قبل اسلامی تعلیمات کو پڑھا، اسلام کو خوب سمجھا اور پھر قبول کیا۔ انہیں اسلامی تعلیمات کو دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ اصل اور حق پر مبنی مذہب صرف اور صرف اسلام ہے۔ ان کا نیا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔ جناب عبداللہ صاحب سوڈان سے انڈیا آگئے اور اپنی فیملی کو اپنے اسلام لانے کی اطلاع دی اور گھر والوں کو سمجھایا کہ تم بھی کلمہ حق پڑھ لو۔ اس پر ان کی والدہ، بہن، دو بیٹوں برجور (قاری عبدالحلیم) اور سہراب نے اسلام قبول کرلیا۔ لیکن ان کی خوشدامن کو اعتراض تھا اور خاندان کی بڑی ہونے کی حیثیت سے انہوں نے خاصی مشکلات میں ڈال دیا اور پھر وہی پریشانیاں رہیں جو عام طور پر نومسلموں کو پیش آتی ہیں۔

قاری عبدالحلیم صاحبؒ کا پارسی نام برجور تھا، بام خاندان سے تعلق تھا، اور اسلام لانے کے وقت ان کی عمر ۴ برس تھی۔ ان کی خوشدامن کٹر پارسی تھیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کیا بلکہ بائیکاٹ کیا اور کہا کہ یہ برجور جب سے پیدا ہوا ہے منحوس ہے اسی کی وجہ سے ہمارے گھر میں اسلام آیا۔ مشکلات، پریشانی اور حالات کے پیش نظر حیدر آباد دکن چلے گئے کیونکہ بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ وہاں کے مسلمان بہت اچھے ہیں وہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ چنانچہ بحمد اللہ حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کے رویے سے ان کی والدہ بہت خوش ہوئیں، والدین نے اسلامی تعلیمات کے لیے قاری صاحب کو ڈابھیل کے ایک مدرسہ میں حفظ قرآن کے لیے داخل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس مدرسہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ کون جانتا تھا کہ یہ چار سال کا بچہ اسلام لانے کے بعد اسلامی تعلیمات کو پورے عالم میں پھیلانے کا باعث ہوگا۔ حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل کرنے کے بعد قاری

عبدالحلیم صاحب مرحوم نے پہلی تراویح بمبئی بھنڈی بازار میں پڑھائی اور بمبئی میں ہی انہوں نے اسکول کی تعلیم حاصل کی۔

قاری صاحب مرحوم کے والد محترم جناب عبداللہ کا ویسے تو چند سال مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ آنا جانا لگا رہا لیکن آخری عمر میں نیت کر کے کہ میری موت وہیں واقع ہو اور مجھے مدینہ منورہ کے قبرستان میں دفنایا جائے، ۱۹۴۳ء سے مستقل مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی۔ اعزہ واقربا واولاد نے بار بار اصرار کیا کہ آپ پاکستان تشریف لائیں، کچھ عرصہ کے لیے آجائیں لیکن وہ بضد تھے اور کہتے تھے کہ میری موت کہیں اور واقع نہ ہوجائے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ فیملی ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئی۔ ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والی فیملی نے یہاں تیرہ سو گز کا بنگلہ اس زمانہ میں انتالیس ہزار روپے میں خریدا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ پیسے دے کر بنگلہ خرید رہے ہیں حالانکہ آپ کو ہندوستان سے بدحال کر کے بھیجا گیا ہے۔ قاری صاحبؒ نے کہا کہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم بغیر پیسے دیے اس بنگلے میں سکونت اختیار کریں۔ پاکستان آنے کے بعد قاری عبدالحلیمؒ نے سب سے پہلی تراویح سولجر بازار کے علاقہ میں واقع مسجد قباء میں پڑھائی۔ ۱۹۵۳ء میں مکی مسجد میں تراویح پڑھانی شروع کی اور مسلسل تیرہ سال تک یہیں تراویح پڑھاتے رہے، اسی وجہ سے ان کا نام قاری عبدالحلیم مکی مسجد والے کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ اس دوران مکی مسجد کی مسلسل تراویح میں قاری صاحب کی شخصیت اور مسحور کن آواز میں تلاوت قرآن سے متاثر ہو کر اس وقت کے تبلیغی جماعت کے بزرگ حاجی خدابخش مرحوم نے اپنی بیٹی صدیقہ کا رشتہ طے کردیا اور اس رشتہ کے بعد ایک میواتی فیملی کا رشتہ دہلی پنجابی سوداگران سے طے پایا۔ حاجی خدابخش مرحوم کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور وہ انتہائی نیک وصالح ومتقی تھے، ساری زندگی تبلیغی خدمات انجام دیں۔

قاری صاحبؒ اپنے بھائی کے ہمراہ اس بنگلہ میں رہا کرتے تھے لیکن والدہ کی خواہش پر گارڈن کے علاقہ میں رہائش اختیار کی۔ تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ بھائی ابراہیم عبدالجبار نے مزدوروں کے لیے چھوٹے چھوٹے مکان بنوائے تھے، ان میں سے ایک مکان قاری صاحبؒ کو کرایہ پر دے دیا گیا لیکن انہوں نے اس مکان میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں، چھوٹا سا مکان تھا، بجلی نہیں تھی، سخت گرمی میں گزارہ کرتے تھے۔ رہائش ناموافق ہونے کی بنا پر پرانا گولیمار میں رہائش اختیار کی لیکن یہاں فقط چھ مہینے کا عرصہ گزرا۔ پھر قاری صاحبؒ کی والدہ کی ایک سہیلی نے اسٹار ملز کے مالک سے سفارش کر کے قاری صاحبؒ کو اسٹار ملز کالونی کے مدرسہ میں قرآنی خدمات پر مامور کیا۔ اسٹار ملز کی ورکرز کالونی میں ۲۱۰ مکانات تھے جن میں سے ایک

مکان انہیں رہائش کے لیے دیا گیا جہاں وہ ایک لمبا عرصہ مقیم رہے۔

مجھے قاری عبدالحلیم مرحوم کی زیارت کا ایک بار موقع ملا ہے جب جامعہ بنوریہ کے قیام کے بعد میں پہلی بار وہاں گیا تو مولانا مفتی محمد نعیم صاحب نے ان سے میری ملاقات اور تعارف کرایا۔ مرحوم بلاشبہ اس دور میں ایک مثالی زندگی کے حامل بزرگ تھے اور خاص طور پر ایک نومسلم کے طور پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کے شعبہ میں جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ قابل رشک ہیں۔ مولانا مفتی محمد نعیم اور ان کے زیر نگرانی چلنے والا ایک بڑا دینی ادارہ جامعہ بنوریہ کی صورت میں قاری عبدالحلیم صاحبؒ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۰ جنوری ۲۰۱۰ء)

حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقبؒ

حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقب بھی انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شاید فضلائے دیوبند میں سے ہمارے علاقے میں آخری بزرگ تھے۔ ابھی چند ماہ قبل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے سابق ناظم اور محکمہ اوقاف کے سابق ڈسٹرکٹ خطیب مولانا لالہ عبدالعزیز سرگودھوی کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ہم کہا کرتے تھے کہ اب دیوبند کی آخری نشانی ہمارے پاس حضرت مولانا محمد فیروز خان رہ گئے ہیں، وہ بھی ۹ مارچ کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کا تعلق آزاد کشمیر کی وادی نیلم سے تھا۔ غالباً ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کیا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کے شاگرد تھے اور ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں آ گئے اور دارالعلوم مدنیہ کے نام سے دینی ادارہ قائم کیا جو اب ضلع سیالکوٹ کے بڑے دینی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ اور قادیانی امت کے عالمی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان کا تعلق بھی ڈسکہ سے تھا اور ان کا خاندان ایک عرصہ تک یہاں آباد رہا ہے۔ مولانا فیروز خان نے ظفر اللہ خان کی خاندانی حویلی کے سامنے ایک متروکہ بلڈنگ پر ڈیرہ لگا لیا۔ مزاج میں جلال غالب تھا، متحرک اور فعال عالم دین تھے اور دینی حمیت و غیرت کا مجسمہ تھے، اس لیے خوب گہما گہمی رہی اور "اٹ کھڑکا" وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ دارالعلوم مدنیہ کے جلسے کا اسٹیج چودھری ظفر اللہ خان کی خاندانی حویلی کے سامنے ہوتا تھا اس لیے اس اسٹیج پر احراری خطابت کی گھن گرج عجیب سماں پیدا کرتی تھی۔

حضرت مولانا محمد فیروز خان ثاقب اعلیٰ پائے کے مدرس تھے، بالخصوص ادب اور معقولات میں چوٹی کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دینی تحریکات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، خود ان کا اپنا مزاج تحریکی تھا اور جب تک صحت نے ساتھ دیا دینی معاملات میں کسی نہ کسی حوالے سے پیش رفت کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت، ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ، ۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۱۹۸۷ء کی شریعت بل کی تحریک میں ہمارا باہمی ساتھ رہا۔ ان کا جوش و جذبہ اور عزم و استقلال دیکھ کر مایوس دلوں میں حوصلہ پیدا ہو جاتا تھا اور خاموش مزاج لوگوں کا بھی بولنے اور کچھ کر گزرنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ وہ بے باک اور دبنگ مقرر تھے۔ پبلک اجتماع ہو یا خصوصی محفل، کارکنوں کا اجلاس ہو یا اعلیٰ سطح کی شورائی میٹنگ، ہر جگہ وہ دوٹوک اور بے لچک بات کرتے تھے۔ غیر ضروری مصلحتوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتے تھے اور جہاں ضرورت محسوس کرتے تھے ڈٹ جاتے تھے۔ وہ قید و بند کی صعوبتوں سے کئی بار دوچار ہوئے مگر ہر آزمائش سے سرخرو نکلے۔

والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کے ساتھ ان کا ہمیشہ قریبی تعلق رہا۔ مسلکی، جماعتی اور تعلیمی معاملات میں مشاورت و تعاون کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تینوں فضلائے دیوبند تھے اور تینوں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے شاگرد تھے۔ اس نسبت کا رابطہ الگ سے لطف دیتا تھا۔ میری ہمیشہ ان سے نیاز مندی رہی ہے اور میں نے ان سے نہ صرف بہت سے معاملات میں استفادہ کیا ہے بلکہ راہ نمائی بھی لی ہے۔ آج اس روایت و مزاج کے حضرات کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر اب زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ سے نوازیں اور ان کے فرزندوں اور اہل خاندان کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ اپریل ۲۰۱۰ء)

حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ

(۱)

۵ مئی کو نماز مغرب کے بعد مدرسہ نصرۃ العلوم میں مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس بات کا تذکرہ ہوا کہ آج حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی وفات کو ایک سال پورا ہو گیا ہے کہ گزشتہ سال ۵ مئی کو ان کا وصال ہوا تھا۔ اس سے کچھ ہی دیر بعد یہ غم ناک خبر ملی کہ حضرت

خواجہ خان محمد صاحب کا ملتان میں انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر کے ساتھ ہی ہمارا ایک سال پہلے والا صدمہ پھر سے تازہ ہو گیا کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے انتقال کے بعد جن دو چار شخصیات کی سرپرستی، دعاؤں اور موجودگی کا سہارا ہمارے پاس باقی رہ گیا تھا، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ ان میں سرفہرست تھے۔

میں نے ان کی پہلی بار زیارت غالباً ۱۹۶۷ء کے دوران ڈیرہ اسماعیل خان میں جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ''آئین شریعت کانفرنس'' کے موقع پر کی تھی۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کا جلوس کی شکل میں استقبال کیا گیا تھا اور قبائلی عوام اپنے روایتی انداز میں ان دونوں بزرگوں کو جلوس کے ساتھ شہر کے مختلف بازاروں میں گھمار ہے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ براہ راست اس کانفرنس کے انتظامات کر رہے تھے اور ہمارے پرانے دوست خواجہ محمد زاہد صاحب، جنہوں نے ابھی کچھ عرصہ قبل جام شہادت نوش کیا ہے، کانفرنس کا انتظام کرنے والے نوجوانوں کی قیادت کر رہے تھے۔ مجھے اس سفر کے دوران خانقاہ سراجیہ شریف میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی کہ میرے بڑے بہنوئی حاجی سلطان محمود خان صاحب ریلوے میں ڈیزل مکینک تھے اور ان دنوں ان کی ڈیوٹی کندیاں ریلوے جنکشن پر تھی جہاں وہ ایک کوارٹر میں اہل خانہ سمیت رہائش پذیر تھے۔ ان کے پاس گیا تو خانقاہ سراجیہ شریف میں بھی حاضری ہوئی، غالباً ایک رات قیام کیا تھا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ موجود تھے، انہوں نے بہت شفقت کا اظہار فرمایا مگر میری دلچسپی کا بڑا حصہ خانقاہ شریف کی لائبریری سے وابستہ تھا جو اس وقت ملک کی اہم لائبریریوں میں شمار ہوتی تھی۔ میں نے اس دور میں مزارعت اور بٹائی کی حرمت کے حوالے سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے موقف کی تائید میں ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں قسط وار شائع ہوا تھا، اس مضمون کی بیشتر تیاری میں نے خانقاہ سراجیہ کی لائبریری میں کی تھی۔ اور حضرت خواجہ صاحبؒ کی آخری زیارت میں نے گزشتہ سال رجب کے دوران ایک سفر میں خانقاہ سراجیہ شریف میں حاضری کے موقع پر کی۔ اس سفر میں مجھے خانقاہ سراجیہ میں حاضری کے علاوہ رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علیؒ کی قبر پر حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اس پہلی اور آخری ملاقات کے دوران نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ملاقاتوں کے وسیع سلسلہ کو اگر تین ہندسوں میں بھی بیان کروں تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ پاکستان میں اور بیرون ملک ان کی خدمت میں حاضریوں اور ان کی دعاؤں و شفقتوں

سے فیض یاب ہونے کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ وہ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی قیادت میں شامل تھے اور ایک عرصہ تک نائب امیر رہے۔ میں نے بھی کم و بیش ربع صدی کا عرصہ جمعیۃ علماء اسلام میں ایک متحرک کارکن کے طور پر گزارا ہے اور سالہا سال تک جمعیۃ کے مرکزی عہدے داران کی ٹیم میں سیکرٹری اطلاعات کے طور پر شامل رہا ہوں۔ اس دوران جمعیۃ کے اجتماعات اور کانفرنسوں میں ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے۔ وہ خاموش اور دعاگو بزرگ تھے، جلسوں میں گھنٹوں بیٹھے رہتے اور آخر میں دعا فرماتے۔ میں نے انہیں زندگی میں ایک ہی بار جلسہ عام میں مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کہتے سنا ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۵ء کی بات ہے جب جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا ''قومی نظام شریعت کنونشن'' تھا، ملک بھر سے ہزاروں علماء کرام جمع تھے اور جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی و صوبائی قیادتیں موجود تھیں۔ کنونشن کی آخری نشست میں اسٹیج پر موجود اکابر علماء کرام کو، جن میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا خواجہ خان محمدؒ، مولانا سید محمد شاہ امروٹیؒ، مولانا سید محمد ایوب جان بنوریؒ، مولانا عبید اللہ انورؒ، مولانا عبد الغفور آف کوئٹہ، اور مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ جیسی بزرگ شخصیات بھی شامل تھیں۔ حضرت درخواستیؒ نے باری باری مائیک پر بلا کر ان سے نفاذ شریعت کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہنے کا عہد لیا تھا۔ میں اس نشست کا اسٹیج سیکرٹری تھا اور خیر وسعادت کی یہ ساری کارروائی میرے ہاتھوں سرانجام پا رہی تھی، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ کل ہی ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کسی نے مولانا خواجہ خان محمدؒ کو کسی جلسے میں تقریر کرتے بھی دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ تقریر کرتے تو نہیں البتہ ایک بڑے جلسہ عام میں مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کہتے ضرور سنا ہے، اور یہ وہی موقع تھا جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

میری تگ و تاز کا دوسرا بڑا میدان ہمیشہ سے تحفظ ختم نبوت کا محاذ رہا ہے اور اس سلسلہ میں کام کرنے والے ہر حلقے کے ساتھ تعاون کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہوں۔ اس محاذ میں حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کی امارت میں سرگرم کردار ادا کرنے کی سعادت بھی مجھے حاصل رہی ہے اور بیسیوں اجتماعات اور اجلاسوں میں ان کے ساتھ رفاقت کے شرف سے بہرہ ور رہا ہوں۔ میں ان کے صبر و حوصلے کا ہمیشہ معترف رہا ہوں کہ وہ ختم نبوت کانفرنسوں میں گھنٹوں مسند صدارت پر تشریف فرما رہتے، توجہ کے ساتھ مقررین کے خطابات سنتے، ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی خطیبانہ اداؤں پر داد بھی دیتے، اور آخر میں ان کی پر خلوص اور پر نور دعا پر محفل کا اختتام ہوتا۔

یہ غالباً ۱۹۷۸ء کے لگ بھگ کا قصہ ہے کہ کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نیم والی مسجد میں جمعیۃ علماء اسلام کا جلسہ تھا جس میں میری تقریر تھی۔ یہ گرمیوں کا موسم تھا اور نماز عشاء کے بعد جلسے کی کارروائی شروع

ہونے والی تھی کہ کسی دوست نے آکر خبر دی کہ مولانا خان محمد صاحبؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔ جلسے کے منتظم حضرت پیر جی عبدالحکیمؒ تھے، ان کے ساتھ باہمی مشورے سے طے پایا کہ جلسے میں ایک تعزیتی تقریر کے بعد اس کے التواء کا اعلان کر دیا جائے اور پھر سفر کی تیاری کی جائے تاکہ صبح جنازے پر کندیاں شریف پہنچا جا سکے۔ چنانچہ جلسے کی کارروائی کو مختصر کر کے میں نے صرف بیس پچیس منٹ خطاب کیا، مولانا خان محمدؒ کی دینی و علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا، اور پھر تعزیت کے طور پر جلسہ ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد کندیاں شریف جانے کے لیے کرائے کی ویگن کا اہتمام کیا گیا، ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ ویگن پر سوار ہونے کے لیے روڈ پر پہنچے تو میں نے پیر جی سے عرض کیا کہ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے، سامنے والے اسٹال سے چائے پی لیتے ہیں اور ساتھ ہی گیارہ بجے والی خبریں ریڈیو سے سنتے ہیں، ممکن ہے جنازے وغیرہ کے پروگرام کی کوئی خبر ہو۔ چنانچہ جب خبریں سنیں تو معلوم ہوا کہ وفات پانے والے خواجہ خان محمد صاحب ہمارے کندیاں شریف والے بزرگ نہیں بلکہ کوئی اور ہیں۔ اس طرح چائے کے کپ کی طلب نے ہمیں کندیاں شریف کی طرف بے مقصد سفر کی صعوبت سے بچا لیا۔ بعد میں ایک موقع پر، شاید جمعیۃ علماء اسلام کے کسی اجلاس میں، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ نے مجھے اپنے پاس بلا کر آہستہ سے کان میں کہا کہ تمہاری وہ کمالیہ والی تقریر کسی نے ریکارڈ بھی کی تھی یا نہیں؟ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو پتا چل گیا ہے؟ مسکرا کر فرمایا کہ ہاں پتا چل گیا ہے لیکن اگر وہ تقریر مل جائے تو سننا چاہتا ہوں۔

مولانا خواجہ خان محمدؒ سلسلہ نقشبندیہ سراجیہ کی ایک بڑی خانقاہ کے مسند نشین تھے، ان سے ہزاروں افراد نے، جن میں بڑی تعداد دینی کارکنوں اور علماء کرام کی ہے، استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ صاحب علم صوفی تھے، تصوف کے رموز و اسرار سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ ان کے ثقہ شارح بھی تھے اور اب ان جیسے چند نفوس کے دم قدم ہی سے تصوف کا یہ جہاں آباد ہے۔ ایک بار امریکہ سے ایک نومسلم خاتون گوجرانوالہ آئیں، یہ نومسلم خاتون فلسفہ کی پروفیسر ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ انہوں نے حضرت مولانا صوفی عبدالحمیدؒ سواتی سے ملاقات کے دوران تصوف کے بعض حساس اور دقیق مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا اور دریافت کیا کہ تصوف کے علمی مسائل اور اشکالات پر مجھے کس بزرگ سے بات کرنی چاہیے؟ حضرت صوفی صاحبؒ نے دو بزرگوں کے نام لیے کہ حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ میں سے جن بزرگ سے بھی ملیں گی آپ کو اپنے اشکالات و سوالات کا تسلی بخش علمی جواب ملے گا۔

میں اس وقت حضرت خواجہ خان محمدؒ کے جنازے میں شرکت کے لیے سفر کی تیاری کر رہا ہوں اور جلدی جلدی یہ سطور تحریر کر رہا ہوں کہ حاضری میں تاخیر نہ ہو جائے مگر ان کی یادوں کے مختلف مراحل ذہن کی اسکرین پر بار بار نمودار ہو رہے ہیں۔ یادوں کا یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا کہ ان کے بعد ان کی یادیں ہی اب ہمارا سہارا ہیں۔ میں حضرت خواجہ صاحبؒ کے خاندان، جماعت، مریدین، معتقدین، اور متعلقین سے تعزیت کرتے ہوئے یہ سوچ رہا ہوں کہ تعزیت تو سب حضرات کو مجھ سے کرنی چاہیے کہ ایک کارکن سے اس کا امیر رخصت ہو گیا ہے، ایک گناہ گار سے دعاؤں کا سہارا چھن گیا ہے، اور ایک راہرو سے اس کا رہبر جدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت خواجہ صاحبؒ کی حسنات قبول فرمائیں، کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں، اور تمام پسماندگان و متعلقین کو یہ عظیم صدمہ صبر و حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے حضرت خواجہ صاحبؒ کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق فراواں فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۷ مئی ۲۰۱۰ء)

(۲)

۵ مئی کو حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گزشتہ سال اسی تاریخ کو والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر کا انتقال ہوا تھا۔ وہ دونوں دار العلوم دیوبند میں ہم سبق رہے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے۔ ان کا روحانی سرچشمہ بھی ایک ہی تھا کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں موسیٰ زئی شریف کی خانقاہ کے فیض یافتہ تھے۔ نقشبندی سلسلے کی اس خانقاہ کے حضرت خواجہ سراج الدینؒ سے حضرت مولانا احمد خانؒ نے خلافت پائی جو خانقاہ سراجیہ کے بانی تھے اور اسی خانقاہ کے مسند نشین کی حیثیت سے مولانا خواجہ خانؒ محمد ساٹھ برس سے زیادہ عرصے تک لوگوں کی روحانی پیاس بجھاتے رہے، جبکہ خواجہ سراج الدینؒ کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا حسین علیؒ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے شیخ تھے۔

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور مولانا خواجہ خان محمدؒ تعلیمی اور روحانی طور پر دار العلوم دیوبند اور خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے مشترکہ طور پر فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی بھر ایک مشن اور پروگرام کے داعی رہے اور ایک سال کے وقفے کے ساتھ وفات بھی ایک ہی دن پائی۔ مولانا خواجہ خان محمد نے ۹۰ برس عمر پائی اور دینی جدوجہد کے مختلف میدانوں میں خدمات سرانجام دیں۔ دہلی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خانوادے اور روحانی سلسلے سے تعلق رکھنے والے عظیم بزرگ حضرت شاہ سعید احمد دہلویؒ سے افغانستان سے تعلق رکھنے والے بزرگ حضرت خواجہ دوست محمد قندھاریؒ نے فیض پایا اور سلسلہ نقشبندیہ

مجددیہ میں خلافت کی خلعت سے سرفراز ہو کر ڈیرہ اسماعیل خان میں موسیٰ زئی شریف کے مقام پر خانقاہ احمدیہ سعیدیہ قائم کی جس کا فیض آج افغانستان اور پاکستان کے طول وعرض میں جاری ہے۔

مولانا خواجہ خان محمد سلسلہ نقشبندیہ کے بلند پایہ شیخ تھے اور تصوف وسلوک کے مستند شارح بھی تھے جن کی خدمت میں بڑے بڑے علماء کرام حاضر ہو کر روح وقلب کی تسکین پاتے اور تصوف وسلوک کی پیچیدہ گتھیاں سلجھاتے تھے۔ وہ صاحب علم صوفی تھے، تصوف کے رموز واسرار سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ ان کے ثقہ شارح بھی تھے۔ ایک بار امریکہ سے ایک نومسلم خاتون ڈاکٹر ایم کے ہر مینسن گوجرانوالہ آئیں جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں، انہوں نے حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی سے ملاقات کے دوران تصوف کے بعض حساس اور دقیق مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا اور دریافت کیا کہ تصوف کے علمی مسائل اور اشکالات پر مجھے کس بزرگ سے بات کرنی چاہیے؟ حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ میں سے جن بزرگ سے بھی ملیں گی، آپ کو اپنے اشکالات وسوالات کا تسلی بخش جواب ملے گا۔

مولانا خواجہ خان محمدؒ کی تگ و تاز کا دوسرا بڑا میدان جمعیۃ علماء اسلام اور نفاذ شریعت کی جدوجہد رہی ہے۔ وہ مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ کے قریبی رفقا میں سے تھے اور جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی قیادت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک جمعیۃ کے مرکزی نائب امیر رہے اور انہیں جمعیۃ کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی وفات کے بعد انہیں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کا امیر منتخب کیا گیا، اس کے بعد وہ زندگی کے آخری لمحات تک تحریک ختم نبوت کی قیادت کرتے رہے۔ ۱۹۸۴ء میں انہیں تمام مکاتب فکر کی مشترکہ مرکزی مجلس عمل ختم نبوت کا سربراہ منتخب کیا گیا اور ملک کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی جماعتوں نے ان کی قیادت میں ختم نبوت کے محاذ پر کئی بار متحد ہو کر جدوجہد کی۔ وہ دیوبندی مکتب فکر کی مختلف جماعتوں اور حلقوں میں نکتہ اتحاد اور مرجع کا مقام رکھتے تھے۔ دیوبندی مکتب فکر کی داخلی گروہ بندیوں میں جب بھی کسی مسئلے پر سب کو اکٹھا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا خواجہ خان محمد نے اس میں کلیدی کردار ادا کیا اور ان کی شخصیت وجۂ اتحاد بن گئی۔ انہیں دیوبندی مکتب فکر کے دائرے سے ہٹ کر مختلف مکاتب فکر کے درمیان بھی یہ حیثیت حاصل تھی اور دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکاتب فکر کے علماء کرام اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے متعدّد بار ان کی قیادت میں تحریک ختم نبوت میں مشترکہ تحریکات کا اہتمام کیا۔

مجھے یوں یاد پڑتا ہے کہ میں نے پہلی بار ان کی زیارت ۱۹۶۷ء کے دوران ڈیرہ اسماعیل خان میں جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی آئین شریعت کانفرنس کے موقع پر کی تھی۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کا جلوس کی شکل میں استقبال کیا گیا تھا اور قبائلی عوام اپنے روایتی انداز میں ان دونوں بزرگوں کو جلوس کے ساتھ شہر کے مختلف بازاروں میں گھما رہے تھے۔ مجھے اس سفر کے دوران خانقاہ سراجیہ شریف میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ حضرت خواجہ صاحبؒ کی آخری زیارت میں نے گزشتہ سال رجب کے دوران ایک سفر میں خانقاہ سراجیہ شریف میں حاضری کے موقع پر کی، اس سفر میں مجھے خانقاہ سراجیہ میں حاضری کے علاوہ واں بھچراں ضلع میانوالی میں رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علیؒ کی قبر پر حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا۔

حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کے ساتھ میری نیاز مندی کا عرصہ چار عشروں سے متجاوز ہے۔ سفر و حضر اور خلوت و جلوت کی سینکڑوں ملاقاتوں اور مختلف تحریکات میں ایک کارکن کے طور پر رفاقت کے شرف سے بہرہ ور رہا ہوں اور ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہا ہوں۔ میں حضرت خواجہ صاحب کے خاندان، جماعت، مریدین، معتقدین اور متعلقین سے تعزیت کرتے ہوئے یہ سوچ رہا ہوں کہ تعزیت تو سب حضرات کو مجھ سے کرنی چاہیے کہ ایک کارکن سے اس کا امیر رخصت ہو گیا ہے، ایک گناہ گار سے دعاؤں کا سہارا چھن گیا ہے اور ایک راہ رو سے اس کا رہبر جدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت خواجہ صاحب کی حسنات کو قبول فرمائیں، کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں اور تمام پس ماندگان اور متعلقین کو یہ عظیم صدمہ صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے حضرت خواجہ صاحبؒ کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جون ۲۰۱۰ء)

حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ

(۱)

میں گزشتہ روز امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن میں پاکستان سے تعلق رکھنے والے قاری محمد ہاشم صاحب کے گھر میں قیام پذیر تھا کہ انہوں نے انٹرنیٹ پر پاکستانی اخبارات کا مطالعہ کرایا۔ خبروں میں ایک تعزیتی بیان نے چونکا دیا جس میں مولانا قاضی عبد اللطیف آف کلاچیؒ کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا

تھا۔ میرے لیے یہ خبر اچانک تھی، بہت صدمہ ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ابھی چند روز قبل ان کے بھتیجے مولانا قاضی عبدالحلیم کا انتقال ہوا تھا تو میں بیرون ملک سفر کی تیاری میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ واپسی پر رمضان المبارک کے بعد کلاچی حاضری دوں گا۔ مولانا قاضی عبداللطیفؒ کی وفات کی خبر نے صدمہ میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کا یہ قاضی خاندان کئی پشتوں سے علمی و دینی خدمات میں مصروف ہے اور نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ ملک بھر کے عوام کی سیاسی و دینی راہنمائی میں اس خاندان کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت مولانا قاضی نجم الدینؒ کا تذکرہ ہم علماء کرام سے سنتے رہتے تھے جن کے نام پر کلاچی مدرسہ نجم المدارس قائم ہے اور ہزاروں علماء وطلبہ اب تک اس سے استفادہ کر چکے ہیں۔ ان کے فتاویٰ کے مجموعہ "نجم الفتاویٰ" سے ان کے علمی مقام کی بلندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا قاضی عبدالکریم دامت برکاتہم اس خاندان میں سے ہیں جن سے میں نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے اور انہوں نے بھی مسلسل سرپرستی، شفقتوں اور دعاؤں سے نوازا ہے۔ جبکہ ان کے بھائی مولانا قاضی عبداللطیفؒ کے ساتھ میری طویل سیاسی و جماعتی رفاقت رہی ہے اور مختلف تحریکات میں ہم نے اکٹھے کام کیا ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے ایک کارکن کے طور پر میری جماعتی زندگی کا ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کا دور گوجرانوالہ ڈویژن کی حدود تک جبکہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۰ء مرکزی سطح پر رہا۔ پھر مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب سے مستعفی ہو کر میں نے خود کو جمعیۃ علماء اسلام کے ایک عام رکن کی حد تک محدود کر لیا۔ پورا ملک مسلسل بیس سال تک میری جماعتی سرگرمیوں کی جولانگاہ تھا، اس بیس سالہ دور میں جن چند بزرگوں کے ساتھ میری سب سے زیادہ ذہنی و فکری ہم آہنگی اور عملی رفاقت رہی ہے ان میں حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کا نام نمایاں ہے۔ وہ عمر، علم، اور عمل تینوں حوالوں سے مجھ سے سینئر بلکہ میرے بزرگ تھے مگر عملی و جماعتی زندگی کے اس دور میں انہوں نے کبھی اس کا احساس نہیں دلایا اور کبھی اشارتاً بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ چنانچہ عمر، علم، عمل کے تفاوت کے باوجود ہمارے درمیان بے تکلفی، دوستی، اعتماد، اور تعاون کا یہ تعلق قائم رہا۔

حضرت مولانا قاضی عبداللطیفؒ ایک مدرس عالم دین، پختہ کار سیاسی رہنما، انتھک جماعتی کارکن، سنجیدہ پارلیمنٹیرین، اور بے باک مقرر تھے۔ وہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے معتمد رفقاء میں سے تھے اور مفتی صاحبؒ کی وفات کے وقت ان کے چار نائبین میں سے تھے۔ مفتی صاحبؒ جمعیۃ علماء اسلام کے سیکرٹری جنرل تھے جبکہ ان کے معاون چار جماعتی سیکرٹریوں میں مولانا محمد اجمل خانؒ، مولانا قاضی عبد

اللطیفؒ، اور مولانا غلامؒ ربانی آف رحیم یار خان کے ساتھ مجھے بھی اس ٹیم کا چوتھا رکن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ قاضی عبد اللطیفؒ سیاسی زبان، مذاکراتی لب و لہجہ، اور دستور و قانون کی موشگافیوں سے آگاہ تھے اور جماعتی اجلاس میں ہونے والے بحث و مباحثہ میں ان کی شرکت بھرپور ہوتی تھی۔ وہ پیش آمدہ امور پر سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتے، اس کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کرتے، اس کے حق میں دلائل دیتے، اس کا دفاع کرتے، اور اسے منوانے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ وہ اجلاس کا رخ دیکھ کر رائے قائم نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے سے تیاری کے ساتھ رائے متعیّن کر کے آتے تھے اور انہیں ان کے موقف سے ہٹانا آسان بات نہیں ہوتی تھی۔ البتہ وہ اپنی رائے کے خلاف جماعتی فیصلوں کا مکمل احترام کرتے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

میرا ذوق بھی کم و بیش اسی طرح کا تھا اس لیے اگر کسی مسئلہ میں ہماری رائے مختلف ہو جاتی تو شوریٰ کے اجلاس میں ہمارا باہمی مباحثہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے مارشل لاء کی حکومت میں پاکستان قومی اتحاد کی شمولیت کے مسئلہ پر ہماری رائے ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ وہ شمولیت کے حق میں تھے جبکہ میں اس کے سخت خلاف تھا۔ جامعہ حنفیہ عثمانیہ ورکشاپی محلہ راولپنڈی میں جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا، قاضی صاحبؒ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور میں اپنی رائے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس پر ہمارے مباحثہ نے ایک طرح سے باقاعدہ مناظرے کی شکل اختیار کر لی جسے حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دیگر شرکاء دلچسپی سے سنتے رہے، بالآخر ہاؤس نے فیصلہ مولانا مفتی محمودؒ پر چھوڑ دیا اور انہوں نے یہ کہہ کر مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ اصولاً بات راشدی کی درست ہے لیکن موجودہ صورتحال میں پاکستان قومی اتحاد کو بچانے کے لیے حکومت میں شمولیت ہماری مجبوری ہے۔ میرے ذہن میں مارشل لاء کی کابینہ میں شمولیت کی صورت میں شدید تحفظات تھے اس لیے میں نے اختلافی نوٹ کا حق مانگا جو مل گیا اور میں نے کارروائی کے رجسٹر میں شوریٰ کے فیصلے کے ساتھ اپنا اختلافی نوٹ تحریر کرا دیا۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمان گروپ میں تقسیم ہوئی تو ہم دونوں درخواستی گروپ کا حصہ بلکہ سرگرم کردار تھے۔ اس دوران صدر ضیاء الحق مرحوم نے غیر جماعتی مجلس شوریٰ تشکیل دی تو ہماری رائے پھر مختلف ہو گئی۔ مولانا سمیع الحق، مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، اور مولانا قاری سعید الرحمانؒ آف راولپنڈی نے مجلس شوریٰ کی رکنیت اختیار کر لی۔ مجھے بھی پیشکش ہوئی مگر میں نے معذرت کا راستہ اختیار کیا۔ دراصل ہمارے بعض بزرگوں کی مخلصانہ رائے تھی کہ

صدر ضیاء الحق چونکہ ایک مضبوط حکمران ہیں اور نفاذ شریعت کے دل سے خواہاں ہیں اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ان کا مکمل ساتھ دینا چاہیے اور جتنا کام بھی اس سلسلے میں ان سے لیا جا سکتا ہے اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ مگر میری رائے یہ تھی کہ صدر ضیاء الحق مرحوم اپنے تمام تر خلوص اور مضبوط حکمرانی کے باوجود نفاذ شریعت کے سلسلے میں معروضی صورتحال میں کچھ زیادہ مؤثر پیش رفت نہیں کر پائیں گے، البتہ اپنا پورا وزن ان کے پلڑے میں ڈال دینے سے دینی قوتوں کی سیاسی ساکھ مجروح ہوگی جو مستقبل میں ان کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ مگر اس اختلاف رائے کے باوجود ہم اکٹھے چلتے رہے حتیٰ کہ غیر جماعتی الیکشن میں مولانا سمیع الحقؒ اور مولانا قاضی عبد اللطیفؒ سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے۔ اور جب انہوں نے سینٹ میں نفاذ شریعت کے حوالے سے ”شریعت بل“ پیش کیا تو نہ صرف ہماری جماعتی سرگرمیوں میں ہلچل پیدا ہوئی بلکہ ملک بھر کے دینی حلقوں میں جوش وخروش سامنے آیا۔ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کی سربراہی میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور راہنماؤں پر مشتمل متحدہ شریعت محاذ تشکیل پایا جس کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں سینٹ آف پاکستان نے ”شریعت بل“ منظور کر لیا۔ لیکن بعد قومی اسمبلی میں اس بل کو اصلی شکل میں توثیق حاصل نہ ہو سکی اور دستور کی دیگر اسلامی دفعات کی طرح وہ بھی ایک نمائشی ایکٹ کی صورت اختیار کر گیا۔

اس دوران کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ جس روز اوجڑی کیمپ میں اسلحہ کا ذخیرہ پھٹنے کا سانحہ ہوا اس روز نفاذ شریعت کے سلسلے میں ہمارا پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کرنے کا ارادہ تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق مولانا سمیع الحق، مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی، مولانا عبد الرحمان قاسمیؒ، اور راقم الحروف پر مشتمل پانچ حضرات کے گروپ کو پلے کارڈ اٹھا کر پارلیمنٹ کے سامنے اس کے اجلاس کے دوران خاموش مظاہرہ کرنا تھا۔ مولانا سمیع الحق کے علاوہ باقی چاروں حضرات اس سے پچھلی رات چکوال میں تھے۔ صبح ہم اس مقصد کے لیے اسلام آباد کی طرف روانہ ہوئے تو روات سے اسلام آباد جانے والی شاہراہ پر ہمیں روک دیا گیا۔ پولیس نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور اسے ہدایت تھی کہ ہمیں اسلام آباد میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ناکے پر پولیس نے ہمیں روکا تو قاضی عبد اللطیفؒ نے متعلقہ پولیس آفیسر سے کہا کہ میں پارلیمنٹ کا رکن ہوں مجھے آپ اجلاس میں شرکت سے روکنے کے مجاز نہیں ہیں اور یہ میرے ساتھی ہیں یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے۔ پولیس آفیسر نے کہا کچھ بھی ہو اس وقت ہم آپ کو یہاں سے آگے نہیں جانے دیں گے۔ قاضی صاحبؒ نے اپنے قافلے کی گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے کہا کہ گاڑیاں روڈ پر ٹیڑھی کھڑی کر کے روڈ بلاک کر دو، اگر ہم آگے نہیں جائیں گے تو کوئی بھی یہاں سے

آگے نہیں جائے گا۔ مگر ہم ابھی اس کی تیاری کر رہے تھے کہ ہر طرف سے خوفناک دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسلام آباد پر فضائی حملہ ہوگیا ہے، ہر طرف بم دھماکوں کا راج تھا۔ چنانچہ ہمارا اور پولیس دونوں کا پروگرام ادھورا رہ گیا، ہم نے ایم این اے ہاسٹل پہنچ کر قاضی صاحب مرحوم کے کمرے میں پناہ لی اور وہاں جاکر معلوم ہوا کہ اوجڑی کیمپ میں اسلحہ کا ذخیرہ پھٹ گیا ہے اور دیگر بہت سے حضرات کے علاوہ رکن قومی اسمبلی خاقان عباسی بھی شہید ہوگئے ہیں۔

یہ چند باتیں قاضی صاحبؒ کے حوالے سے فی الوقت ذہن میں آئیں جو تحریر کر دی ہیں جبکہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کی جدوجہد کا دائرہ بہت متنوع اور وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبولیت سے نوازے اور ان کے برادر حضرت مولانا قاضی عبد الکریم دامت برکاتہم اور دیگر اہل خانہ کو یہ صدمہ صبر و حوصلہ کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق دے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۵ اگست ۲۰۱۰ء)

(۲)

حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، کلاچی میں ان کا مدرسہ نجم المدارس کے نام سے قرآن و سنت کی تعلیمات لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ کلاچی کے عوام کا مرجع تھے، لوگ دور دور سے راہ نمائی اور اپنے معاملات کے فیصلے کروانے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ ہمیشہ جمعیۃ علماء اسلام میں سرگرم رہے۔ جب میں گوجرانوالہ میں جمعیۃ کا سیکرٹری جنرل تھا، اس وقت وہ کلاچی میں جمعیۃ کے سیکرٹری جنرل تھے۔ علماء میں ایسے افراد بہت کم ہیں جو آج کے قانون اور بیوروکریسی کی اصطلاحات اور زبان کو سمجھ سکیں۔ قاضی صاحبؒ کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ آج کے قانون، بیوروکریسی اور سرکاری ڈرافٹس وغیرہ کی زبان سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں جب شریعت بل اسمبلی میں پیش ہوا تو اس کو منظور کروانے میں جن لوگوں نے علمی جنگ لڑی، ان میں قاضی عبد اللطیفؒ اور جسٹس افضل چیمہ سرفہرست ہیں۔ ایک موقع پر جناب وسیم سجاد نے کہا کہ قرآن کریم قانون کی نہیں، اخلاقیات کی کتاب ہے۔ قاضی صاحبؒ نے ان کے ساتھ تین گھنٹے مذاکرات کیے اور لاجواب کر دیا۔

۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے چار نائبین سمجھے جاتے تھے: مولانا محمد اجمل خانؒ، مولانا غلام ربانیؒ، قاضی عبد اللطیفؒ اور چوتھا میں فقیر تھا۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے آج سے چار سال پہلے کسی ملاقات میں فرمایا تھا کہ ان قبائل کو سنبھالو۔ گویا آج قبائل اور بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا

ہے اس کا انہوں نے کافی عرصہ پہلے ادراک کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی مساعی کو اپنی جناب میں قبول فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

(۳)

ظہر سے قبل ہم کلاچی پہنچے۔ حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کی زیادت کی اور ان سے ان کے بھائی مولانا قاضی عبداللطیفؒ اور بیٹے مولانا قاضی عبدالحلیمؒ کی وفات پر تعزیت کی۔ مولانا قاضی عبداللطیفؒ کے ساتھ میری طویل جماعتی رفاقت رہی ہے۔ مگر یہ بات یہاں آکر مختلف واقعات کو کریدتے ہوئے معلوم ہوئی کہ وہ بھی دارالعلوم دیوبند میں میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے ساتھ دورۂ حدیث میں شریک تھے اور کرک بنوں کے مولانا صدر الشہید نے بھی ان کے ساتھ ہی دورۂ حدیث کیا تھا۔

علاقے میں اس خاندان کی علمی وجاہت اور مرجعیت معروف ہے اور فقر و درویشی کی روایت بھی قائم ہے۔ سادہ سی مسجد کے ساتھ کچے مکانات ان کا مسکن ہیں اور پورا خاندان قناعت اور درویشی کے ماحول میں دینی خدمات میں مصروف ہے۔ مولانا قاضی عبداللطیفؒ چھ سال تک سینیٹر رہے ہیں، جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے تھے اور صوبہ خیبر پختون خواہ میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے دوران صوبائی متحدہ مجلس عمل کے صدر تھے، مگر ان کی رہائش گاہ وہی سادہ سی تھی جو ان مراحل سے گزرنے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ ہم ان کے حجرے میں، جو ان کی لائبریری بھی تھی اور نشست گاہ بھی، بیٹھے ہوئے تھے اور میری نظریں بار بار ان کی کچی دیواروں اور کانوں کی چھت کا طواف کر رہی تھیں کہ کیا پاکستان میں کسی سینیٹر کا چوکیدار بھی اس قسم کے مکان میں رہتا ہو گا؟

(روزنامہ اسلام)

حضرت مولانا محمد یوسف خانؒ

(۱)

عیدالفطر کی رات جن چند دوستوں کو عید مبارک کہنے اور حال احوال معلوم کرنے کے لیے فون کیا ان میں برادرم مولانا سعید یوسف خان بھی تھے، انہیں فون کرنے کا ایک مقصد حضرت الشیخ مولانا محمد یوسف خان کی خیریت دریافت کرنا تھا جو پاکستان اور آزاد کشمیر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے

باقی ماندہ چند گنے چنے شاگردوں میں سے تھے اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے دورۂ حدیث کے ساتھی تھے۔ مولانا سعید نے بتایا کہ حضرت کی صحت معمول کے مطابق ہے، وہ بخیریت ہیں اور انہوں نے رمضان المبارک کے روزے بھی سارے رکھے ہیں۔ میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں سلام عرض کرنے اور دعا کی درخواست پیش کرنے کے لیے کہا اور مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

مگر اس کے صرف دو روز بعد کی بات ہے جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی جو میرے چچازاد ہونے کے ساتھ ساتھ داماد بھی ہیں، حسب معمول عید کی چھٹیوں میں بچوں سمیت گھر آئے ہوئے تھے، عشاء کی نماز مسجد میں ادا کرنے کے بعد سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گھر آ رہے تھے کہ کسی دوست کا فون آنے پر انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا شروع کر دیا، میرا دل دھڑکا اور فون مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت مولانا محمد یوسف خان کا انتقال ہو گیا ہے، زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور دل غم واندوہ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ ہم نے پیر کے روز لاہور جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا کہ مخدوم زادہ مکرم صاحبزادہ میاں محمد اجمل قادری صاحب پر رمضان المبارک کے دوران فالج کا اٹیک ہوا ہے اور وہ صاحب فراش ہیں۔ حاجی عثمان عمر ہاشمی صاحب کے ہمراہ ان کی عیادت اور بیمار پرسی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام طے تھا۔ مگر "عرفت ربی بفسخ العزائم" (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) کی تصویر سامنے آ گئی اور لاہور جانے کی بجائے پلندری کی طرف سفر کرنا پڑا۔

حاجی محمد فیاض خان سواتی، مولانا قاری جمیل الرحمان اختر اور عزیزم حافظ زبیر جمیل کے ہمراہ نماز فجر کے بعد گوجرانوالہ سے روانگی ہوئی اور ہم ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ پلندری پہنچ گئے۔ دارالعلوم تعلیم القرآن میں داخل ہوئے تو ہر طرف علماء کرام کا ہجوم تھا۔ حضرت شیخ اسی برآمدے میں چارپائی پر سکون کی نیند سوئے ہوئے تھے جہاں ابھی دو ماہ قبل ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان کی زیارت و ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا، ایک دن ان کی خدمت میں رہا، اسی برآمدے میں وہ اپنی مخصوص مسند پر تشریف فرما تھے، مجھے انہوں نے ساتھ بٹھا رکھا تھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے باتوں میں مصروف تھے۔

میرا ان کے ساتھ گزشتہ چار عشروں سے مسلسل تعلق تھا جو چچا اور بھتیجے کا تعلق بھی تھا، استاذ اور شاگرد کا بھی تھا، راہنما اور کارکن کا بھی تھا اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں علمی و فکری استفادہ کا بھی تھا۔ ان سے رخصت ہونے لگا تو دل کے کونے سے آواز آئی کہ اچھی طرح زیارت کر لو شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ مین گیٹ تک جانے کے بعد ایک بار پھر واپس پلٹا، زیارت کی، مصافحہ کیا اور دعائیں سمیٹتا ہوا رخصت ہو گیا۔

آج بھی وہی برآمدہ تھا مگر مسند کی بجائے چارپائی تھی اور حضرت شیخ بلبل کی طرح چہچہانے کی بجائے آرام کی نیند سو رہے تھے۔ چہرے پر بلا کا سکون تھا، ہمیں ان کے قدموں میں گھنٹہ بھر بیٹھنے کی سعادت مل گئی، حاجی محمد فیاض خان نے کہا کہ چہرے پر نورانیت کا منظر دیکھیں جبکہ میرے ذہن کا کیمرہ اس سکون اور نورانیت کی بار بار تصویریں لے رہا تھا۔

علماء کرام اور سرکردہ حضرات ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے چہرے کی زیارت کر رہے تھے، دوسری طرف عوام کا جم غفیر قطار میں تھا اور لوگ اپنے اس محبوب بزرگ کی باری باری زیارت کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ سامنے صحن میں ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے علماء کرام اور دیگر حضرات تشریف فرما تھے اور علماء کرام ان کے سامنے خطاب میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف خان کے عزیز ترین شاگرد اور رفیق خاص حضرت مولانا محمد اسحاق مدنی ایک طرف بیٹھے آنسو بہا رہے تھے جبکہ حضرت شیخ کے صاحبزادگان صبر وضبط کا دامن تھامے ارد گرد آنے والے لوگوں سے تعزیتیں وصول کر رہے تھے۔ اس موقع پر بتایا گیا کہ حضرت شیخ نے رمضان المبارک کے سارے روزے رکھے، تراویح کی نماز مسجد میں اہتمام کے ساتھ باجماعت ادا کرتے رہے، وفات کے دن بھی مغرب کی نماز گھر میں باجماعت پڑھی، نماز کے بعد معمول کے مطابق وظائف میں مصروف تھے اور تسبیح ہاتھ میں لیے ذکر کر رہے تھے کہ اچانک سینے میں تکلیف محسوس ہوئی اور تسبیح ہاتھ سے گر گئی، فوری طور پر ایک قریبی ہسپتال میں لے جانے کا اہتمام ہوا مگر کاتب تقدیر کا قلم اپنا فیصلہ صادر کر چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے حضرت شیخ کی وفات کی تصدیق کی اور یہ خبر آناً فاناً علاقے میں ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں پھیل گئی۔ خود میرے موبائل فون پر گزشتہ رات پیغامات کا تانتا بندھا رہا اور موبائل فون کی کالوں اور پیغامات نے رات ہی رات دنیا بھر میں حضرت شیخ کے متعلقین اور عقیدت مندوں کو اس سانحے سے آگاہ کر دیا تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف خان نے نوے برس کے لگ بھگ عمر پائی، ان کی ساری زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی، دینی اور قومی زندگی کا کوئی شعبہ ان کی تگ و تاز سے خالی نہیں رہا، ہر شعبہ زندگی کے لوگ سمجھتے تھے کہ شاید سب سے زیادہ توجہ انہیں حاصل ہے۔ مگر ان کے اوقات کار اور توجہات کی ایسی متوازن تقسیم تھی کہ انہوں نے مختلف شعبوں کو بھرپور وقت دیا اور زندگی کا کوئی لمحہ مصروفیت سے خالی نہیں رہنے دیا۔ دینی علوم کی تدریس کا شعبہ ہو، سلوک وارشاد کے ذریعے علماء اور عوام کی روحانی اصلاح کا میدان ہو، سیاسی قیادت اور راہنمائی کا محاذ ہو، سماجی خدمات کا دائرہ ہو، نفاذِ شریعت کی جدوجہد کی فکری و علمی پشت پناہی ہو، آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد ہو، جمعیۃ علماء آزاد کشمیر کے عنوان سے علماء کرام میں تحریکی ذوق

پیدا کرنے کا معاملہ ہو، حضرت مولانا محمد یوسف خان ہر محاذ پر صف اول میں موجود رہے۔

حضرت شیخ کی علمی، دینی، قومی، تحریکی اور سماجی خدمات کا احاطہ اس مختصر تاثراتی مضمون میں ممکن نہیں ہے مگر ان کی وفات پر جنازے کے لیے آنے والے ہزاروں افراد سے خطاب کرتے ہوئے مختلف حضرات نے جن تاثرات کا اظہار کیا ان کے چند پہلوؤں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ایک مقرر نے، جن کا نام میں یاد نہیں رکھ سکا، کہا کہ آزاد کشمیر کی عدالتوں میں آج اگر ججوں کے ساتھ قاضی بیٹھتے ہیں اور بہت سے معاملات میں شریعت کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں تو یہ حضرت مولانا محمد یوسف خان اور ان کے رفقاء کی طویل جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جب آزاد جموں وکشمیر کی عدالتوں میں شرعی قوانین کے نفاذ کا فیصلہ ہو رہا تھا تو انتظامیہ اور عدلیہ کے ایک اعلیٰ سطحی بھرپور اجلاس میں چیف جسٹس آزاد کشمیر نے اس سلسلہ میں اپنے اشکالات اور اعتراضات تفصیل کے ساتھ پیش کیے مگر حضرت مولانا محمد یوسف خان نے ان کے اس قدر مدلل اور تسلی بخش جوابات دیے کہ خود جسٹس موصوف نے اسی محفل میں برملا اعتراف کیا کہ مولانا یوسف خان کے مفصل خطاب نے نہ صرف ان کے بہت سے اشکالات دور کر دیے ہیں بلکہ ان کے ذہن کا رخ بھی بدل ڈالا ہے۔

آزاد کشمیر کے وزیر اعظم سردار عتیق احمد خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا محمد یوسف خان صرف آزاد کشمیر اور پاکستان کے نہیں بلکہ عالم اسلام کی شخصیت تھے اور وہ ان کے بارے میں ایک مغربی دانشور کا یہ قول بیان کرنا چاہیں گے کہ کسی چھوٹے آدمی کا بڑی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنا بڑی بات نہیں ہے بلکہ بڑے آدمی کا چھوٹی جگہ پر بیٹھ کر اپنے کمالات کا اظہار کرنا اور انہیں منوانا اصل کمال کی بات ہے، اور یہ مقولہ مولانا محمد یوسف خان کی جدوجہد پر صادق آتا ہے۔ سابق صدر آزاد کشمیر سردار محمد انور خان نے کہا کہ مولانا محمد یوسف خان کی خدمات کو صرف دینی دائرے میں محدود کرنا درست نہیں ہے، وہ تحریک آزادی اور نفاذِ اسلام کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی محاذ پر بھی ہمارے راہنما تھے۔

راقم الحروف نے اپنی گزارشات میں عرض کیا کہ حضرت شیخ نے ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزاری، آج سے ۶۵ برس پہلے جب وہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر اس علاقے میں آئے تھے تو ان کا استقبال ڈوگرہ حکمرانوں کے جیل خانے نے کیا تھا، اور آج جب وہ رخصت ہو رہے ہیں تو قوم کے تمام طبقات ان کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہیں اور ان کی یہ کامیاب زندگی "فزت و رب الکعبۃ" (رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا) کا عملی نمونہ پیش کر رہی ہے۔

اس فضا میں مولانا سعید یوسف خان کے سر پر حضرت شیخ کی پگڑی رکھ کر ان کے جانشین ہونے کا

اعلان کیا گیا اور لاکھوں افراد نے مولانا سعید یوسف کی اقتداء میں نماز ادا کر کے حضرت شیخ کو الوداع کیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۵ستمبر ۲۰۱۰ء)

(۲)

مولانا محمد یوسف خانؒ کی ولادت ۱۹۱۹ء/ ۱۹۲۰ء کی ہے۔ کشمیر کے علاقہ "منگ" کے ایک اچھے بااثر خاندان سے تعلق تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۰ء/ ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے بھی اسی زمانے میں دورۂ حدیث کیا تھا۔ آپ مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا محمد یوسفؒ کو اللہ تعالیٰ نے حق گوئی و بے باکی عطا فرمائی تھی۔ جب وہ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد واپس اپنے علاقے میں پہنچے تو اس وقت اہل کشمیر پر بڑی آزمائش کا دور تھا، ڈوگرہ فوج نے لوگوں پر مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ مولانا کا جوان خون تھا، نیا نیا علم تھا، اپنے استاد سید حسین احمدؒ مدنی کو تحریکیں چلاتے اور ان کی قیادت کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت لوگوں میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل علماء کا بڑا احترام تھا، اس لیے مولانا محمد یوسف خان سے عید کی نماز پڑھانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کھل کر ڈوگرہ فوج کے مظالم کی مخالفت کی جس کی پاداش میں اگلے ہی دن گرفتار ہو کر پونچھ جیل میں پہنچ گئے، یہ ان کی عملی زندگی کی ابتدا تھی۔ مولانا کا شمار ان علما میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے سب سے پہلے جہاد کا فتویٰ دیا اور تحریک اور جہاد کشمیر میں عملاً شریک ہوئے، جنگ لڑی اور آزاد کشمیر حاصل کیا۔

مولانا مرحوم علم میں بھی بہت پختہ تھے اور ان کا شمار پاکستان ہی نہیں برصغیر کے بڑے محدثین میں ہوتا تھا۔ علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بصیرت بھی عطا کی تھی، بڑے صاحب فراست آدمی تھے اور اظہار خیال کا سلیقہ بھی خوب ملا تھا۔ چوٹی کے مدرس تھے، دارالعلوم تعلیم القرآن جو کشمیر کے مدارس میں سب سے قدیم درس گاہ ہے، وہاں انہوں نے ۶۰ سال تک تدریس کی۔

میرے نزدیک مولانا محمد یوسف خانؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ریاست کے نظام میں اسلامی روایات کی پاسداری کو یقینی بنانے کے لیے کامیاب اقدامات کرنا ہے۔ جب ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس کے نظام کی تشکیل میں مولانا نے کلیدی کردار ادا کیا۔ آج بھی آزاد کشمیر کی عدالتوں میں بہت سے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہیں اور یہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ اور ان کے رفقا کی طویل جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ جب آزاد جموں و کشمیر کی عدالتوں میں شرعی قوانین کے نفاذ کا فیصلہ ہو رہا تھا تو انتظامیہ اور عدلیہ کے ایک اعلیٰ سطحی

اجلاس میں چیف جسٹس آزاد کشمیر جسٹس صراف نے اس حوالے سے اپنے اشکالات اور اعتراضات دو گھنٹے کے خطاب میں تفصیل کے ساتھ پیش کیے۔ حضرت مولانا محمد یوسف خانؒ نے اس کے جواب میں تین گھنٹے تقریر کی اور ان کے اشکالات کے اس قدر مدلل جوابات دیے کہ خود جسٹس موصوف نے اسی محفل میں برملا اعتراف کیا کہ مولانا یوسف خانؒ کے مفصل خطاب نے نہ صرف ان کے بہت سے اشکالات دور کر دیے ہیں بلکہ ان کے ذہن کا رخ بھی بدل ڈالا ہے۔

میرا ان کے ساتھ چار عشروں کا تعلق تھا جو چچا اور بھتیجے کا تعلق بھی تھا، استاد اور شاگرد کا بھی، راہ نما اور کارکن کا بھی اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں علمی و فکری استفادے کا بھی۔ میری دلچسپی کا میدان مغربی تہذیب و فلسفہ ہے۔ اس میدان میں کئی ایسے موڑ آئے کہ خود میرا ذہن بھی الجھن کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایسے موقع پر دو آدمی ایسے تھے جو میری اس الجھن کو حل فرمایا کرتے تھے۔ ایک حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دوسرے حضرت مولانا محمد یوسف خانؒ۔ میں ان کے پاس جاتا اور الجھن پیش کرتا، وہ کوئی بات کوئی جملہ ارشاد فرماتے اور ذہن بالکل مطمئن ہو جاتا۔

انہوں نے اپنے آپ کو کشمیر تک محدود کر رکھا تھا۔ اکثر میں انہیں کشمیر سے باہر نکلنے کا کہتا اور بسا اوقات جھنجھلا کر میں کہتا کہ آپ کشمیری کیوں ہیں؟ تو وہ مسکرا کر جواب دیتے کہ تم کشمیری کیوں نہیں ہو؟ جس پر مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑتی۔ وہ تھے تو کشمیری لیکن انہوں نے وہاں بیٹھ کر کتنا کام کیا، اس کا اندازہ آزاد کشمیر کے وزیر اعظم سردار عتیق احمد خان کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ مولانا محمد یوسف خان صرف آزاد کشمیر کے اور پاکستان کے نہیں بلکہ عالم اسلام کی شخصیت تھے۔ سردار صاحب نے ان کے بارے میں ایک مغربی دانش ور کا یہ قول بیان کیا کہ کسی چھوٹے آدمی کا بڑی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنا بڑی بات نہیں ہے، بلکہ بڑے آدمی کا چھوٹی جگہ پر بیٹھ کر اپنے کمالات کا اظہار کرنا اور انہیں منوانا اصل کمال کی بات ہے اور یہ مقولہ مولانا محمد یوسف خانؒ کی جدوجہد پر صادق آتا ہے۔ آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار محمد انور خان نے کہا کہ مولانا محمد یوسف خانؒ کی خدمات کو صرف دینی دائرے میں محدود کرنا درست نہیں ہے، وہ تحریک آزادی اور نفاذ اسلام کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی محاذ پر بھی ہمارے راہ نما تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو موت بھی عجیب عطا فرمائی۔ ۹۰ سال سے زیادہ ان کی عمر تھی، انہوں نے رمضان کے پورے روزے رکھے، تراویح کی نماز مسجد میں اہتمام کے ساتھ باجماعت ادا کی، وفات کے دن بھی مغرب کی نماز گھر میں باجماعت پڑھی، نماز کے بعد معمول کے مطابق وظائف میں مصروف تھے اور تسبیح ہاتھ میں لیے ذکر کر رہے تھے کہ اچانک سینے میں تکلیف محسوس ہوئی اور تسبیح ہاتھ سے گر گئی اور حضرت

مولانا، جناب باری تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے لیے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی و دینی خدمات کو اپنی بارگاہ عالیہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں ان کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

(۳)

دار العلوم تعلیم القرآن پلندری آزاد کشمیر کے بانی و مہتمم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان آزاد کشمیر کے ان بزرگ علماء میں سے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے جہاد آزادی کو منظم کرنے میں سرگرم کردار ادا کیا، اس میں عملی حصہ لیا اور آزاد کشمیر کی ریاست قائم ہونے کے بعد اس میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے سرگرم عمل ہو گئے جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر میں سرکاری طور پر قضا اور افتا کے شرعی محکمے الگ الگ کام کر رہے ہیں، ہر ضلع اور تحصیل میں ججوں کے ساتھ جید علماء کرام بطور قاضی بیٹھ کر مقدمات کی سماعت کرتے ہیں اور شرعی قوانین پر عمل درآمد کی نگرانی کرتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف خان جہاد کشمیر کے اس مرحلہ اور اسلامائزیشن کے اس عدالتی عمل کے عین گواہ ہیں اور علماء کرام کی اس کھیپ میں سے غالباً واحد بزرگ باقی رہ گئے ہیں۔ جبکہ ان کے دیگر رفقاء مولانا مفتی امیر عالم خان، مولانا محمد عبد اللہ کفل گڑھیؒ، مولانا عبد الحمید قاسمیؒ، مولانا محمد عبد اللہ سیاکھویؒ، مولانا مفتی عبد المتینؒ، مولانا امیر الزمان خانؒ اور دیگر بزرگ عالم آخرت کو سدھار چکے ہیں۔ مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ میری نیاز مندی بہت پرانی ہے، وہ میرے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کے دورۂ حدیث کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں اکٹھے دار العلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے سند فراغت حاصل کی تھی۔ اس نسبت سے ان کے ساتھ میرا تعلق چچا بھتیجے کا ہے اور اس حوالے سے ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہتا ہوں۔

مولانا موصوف آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں اور آل جموں و کشمیر جمعیۃ علماء اسلام کے امیر کی حیثیت سے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے فرزند برادرم مولانا سعید یوسف خان کی دعوت اور اصرار پر اپنے معمول کے خلاف جمعہ کے روز پلندری جانا ہوا اور دار العلوم تعلیم القرآن کی جامع مسجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا تو اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ بھی ایک نشست کر ڈالی جس کا مقصد جہاد کشمیر میں علماء کرام کے کردار اور آزاد کشمیر میں افتا اور قضا کے شرعی محکموں کے قیام میں علماء کرام کے حصے کے بارے میں ان کے

مشاہدات کو کریدنا تھا تاکہ نئی نسل اس سے آگاہ ہو اور تاریخ اپنے ریکارڈ کے اس اہم حصے سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ ان دونوں موضوعات پر ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا محمد یوسف خان نے بتایا کہ کشمیر کی آزادی اور اسے ایک مکمل اسلامی ریاست بنانے کے لیے کشمیری عوام کی جدوجہد کا سلسلہ بہت پرانا ہے اور کشمیری مجاہدین امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے اس جہاد میں بھی شریک رہ چکے ہیں جس کا اصل ہدف کشمیر پر قبضہ کرنا اور اسے تحریک آزادی کا بیس کیمپ بنانا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ بالاکوٹ کی طرف شہدائے بالاکوٹ کے قافلہ کی آمد کا مقصد بالاکوٹ کا علاقہ نہیں بلکہ مظفر آباد تھا جس پر قبضہ کے لیے وہ تیاریاں کر رہے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کی فوجوں نے بالاکوٹ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور وہ علاقہ کے کچھ لوگوں کی مخبری پر شیر سنگھ کی فوجوں کے گھیرے میں آکر شدید مقابلہ کے بعد جام شہادت نوش کر گئے۔ شہدائے بالاکوٹ کے ساتھ ان جنگوں میں ریاست پونچھ کے بہت سے لوگ شریک تھے، چنانچہ بالاکوٹ کے اس معرکہ کے بعد پونچھ کے مجاہدین آزادی کو سزا دینے کے لیے جموں کا ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ خود اس علاقہ میں آیا اور اس نے چن چن کر ایسے لوگوں کو گرفتار اور قتل کیا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہ شہدائے بالاکوٹ کے ساتھ پشاور سے بالاکوٹ تک کی جنگوں میں شریک رہے ہیں۔ ہزاروں مسلمان گرفتار کیے گئے، سینکڑوں کو جموں لے جایا گیا، بیسیوں افراد کے سر کاٹ کر ان کے سروں کی پلندری اور گردونواح میں نمائش کی گئی اور آزادی کے دو متوالوں سردار سبز علی خان شہیدؒ اور سردار ملی خان شہیدؒ کو راجہ گلاب سنگھ نے اپنے سامنے درختوں کے ساتھ الٹا لٹکا کر زندہ حالت میں ان کی کھالیں اتروا دیں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کا ہے اور اس کی یادیں ابھی تک علاقہ کے پرانے بزرگوں کے دلوں میں تازہ ہیں جو انہوں نے اپنے باپ دادا سے سن رکھی ہیں۔

اس موقع پر مولانا محمد یوسف خان کے ساتھ ہماری مجلس میں موجود ایک بزرگ نے کہا کہ گلاب سنگھ کی طرف سے مسلمانوں کے قتل عام پر انعام مقرر کیا گیا تھا کہ جو کسی مجاہد کا سر لائے گا، اسے آٹھ آنے ملیں گے اور ان کے کسی حمایتی مسلمان کا سر لانے والے کو چار آنے انعام دیا جائے گا۔ اسی مجلس میں مولانا سعید یوسف خان نے بتایا کہ ان واقعات کا تذکرہ خود راجہ گلاب سنگھ نے اپنی ڈائری ”گلاب نامہ“ میں اور میجر اسمتھ نے اس علاقہ کی تاریخ میں کیا ہے۔ گلاب سنگھ نے اپنی ڈائری میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب درخت سے الٹے لٹکے ہوئے دو زندہ مجاہدوں سبز علی خان شہیدؒ اور ملی خان شہیدؒ کی کھالیں سینے تک اتر گئیں تو انہوں نے پیاس اور تکلیف کی شدت کے باعث پانی مانگا تو گلاب سنگھ نے انہیں پانی دینے سے انکار کر دیا

اور اسی حالت میں وہ دونوں مجاہد جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ جہاد آزادی میں شرکت کی تھی اور کشمیر کو سکھوں کے اقتدار سے نجات دلا کر ایک آزاد اسلامی ریاست بنانے کی مہم میں شامل ہو گئے تھے جو پورے ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک ''بیس کیمپ'' کے طور پر مجاہدین کا مرکز سکتی تھی، مگر بالاکوٹ میں مجاہدین کی شکست سے اس جدوجہد کا باب بند ہو گیا۔

کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوت کا دوسرا مرحلہ ۱۹۳۱ء کا ہے جس میں ڈوگروں کے وحشیانہ مظالم کے خلاف کشمیری عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس احرار اسلام نے پورے ہندوستان سے ان کی حمایت میں رضا کار کشمیر بھجوانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ڈوگرہ پولیس سے تصادم کے نتیجے میں بیسیوں مجاہد شہید ہوئے اور کم و بیش تیس ہزار افراد نے گرفتاری پیش کی جن کے لیے ریاست جموں و کشمیر کی جیلیں تنگ پڑ گئیں اور انہیں حراست میں رکھنے کے لیے کیمپ قائم کرنا پڑے۔ اس تحریک میں رضا کار بھجوانے کے اہم مراکز میں گوجرانوالہ اور سیالکوٹ بھی شامل ہیں جہاں کے پرانے بزرگ اب بھی اس دور کے واقعات مزے لے لے کر سناتے ہیں، مگر مولانا یوسف خان اپنی یادداشتوں کے سلسلہ کا آغاز ۱۹۴۳ء سے کرتے ہیں جب وہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے علاقہ منگ آزاد کشمیر میں آئے، ان کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں رہ کر آئے تھے اور حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی جیسے مجاہد آزادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا، اس لیے سینے میں آزادی کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ موجزن تھا اور آتے ہی ایک دل خراش واقعہ کا سامنا کرنا پڑا جس نے ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف نفرت کی آگ اور بھڑکا دی۔ واقعہ یہ تھا کہ علاقہ کا ایک مسلمان نمبردار زمان علی قتل ہو گیا۔ قاتل ہندو تھا جسے مقدمہ چلائے جانے کے بعد صرف دو سال قید کی سزا سنائی گئی جبکہ ان دنوں ریاست میں گائے ذبح کرنے پر پابندی تھی اور اس کی سزا سات سال قید مقرر تھی۔ مولانا محمد یوسف خان شعبان میں دیوبند سے فارغ ہو کر آئے اور رمضان المبارک کے بعد عید الفطر کے روز منگ کی عید گاہ میں نماز عید کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ''کھڑاک'' کر دیا۔ انہوں نے ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم اور مذکورہ بالا مقدمہ کے حوالے سے مسلمانوں کو غیرت دلائی اور ڈوگرہ حکومت کو سرعام للکارا جس کے نتیجے میں وہ گرفتار کر لیے گئے۔ ایک ماہ حوالات میں رہے، پھر تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی اور نصف کے قریب سزا بھگت چکے تھے کہ پونچھ کے مسلمان سیشن جج نے اس تنبیہ کے ساتھ انہیں رہا کر دیا کہ ''مولوی صاحب! اتنی گرم تقریر نہ کیا کرو۔'' یہ مولانا یوسف خان کی عملی زندگی کا آغاز تھا جس کے بعد انہوں نے پلندری کے عوام کی خواہش پر

پلندری کی مرکزی جامع مسجد میں ڈیرہ ڈال لیا اور دار العلوم تعلیم القرآن کے نام سے دینی درس گاہ کا آغاز کیا جواب آزاد کشمیر کے سب سے بڑے دینی تعلیمی ادارے کے طور پر تعلیمی خدمات میں مصروف ہے۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور کشمیر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو پونچھ کے عوام نے ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد یوسف خان اور ان کے رفیق کار مولانا عبد العزیز تھوراڑوی نے علماء کرام سے رابطہ قائم کر کے ان کی مشاورت کا اہتمام کیا جس میں مولانا محمد عبد اللہ کفل گڑھیؒ، مولانا مفتی عبد الحمید قاسمیؒ، مولانا مفتی امیر عالم خانؒ، مولانا مظفر حسین ندوی، مولانا عبد الرحمن عباس پوریؒ، مولانا حکیم حیات علی میر پوریؒ، مولانا عبد الرحمن مظفر آبادیؒ اور دیگر سرکردہ علماء کرام شریک ہوئے۔ یہ مشاورت ۲۲ جولائی کو ہوئی جس میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کرتے ہوئے سب علماء کرام نے حلف اٹھایا جبکہ اس کے ایک ماہ بعد نیلا بٹ میں سردار محمد عبد القیوم خان والی مشاورت ہوئی اور اس میں بھی بغاوت کا حلف اٹھایا گیا۔ اس حوالے سے تحریک آزادی کشمیر میں پہل کرنے کا اعزاز علماء کرام کو حاصل ہوا۔

مولانا محمد یوسف خان اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہوتے ہی ڈوگرہ حکمرانوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کشمیر کے مسلمان انہیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کریں گے، اس لیے انہوں کے حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے جگہ جگہ امن کمیٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں، مگر مذکورہ بالا علماء کرام نے ان کمیٹیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہر علاقہ کے عوام کو ان میں شرکت سے منع کیا اور پھر ۲۲ جولائی کی مشاورت میں ڈوگرہ راج کو مسترد کرنے کا باقاعدہ فیصلہ کیا گیا۔ اسی دوران سردار محمد ابراہیم خان جو ریاستی اسمبلی کے ممبر تھے، سری نگر چھوڑ کر مری آ گئے اور حریت پسندوں کو منظم کر کے آزاد حکومت کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں تو علماء کرام ان کے ساتھ ان کوششوں میں شریک ہو گئے۔ اس جہاد آزادی میں جن علماء کرام نے خود عملاً حصہ لیا، ان میں مولانا محمد یوسف خان، مولانا مفتی امیر عالم خانؒ، مولانا عبد الحمید قاسمیؒ، مولانا محمد عبد اللہ کفل گڑھیؒ، مولانا عبد الرحمن عباس پوریؒ، مولانا عبد الرحمن مظفر آبادیؒ اور مولانا مظفر حسین ندوی شامل ہیں جن میں سے اول الذکر مولانا محمد یوسف خان اور آخر الذکر مولانا مظفر حسین ندوی ابھی تک بقید حیات ہیں جبکہ باقی بزرگ عالم بقاء کو سدھار چکے ہیں۔ پونچھ کے معرکہ میں مولانا محمد کریم اور باغ کے معرکہ میں مولانا جلال الدین نے جام شہادت نوش کیا جبکہ ارجہ تحصیل دھیر کوٹ کے مولانا خدا بخش مرحوم نے جنگ میں سب سے پہلی گولی چلانے کا اعزاز حاصل کیا جن کے فرزند مولانا عبد الحئی آج کل مدنی مسجد دھیر کوٹ کے خطیب ہیں۔

مولانا محمد یوسف خان نے بتایا کہ جہاد کشمیر کے اس مرحلہ میں جس کے نتیجے میں آزاد جموں وکشمیر کی حکومت قائم ہوئی، صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ خان عبد القیوم خان مرحوم کا بھی بڑا کردار ہے جنہوں نے جہاد کشمیر کے لیے آنے والے قبائلی مجاہدین کو سہولتیں مہیا کیں اور ان کی وساطت اور کوشش سے مجاہدین کشمیر کو درہ سے اسلحہ کی بہت بڑی مقدار حاصل ہوئی جس سے مجاہدین نے جنگ لڑی اور اس خطہ میں ایک آزاد حکومت قائم ہوگئی جس کے پہلے سربراہ سردار محمد ابراہیم خان تھے۔

مولانا موصوف کا کہنا ہے کہ اگر اس وقت ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف کشمیری علماء اور عوام کے جوش آزادی میں مداخلت نہ کی جاتی اور بین الاقوامی دباو کو قبول کر کے سیز فائر قبول نہ کیا جاتا تو آج صورت حال مختلف ہوتی، مگر اقوام متحدہ نے کشمیری عوام کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیا اور خود بھی مسئلہ کشمیر کی فائل کو نصف صدی سے گھٹنوں کے نیچے دبائے بیٹھی ہے۔

علماء کے نزدیک آزادی کی تحریک اور اسلامی نظام کا نفاذ آپس میں لازم وملزوم ہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد کا مقصد ہی نفاذ اسلام ہوتا ہے، ورنہ تحریک آزادی ان کے نزدیک بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔ شہدائے بالاکوٹ کی حکومت پشاور سے لے کر طالبان کی حکومت افغانستان تک ایک تسلسل ہے جو اس فلسفہ جہاد کے عملی مظاہر کی نشان دہی کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب مظفر آباد، پونچھ اور میرپور کے اضلاع پر مشتمل آزاد جموں وکشمیر کی حکومت سردار محمد ابراہیم خان کی سربراہی میں قائم ہوئی تو جہاد آزادی کو منظم کرنے اور اس میں عملی حصہ لینے والے علماء کرام نے آزاد حکومت کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کے عملی نفاذ کی طرف پیش رفت شروع کر دی اور آپس میں مشورہ کر کے مختلف علاقوں میں شرعی قاضی مقرر کیے جنہوں نے لوگوں کے مقدمات سن کر فیصلے کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ راولاکوٹ میں مولانا عبد العزیز تھوراڑوی، باغ میں مولانا محمد عبد اللہ کفل گڑھی، عباس پور میں مولانا عبد الرحمن اور منگ میں مولانا نذیر احمد کو قاضی مقرر کیا گیا۔ ان قاضیوں نے عدالتی کام کا آغاز کیا تو پہلے سے چلی آنے والی سول عدالتوں کے ساتھ تصادم ناگزیر تھا اور اس کا آغاز راولاکوٹ سے ہوا جہاں کے قاضی مولانا عبد العزیز تھوراڑوی اور سب جج سردار محمد یوسف شریف تھے جو بعد میں چیف جسٹس کے منصب تک پہنچے اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان دونوں میں راولاکوٹ کے ایک جلسہ میں اسی مسئلہ پر تلخ کلامی ہوگئی۔ جلسہ میں صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان بھی موجود تھے۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو سردار شریف نے کہا کہ مولوی صاحب نے متوازی عدالت قائم کر رکھی ہے جبکہ مولانا عبد العزیز نے کہا کہ سردار شریف صاحب شرعی قوانین کو تسلیم نہیں کر رہے۔ اس پر سردار محمد ابراہیم خان نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سرکردہ علماء کرام کو

مشاورت کے لیے طلب کر لیا۔ اس وقت آزاد حکومت کا مرکز پلندری تھا اور مولانا محمد یوسف خان کی معیت میں سرکردہ علماء کرام نے صدر حکومت سے ملاقات کی جس میں کابینہ کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔ علماء کرام نے ان پر واضح کیا کہ ہمارے نزدیک تو آزادی کا مقصد ہی شرعی قوانین کا نفاذ ہے، اس لیے ہم شرعی عدالتوں سے کم کسی بات کو قبول نہیں کریں گے۔ حکومت نے غور کے لیے ایک ہفتہ کا وقت طلب کیا اور اس کے بعد ان علماء کو بتایا کہ سردست ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ محکمہ افتاء قائم کر کے سرکاری طور پر تحصیل اور ضلع کی سطح پر مفتی مقرر کر دیں جو ججوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی دینی رہنمائی کریں۔ کچھ عرصہ بعد جب ان علماء کو عدالتی کام کا تجربہ ہو جائے گا تو انہیں باقاعدہ قاضی کا درجہ دے دیا جائے گا۔

علماء کرام نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور ضلع مفتیوں کے تقرر کے لیے نام تجویز کرنے کا کام مولانا محمد یوسف خان کے سپرد ہوا اور ان کی مشاورت سے اس وقت کی نو تحصیلوں میں مفتی مقرر کیے گئے۔ صوبائی مفتی کے لیے ممتاز کشمیری عالم دین علامہ محمد شریف کشمیری کا نام تجویز ہوا جو اس وقت بلوچستان کی ریاست قلات میں علامہ شمس الحق افغانی کے معاون کے طور پر نائب وزیر معارف تھے، مگر انہوں نے یہ منصب قبول کرنے سے معذرت کر دی جس کے بعد مولانا عبد الرحمن عباس پوری کو صوبائی مفتی مقرر کیا گیا جن کی نگرانی میں مفتیان کرام نے سول عدالتوں میں ججوں کے ساتھ ان کی دینی رہنمائی کے لیے بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد چودھری غلام عباس مرحوم اور سردار محمد ابراہیم خان کے درمیان سیاسی کشمکش کا آغاز ہو گیا جس نے پورے آزاد کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ کشمکش کئی سال تک جاری رہی اور اس دوران دیگر معاملات کی طرح افتاء اور قضاء شرعی کے اس معاملہ میں بھی کوئی پیش رفت نہ ہو سکی حتی کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں آزاد کشمیر میں جناب کے ایچ خورشید مرحوم کی حکومت قائم ہوئی تو افتاء کے اس محکمہ کو سرے سے ختم کر دینے کی بھی کوشش کی گئی جس کی علماء کرام نے مزاحمت کی، اس لیے افتاء کا محکمہ تو ختم نہ کیا جا سکا مگر حکمت عملی یہ اختیار کی گئی کہ جو مفتی وفات پا جاتا یا ریٹائر ہو جاتا اس کی جگہ نئے مفتی کا تقرر نہ کیا جاتا۔ اسی دوران آزاد کشمیر میں عائلی قوانین نافذ کرنے کی بھی کوشش کی گئی جس کی بہت سی شقوں پر علماء کرام کو اعتراض تھا اور یہ قوانین پاکستان میں نافذ ہو چکے تھے لیکن آزاد کشمیر کے علماء کرام کے سخت احتجاج کے باعث وہاں یہ قوانین نافذ نہ کیے جا سکے۔

آزاد کشمیر میں سردار محمد عبد القیوم خان کی حکومت قائم ہوئی تو افتاء کے محکمہ کو باقاعدہ قضاء شرعی میں تبدیل کرنے کے لیے پیش رفت کا آغاز ہوا۔ سردار محمد عبد القیوم خان نے وزیر قانون خواجہ محمد اقبال بٹ

کی سربراہی میں لاء کمیشن قائم کیا جس میں حکومت آزاد کشمیر کے لاء سیکرٹری اور اس وقت کے چیف جسٹس سردار یوسف صراف کے علاوہ مولانا محمد یوسف خان، مولانا مظفر حسین ندوی، مولانا محمد یونس اثری، مولانا مفتی عبدالحکیم اور مولانا صدر الدین شامل تھے۔ اس کمیشن نے کئی ماہ تک شرعی قوانین کا جائزہ لے کر قوانین کے مسودات اور عدالتی نظام کا ڈھانچہ مرتب کیا اور اس دوران مولانا محمد یوسف خان نے کمیشن کے اجلاسوں میں اسلامی قوانین کے اس دور میں ناقابل عمل ہونے کے خدشات اور دیگر اعتراضات کا نقلی اور عقلی طور پر تجزیہ کرتے ہوئے اسلامی قوانین کا جس کامیابی کے ساتھ دفاع کیا، اس کی یاد ابھی تک کمیشن کے شرکاء کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ حتیٰ کہ چیف جسٹس سردار یوسف صراف نے کمیشن کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ مولانا محمد یوسف خان کی گفتگو سننے کے بعد اس بات کے شعوری طور پر قائل ہو گئے ہیں کہ اسلامی قوانین آج کے دور میں بھی نہ صرف قابل عمل ہیں بلکہ ضروری ہیں۔

کمیشن کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد پاکستان کی سپریم کورٹ کے سربراہ جسٹس حمود الرحمن صاحب کو آخری اجلاس میں شرکت اور مسودہ پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی گئی چنانچہ وہ مظفر آباد گئے اور کمیشن کے اجلاس میں اس مسودہ کا جائزہ لیا۔ انہوں نے بھی مسودہ کی مختلف شقوں پر ایک درجن سے زائد اعتراضات کیے جن کے جواب میں مولانا محمد یوسف خان نے تقریباً تین گھنٹے تک کمیشن سے خطاب کیا اور اس کے بعد جسٹس حمود الرحمن صاحب نے یہ کہہ کر مسودہ کی منظوری دے دی کہ مولانا محمد یوسف خان علم کا مینار ہیں، البتہ انہوں نے زنا کی شرعی سزا کے بارے میں کہا کہ اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا، مگر میری رائے ہے کہ مصلحت کا تقاضا اسی میں ہے کہ اسے مسودہ میں شامل نہ کیا جائے اور اس طرح بحث و مباحثہ کے اس طویل عمل کے بعد آزاد کشمیر میں عدالتی سطح پر شرعی قوانین کے نفاذ اور تحصیل اور ضلع کی سطح پر باقاعدہ شرعی قاضیوں کے تقرر کا فیصلہ کر لیا گیا جو بدستور آج سیشن اور سول ججوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

مفتیوں کا دائرہ کار قاضیوں سے قدرے وسیع تھا اور وہ عدالتی کام کے علاوہ دیگر سرکاری اور عوامی شعبوں میں بھی عوام اور افسران کی دینی راہنمائی کی خدمات سرانجام دیتے تھے، اس لیے جب انہیں قاضی کی حیثیت دے دی گئی تو وہ عدالتی دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئے اور دیگر شعبوں میں دینی رہنمائی کا خلا پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ جب سردار محمد عبدالقیوم خان آزاد کشمیر کے صدر اور سکندر حیات خان وزیر اعظم تھے، افتاء کا ایک مستقل محکمہ سرکاری طور پر قائم کیا گیا جس کے تحت ضلع اور تحصیل کی سطح پر مفتی مقرر کیے گئے ہیں اور وہ سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد یوسف خان کا کہنا ہے کہ اگرچہ آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں خاصی پیش رفت

ہوئی ہے، مگر ابھی یہ کام ادھورا ہے اور ہمارا کام اس وقت مکمل ہو گا جب پورا کشمیر بھارتی سامراج کے تسلط سے نجات حاصل کرے گا اور اس میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں آجائے گا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۹ و ۳۱ جولائی و یکم اگست ۲۰۰۰ء)

(۴)

سات جولائی کو دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری کے سالانہ جلسہ میں شرکت کا موقع ملا، اس دینی درسگاہ کو ریاست آزاد جموں و کشمیر کے دینی مدارس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کی وجہ شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم کی ذات گرامی ہے جو گزشتہ ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ سے اس خطے میں دینی رہنمائی اور علمی قیادت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے علمی مقام و مرتبہ اور مسلسل دینی خدمات کے باعث نہ صرف آزاد کشمیر بلکہ پورے ملک میں دینی حلقوں کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ علاقے کی ممتاز سیاسی شخصیات بھی شریک ہوتی ہیں اور آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد کے بارے میں اپنے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری کی دینی خدمات کا تذکرہ اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتی ہیں۔ چنانچہ جمعرات کو ظہر کے بعد کی جس نشست میں مجھے اظہار خیال کی دعوت دی گئی، اس نشست کی صدارت کشمیر کونسل کے رکن ڈاکٹر نجیب نقی کر رہے تھے اور مہمان خصوصی ریاست آزاد جموں و کشمیر کے صدر سردار محمد انور خان تھے جبکہ سردار محمد سوار خان، سردار محمد حسین اور سردار ممتاز خان ایڈووکیٹ نے بھی اس نشست سے خطاب کیا۔ اور یہ سب لوگ آزاد کشمیر اور خاص طور پر پلندری کے علاقے کی اہم سیاسی شخصیات ہیں۔ ان حضرات نے آزادیٔ کشمیر اور کشمیری مجاہدین کی مسلح جدوجہد کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہم آہنگی اور یک جہتی کا اعلان کیا، حضرت مولانا محمد یوسف خان کو ان کی ملی و دینی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا اور دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری کی مسلسل دینی جدوجہد کو سراہا۔

سردار محمد سوار خان نے کہا کہ مولانا محمد یوسف خانؒ نے صرف دینی و علمی میدان میں ہی اپنی شخصیت نہیں منوائی بلکہ تحریک آزادیٔ کشمیر میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں، ان کا کہنا ہے کہ تقسیم ہند سے قبل ڈوگرہ سامراج کے خلاف کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد میں مولانا محمد یوسف خانؒ نے قائدانہ کردار ادا کیا اور ڈوگرہ سامراج کے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پھر جب اس خطے کو ڈوگرہ سامراج سے آزادی دلانے کے لیے مسلح جدوجہد کا فیصلہ ہوا تو ''وار کونسل'' اسی درسگاہ میں قائم

ہوئی جو آج دارالعلوم تعلیم القرآن کی شکل میں ترقی کی منازل طے کر رہی ہے اور اسی جہاد آزادی کے نتیجے میں آزاد جموں وکشمیر کی موجودہ ریاست قائم ہوئی۔

صدر آزاد کشمیر سردار محمد انور خان نے مولانا محمد یوسف خانؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے دو باتوں کا بطور خاص تذکرہ کیا۔ ایک یہ کہ اس ماحول میں جبکہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وقتال کا سلسلہ جاری ہے اور مسجد اور امام بارگاہوں میں حملے ہو رہے ہیں، آزاد کشمیر اس فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد سے پاک ہے۔ ان کے نزدیک اس کی بڑی وجہ مولانا محمد یوسف خانؒ کی شخصیت اور ان کا حلم و تدبر ہے جو آزاد کشمیر میں فرقہ وارانہ تشدد کے فروغ میں رکاوٹ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مولانا موصوف کے ایثار کا بھی اس میں دخل ہے۔ اس پر سردار محمد انور خان نے ایک واقعہ سنایا کہ آزاد کشمیر میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل پر بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض سامنے آیا کہ کونسل میں بعض مسالک کی نمائندگی زیادہ ہے اور ان کی کم ہے تو اس پر حضرت مولانا محمد یوسف خانؒ نے کسی کے کہے بغیر خود اپنا استعفیٰ حکومت کو بھجوا دیا کہ جن حلقوں کو نمائندگی کم ہونے پر اعتراض ہے میری جگہ ان کے کسی بزرگ کو مقرر کر کے اعتراض دور کر دیا جائے۔ یہ مولانا موصوف کا ایثار تھا مگر کم و بیش سب حلقوں نے ان کا استعفیٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا کہ کونسل میں ان جیسی علمی و دینی شخصیت کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۱ جولائی ۲۰۰۵ء)

حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ

حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ کی وفات صرف اہل حدیث حضرات کے لیے باعث رنج و صدمہ نہیں بلکہ پاکستان کے اسلامی تشخص کے تحفظ اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد سے تعلق رکھنے والا ہر مسلمان اور ہر پاکستانی ان کی جدائی سے غمزدہ ہے۔ جن بزرگ اہل حدیث علماء کرام کے ساتھ میرا عقیدت اور نیاز مندی کا تعلق رہا ہے ان میں حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ بھی شامل ہیں۔ میں نے جب اردو لکھنا پڑھنا شروع کی تو بالکل ابتداء میں جو چند کتابیں میرے مطالعہ میں آئیں ان میں آغا شورش کاشمیری مرحوم کی ”خطبات احرار“ بھی تھی۔ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ احرار کے باقاعدہ کارکن رہے ہیں، اس لیے گھر اور اردگرد کے ماحول میں احراری رہنماؤں اور احرار کا تذکرہ عام رہتا تھا۔ اسی پس منظر میں ”خطبات احرار“ کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کا نام پہلی بار پڑھا اور عقیدت کا رشتہ جڑ گیا۔ مولانا غزنویؒ کی زیارت مجھے یاد نہیں لیکن ان کے ساتھ عقیدت و محبت

کا رشتہ تب سے استوار ہے۔

ان کے بعد مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی شخصیت نے بطور اہل حدیث اور بزرگ عالم دین میرے دل میں جگہ بنائی۔ جب صدر ایوب خان مرحوم نے ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء اٹھایا تو گوجرانوالہ میں پہلا سیاسی جلسہ میاں افتخار الدین مرحوم کی یاد میں ہوا جس کی صدارت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے کی اور اس سے دیگر مقررین کے علاوہ آغا شورش کاشمیریؒ اور شیخ حسام الدینؒ نے بھی خطاب کیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سیاسی جلسہ تھا جس میں بطور سامع شرکت کی اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی زیارت سب سے پہلے اسی جلسے میں کی، پھر اس کے بعد مختلف جلسوں میں انہیں سنا بلکہ ایک بار ارادہ کر کے ان کے پیچھے جمعہ پڑھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں، جہاں میں زیر تعلیم تھا، ہفت روزہ ”الاعتصام“ پابندی سے آتا تھا اور میں تب سے اس مجلہ کا باقاعدہ قاری ہوں کہ اس میں مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے ارشادات اور سرگرمیاں پڑھنے کو ملتیں۔ ایک بار میں اپنے بزرگ مولانا مفتی عبد الواحدؒ کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس گیا، مولانا اسماعیل سلفیؒ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد اردو بازار میں اسکول بک ڈپو پر کچھ دیر کے لیے بیٹھتے تھے۔ وہاں کرسی پر بیٹھے ہوئے ان کا سراپا ابھی تک ذہن کی اسکرین پر موجود ہے۔ اسکول بک ڈپو بھی ایک اہل حدیث عالم دین مولانا حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم کا تھا جو گکھڑ کی مسجد توحید گنج کے خطیب وامام تھے اور اردو بازار گوجرانوالہ میں اسکول بک ڈپو کے نام سے کتابوں اور اسٹیشنری کی دکان کرتے تھے۔ میرا تعلق بھی گکھڑ سے ہے، بچپن میں ان کے گھر میں ہمارا آنا جانا رہتا تھا اور ان کے بچے بھی ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ جماعت مجاہدین کے ساتھ ان کا تعلق تھا اور وہ کشمیر اور قبائل کے مجاہدین کی وقتاً فوقتاً مدد کرتے تھے اور ان کی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتے رہتے تھے۔ کافی عرصے کے بعد سردار محمد عبد القیوم خانؒ نے ایک ملاقات میں ان کا تذکرہ کیا تو مجھے بھی بہت سی باتیں یاد آگئیں اور ہم کچھ دیر تک حافظ محمد یوسف گکھڑویؒ اور ان کی جہادی سرگرمیوں کی باتیں کرتے رہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی کے ہمراہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جو مولانا حافظ محمد یوسف گکھڑویؒ نے پڑھائی تھی۔

اس فہرست میں تیسرے بزرگ اہل حدیث عالم دین مولانا عبد الغفار حسنؒ ہیں جن کے ساتھ میری پہلی ملاقات فیصل آباد میں مولانا حکیم عبد الرحیم اشرفؒ کے گھر میں ہوئی جہاں میں کبھی کبھی جایا کرتا تھا اور وہ بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے تین بزرگوں کا اپنی زندگی میں معمول دیکھا ہے کہ وہ رات کو سویا نہیں کرتے تھے، ان کی محفلیں رات گئے آباد رہتی تھیں جبکہ صبح اشراق سے فارغ ہو کر دوپہر تک ان کا

سونے کا معمول تھا۔ ان میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا سید حامد میاںؒ کے علاوہ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ بھی تھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ فیصل آباد میں کسی جلسے سے خطاب کرنے کے بعد میں نصف شب کے قریب فارغ ہو کر اسٹیج سے اترا تو دیکھا کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحبؒ کی گاڑی کھڑی ہے، انہیں کہیں سے میری آمد کا پتہ چل جاتا تھا اور وہ گاڑی بھیج دیتے تھے کہ واپسی پر ان سے مل کر جاؤں۔ وہاں حاضری ہوتی تو محفل خوب گرم ہوتی اور صبح سحری کے وقت ہی وہاں سے واپسی کی گنجائش نکلتی۔

جب مولانا عبدالغفار حسنؒ نے مجھے بتایا کہ وہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران جیل میں والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے ساتھی رہے ہیں تو تعلق و محبت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ مجھے شفقت سے نوازتے تھے اور مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سکون ملتا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں شریعت بل کی تحریک کے لیے پیش پیش حضرات میں میرا نام بھی ہے۔ اس دوران بعض دوستوں کی غلط فہمی سے فقہ حنفی اور اہل حدیث کشمکش کے حوالے سے بحث چھڑ گئی اور ایک معروف اہل حدیث جریدے میں شریعت بل کے پس منظر میں فقہ حنفی کے خلاف تند و تیز مضمون شائع ہوا۔ مولانا عبدالغفار حسنؒ کو خدشہ ہوا کہ اس مضمون کے جواب میں لکھوں گا تو بحث بڑھ جائے گی اور خواہ مخواہ تلخی میں اضافہ ہو گا تو انہوں نے مجھے بطور خاص پیغام بھجوایا کہ اس کے جواب میں آپ کچھ نہ لکھیں میں خود اس کی وضاحت کروں گا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کر کے خاموشی اختیار کر لی، پھر مولانا عبدالغفار حسنؒ نے اسی جریدے کے اگلے شمارے میں ایک مضمون کے ذریعے یہ بات سمجھائی کہ یہ حنفی اہلحدیث مسئلہ نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کا نفاذ اور شریعت کی بالادستی امت کا اجتماعی معاملہ ہے جسے فرقہ وارانہ تناظر میں دیکھنا درست نہیں ہے۔

ایک اور اہل حدیث عالم دین مولانا حکیم عبدالرحمان آزادؒ کے ساتھ مجھے کم و بیش دو عشروں تک تحریک ختم نبوت کے لیے اکٹھے کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت گوجرانوالہ ڈویژن کے امیر تھے۔ تحریک ختم نبوت کے لیے اس دوران جب بھی کوئی مشترکہ فورم تشکیل پایا میں حکیم صاحب کی ٹیم کا حصہ رہا، اکٹھے تحریکی جدوجہد کا کئی بار حظ اٹھایا، اور مل جل کر دینی جدوجہد میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ اسی طرح حضرت مولانا حافظ عبدالقادر روپڑیؒ اہل حدیث علماء کرام میں بڑے مناظر تھے اور حنفیوں کے ساتھ مناظروں میں ان کا نام سرفہرست ہوتا تھا، مگر میرے ساتھ ان کا معاملہ بھی ہمیشہ شفقت کا رہا۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں ان کے ساتھ رفاقت رہی۔ ایک بار ان سے ملاقات کے لیے دالگراں چوک کے اہل حدیث مرکز میں حاضر ہوا تو بڑی محبت سے ملے اور فرمایا کہ تم اچھی باتیں کیا کرتے ہو، کبھی کبھی آجایا کرو۔

حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ بھی اسی صف کے بزرگ تھے۔ ۱۹۸۷ء کی تحریک شریعت بل اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں ان کے ساتھ متحدہ شریعت محاذ کے سرگرم کارکن کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ حالات سے باخبر اور وقت کے تقاضوں سے آشنا بزرگ تھے، نپی تلی گفتگو کرتے تھے اور اجتماعی معاملات میں دینی موقف کی بھرپور ترجمانی کرتے تھے۔ ان کی خدمت میں بھی کئی بار حاضری کا موقع ملا اور ہر بار شفقت اور دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں بھی ایک بار ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو بہت خوش ہوئے اور بہت سے معاملات میں مشاورت ہوئی۔ ان کا ایک جملہ بہت یاد آتا ہے جو خود انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایک جگہ کسی جذباتی دوست نے ان سے سرمحفل سوال کر دیا کہ شریعت بل کے نام سے کہیں فقہ حنفی تو نافذ نہیں ہو جائے گی؟ مولانا نے اس کا جواب دیا کہ اگر ہو بھی گئی تو کیا، فقہ فرنگی سے بہتر ہوگی۔ حضرت مولانا معین الدین لکھویؒ کی وفات کی خبر پڑھ کر بزرگ اہل حدیث علماء کرام کے ساتھ اپنے تعلقات کی بہت سی باتیں ذہن میں تازہ ہوگئی ہیں جن میں سے چند ایک کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اپنے دو بے تکلف دوستوں اور ساتھیوں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ اور مولانا سید حبیب الرحمان شاہ بخاریؒ کے نام میں نے عمداً اس فہرست میں شامل نہیں کیے، انہیں کسی اور مناسب موقع کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا معین الدین لکھویؒ سمیت ان سب بزرگوں کی مغفرت فرمائے اور ان کی حسنات کو قبول کرتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء)

حضرت مولانا سید محمد محسن شاہ شہید

(تاریخ وفات: ۱۲ مئی ۲۰۱۲ء)

پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی خانقاہ یاسین زئی کے بارے میں میرا مبلغ علم اتنا ہی تھا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے بارہا اس روحانی مرکز کا تذکرہ سنا۔ اور اس کی عظمت دل میں بیٹھ جانے کے لیے اتنی بات ہی میرے لیے کافی تھی کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی نیاز مندی اور رفاقت میں میری جماعتی اور سیاسی زندگی کے کئی سال گزرے ہیں اور بحمد اللہ مجھے ان کی شفقت واعتماد کا بھرپور حصہ میسر آیا ہے۔ میں نے انہیں بے پناہ سیاسی سرگرمیوں کے دور عروج میں بھی ذاکر وشاغل اور شب زندہ دار پایا ہے جس کی بڑی وجہ اس عظیم روحانی خاندان اور مرکز کے ساتھ ان کی وابستگی بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح درہ پیزو کے جامعہ حلیمیہ کے بارے میں بھی صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ صوبہ خیبر پختون خواہ کے بڑے دینی مدارس میں سے ہے۔ وہاں ایک بار حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ مجھے بھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے اور جامعہ حلیمیہ کے مختلف متعلقین سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ اس لیے جب حضرت مولانا سید محمد محسن شاہ شہیدؒ، مہتمم جامعہ حلیمیہ کے بارے میں مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو ایک عرصہ تک تردّد رہا کہ جانتا تو کچھ ہوں نہیں لکھوں گا کیا؟ مگر اللہ تعالیٰ بھلا کرے برادر مکرم مولانا ڈاکٹر عبد الحکیم اکبری کا جنہوں نے چند ماہ قبل ڈیرہ اسماعیل خان میں حاضری کے موقع پر حضرت مولانا محمد محسن شاہؒ کے بارے میں اپنی تصنیف مرحمت فرمادی جس کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ خانقاہ یاسین زئی کا تاریخی پس منظر کیا ہے اور جامعہ حلیمیہ کا اس سے تعلق کیا ہے؟ اور یہ بات پہلی بار میرے علم میں آئی کہ حضرت مولانا سید محمد محسن شاہؒ کا تعلق خانقاہ یاسین زئی کے عظیم روحانی مرکز اور خاندان سے ہے اور جامعہ حلیمیہ بھی دراصل خانقاہ یاسین زئی کے علوم وفیوض کا مظہر ہے۔

خانقاہ یاسین زئی میں حاضری کی حسرت رہی ہے جو اب بڑھ گئی ہے جبکہ حضرت مولانا سید محمد محسن شاہؒ کی زیارت وملاقات کا وہی موقع ذہن میں محفوظ ہے جس کا تذکرہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ جامعہ حلیمیہ میں ایک بار حاضری کے حوالہ سے کر چکا ہوں۔ جماعتی پروگراموں میں اور ملاقاتیں بھی ہوئی ہوں گی مگر یاد صرف وہی ہے۔ البتہ جامعہ حلیمیہ کی تعلیمی خدمات اور خانقاہ یاسین زئی کے روحانی فیوض مختلف احباب کے ذریعہ اور متعدّد فضلاء کی صورت میں معلوم ہوتے رہتے ہیں اور اس مرکز علوم وفیوض کے لیے مسلسل دعا گو رہتا ہوں۔

ہمارے ان اکابر نے اس دور میں، جب آج جیسی سہولتیں اور وسائل تصور میں بھی نہیں آسکتی تھیں، دینی علوم اور روحانی فیوض کے فروغ کے لیے دینی مدارس اور خانقاہوں کی صورت میں جو صبر آزما محنت کی ہے وہ یقیناً ان حضرات کی کرامت شمار ہوگی جو اسلام کی صداقت وعظمت کا اظہار ہے۔ خاص طور پر برطانوی استعمار کے دورِ استبداد میں جب وہ جنوبی ایشیا میں اسلام کی ہر علامت کو ختم کر دینے کے درپے تھا، ان بزرگوں نے اپنے وجود کو مٹا کر اسلام کی عظمت کا پرچم سربلند رکھا۔ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول زمانے کی نگاہوں سے اپنی محنت اور جدوجہد کو اوجھل رکھنے کے لیے وہ چٹائیوں اور تپائیوں پر آگئے بلکہ زمین پر بچھ گئے اور اس وقت تک ''کیموفلاج'' رہے جب تک دنیا کی سازشوں کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں آگئے۔

آج کا عالمی استعمار ان مدارس اور خانقاہوں کا سامنا کرنے میں خود کو بے بس محسوس کر رہا ہے اور اس

پر اس کی جھنجھلاہٹ اب جھلاّہٹ میں بدلتی جا رہی ہے کہ وہ نہ تو ان مدارس اور خانقاہوں کو ختم کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے، نہ ہی ان پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش میں اسے کامیابی ہو رہی ہے، اور نہ ہی ان کا رخ تبدیل کرنے کے لیے اس کی کوئی سازش کامیاب ہو رہی ہے۔ یہ یقیناً حضرت مولانا سید محمد محسن شاہؒ اور ان جیسے دیگر بزرگوں کے خلوص و محنت پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلہ و ثمرہ ہے جس سے نہ صرف اس خطہ کے لوگ بلکہ دنیا بھر کے مسلمان بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اکابر کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، ستمبر ۲۰۱۴ء)

حضرت مولانا عبد الستار تونسویؒ

حضرت مولانا عبد الستار تونسویؒ بھی چل بسے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ابھی دو ہفتے قبل وہ گوجرانوالہ تشریف لائے تھے۔ ایک پروگرام میں شریک ہونے کے بعد جامعہ نصرۃ العلوم میں آرام فرمایا۔ میں صبح اسباق کے لیے مدرسہ میں پہنچا تو طلبہ نے بتایا کہ حضرت تونسویؒ صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں اور مہمان خانے میں آرام فرما رہے ہیں۔ اسباق سے فارغ ہو کر میں مہمان خانے میں گیا تو وہ لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے تھے مگر جاگ رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا، مصافحہ کیا اور دعا کی درخواست کر کے واپس پلٹ گیا تاکہ ان کے آرام میں زیادہ خلل نہ آئے۔ دورہ حدیث کے طلبہ نے فرمائش کی کہ حضرت تونسوی صاحبؒ انہیں اپنی سند کے ساتھ حدیث روایت کرنے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ میں نے مولانا حاجی فیاض خان سواتی سے کہا کہ وہ مناسب موقع دیکھ کر حضرتؒ سے درخواست کر دیں اور گھر واپس آ گیا۔ یہ معلوم ہوتا کہ یہ حضرت تونسویؒ سے میری آخری ملاقات ہے تو شاید انہیں کچھ دیر کے لیے بے آرام بھی کر لیتا، مگر یہ علم اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے پاس ہی رکھا ہے کہ کس کی زندگی نے کب اور کہاں اس کا ساتھ چھوڑ جانا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

حضرت علامہ عبد الستار تونسویؒ کی زیارت پہلی بار غالباً طالب علمی کے دور میں قلعہ دیدار سنگھ کی مدینہ مسجد کے سالانہ اجلاس میں ہوئی تھی جہاں وہ اور "تنظیم اہل سنت" کے دیگر قائدین حضرت مولانا دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا قائم الدین عباسیؒ اور دیگر حضرات تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کے بعد گزشتہ نصف صدی کے دوران متعدّد مجالس اور پبلک جلسوں میں ان سے ملاقات رہی۔ مختلف تحریکات میں ان

کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا اور بہت سے مواقع پر ان سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اہل سنت کے عقائد و مسلک کے تحفظ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے ناموس و وقار کی سربلندی کے لیے حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کی جدوجہد اور خدمات اس حوالہ سے تاریخ کے ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے لکھنو میں بیٹھ کر جو ہمیشہ اہل تشیع کا گڑھ رہا ہے، اہل سنت کے عقائد کا پرچار کیا، حضرات صحابہ کرامؓ کی عزت و ناموس کا پرچم بلند کیا، سنی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا اور اس مشن کے لیے برصغیر کے طول و عرض سے تعلق رکھنے والے ہزاروں علماء کرام کی تربیت کر کے انہیں تیار کیا۔ میرے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ بھی حضرت لکھنویؒ کے شاگردوں میں سے ہیں بلکہ ان کی وساطت سے ہماری سند حدیث ”علماء فرنگی محل“ کے ساتھ متّصل ہو جاتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جن علماء کرام نے حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کے اس مشن کو ان کے سکھائے ہوئے طرز اور اسلوب کے مطابق سنبھالا اور مسلسل محنت کر کے اسے ایک مستقل تحریک کی حیثیت دی ان میں حضرت مولانا عبد الستار تونسویؒ، حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ، حضرت مولانا دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا قائم الدین عباسیؒ، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ اور حضرت مولانا عبد الحئی جام پوریؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ملتان میں تنظیم اہل سنت کے عنوان سے مرکز قائم کیا۔ ایک دور میں ”دعوت“ کے نام سے تنظیم اہل سنت کا مستقل جریدہ حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے جس نے اس مشن اور محاذ کے لیے دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ سرکردہ علماء کرام کے اس عظیم قافلہ کے ساتھ اس محاذ کے ایک اور عظیم مجاہد سردار احمد خان پتافیؒ اور ان کے علاوہ شاعر اہل سنت خان محمد کمتر مرحوم کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی کی بات ہو گی جن کی خدمات اس حوالہ سے بہت نمایاں ہیں۔

حضرت مولانا عبد الستار تونسویؒ کے تین بڑے محاذ تھے، وہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اختلافی مسائل پر مباحثہ کے لیے اپنے وقت کے سب سے بڑے سنی مناظر تھے اور انہوں نے اس محاذ پر بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ وہ پبلک جلسوں میں ناموس صحابہؓ اور عقائد اہل سنت کے اثبات و دفاع میں ایک کامیاب خطیب تھے جن کے محققانہ خطبات ہزاروں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے ہیں اور دینی

مدارس کے اساتذہ وطلبہ کو سنی شیعہ تنازعات پر مناظرہ کی تیاری کرانا اور سنی کاز کے لیے محنت کرنے کی تربیت دینا ان کا خصوصی مشغلہ تھا جس میں وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مصروف رہے ہیں اور ان کے تربیت یافتہ ہزاروں علماء کرام نہ صرف پاکستان بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

ان کا سیاسی تعلق ہمیشہ جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ رہا ہے اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور دیگر اکابر جمعیۃ کے ساتھ ان کا مسلسل ربط وتعلق تھا۔ انہوں نے اپنے محاذ اور مشن کے ساتھ ساتھ تحریک تحفظ ختم نبوت، تحریک نفاذ شریعت، تحریک تحفظ ناموس رسالتؐ اور دیگر دینی تحریکات میں بھی متحرک کردار ادا کیا اور ان تحریکوں کی بھرپور سرپرستی کی۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے ساتھ ان کا گہرا تعلق تھا اور ان بزرگوں کی باہمی محبت وشفقت کے بہت سے مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کا تربیت یافتہ یہ قافلہ ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہو گیا ہے اور ان کے اسلوب وطرز کے حوالہ سے پیدا ہونے والا یہ عظیم خلا ہم جیسے حساس کارکنوں کو زندگی بھر پریشان کرتا رہے گا۔ ان میں سے اب صرف حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ حیات ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں اور حضرت تونسویؒ کی خدمات کو قبولیت سے نوازتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ

جمعرات کو نمازِ مغرب کے بعد مری کے قریب ایک تعلیمی مرکز میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا ان کی فرمائش پر اپنے دورِ طالب علمی کے کچھ واقعات کا تذکرہ کر رہا تھا اور استاذِ محترم حضرت عبد القیوم ہزارویؒ کا تذکرہ زبان پر تھا، میں دوستوں کو بتا رہا تھا کہ جن اساتذہ سے میں نے سب سے زیادہ پڑھا اور بہت کچھ سیکھا ہے ان میں حضرت والد مکرم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے بعد تیسرے بڑے استاذ حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ ہیں اور اس حوالہ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ میری ذہن سازی اور تربیت میں مسلک کے دائرے میں حضرت والدِ محترمؒ اور فکری محاذ پر حضرت مولانا صوفی عبد

الحمید سواتیؒ اور حضرت مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ میں ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ مجلس میں موجود ایک دوست کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی وہ اٹھ کر باہر گئے اور واپس آکر بتایا کہ استاذِ محترم مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جنازہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ کل جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد ان کے گاؤں تمبر کھولا میں ادا کی جائے گی جو مانسہرہ سے آگے ہے، جمعۃ المبارک کی وجہ سے نماز جنازہ میں شرکت سے محروم رہا۔ البتہ نماز مغرب کے بعد گکھڑ میں حضرت والدِ محترمؒ کی مسجد میں ہفتہ وار درس کے دوران استاذِ محترم حضرت مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ، حضرت مولانا عبدالمجید دین پوریؒ اور حضرت مولانا قاری عبدالحیٔ عابدؒ کی دینی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت کی سعادت حاصل کی۔

حضرت مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے آغاز سے ہی حضرت صوفی صاحبؒ کے رفیقِ کار تھے اور ہمارے طالب علمی کے دور میں حضرات شیخینؒ کے ساتھ وہ تیسرے بڑے استاذ کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے چار عشروں سے زیادہ عرصہ تک مسلسل نصرۃ العلوم میں تدریسی خدمات سر انجام دیں، میں نے زرّادی اور انجانی سے لے کر دورۂ حدیث میں ابوداؤد شریف تک مختلف فنون کی بہت سی کتابیں ان سے پڑھی ہیں، معقولات کے اونچے درجے کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، مزاج کے سخت تھے اور عبارت وغیرہ میں نرمی اور کمزوری برداشت نہیں کرتے تھے اس لیے ان کے سبق میں خاصی تیاری کر کے بیٹھنا پڑتا تھا۔ ابتداء میں ان کا طرز اُنّھی والے استاذ حضرت مولانا ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ والا ہوتا تھا، طالب علم کو خود مطالعہ کر کے اور سبق حل کر کے آنا ہوتا تھا، استاذ صرف سنتے تھے اور اگر کوئی بات ضروری ہوتی تو وضاحت کر دیتے تھے۔ میں نے نور الانوار سمیت بہت سی کتابیں اس طرز پر ان سے پڑھی ہیں، وہ کتاب پڑھانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی ذہن سازی کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ سیاسی طور پر حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ سے زیادہ قریب تھے اور زندگی بھر اسی فکر پر رہے۔ دینی اور روحانی حوالہ سے شیرانوالہ لاہور اور حضرت درخواستیؒ کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔
حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے ساتھ ان کی اکثر و بیشتر معاملات میں ذہنی ہم آہنگی ہوتی تھی، ایک دور میں مجلس احرار اسلام اور مجلس تحفظ ختم نبوت میں عملی طور پر متحرک رہے، جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم نو میں شریک تھے اور ایک مرحلہ میں شہر کے امیر بھی رہے ہیں۔

صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں ان کی آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد اور ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کی فکری بے روی کے خلاف جمعیۃ علماء اسلام کی تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ متحدہ حزب

اختلاف کے زیر اہتمام شیرانوالہ باغ میں ہونے والے اس عوامی جلسہ کی صدارت انہوں نے ہی کی تھی جس پر پولیس نے پہلے آنسو گیس پھینکی اور پھر فائرنگ کی تھی، اس فائرنگ میں غالباً دو نوجوان شہید ہوئے تھے اور گوجرانوالہ ایوبی آمریت کے خلاف عوامی تحریک کا اہم مرکز بن گیا تھا۔

یحییٰ خان کے مارشل لاء کے آغاز میں انہوں نے مسجد فاروقیہ پونڈانوالہ میں خطبۂ جمعہ کے دوران قادیانیوں کی تردید کی جس کے نتیجے میں وہ مارشل لاء کے تحت گرفتار ہوئے، اس کے علاوہ تحریک ختم نبوت کے دوران بھی گرفتار ہوئے اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں وہ اس دور میں پورے جوش وجذبہ کے ساتھ سرگرم حصہ لیتے رہے جس دور میں کسی خطبہ یا تقریر میں قادیانیوں کا نام لینا بھی قانونی جرم سمجھا جاتا تھا اور اس پر مقدمہ درج ہو جایا کرتا تھا۔

استاذِ محترمؒ جامع مسجد فاروقیہ پونڈانوالہ کے ایک عرصہ تک خطیب رہے ہیں اور ان کے دور میں یہ مسجد مسلکی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک ختم نبوت اور دیگر دینی تحریکات کا بھی مورچہ ہوتی تھی۔ صدر یحییٰ خان کے مارشل لاء میں خطبہ جمعۃ المبارک کے دوران قادیانیوں کے خلاف تقریر کے بعد وہ گرفتار ہوگئے تو حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ نے مجھے طلب فرمایا کہ مولانا عبدالقیومؒ گرفتار ہوگئے ہیں، اب اگر اگلے جمعہ پر اس مسجد میں قادیانیوں کے بارے میں کوئی بات نہ ہوئی تو اسے ہماری کمزوری سمجھا جائے گا اور اگر تقریر کرنے کے بعد دوسرا خطیب بھی گرفتار ہوگیا تو یہ سلسلہ تحریک کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس کا ابھی موقع مناسب نہیں ہے۔ اس لیے یہ جمعہ مسجد فاروقیہ میں تم نے پڑھانا ہے، اس طرح کہ ختم نبوت پر بات بھی پوری ہو اور گرفتاری کی صورت بھی نہ بنے۔ میں اس وقت نصرۃ العلوم میں غالباً موقوف علیہ کے درجہ کا طالب علم تھا، حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم پر میں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور میں اسے حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کی چند صحبتوں کا فیضان سمجھتا ہوں کہ عقیدۂ ختم نبوت پر ایک گھنٹہ خطاب کے باوجود گرفتاری سے محفوظ رہا۔ سی آئی ڈی میں ہمارے ایک دوست سید مہتاب علی شاہ مرحوم ہوتے تھے انہوں نے بعد میں ایک موقع پر بتایا کہ محکمہ پولیس کے مقدمات کے انچارج پی ڈی ایس پی نے تین مرتبہ ٹیپ ریکارڈر سے آپ کی تقریر سنی ہے لیکن وہ کوئی ایسی بات تلاش نہیں کر سکے جسے مقدمہ کی بنیاد بنایا جا سکے۔ یہ بات میں نے تحدیث نعمت کے لیے عرض کی ہے اور یہ بات بتانے کے لیے لکھی ہے کہ ہمارے بزرگ بالخصوص حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ ہمیں اس بات کی تلقین کرتے تھے اور تربیت دیا کرتے تھے کہ اپنی بات صحیح طریقہ سے پوری بیان کرنا تو ضروری ہے لیکن پکڑے جانا ضروری نہیں ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، ملک میں نفاذِ شریعت اور دیوبندی مسلک کے فروغ و تحفظ میں حضرت

مولانا عبد القیوم ہزارویؒ اس دور میں ہمارے لیے راہ نما اور رہبر کی حیثیت رکھتے تھے اور میری سیاسی و تحریکی زندگی کا آغاز ان کی انگلی پکڑ کر ہوا تھا۔

بعد میں جمعیۃ علماء اسلام کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کی وجہ سے جن کا اظہار وہ کھلم کھلا کرتے تھے وہ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتے گئے جبکہ میری پیش رفت جاری رہی، وہ مجھے بھی سمجھایا کرتے تھے اور کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتے تھے جسے میں ان کا بزرگانہ حق سمجھ کر خاموشی کے ساتھ سن لیا کرتا تھا۔ مجھے مزاج اور ڈیلنگ کے حوالے سے بہت نرم سمجھا جاتا ہے اور کسی حد تک میں ہوں بھی، لیکن موقف اور پالیسی کے معاملہ میں ہمیشہ بے لچک رہا ہوں، سنتا سب کی ہوں مگر کرتا وہی ہوں جسے صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں، اور اسے بھی استاذِ محترم حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ کے فیض کا حصہ سمجھتا ہوں۔ کافی عرصہ سے علیل تھے لیکن اس کے باوجود جامعہ محمدیہ چائنہ چوک اسلام آباد میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کئی سال تک انہوں نے تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہاں کئی بار ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ گزشتہ سال رمضان المبارک سے قبل مانسہرہ کے ایک سفر کے دوران تمبر کھولا حاضری ہوئی، ملاقات و زیارت کے ساتھ ساتھ ان کی دُعا اور شفقت سے بھی شاد کام ہوا۔ آج وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن ان کا فیض اور یادیں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کے صدقات جاریہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور جامعہ محمدیہ اسلام آباد کے علاوہ ان کے ہزاروں شاگردوں کی صورت میں ان کے ذخیرۂ آخرت میں اضافے کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۰ فروری ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اخترؒ

حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمہ اللہ تعالیٰ ملک کے بزرگ صوفیاء کرام میں سے تھے جن کی ساری زندگی سلوک و تصوف کے ماحول میں گزری اور ایک دنیا کو اللہ اللہ کے ذکر کی تلقین کرتے ہوئے طویل علالت کے بعد گزشتہ ہفتے کراچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا روحانی تعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقہ کے تین بڑے بزرگوں حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ، حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوریؒ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق آف ہردوئیؒ سے تھا۔ وہ ان بزرگوں کے علوم و فیوض کے امین تھے اور زندگی بھر ان فیوض و برکات کو لوگوں میں تقسیم کرتے

رہے۔ ان کا حلقۂ ارادت پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے باہر جنوبی افریقہ، برطانیہ اور دیگر ممالک تک وسیع تھا اور بلا مبالغہ لاکھوں مسلمانوں نے ان سے روحانی استفادہ کیا۔ علماء کرام کی ایک بڑی تعداد ان سے بیعت تھی اور انہیں اہل علم کے مرجع کا مقام حاصل تھا۔

مجھے مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ہمراہ لندن کی بالہم مسجد میں ایک بار ان کی صحبت میں حاضری کا اتفاق ہوا تھا اور اس مجلس کی تروتازگی اور بہار ابھی تک ذہن میں نقش ہے۔ باغ و بہار شخصیت تھے، سخن فہمی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا کمال بھی رکھتے تھے اور باذوق صوفیاء کرامؒ کی طرح انہیں محبت الٰہی اور عشق رسولؐ کے حوالہ سے دلی جذبات کی تپش کو اشعار کی صورت میں ڈھالنے کا بھرپور ذوق اور ملکہ حاصل تھا۔ گلشن اقبال کراچی میں ایک بڑی دینی درسگاہ اور خانقاہ قائم کی جہاں سے ہزاروں علماء کرام نے علمی و روحانی فیض حاصل کیا۔ اب ان کے فرزند جانشین مولانا حکیم محمد مظہر صاحب اس مرکز کا نظام چلا رہے ہیں اور اپنے عظیم باپ کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لاہور میں اس خانقاہ کی شاخ چڑیا گھر کی مسجد میں مصروف عمل ہے اور ہمارے محترم دوست ڈاکٹر عبدالمقیم اپنے شیخؒ کی روحانی برکات لوگوں میں بانٹ رہے ہیں۔

ہماری دینی اور معاشرتی زندگی میں خانقاہ کا ایک مستقل مقام اور نظام ہے جہاں سے لوگوں کو روحانی فیض، اللہ اللہ کے ذکر کی تلقین اور محبت رسولؐ کی حلاوت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی سکون بھی ملتا ہے۔ اگرچہ دوسرے بہت سے اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی کمرشل ازم سے بہت متاثر ہوا ہے لیکن شاہ حکیم محمد اخترؒ جیسے باخدا بزرگوں کی صورت میں قدرت ایزدی نے اس عظیم ادارے کی آبرو اور بھرم کو قائم رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت حکیم صاحبؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے لگائے ہوئے علمی و روحانی گلشن کو ہمیشہ آباد رکھیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا علاء الدینؒ

حضرت مولانا علاء الدین نور اللہ مرقدہ کی وفات کی خبر ہمیں دہلی میں ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ تعالیٰ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ اسی جگہ مجھے وفد میں شامل مولانا حافظ عبد القیوم نعمانی نے بتایا کہ استاذ علاء الدین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، انہیں ٹیلی فون رابطہ کے ذریعہ یہ خبر ملی تھی۔ خبر سن کر سب احباب غم زدہ ہو گئے اور زبانوں سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا۔

حضرت مولانا علاء الدینؒ ہمارے پرانے بزرگوں میں سے تھے۔ سو سال کے لگ بھگ عمر پائی ہے اور ساری زندگی دینی علوم کی تعلیم و تدریس میں گزاری ہے۔ ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث کر کے فراغت حاصل کی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے، ان کے بھائی حضرت مولانا سراج الدینؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں سے تھے۔ دونوں بھائیوں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں مدرسہ نعمانیہ کی بنیاد رکھی جو ہمیشہ دینی تحریکات اور مسلکی و جماعتی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے سلسلہ میں جب تک میرا آنا جانا ڈیرہ اسماعیل خان میں رہا، مدرسہ نعمانیہ ہی میری سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا اور دونوں بزرگوں کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتا تھا۔ دارالعلوم نعمانیہ کے سالانہ اجتماعات میں سالہا سال تک حاضری اور گفتگو کا موقع حاصل ہوتا رہا۔ مولانا علاء الدین جمعیۃ علماء اسلام کے سینئر راہ نماؤں میں سے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ساتھیوں اور اصحاب مشاورت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تجربہ کار اور کہنہ مشق استاذ تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد مختلف ممالک میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ قومی اور مسلکی مسائل میں ان کی رائے چچی تلی اور دو ٹوک ہوتی تھی اور ہمیشہ ان سے صحیح سمت راہ نمائی ملتی تھی۔

ان کی وفات بلاشبہ اہل علم و دین کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے جبکہ میرے لیے تو یہ ذاتی صدمہ بھی ہے کہ وہ میرے چند دعاگو بزرگوں میں سے تھے۔ ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے اور حوصلہ افزائی کے انداز میں تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور برادرم مولانا اشرف علی سمیت تمام پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اپنے عظیم بزرگ کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا محمد نافعؒ

گزشتہ ماہ کے دوران ایک غمناک خبر نے سب کو رنجیدہ کر دیا کہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد نافعؒ کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علمی دنیا انہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی ترجمان اور صحابہ کرامؓ کے ناموس و وقار کے تحفظ کی علامت کے طور پر جانتی ہے۔ وہ امام اہل السنۃ حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کے اس علمی قافلہ کے ایک فرد تھے جنہوں نے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کے فروغ و تحفظ اور حضرات صحابہ کرام واہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کی حیات و خدمات کی اشاعت اور ان کے بارے میں معاندین کی

طرف سے مختلف ادوار میں پھیلائے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے جواب و دفاع میں مسلسل جدوجہد کی ہے۔ ان میں حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت علامہ دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا قائم الدین عباسیؒ، حضرت مولانا عبدالحئ جام پوریؒ، اور حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں، جبکہ اس قافلہ کے غالباً آخری فرد حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود دامت برکاتہم کچھ عرصہ سے علیل اور صاحب فراش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور حضرت علامہ صاحب کو صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا محمد نافع جھنگویؒ والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کے دورۂ حدیث کے ساتھیوں میں سے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے۔ میرا ان سے استفادہ کا تعلق تو طالب علمی کے دور سے تھا کہ ان کی بہت سی تصانیف بالخصوص "رحماء بینہم" اور حضرت علامہ خالد محمود مدظلہ کے متنوع مضامین کا مجموعہ "عبقات" اس قسم کے مسائل میں میرے لیے راہ نمائی کا سب سے بڑا ذریعہ چلے آرہے ہیں، مگر ایک بار مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی معیت میں چنیوٹ کے چند علماء کرام کے ساتھ جامعہ محمدی شریف میں حضرت مولانا محمد نافعؒ کی خدمت میں حاضری دی تو ان سے تلمذ کا شرف اور ان کی سند کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت کی سعادت بھی ہم لوگوں نے حاصل کی۔ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہتا تھا۔ وہ شفقتوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی کسی تازہ تصنیف سے بھی نوازتے تھے، اور کوئی نہ کوئی مسئلہ یا حوالہ بھی ان سے مل جایا کرتا تھا۔

ایسے بزرگوں کی وفات پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یرفع اللہ العلم بقبض العلماء کی عملی تصویر تو ذہن میں پھر سے تازہ ہو جاتی ہے، مگر اس خلا کو مسلسل بڑھتے دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مشیت ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہے، اللہ تعالیٰ حضرت استاذ محترمؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے تلامذہ و متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲ جنوری ۲۰۱۵ء)

حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی قدس سرہ العزیز کا سانحۂ ارتحال پورے ملک کے دینی، علمی اور مسلکی حلقوں کے لیے بے پناہ رنج و غم اور صدمہ کا باعث بنا ہے۔ وہ ملتان میں وفاق

المدارس العربیہ کے سیمینار سے خطاب کر رہے تھے کہ اجل کا بلاوا آگیا اور وہ اپنے ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ حضرت مولانا مفتی عبد الخالقؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے اور انہیں اپنے استاذ محترم کے ساتھ اس مماثلت کا اعزاز بھی مل گیا ہے کہ علماء کرام کے اجتماع میں مدارس دینیہ کے تحفظ اور دینی اقدار کی سربلندی کی صدا لگاتے ہوئے ان کا انتقال ہوا۔

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانویؒ کا شمار ملک کے نامور اساتذہ میں ہوتا تھا اور وہ صرف استاذ نہیں بلکہ ”استاذ گر“ تھے کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے سینکڑوں علماء کرام ملک کے طول وعرض میں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں دینی علوم کی تدریس و ترویج اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ جامعہ باب العلوم کہروڑپکا ان کا مستقل صدقہ جاریہ ہے اور وہ ایک شیخ کامل کے طور پر علماء کرام، طلبہ اور دیگر عقیدت مندوں کی روحانی تربیت میں بھی مصروف رہتے تھے۔ دینی تحریکات میں انہوں نے ہمیشہ سرپرست اور مربی کا کردار ادا کیا۔ تحریک ختم نبوت میں تو وہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر کی حیثیت سے قائد کا درجہ رکھتے تھے، مگر تحفظ ناموس صحابہؓ اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کے کارکن بھی ان کی سرپرستی، دعاؤں اور راہ نمائی سے مسلسل فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت مولانا خواجہ خان محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کے بعد تحریک ختم نبوت کی قیادت کے لیے ان کا چناؤ ملک بھر کے دینی حلقوں کے اعتماد کا آئینہ دار تھا۔ مسلکی طور پر متصلب دیوبندی تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں مسلکی معاملات میں حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کو سند سمجھتا ہوں اور انہی کے موقف اور تعبیرات کو اختیار کرتا ہوں۔

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانویؒ کی وفات ملک بھر کے اہل دین کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے مگر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اپنے سربراہ اور امیر سے محروم ہوگئی ہے۔ پرانی وضع اور طرز کے علماء کرام جو اپنے مزاج اور انداز کار میں اپنے اکابر اسلاف کی یاد تازہ رکھے ہوئے تھے، اب کم ہوتے جا رہے ہیں اور ماضی قریب میں حضرت مولانا محمد نافع جھنگویؒ اور حضرت مولانا عبد المجید لدھیانویؒ کی وفات نے اس خلا بلکہ گھاؤ کو مزید گہرا کر دیا ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، حضرت مولانا قاضی عبد الکریم آف کلاچی، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، اور ان جیسے چند بزرگ باقی رہے گئے ہیں جن کا وجود غنیمت ہے اور جن کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و

عافیت کے ساتھ ملک وقوم کو تادیر اپنے فیوض سے مستفید کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ فروری ۲۰۱۵ء)

حضرت مولانا قاضی عبدالکریم کلاچویؒ

(۱)

حضرت مولانا قاضی عبدالکریم آف کلاچیؒ کا انتقال علمی ودینی حلقوں کے لیے غم وصدمہ کا باعث ہے اور بلاشبہ ہم ایک مخلص بزرگ اور مدبر راہ نما سے محروم ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے والد گرامی حضرت مولانا قاضی نجم الدین کلاچویؒ اپنے دور کے بڑے علماء کرام میں سے تھے اور علمی ودینی دنیا میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے فتاوٰی ''نجم الفتاوٰی'' کے عنوان سے کتابی شکل میں موجود ہیں اور علماء کرام کے لیے راہ نمائی اور استفادہ کا اہم ذریعہ ہیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالکریمؒ دارالعلوم دیوبند کے پرانے فضلاء میں سے تھے۔ انہوں نے غالباً ۱۹۳۸ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تلمذ حاصل کر کے دورۂ حدیث کیا تھا، جبکہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا قاضی عبداللطیفؒ ۱۹۴۲ء میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے تھے اور اسی سال میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے بھی فراغت حاصل کی تھی۔

میں نے دونوں بھائیوں کو ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے دوران پہلی بار جمعیۃ علماء اسلام میں متحرک دیکھا تھا جو میرا ابتدائی دور تھا۔ اور یہ دونوں بزرگ جمعیۃ کے اہم راہنماؤں اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقہ میں حضرت مولانا علاء الدینؒ، حضرت مولانا قاضی عبدالکریمؒ، حضرت مولانا قاضی عبداللطیفؒ، حضرت مولانا قاضی عطاء اللہ آف ٹانکؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالقدوسؒ اس وقت کے بڑے جماعتی بزرگ شمار ہوتے تھے اور ان سب سے میری نیاز مندی ایک کارکن کے طور پر اس وقت سے قائم تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور کلاچی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شورٰی کے اجلاسوں میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی اور جماعتی امور میں نیازمندانہ رفاقت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ مولانا قاضی عبدالکریمؒ نکتہ رس اور صاحب الرائے بزرگ تھے اور علمی وسیاسی اجلاسوں میں ان کی رائے ہمیشہ وقیع ہوتی تھی جسے توجہ سے سنا جاتا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ جمعیۃ کے مرکزی اجلاسوں کا لازمی حصہ رہے مگر بعد میں بوجوہ غیر متحرک ہوتے چلے گئے۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا قاضی عبد اللطیفؒ جمعیۃ کی مرکزی قیادت کا متحرک حصہ بن گئے تھے اور بڑے بھائی ہر اجلاس میں شرکت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کو حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے رفقاء میں سینئر معاون کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ جماعتی سیاست کے ساتھ ساتھ بعد میں پارلیمانی سیاست کا بھی اہم کردار بن گئے تھے۔ بالخصوص حضرت مولانا سمیع الحق کے ساتھ سینٹ میں شریعت بل پیش کرنے پر انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے وقت مرکزی ناظم کے طور پر ان کے نائبین میں حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ، حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، حضرت مولانا غلام ربانیؒ آف رحیم یار خان، حضرت مولانا نیاز محمدؒ آف زیارت بلوچستان، اور راقم الحروف متحرک تھے۔

مولانا قاضی عبد الکریمؒ بعض علمی امور پر اپنی منفرد رائے رکھتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اسمبلی میں غیر مسلموں کی نمائندگی کے حق میں نہیں تھے، ان سے اس مسئلہ میں متعدّد بار میری بھی گفتگو ہوئی۔ ان کا موقف تھا کہ ایک اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ میں کسی غیر مسلم کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں ہے، جبکہ ہمارا موقف یہ تھا کہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے غیر مسلموں کو اسمبلی میں نمائندگی دی جا سکتی ہے۔

افغانستان میں طالبان حکومت کے دوران میں نے ایک موقع پر رائے دی کہ طالبان راہ نماؤں کو اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے پاکستان میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے علماء کرام کی علمی و فکری جدوجہد اور اس سلسلہ میں سرگرم سرکردہ علماء کرام کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور علمی و فکری محاذ کے ہوم ورک سے استفادہ کرنا چاہیے۔ خاص طور پر علماء کے ۲۲ نکات اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کو اپنے ہاں دستوری بنیاد بنانا چاہیے۔ میں اس رائے پر اب بھی قائم ہوں اور اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں، مگر ایک بار میں نے اس رائے کا تفصیل کے ساتھ کسی مضمون میں اظہار کیا تو مولانا قاضی عبد الکریمؒ نے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا کہ ”کیوں طالبان قائدین کو بھی ہمارے جیسی عادتیں ڈالنا چاہتے ہو“۔ سچی بات ہے کہ اپنے موقف پر اصولی طور پر قائم رہتے ہوئے بھی مجھے حضرت قاضی صاحبؒ کی یہ پر خلوص بات اپیل کر گئی اور میں اپنی رائے کے اظہار میں محتاط ہو گیا۔

حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ ان بزرگوں میں سے تھے جو علم و حکمت کے ساتھ فکر و دانش سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے اور حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ میں نے کئی بار کلاچی میں ان کی خدمت میں حاضری دی ہے اور علمی و فکری استفادہ کے ساتھ ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے ہمیشہ فیض

یاب ہوا ہوں۔ اللہ رب العزت ان کے درجات جنت میں بلند فرمائیں اور برادرم مولانا قاضی محمد نسیم کلاچوی اور دیگر رفقا، تلامذہ اور اہل خاندان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳ اگست ۲۰۱۵ء)

(۲)

حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ اور ان کے بھائی حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کو ملک کی دینی تحریکات اور جماعتی زندگی میں منفرد مقام اور شناخت حاصل ہے۔ وہ اپنے علاقہ میں تو اکابر علماء دیوبند کی روایت و مسلک کے پرچارک تھے ہی، انہیں اہل حق کی ترجمانی اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں ملکی سطح پر بھی بھرپور کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی تگ و دو کو دینی تحریکات کی تاریخ میں ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔ مجھے مولانا قاضی عبد الکریمؒ کی زیارت کا شرف سب سے پہلے ۶۷ یا ۶۸ء میں ملا جب میں ڈیرہ اسماعیل خان کی تاریخی شریعت کانفرنس میں شرکت کے لیے وہاں گیا۔ یہ کانفرنس حق نواز پارک میں ہوئی اور مجھے اس جلوس کے بہت سے مناظر اور لطیفے اب بھی یاد ہیں جس کا ڈیرہ والوں نے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ اور دیگر اکابرین کے استقبال کے لیے اہتمام کیا تھا۔ اور یہ سعادت بھی میرے ذہن کے ایک کونے میں محفوظ ہے کہ اس کانفرنس کے منتظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمودؒ خود تھے۔ میں کانفرنس سے ایک روز قبل سیدھا حق نواز پارک پہنچا جو اس وقت میونسپل پارک کہلاتا تھا۔ مفتی صاحبؒ پارک کے وسط میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ اچھا ہوا کہ وقت پر آ گئے ہو، ہم نے تو ابھی تک کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ ہی نہیں لکھا۔ اس لیے تم پہلا کام یہی کرو کہ خطبہ استقبالیہ لکھ دو۔ خواجہ محمد زاہد مرحوم میرے ساتھ تھے ان کے ذمہ لگایا کہ رات ہی رات اسے طبع کرانے کا اہتمام کرو۔ میں نے فوری طور پر یہ خدمت سرانجام دی۔ اور جمعیۃ ہی کے ایک بزرگ شیخ عزیز الرحمان مرحوم کا پریس رات کو کھلوا کر اسے چھپوایا گیا۔

قاضی صاحبان کا تذکرہ تو ہفت روزہ ترجمان اسلام میں پڑھتا ہی رہتا تھا مگر پہلی ملاقات کا موقع یہی یاد ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی آئین شریعت کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کی ملاقاتوں اور خلوت و جلوت کی صحبتوں کو شمار کرنا تو کجا ان کا اندازہ لگانا چاہوں تو وہ بھی میرے بس کی بات نہیں ہے۔

حضرت مولانا قاضی عبد الکریمؒ نکتہ رس مدرس اور نکتہ شناس دانشور تھے۔ زندگی بھر درس و تدریس، افتاء و ارشاد اور تربیت و سلوک کے ماحول میں گزری۔ لیکن ملکی و قومی معاملات اور دینی تحریکات کے

متنوع تقاضوں پر اظہار خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ صاحب مطالعہ اور تجزیہ و تبصرہ کے عمدہ ذوق سے بہرہ ور تھے۔ جن دنوں ملک میں سنی شیعہ کشیدگی عروج پر تھی میں نے اس کشمکش کے تاریخی پس منظر اور معروضی حالات کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا جو اس وقت کے اخبارات کے علاوہ ماہنامہ الشریعہ میں بھی شائع ہوا تھا، حضرت قاضی صاحبؒ نے ایک ملاقات میں اس پر بے حد خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ تم نے ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی کر دی ہے اور اس کی اشاعت بھی خوب ہوئی ہے۔

میں نے ایک مضمون میں افغان طالبان کی قیادت سے یہ عرض کیا کہ وہ نفاذ اسلام کے لیے پاکستان میں قرارداد مقاصد اور علماء کرام کے ۲۲ متفقہ نکات سے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات تک کے عمل سے استفادہ کریں اور جو سرکردہ حضرات پاکستان میں سیاسی اور عدالتی شعبوں میں نفاذ اسلام کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں ان سے راہ نمائی حاصل کریں۔ اس پر حضرت قاضی صاحبؒ نے مجھے خط لکھا کہ ”انہیں اپنی نہج پر کام کرنے دو، انہیں ہمارے والی عادتیں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟“ قاضی صاحبؒ کے اس درد بھرے جملہ میں معانی کا ایک جہان آباد ہے۔ میری رائے تو تبدیل نہیں ہوئی اور اب بھی وہی ہے مگر حضرت قاضی صاحبؒ کے اس درد دل نے اس قدر متاثر کیا کہ جب بھی موقع ملتا ہے مختلف محافل میں اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کا علاقہ تقسیم ہند سے قبل جمعیۃ علماء ہند کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور یہاں سے صوبائی اسمبلی کا ایک رکن بھی جمعیۃ کی حمایت سے کامیاب ہوا تھا۔ اس لیے تحریک پاکستان کے موقع پر صوبہ سرحد میں جو ریفرنڈم ہوا اس میں اس علاقہ کے بارے میں خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ حضرت مولانا قاضی عبدالکریمؒ نے ایک موقع پر بتایا کہ اس خطرہ کے پیش نظر پیر صاحب آف مانکی شریفؒ کی تجویز و تحریک پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خود صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ وہ ہمارے بھی استاذ محترم تھے چنانچہ ان کے حکم پر اور ان کی وجہ سے ہم ان کے اکثر شاگرد ان کے ساتھ ہو گئے جس سے صوبہ سرحد میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی گئی۔ حضرت قاضی صاحبؒ ابتداء میں جمعیۃ علماء اسلام کے لیے خاصے متحرک تھے اور غالباً ایک موقع پر جمعیۃ علماء اسلام ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلعی امیر اور صوبائی نائب امیر بھی رہے۔ مگر بعد میں گوشہ نشین ہو گئے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ جمعیۃ کی قیادت کی صف اول تک پہنچ گئے تھے۔ یہ صورتحال خود ہمارے ہاں بھی پیش آئی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک بار گکھڑ کا سفر کر کے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے کہا، جو اس وقت جمعیۃ کے ضلعی امیر تھے، کہ آپ جمعیۃ کی قیادت کے لیے آگے آئیں اور صف اول میں ہمارے ساتھ شریک ہوں۔

حضرت والد محترمؒ نے جواب میں فرمایا کہ میرے استاذ محترم مولانا مفتی عبدالواحدؒ جمعیۃ کے مرکزی ناظم، جبکہ میرا بیٹا زاہد الراشدی مرکزی سیکرٹری اطلاعات ہے اس لیے یہی کافی ہے، مجھے بھی آپ ساتھ ہی سمجھیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالکریمؒ کو بعض امور میں اختلاف بھی تھا۔ خاص طور پر وہ پاکستان کی اسمبلیوں میں غیر مسلموں کی نمائندگی کے حق میں نہیں تھے اور اس پر مستقل موقف اور دلائل رکھتے تھے۔ جبکہ ۷۳ء کے دستور میں غیر مسلموں کی نمائندگی کو تسلیم کیا گیا ہے اور جمعیۃ علماء اسلام کی قیادت اس دستور کی تیاری اور پاسداری میں شروع سے شریک ہے۔ ہم نے جب پاکستان شریعت کونسل کے نام سے ایک مستقل فورم بنایا تو حضرت قاضی صاحبؒ سے سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے اس شرط پر قبول فرمائی کہ میرا موقف وہی رہے گا۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ کو اپنا یہ موقف قائم رکھنے اور اس کے اظہار کا بجا طور پر حق ہے اور ہم اس میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

قاضی صاحب مرحوم وضعدار اور بااصول علماء کرام کی فہرست میں چند گنے چنے افراد میں شمار ہوتے تھے جن سے استفادہ ہمارے جیسے کارکنوں کے لیے ہمیشہ باعث سعادت رہا ہے۔ اب بھی ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو فکر و دانش کی خوشبو مہک اٹھتی ہے اور خلوص وللّٰہیت کی چمک صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۸ اپریل ۲۰۱۶ء)

حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ

جامعہ حمادیہ کراچی کے حضرت مولانا عبدالواحدؒ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ بھی داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت شاہ صاحبؒ ملک کے ان بزرگ اور مجاہد علماء کرام میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف تعلیم و تدریس کی مسند کو آباد کیا بلکہ زندگی بھر نفاذ شریعت کی جدوجہد اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کی محنت میں مصروف رہے۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کے نامور تلامذہ میں سے تھے اور انہی کی مسند پر بیٹھ کر ایک عرصہ تک حدیث شریف کا درس دیتے رہے جس سے پاکستان، افغانستان اور اردگرد کے دیگر ممالک کے ہزاروں علماء کرام نے فیض حاصل کیا۔ وہ حدیث میں اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالحقؒ کے علوم

کے وارث و ترجمان، جبکہ تفسیر قرآن میں ایک اور عظیم المرتبت شیخ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے فیوض کے امین تھے۔ اس لیے بخاری شریف کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کے دورہ کی روایت بھی انہوں نے ہمیشہ قائم رکھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں ممتاز عرب اساتذہ سے استفادہ کیا اور امام التابعین حضرت حسن بصریؒ کے تفسیری فیوضات پر گراں قدر مقالہ لکھ کر مدینہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہ بیک وقت اکوڑہ خٹک، شیرانوالہ لاہور، اور مدینہ یونیورسٹی کی متنوع علمی روایات کے جامع تھے اور دینی صلابت کے ساتھ ساتھ توسع اور علمی رواداری کا عملی نمونہ بھی تھے۔

ایک بات میں پہلے بھی کئی بار لکھ چکا ہوں کہ روسی استعمار کے خلاف افغان جہاد کو علمی و فکری آب یاری کا ماحول اکوڑہ خٹک کی برکت سے میسر آیا اور وہی افغان مجاہدین اور ان کے بعد افغان طالبان کی جدوجہد میں پختگی اور سنجیدگی کا باعث بنا۔ اس سنجیدگی اور پختہ فکری کی قدر وقیمت عالم اسلام کے مختلف حصوں میں نفاذ شریعت کی متعدّد تحریکات میں افراط وتفریط کا مشاہدہ کرتے ہوئے صحیح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اور اس پر حضرت مولانا عبد الحقؒ کی علمی عظمت، دینی حمیت اور فکری صلابت کے آگے سرنیاز بے ساختہ خم ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے اس علمی ورثہ کو سینے کے ساتھ لگانے والے چند گنے چنے افراد میں حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ نمایاں مقام رکھتے ہیں، جبکہ مولانا سمیع الحق اور مولانا انوار الحق کے ساتھ ان کی زندگی بھر کی رفاقت اپنے شیخ کے خاندان کے ساتھ ان کی بے لوث وفاداری کی علامت ہے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ مستقبل کا کوئی بھی غیر جانبدار مؤرخ جب گزشتہ صدی کے دوران جہاد کے احیاء، خاص طور پر جہاد افغانستان کے پس منظر و نتائج اور دنیا بھر میں اس کے مثبت اور منفی اثرات کا تجزیہ کرے گا تو وہ اس کے علمی و فکری محاذ پر حضرت مولانا عبد الحقؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی خدمات اور کردار کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ اسی صف بندی کی سیکنڈ لائن کے بزرگ تھے اور ان کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

وہ علماء اور مجاہدین کے صرف استاذ نہیں تھے بلکہ مربی اور پشت پناہ بھی تھے اور صحیح کاموں پر حوصلہ افزائی کے ساتھ غلط کاموں پر ٹوکنے کا ذوق اور معمول بھی رکھتے تھے۔ راقم الحروف کو ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ جامعہ نصرۃ العلوم میں متعدّد بار تشریف لائے، حضرات شیخینؒ کے ساتھ گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے جس کی برکات سے ہم بھی مستفید ہوتے رہے۔ مختلف تحریکات اور اجلاسوں

میں ان کے ساتھ رفاقت رہی اور بہت سے معاملات میں مشاورت کا تعلق بھی رہا۔ اب وہ نہیں ہیں تو آنکھوں کے سامنے خلا خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ اس غم میں ان کے خاندان کے علاوہ مولانا سمیع الحقؒ دارالعلوم حقانیہ کے اساتذہ و طلبہ اور حضرت مرحوم کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مستفیدین کے ساتھ شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ نومبر ۲۰۱۵ء)

حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانیؒ

(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ گورمانی گزشتہ روز طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا تعلق تونسہ شریف کے قریب لتڑی جنوبی سے تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گوجرانوالہ میں گزرا۔ وہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ابتدائی فضلاء میں سے تھے جب نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ تھے۔ بخاری شریف انہوں نے حضرت قاضی صاحبؒ سے پڑھی جبکہ دورۂ حدیث کے دیگر اسباق حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، اور حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ سے پڑھے۔ حضرات شیخینؒ اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے تھے اور ایک عرصہ تک نصرۃ العلوم کے دارالافتاء کے سربراہ رہے۔ ان کا شمار ملک کے معروف مفتیانِ کرام میں ہوتا تھا اور حضرت مولانا عبد الواحدؒ کی وفات کے بعد گوجرانوالہ کے علماء کرام اور اہلِ دین کا فتویٰ کے بارے میں عام طور پر رجوع انہی کی طرف رہتا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں جب جمعیۃ علماء اسلام کے تحت لوگوں کے تنازعات شریعت کے مطابق نمٹانے کے لیے پرائیویٹ سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا گیا تو وہ ضلع گوجرانوالہ کے نائب قاضی مقرر کیے گئے جبکہ ضلعی قاضی مولانا قاضی حمید اللہ خانؒ تھے۔ کتاب اور تحقیق سے گہرا تعلق تھا، وہ میرے دورۂ حدیث سے فارغ ہو جانے کے بعد مدرسہ نصرۃ العلوم میں استاذ اور مفتی کے طور پر تشریف لائے جبکہ ہمارے دور میں استاذ محترم حضرت مولانا مفتی جمال احمد بنویؒ یہ ذمہ داری سرانجام دیتے تھے۔

مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ گورمانی کے ساتھ زندگی بھر میرا ربط و تعلق رہا۔ ہمارے درمیان عام طور پر مختلف دینی مسائل کی تحقیق اور نادر کتابوں کے حوالہ سے گفتگو چلتی رہتی تھی۔ نوشہرہ سانسی کی مسجد توحیدی میں امامت و خطابت کے ساتھ ان کی رہائش تھی اور اسی علاقہ میں جامعہ فتاح العلوم کے نام سے ایک

درسگاہ بھی انہوں نے قائم کر رکھی تھی جس میں اپنی صحت کے زمانہ میں افتاء کا کورس کراتے تھے۔ بہت سے فاضل علماء کرام نے ان سے استفادہ کیا اور فقہ وافتاء کی تربیت حاصل کی۔ جب بھی ملاقات ہوتی کسی نایاب کتاب یا کسی مسئلہ پر نئی تحقیق پر بات چیت ہوتی، کوئی نئی کتاب ان کے علم میں آتی یا مجھے معلوم ہوتی تو باہمی معلومات کا تبادلہ ہو جاتا اور مسائل پر گفتگو ہوتی۔ ملاقات میں زیادہ دیر ہو جاتی تو پیغام بھیجتے تھے کہ کسی روز آکر مل جاؤ، میں جاتا اور ان کی مسجد میں کسی نماز کے بعد درس دیتا، پھر کچھ دیر نشست رہتی، وہ مجھے کوئی کتاب ہدیہ کے طور پر مرحمت فرما دیتے۔ الشریعہ اکادمی میں بہت دفعہ تشریف لائے اور دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے۔

جمعہ سے قبل گیارہ بجے جامعہ فتاح العلوم کے قریب کھلے میدان میں ان کی نماز جنازہ برادر عزیز مولانا عبد القدوس قارن حفظہ اللہ تعالیٰ کی امامت میں ادا کی گئی جس میں حضرت مولانا فضل الرحمان درخواستی، حضرت مولانا سید جاوید حسین شاہ، اور حضرت مولانا محب النبی بھی شریک تھے جبکہ شہر کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی بڑی تعداد نے جنازہ میں شرکت کی اور اس کے بعد ان کی میت تونسہ شریف روانہ کر دی گئی۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۷ نومبر ۲۰۱۶ء)

(۲)

حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ گورمانی گزشتہ ماہ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا تعلق تونسہ شریف کے قریب لتڑی جنوبی سے تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گوجرانوالہ میں گزرا۔ وہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ابتدائی فضلاء میں سے تھے جب نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ تھے۔ بخاری شریف انہوں نے حضرت قاضی صاحبؒ سے پڑھی جبکہ دورۂ حدیث کے دیگر اسباق حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی، اور حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ سے پڑھے۔ حضرات شیخینؒ اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے تھے اور ایک عرصہ تک نصرۃ العلوم کے دار الافتاء کے سربراہ رہے۔ ان کا شمار ملک کے معروف مفتیان کرام میں ہوتا تھا اور حضرت مولانا عبد الواحدؒ کی وفات کے بعد گوجرانوالہ کے علماء کرام اور اہل دین کا فتویٰ کے بارے میں عام طور پر رجوع انہی کی طرف رہتا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں جب جمعیۃ علماء اسلام کے تحت لوگوں کے تنازعات شریعت کے مطابق نمٹانے کے لیے پرائیویٹ سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا گیا تو وہ ضلع گوجرانوالہ کے نائب قاضی مقرر کیے گئے جبکہ ضلعی قاضی مولانا قاضی حمید اللہ خانؒ تھے۔

کتاب اور تحقیق سے گہرا تعلق تھا، وہ میرے دورۂ حدیث سے فارغ ہو جانے کے بعد مدرسہ نصرۃ العلوم میں استاذ اور مفتی کے طور پر تشریف لائے جبکہ ہمارے دور میں استاذ محترم حضرت مولانا مفتی جمال احمد بنویؒ یہ ذمہ داری سرانجام دیتے تھے۔

مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ گورمانی کے ساتھ زندگی بھر میرا ربط و تعلق رہا۔ ہمارے درمیان عام طور پر مختلف دینی مسائل کی تحقیق اور نادر کتابوں کے حوالہ سے گفتگو چلتی رہتی تھی۔ نوشہرہ سانسی کی مسجد توحیدی میں امامت و خطابت کے ساتھ ان کی رہائش تھی اور اسی علاقہ میں جامعہ فتاح العلوم کے نام سے ایک درسگاہ بھی انہوں نے قائم کر رکھی تھی جس میں اپنی صحت کے زمانہ میں افتاء کا کورس کراتے تھے۔ بہت سے فاضل علماء کرام نے ان سے استفادہ کیا اور فقہ و افتاء کی تربیت حاصل کی۔ جب بھی ملاقات ہوتی کسی نایاب کتاب یا کسی مسئلہ پر نئی تحقیق پر بات چیت ہوتی، کوئی نئی کتاب ان کے علم میں آتی یا مجھے معلوم ہوتی تو باہمی معلومات کا تبادلہ ہو جاتا اور مسائل پر گفتگو ہوتی۔ ملاقات میں زیادہ دیر ہو جاتی تو پیغام بھیجتے تھے کہ کسی روز آکر مل جاؤ، میں جاتا اور ان کی مسجد میں کسی نماز کے بعد درس دیتا پھر کچھ دیر نشست رہتی۔ وہ مجھے کوئی کتاب ہدیہ کے طور پر مرحمت فرما دیتے۔ ہمارے پاس الشریعہ اکادمی میں بہت دفعہ تشریف لائے اور دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے۔

جمعہ سے قبل گیارہ بجے جامعہ فتاح العلوم کے قریب کھلے میدان میں ان کی نمازہ جنازہ برادر عزیز مولانا عبد القدوس قارن حفظہ اللہ تعالیٰ کی امامت میں ادا کی گئی جس میں حضرت مولانا فضل الرحمان درخواستی، حضرت مولانا سید جاوید حسین شاہ اور حضرت مولانا محب النبی بھی شریک تھے جبکہ شہر کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی بڑی تعداد نے جنازہ میں شرکت کی اور اس کے بعد ان کی میت تونسہ شریف روانہ کر دی گئی۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ بھی شامل تھے جن کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے، جبکہ مولانا فضل الرحمانؒ مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ کے شاگرد ہیں اور انہوں نے صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی ہے۔ مولانا مفتی عیسیٰ خانؒ مسائل کی تحقیق و تجزیہ کا ذوق رکھتے تھے اور مسئلہ کی تمام جزئیات تک رسائی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وسیع المطالعہ بزرگ تھے، نادر کتابوں اور نئی نئی تحقیقات کے حوالہ سے ان کے ساتھ میری اکثر گفتگو رہتی تھی۔ کوئی نئی تحقیق سامنے آتی تو مجھے ضرور آگاہ کرتے اور رائے بھی طلب کرتے تھے۔ حضرت مولانا عبد العزیز پرھارویؒ کی کچھ تصانیف میں نے طالب علمی کے دور میں دیکھ رکھی تھیں لیکن ان کے علوم و معارف اور فیوض وکمالات سے زیادہ تر واقفیت حضرت

مفتی صاحبؒ کے ذریعہ ہوئی جو حضرت مرحوم کی تحقیقات اور نادر رسائل کی جستجو میں رہتے تھے اور مجھ سمیت بہت سے دوستوں کو اس سے باخبر رکھتے تھے۔

بعض فقہی مسائل میں وہ اپنی مستقل رائے رکھتے تھے اور اس کا بلاجھجک اظہار بھی کرتے تھے لیکن دوسروں کی رائے کا احترام ان کے ہاں پوری طرح پایا جاتا تھا۔ وہ سنجیدہ اہل علم کی طرح اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کے ماحول سے گریز کرتے تھے۔ اپنے اساتذہ میں مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا اکثر ذکر کرتے تھے اور ان کے علمی نکات بیان کیا کرتے تھے۔ افتاء و تدریس کی عمومی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دورۂ تفسیر قرآن بھی ان کا خاص ذوق تھا۔ دارالعلوم مدنیہ رسول پارک لاہور میں حضرت مولانا محب النبی کے مدرسہ میں انہوں نے کئی سال تک مسلسل دورۂ تفسیر پڑھایا۔ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کا یہ ذوق انہوں نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ سے پایا تھا اور اپنے ان تین اساتذہ کے علمی نکات سے اپنے طلبہ کو بڑے ذوق کے ساتھ آگاہ کرتے تھے۔

مولانا مفتی محمد عیسیٰ خانؒ گورمانی کے حوالہ سے میں ایک ذاتی واقعہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہوں گا کہ ۱۹۹۰ء کے دوران میں نے اپنے معاشی حالات و مشکلات سے تنگ آکر ترک وطن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لندن میں میرا آنا جانا تو رہتا ہی تھا، میں نے اس دوران لندن جاکر وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور ساؤتھال کی ابوبکر مسجد کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ گوجرانوالہ کے بہت سے دوستوں سے میں نے کہہ دیا کہ اب میں یہاں شاید واپس نہ آسکوں گا۔ حضرت والد محترم قدس اللہ سرہ العزیز سے بھی اجازت لے لی تھی، وہ میرے حالات اور مجبوریوں سے آگاہ تھے، اس لیے انہوں نے خاموش سی اجازت دے دی تھی۔ میں لندن گیا تو کم و بیش چھ ماہ تک وہاں قیام کیا، جبکہ مستقل قیام کی تیاریاں کر رہا تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانیؒ کا ایک درد بھرا خط موصول ہوا جس کا لہجہ یہ تھا کہ اتنا بڑا مرکز (مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ) کس کے حوالے کر کے چلے گئے ہو؟ اس مرکز کی رونقوں اور آبادی کو اب کون بحال کرے گا؟ اس لہجے میں کم و بیش دو صفحے کے تفصیلی خط نے مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا اور چند روز کے تردد کے بعد بالآخر میں واپس آگیا۔ اس کے بعد کم و بیش بیس سال تک مسلسل لندن جاتا رہا ہوں، مگر وہاں مستقل رہنے کا خیال پھر کبھی نہیں آیا جس کے پیچھے مفتی صاحب مرحوم کے اس خلوص اور سوز کا یقیناً بڑا حصہ ہے۔

مفتی صاحب مرحوم کی وفات سے چند روز قبل ان کے فرزند مولانا حافظ احمد اللہ گورمانی نے فون پر کہا کہ ابا جی یاد کر رہے ہیں، میں نے ڈائری دیکھ کر چند روز کے بعد حاضری کا وعدہ کر لیا کہ مغرب آپ کے پاس

پڑھوں گا، درس بھی دوں گا اور حضرت مفتی صاحبؒ کی زیارت بھی کروں گا۔ مگر اس سے کچھ دن قبل ہی حضرت مفتی صاحبؒ ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفتی صاحب مرحوم کے فرزندان گرامی مولانا حافظ امداد اللہ (فاضل نصرۃ العلوم)، مولانا پروفیسر حافظ عنایت اللہ، مولانا حافظ احمد اللہ اور دیگر اہل خاندان نے مدرسہ کے اہتمام کے لیے مفتی صاحبؒ کے بڑے فرزند مولانا حافظ امداد اللہ پر اتفاق کر لیا ہے جو ایک اچھا فیصلہ ہے اور شہر کے سرکردہ علماء کرام نے اس کی تائید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں جگہ دیں اور ان کے بیٹوں، اہل خاندان اور تلامذہ ورفقاء کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ جنوری ۲۰۱۷ء)

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ

(۱)

گزشتہ دو روز سے صدمہ در صدمہ کی کیفیت میں ہوں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی وفات پر صدمہ کے اظہار کے لیے حواس کو مجتمع کر رہا تھا کہ مدینہ منورہ سے استاذِ محترم حضرت قاری محمد انورؒ کی وفات کی خبر نے دوہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ اور ابھی اس کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ جنوبی افریقہ سے حضرت مولانا عبد الحفیظ مکیؒ کی اچانک وفات کی خبر آگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تینوں بزرگوں کا تذکرہ خاصی تفصیل کا متقاضی ہے مگر سرِ دست ابتدائی تاثرات ہی پیش کر سکوں گا۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ علماء حق کے قافلہ کے سالار تھے اور انہوں نے علمی، عملی اور مسلکی محاذ پر جو خدمات سرانجام دیں وہ تاریخ کے ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے اور اپنے استاذِ گرامی سے انہوں نے اپنے اردگرد ماحول پر ہر طرف نظر رکھنے کا ذوق بھی پایا تھا۔ ان کے اس ذوق کو دیکھتے ہوئے مجھے حضرت خالد بن ولیدؓ کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جو ابن عساکرؒ نے ''تاریخِ دمشق'' میں ذکر کیا ہے کہ دمشق کی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے حمص میں رہائش اختیار کر لی تھی اور یوں سمجھ لیں کہ ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دمشق کے تین فاتحین حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت یزید بن ابی سفیانؓ میں اول الذکر بزرگ فوت ہوگئے تھے، حضرت یزیدؓ کو امیر المومنین حضرت عمرؓ نے شام کا گورنر مقرر کر دیا تھا جبکہ حضرت خالد بن ولیدؓ

حمص میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ نے اب شاید غزوۂ ہند کا ارادہ کر لیا ہے اور انہیں یعنی حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس کی تیاری کے لیے کہا جا رہا ہے۔ اس پر مجلس میں موجود کسی صاحب نے کہا کہ آپ اس سے معذرت کر دیں۔ ایک اور صاحب نے یہ سن کر کہا کہ اس طرح معذرت کرنے سے تو فتنہ پیدا ہو گا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان صاحب کو یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ "امّا فی عہد عمر فلا" کہ اس بات کی تسلی رکھو حضرت عمرؓ کی زندگی میں کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہو گا۔ چنانچہ حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی ہر طرف نظر دیکھ کر یہ اطمینان رہتا تھا کہ کوئی فتنہ ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکے گا اور وہ اس کی نشاندہی اور روک تھام کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۸ جنوری ۲۰۱۷ء)

(۲)

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی خدمت میں پہلی بار حاضری اس دور میں ہوئی جب جامعہ فاروقیہ نیا نیا قائم ہوا تھا اور اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت مولانا موصوفؒ کے حکم پر جامعہ فاروقیہ کے سالانہ جلسہ میں حاضر ہوا۔ جب میں جلسہ گاہ پہنچا تو شاہ بلیغ الدین مرحوم خطاب کر رہے تھے اور مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ بھی اس جلسہ سے خطاب کیا۔ اس کے بعد کئی بار جامعہ فاروقیہ میں مختلف حوالوں سے جانے کا اتفاق ہوا بلکہ ایک موقع پر جب کراچی میں سواد اعظم اہل سنت کا ہر طرف غلغلہ تھا اور گلی گلی اس کے نعرے گونج رہے تھے، جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ کی طرف سے میں اور حضرت مولانا عبد الحکیم ہزارویؒ کراچی کے دورہ پر تھے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ سے ملاقات کے لیے جامعہ فاروقیہ گئے تو وہاں سوادِ اعظم اہل سنت کی ہائی کمان کا اجلاس ہو رہا تھا، حضرت موصوفؒ کے ارشاد پر ہم بھی اس میں شریک ہوئے اور مشاورت کا حصہ بنے۔

گوجرانوالہ کے نواحی قصبہ منڈیالہ وڑائچ میں حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کے ہم زلف رہتے تھے ان سے ملاقات کے لیے کبھی کبھار حضرتؒ تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک بار ریلوے اسٹیشن سے وہ سیدھے جامع مسجد شیرانوالہ باغ آ گئے، مجھے اسی موقع پر منڈیالہ وڑائچ میں ان کی عزیزداری کا پتہ چلا اور ان کی ہلکی پھلکی میزبانی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی علمی و دینی خدمات پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ وہ ان پرانے بزرگوں کی یادگار اور نمونہ تھے جن کا تذکرہ ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں اور جن کی سادگی، قناعت، دینی صلابت اور پیہم جدوجہد کا جذبہ علماء کرام کے لیے ہمیشہ راہنما رہے گا۔ لیکن تاریخ کے ایک طالب علم

کے طور پر میں ان کے اس کردار کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جب جنرل پرویز مشرف کے دور میں دینی مدارس کے خلاف کارروائی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور ہمارے حکمران اپنے حکمرانوں کی پشت پناہی کے ساتھ دینی مدارس کے خلاف عملی آپریشن کا فیصلہ کر چکے تھے، وفاق المدارس نے مولانا سلیم اللہ خانؒ کی قیادت میں دیگر مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے اس طوفان کا رخ موڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۴فروری ۲۰۱۷ء)

حضرت قاری محمد انورؒ

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں بیان کردہ یادداشتیں)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ استاذ الحفاظ و القراء حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کا چند روز پہلے مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا ہے، آپؒ میرے حفظ کے استاذ تھے اور صرف میرے ہی نہیں بلکہ ہمارے پورے خاندان کے استاذ تھے، ہم سب بھائی بہنیں ان کے شاگرد ہیں۔ الحمد للہ نو بھائیوں نے اور تین بہنوں نے حفظ کیا ہے اور ایک بڑی بہن کے سوا باقی سب کے استاذ وہی تھے۔ جبکہ وہ گکھڑ اور اس کے ارد گرد سینکڑوں حفاظ کے استاذ تھے۔ گکھڑ سے وہ افریقہ کے ایک ملک میں تشریف لے گئے، وہاں بھی بیسیوں حفاظ کے استاذ ہیں۔ پھر مدینہ منورہ میں تقریباً پینتیس سال انہوں نے قرآن کریم پڑھایا، وہاں بھی سینکڑوں حفاظ نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ آج کی تقریب میں حضرت قاری صاحبؒ کے حوالے سے کچھ باتیں عرض کروں گا۔

حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کے تعارف کے لیے دو تین باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ گکھڑ میں حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ۱۹۴۳ء میں آئے تھے۔ ۱۹۴۱ء / ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کیا تھا اور ۱۹۴۳ء میں گکھڑ بوہڑ والی مسجد میں بطور امام و خطیب تشریف لائے تھے اور ۲۰۰۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سارا عرصہ انہوں نے گکھڑ میں گزارا۔ جب تک صحت نے اجازت دی، وفات سے سات آٹھ سال پہلے تک تو پانچوں نمازیں خود پڑھاتے تھے، صبح درس بھی دیتے تھے، جمعہ بھی پڑھاتے تھے۔ وہاں درس نظامی کا مدرسہ تھا جس میں حضرت والد صاحبؒ جب سے آئے تھے، پڑھا رہے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں سے علماء آتے تھے وہاں رہتے تھے پڑھتے تھے لیکن حفظ کا کوئی

باضابطہ مدرسہ نہیں تھا۔ حفظ کا باضابطہ مدرسہ تقریباً ۱۹۵۷ء میں بنا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ راہوالی سے گکھڑ جاتے ہوئے راستہ میں ایک گتہ فیکٹری ہوتی تھی، اب وہ ختم ہو چکی ہے لیکن بلڈنگ وغیرہ موجود ہے، اس کے ساتھ سیٹھی کالونی ہے۔ یہ گتہ فیکٹری کسی زمانے میں پاکستان کی دوسری بڑی گتہ فیکٹری ہوتی تھی۔ ایک مردان میں تھی، دوسری یہ تھی۔ اس کے مالک سیٹھی محمد یوسف صاحبؒ نومسلم باپ کے بیٹے تھے، سیالکوٹ روڈ پر ایک قصبہ ہے ترگڑی، وہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد بستی جلال کے تھے۔ ہمارے ایک اور بزرگ گزرے ہیں باواجی عبدالحقؒ، وہ تلونڈی کھجور والی کے تھے۔ تلونڈی کھجور والی، جلال اور ترگڑی، یہ تینوں قریب قریب علاقے ہیں، دو دو تین تین میل کا فاصلہ ہے۔ یہ تینوں حضرات ایک ہی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت لاہوریؒ کے والد سکھ سے مسلمان ہوئے تھے، باواجی عبدالحقؒ ہندو پنڈت سے مسلمان ہوئے تھے اور سیٹھی صاحب کے والد بھی ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ سیٹھی محمد یوسف صاحبؒ کے والد صاحب کو قرآن کریم سے بڑا لگاؤ تھا، اپنے بیٹے کو بھی انہوں نے قرآن کریم کی طرف توجہ دلائی۔ سیٹھی محمد یوسف صاحب گتہ فیکٹری کے مالک تھے اور اپنے زمانے میں ضلع گوجرانوالہ کے چند امیر ترین لوگوں میں سے تھے۔ قرآن کریم کی خدمت کا ذوق تھا اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مدرسے بنائے جائیں۔ اس زمانے میں حفظ اور تجوید کے مدارس اکا دکا کہیں ہوتے تھے، ملتان، کراچی، چنیوٹ کے علاقوں میں جہاں حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ اور حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ کے کچھ شاگرد تھے۔ ہمارے اس علاقے میں حفظ کا کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا۔ سیٹھی محمد یوسف صاحب مرحوم کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ ایک قاری صاحبؒ ہوتے تھے، مولانا قاری عبدالحفیظ صاحبؒ، اکوڑہ خٹک کے قریب شیدو شریف ایک جگہ ہے، یہ وہاں کے تھے۔ سیٹھی صاحب قاری صاحب کو مختلف علاقوں میں لے کر جاتے، مجمع کے سامنے قاری صاحبؒ کو قرآن سنانے کا کہتے۔ قاری صاحب تلاوت کرتے، وہ قرآن کریم اچھا پڑھتے تھے۔ پھر سیٹھی صاحب لوگوں سے کہتے کہ ایسے ہی تم بھی پڑھا کرو۔ لوگ کہتے، ہم ایسے کس طرح پڑھیں؟ سیٹھی صاحب کہتے کہ اس کا بندوبست کرو، میں بھی حصہ ڈالتا ہوں۔ یہاں کوئی مدرسہ بناؤ اور قاری صاحب رکھو، میں بھی حصہ ڈالتا ہوں۔ یہ ان کا طریقہ تھا۔

اب بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ غالباً ۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء کی بات ہے، میں اس وقت آٹھ نو سال کا تھا، سیٹھی صاحبؒ جمعہ کے دن ہماری مسجد میں تشریف لائے، حضرت والد صاحبؒ سے کہا کہ خطبہ

سے پہلے مجھے پانچ سات منٹ دیں گے؟ انہوں نے کہا، ٹھیک ہے۔ سیٹھی صاحب نے قاری صاحب سے کہا، تلاوت کریں، انہوں نے مختصر تلاوت فرمائی۔ پھر سیٹھی صاحب نے کھڑے ہوکر دو تین منٹ بات فرمائی کہ قرآن کریم اچھے طریقے سے پڑھانا چاہیے، صحیح پڑھنا چاہیے اور یاد کرنا چاہیے۔ جیسے قاری صاحب نے پڑھا ہے آپ لوگ بھی شوق پیدا کریں۔ اور کہا کہ جیسا قاری صاحب نے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھا ہے، مولوی صاحب (مراد والد گرامیؒ) کے علاوہ یہاں کے مقامی لوگوں میں سے اگر کوئی اسی طرح ایک رکوع پڑھ کر سنا دے تو پچاس روپے انعام دوں گا۔ اس زمانے کے پچاس روپے آج کے پانچ ہزار تھے۔ ایک بزرگ مہاجر تھے حافظ احمد حسن صاحبؒ (خوشنویس زاہد اقبال صاحب کے والد)۔ انہوں نے کہا میں سناتا ہوں۔ کہا، سنائیں۔ جب سنا چکے تو سیٹھی صاحب نے کہا، آپ مقامی نہیں ہیں۔ کہا، جی میں مقامی تو نہیں ہوں، مہاجر ہوں۔ سیٹھی صاحب نے کہا، میں نے مقامی حضرات سے کہا تھا۔

چنانچہ اس طرح سیٹھی صاحب نے ایک شوق پیدا کیا۔ پھر کہا کہ ایسا کرو کہ کسی قاری صاحب کا بندوبست کرو، انہیں جو تنخواہ دو گے، آدھی تنخواہ میں دیا کروں گا۔ اسی پر فیصلہ ہوگیا کہ قاری صاحب رکھیں گے۔ اور پھر قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی کلاس شروع ہوگئی۔ اس فیصلے کے تحت ہمارے پہلے استاذِ محترم قاری اعزاز الحق صاحبؒ تھے جو امروہہ کے مہاجر تھے، انہیں مقرر کیا گیا۔ میں پہلی کلاس کا طالب علم تھا، مجھے اسکول سے اٹھا کر مدرسہ میں ڈال دیا گیا۔ تب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چوتھی جماعت پڑھی تھی لیکن امتحان نہیں دیا تھا۔ گیارہ بارہ لڑکوں کی کلاس تھی، ہمیں قرآن کریم حفظ شروع کروا دیا گیا۔ ناظرہ میں نے پہلے والدہ مرحومہ سے اور والد صاحبؒ سے پڑھا ہوا تھا۔

سیٹھی صاحب مرحوم سارے ملک میں ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کی فیکٹری کماتی تھی اور وہ خرچ کرتے تھے۔ اسی طرح ترغیب دلا کر مدرسہ بنواتے تھے، کہیں تجوید کا، کہیں حفظ کا۔ کہیں آدھی تنخواہ دیتے، کہیں تیسرا حصہ اور کہیں تو پوری تنخواہ خود دیتے تھے کہ قاری صاحب رکھو تنخواہ میں دوں گا۔ ان کی گتہ فیکٹری کا ایک مستقل شعبہ تھا، شعبہ تعلیم القرآن، اس انچارج محمد حسین صاحب مرحوم تھے۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۶۵ء کی بات ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ ملک کے کتنے مدرسے ہیں جن کی سیٹھی صاحب اس طرح مدد کرتے ہیں؟ انہوں نے سینکڑوں میں تعداد بتائی جن کی سیٹھی صاحبؒ اس طرح معاونت اور نگرانی کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ مدرسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے گئے اور سیٹھی صاحب کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ میں ان کو سہارا دوں، یہ خود کفیل ہو جائیں۔ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے تو سیٹھی صاحب پیچھے ہٹ جاتے کہ میرا کام یہی تھا۔ سیٹھی صاحب مرحوم نے افریقہ میں اور سعودی عرب میں بھی بہت سے مدرسے

بنوائے۔ ہمارے استاذِ محترم قاری محمد انور صاحبؒ کو یہ گکھڑ سے افریقہ لے گئے تھے، قاری صاحبؒ چند سال وہاں پڑھاتے رہے۔

اللہ تعالیٰ سیٹھی صاحب کے درجات بلند فرمائیں۔ یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ سعودی عرب میں حفظ کا کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا اور تراویح میں قرآن مجید سننے سنانے کا سوائے حرمین کے کہیں رواج نہیں تھا۔ سعودی عرب میں حفظ کا پہلا مدرسہ حرم مکہ میں سیٹھی صاحب نے قائم کیا تھا جس کے پہلے طالب علم شیخ عبداللہ بن السبیلؒ تھے جو بعد میں امام الحرمین بنے۔ حرمین شریفین کے حفظ کے پہلے استاذ ابھی زندہ ہیں، قاری خلیل احمد صاحب۔ اب معذور ہیں، آزاد کشمیر سے تعلق ہے۔ قاری خلیل احمد صاحب کا ایک بیٹا حرمین کے ائمہ میں شامل ہے جن کا نام غالباً محمد ہے۔

سیٹھی صاحبؒ نے سعودی عرب میں حفظ قرآن کے مدرسے بنوانے شروع کیے، جب تعداد خاصی بڑھ گئی تو سعودیہ والوں کو خیال آیا کہ باہر کے آدمی خرچہ کر کے مدرسے بنوا رہے ہیں۔ پیسے تو ہمارے پاس بہت ہیں ہم خود یہ کام کیوں نہ کریں۔ اس طرح ان کو خیال آیا اور انہوں نے یہ نظام خود سنبھال لیا۔ لیکن آغاز سیٹھی صاحب مرحوم نے کیا اور کئی سال تک کئی مدارس کا خرچہ یہاں سے بھجواتے رہے۔ ائمہ حرمین میں الشیخ حذیفی اور الشیخ السدیس بھی پاکستانی قاری صاحبان کے شاگرد ہیں اور قاری انور صاحبؒ کے تو وہاں سینکڑوں شاگرد ہیں۔ وہاں کے ائمہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے پاکستانی قاریوں سے پڑھا ہے۔ اس وقت بھی وہاں حضرت قاری بشیر احمد صاحب ملتانی ہیں، مسجد نبویؐ میں عشاء کے بعد بیٹھتے ہیں اور بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آکر اپنا تلفظ صحیح کرتے ہیں۔

یہ ہمارے گکھڑ کے مدرسے کا پس منظر تھا۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ مزاج نہیں ملتے، ہم نے قرآن کریم پڑھنا شروع تو کر دیا لیکن کوئی قاری صاحب یہاں ٹکتے نہیں تھے یا محلے والے ٹکنے دیتے نہیں تھے۔ دونوں باتیں ہوتی ہیں، یا تو قاری صاحب کا اپنا موڈ ٹکنے کا نہیں ہوتا، یا وہ ٹکنا چاہتے ہیں لیکن محلے والے ٹکنے نہیں دیتے۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ایک قاری صاحب آئے وہ چلے گئے، دوسرے آئے وہ چلے گئے۔ اسی طرح کئی قاری صاحبان ہمارے تبدیل ہوئے اور مسئلہ یہ تھا کہ جو قاری صاحب آتے وہ نئے سرے سے شروع کرواتے کہ تم نے صحیح نہیں پڑھا ہوا، تمہارا تلفظ صحیح نہیں، تمہارا لہجہ درست نہیں ہے۔ ہم اسی الجھن میں تھے کہ کریں کیا؟ ہر پانچ چھ مہینے کے بعد نئے قاری صاحب آجاتے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت قاری محمد انور صاحبؒ عطا فرمائے۔ لاہور میں حفظ اور تجوید کا مدرسہ تجوید القرآن سب سے قدیمی مدرسہ ہے۔ حضرت قاری فضل کریم صاحبؒ، قاری محمد حسن شاہ صاحبؒ، اور قاری محمد ظریف صاحبؒ کا

مدرسہ تھا۔ ان سے حضرت والد صاحبؒ نے کہا کہ کوئی اچھا سا قاری دو، ہم نے مدرسہ چلانا ہے۔ حضرت قاری محمد انور صاحبؒ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم انہوں نے دارالعلوم ربانیہ میں حاصل کی تھی۔ تجوید القرآن لاہور میں حفظ مکمل کیا، تجوید قاری محمد حسن شاہ صاحبؒ سے پڑھی اور اس تعلق سے ہمارے پاس گکھڑ تشریف لائے۔ وہ پھر ایسے ٹک کر بیٹھے کہ الحمدللہ ہر طرف حافظ ہی حافظ ہو گئے۔

حضرت قاری محمد انورؒ بڑے اچھے استاذ تھے۔ میں نے ان سے حفظ کرنا شروع کیا، آپؒ بڑی شفقت فرماتے تھے اور ڈنڈا بھی خوب چلاتے تھے۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ویسے آج کا ماحول بدل گیا ہے ورنہ ڈنڈا ہی انسان کو سیدھا رکھتا ہے۔ لیکن زیادہ بھی نہ مارا جائے، ہلکی پھلکی مار میں کوئی حرج نہیں۔ ہم نے تو خیر والد صاحبؒ سے بھی بہت ڈنڈے کھائے ہیں اور قاری صاحبؒ سے بھی بہت ڈنڈے کھائے ہیں۔ میں اس پر طلبہ کو اپنا قصہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے سبق یاد نہیں تھا، قاری صاحبؒ نے میرے دائیں ہاتھ پر پانچ چھڑیاں ٹکا کر ماریں۔ میں آخر صاحبزادہ تھا، منہ بسورا اور اٹھ کر گھر چلا گیا۔ والدہ مرحومہ، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کریں، وہ بھی گھر میں بچیوں کو ناظرہ اور حفظ پڑھاتی تھیں، اگرچہ خود حافظہ نہیں تھیں۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ اماں جی آپ سے کتنی بچیوں نے حفظ کیا ہے؟ کہنے لگیں تیئس بچیوں نے۔ گھر میں روزانہ ان کا مدرسہ ہوتا تھا، انہوں نے بھی ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ میں قاری صاحبؒ سے مار کھا کر گھر آ گیا، والدہ مرحومہ نے دیکھا کہ سبق کے وقت یہ گھر پھر رہا ہے۔ مجھے بلا کر پوچھا، میں نے منہ بسور کر جواب دیا، قاری صاحب نے مارا ہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ ماں مجھے سینے سے لگائے گی، دلاسہ دے گی اور قاری صاحب کو دو چار سنائے گی کہ قاری کون ہوتا ہے میرے بچے کو مارنے والا۔ مجھ سے پوچھا، بیٹے! کیوں مارا تھا؟ میں نے کہا سبق یاد نہیں تھا۔ کس چیز سے مارا تھا؟ میں نے کہا ڈنڈے سے۔ کتنے؟ پانچ۔ کہاں مارا؟ دائیں ہاتھ پر۔ والدہ مرحومہ نے اپنا ڈنڈا پکڑا اور میرے بائیں ہاتھ پر چھ ڈنڈے مارے اور کہا، چلو پہنچو مدرسے۔

اس وقت مجھے بہت غصہ آیا اور آنا بھی تھا، لیکن آج اماں جان کو دعائیں دیتا ہوں کہ اگر اس وقت میری ماں مجھے سینے سے لگا کر سہارا دے دیتی اور گھر میں بٹھا لیتی تو ہم آج یہ کچھ نہ ہوتے جو ہیں۔ پتہ نہیں کدھر کدھر پھرتے، کیا ہوتا اور کہاں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ سارا کمال ان چھ ڈنڈوں کا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے، بزرگوں کی دعائیں اور ماں کے ہاتھ سے کھائے ہوئے ڈنڈے یہی دو چیزیں کام آ گئیں ورنہ میرا کانٹا بدل چکا ہوتا۔ اور ریل گاڑی کا کانٹا ہی بدلنا ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ قاری صاحبؒ مارتے بھی تھے لیکن اگر کبھی سمجھتے کہ زیادہ مار لیا ہے تو بلا کر چائے بھی پلاتے تھے۔ ایک دن مجھے ڈنڈے

زیادہ لگ گئے تو میں پریشان بیٹھا تھا کہ قاری صاحب نے مارا بہت ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے منگوائی، مجھے بلایا اوئے مولوی! ادھر آ چائے پی لے۔ مجھے مولوی کہتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ ابھی مار رہے تھے اور اب چائے پلا رہے ہیں۔ مجھ سے فرمایا، بیٹا ہم مارتے ہیں تو کسی وجہ سے مارتے ہیں۔ یہ ان کا انداز تھا۔ میں قاری صاحب سے حفظ کرتا رہا۔ میرا حفظ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو مکمل ہوا۔ قاری صاحبؒ مجھ پر بہت مہربان تھے اور بڑی شفقت فرماتے تھے۔ قاری صاحبؒ نے دو تین سال تک اپنے ساتھ مجھے قرآن کریم کا دور کروایا۔ آپؒ گکھڑ کی مسجد میں قرآن مجید سنایا کرتے تھے، میں ان کا سامع ہوتا تھا۔ پھر اپنی نگرانی میں پہلا مصلیٰ سنانے کے لیے مجھے بھیجا۔ میں نے پہلا مصلیٰ بدو کے گوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ میں سنایا تھا۔

گکھڑ ہی کی دو باتیں اور ذکر کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ استاذ تو استاذ ہوتا ہے اور جس طالب علم پر استاد کی نظر ہو، اسے کیمیا بنا دیتا ہے۔ مجھے تقریر کرنا بھی حضرت قاری صاحبؒ نے سکھایا ہے، ورنہ قاری صاحبؒ کا تقریر سے کیا تعلق؟ قاری صاحبؒ نے ہمیں حفظ کے دوران تجوید کا رسالہ زینۃ القرآن سبقاً سبقاً پڑھایا اور مجھے کھڑا کر کے کہتے، اوئے مولوی! کیا سبق پڑھا ہے؟ بیان کرو۔ مجھ سے تقریر کرواتے تھے۔ گکھڑ میں کبھی کبھی مولانا قاری سید حسن شاہ صاحبؒ تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ قاری بھی بہت اچھے تھے اور خطیب بھی بہت اچھے تھے۔ قاری محمد انور صاحبؒ کبھی جلسہ کرواتے تو شاہ صاحبؒ کو بلاتے تھے۔ مجھے کچھ جملے رٹا کر، کچھ چیزیں یاد کرا کر کھڑا کر دیتے کہ تقریر کرو۔ کبھی لکھ کر دیتے جسے میں یاد کرتا اور پھر مجمع کے سامنے تقریر کے انداز میں بیان کرتا۔

ایک واقعہ میں عموماً سنایا کرتا ہوں کہ روڈ پر جلسہ تھا، شاہ صاحبؒ کی تقریر تھی، ان سے پہلے قاری صاحبؒ نے مجھے تقریر کرنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ میں مائیک پر کھڑا ہوا اور بازو چڑھا کر قادیانیوں کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دی اور مرزا قادیانی کو پنجابی میں دو چار گالیاں دیں کہ مرزا بے ایمان، مرزا یہ، مرزا وہ۔ دو چار جو سنائیں تو والد صاحبؒ نے گردن سے مجھے پکڑا اور پیچھے بٹھا دیا۔ خود مائیک پر آ کر ارشاد فرمایا، بچہ ہے، جذبات میں غلط باتیں کر گیا ہے، میں معافی مانگتا ہوں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہم آج کل مائیک پر کھڑے ہو کر کیا کچھ نہیں کہتے؟ میں اپنی بات کیا کرتا ہوں کہ میری تربیت اس ماحول میں ہوئی ہے، اس لیے میری زبان سے سخت لفظ کی کسی شدید ترین مخالف کے لیے بھی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ الحمد للہ! میں آج اپنے کسی شدید ترین مخالف کا نام بھی لیتا ہوں تو احترام کے ساتھ لیتا ہوں۔ خیر، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو بولنے اور تقریر کرنے کی صلاحیت اور ذوق ہے، اس کی ابتدا بھی حضرت قاری صاحبؒ نے کی تھی۔

ایک اور واقعہ حضرت قاری صاحبؒ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں تحریک نظام مصطفیٰ چلی جو بہت

بڑی تحریک تھی۔ جلسوں اور جلوسوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک سرکاری فورس ہوتی تھی ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورس) کہلاتی تھی۔ گکھڑ میں حکومت کے خلاف تحریک کا ایک جلوس تھا، حضرت والد صاحبؒ نے قیادت کرنی تھی۔ گورنمنٹ نے پابندی لگادی کہ جلوس نہیں نکالیں گے لیکن جمعہ کے بعد والد صاحبؒ کی قیادت میں لوگ جلوس کے لیے جمع ہوگئے کہ جلوس نکالیں گے۔ جلوس جب آگے بڑھا تو فورس کے کمانڈر نے ایک لکیر کھینچ دی اور چاروں طرف سپاہی کھڑے کردیے اور کہا کہ جو اس لکیر کو عبور کرے گا اسے گولی ماردیں گے۔ اس زمانے میں ایسے ہوتا تھا۔ اب بغیر وارننگ کے مارتے ہیں، اس وقت وارننگ دے کر مارتے تھے۔ اس کا یہ اعلان سن کر سناٹا چھا گیا کہ یہ کیا ہوا، چاروں طرف سپاہی گنیں نشانہ پر لیے ہوئے کھڑے تھے کہ کون لکیر عبور کرتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے۔ ادھر فورس کھڑی ہے، اِدھر یہ ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ، حضرت قاری محمد انور صاحبؒ اور ایک گکھڑ کے حاجی سید ڈار مرحوم تھے، یہ تین آدمی جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ آگے بڑھے اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لکیر عبور کر گئے۔ اس موقع پر والد صاحبؒ نے ایک جملہ کہا کہ مسنون عمر پوری کر چکا ہوں، اگر اب شہادت مل جائے تو بڑی سعادت کی بات ہے۔ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لکیر عبور کر گئے، سب سناٹے میں آگئے لیکن کسی کو کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی قاری صاحبؒ کے بڑے کارناموں میں سے ایک ہے کہ انہوں نے اس طرح اپنی جان کی پروا کیے بغیر ساتھ نبھایا۔

حضرت قاری صاحبؒ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو میں ان کی خدمت میں وہاں جایا کرتا تھا۔ بہت واقعات ہیں، دو تین عرض کرتا ہوں۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۴ء میں جب میں مدینہ منورہ گیا تو آپؒ وہاں پڑھاتے تھے۔ میں نے اطلاع بھیجی کہ فلاں وقت آرہا ہوں۔ میرا زندگی میں مدینہ منورہ جانے کا پہلا موقع تھا، راستے کا پتہ نہیں تھا اس لیے جو وقت بتایا تھا اس سے دو تین گھنٹے لیٹ پہنچا۔ قاری صاحبؒ میرے بتائے ہوئے وقت پر آئے اور اڈے پر ڈیڑھ دو گھنٹے تلاش کرتے رہے، میں نہ ملا تو پریشان واپس چلے گئے۔ میں مدینہ منورہ دیر سے پہنچا، وہاں عصر سے مغرب تک کلاس ہوتی ہے۔ وہ لوگ عصر اول وقت میں پڑھتے ہیں جیسے ہمارے ہاں اہل حدیث حضرات پڑھتے ہیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان خاصا وقت ہوتا ہے، میں نے عصر کی نماز پڑھی اور تلاش کرتے کرتے قاری صاحبؒ کی کلاس تک پہنچ گیا۔ مجھے جونہی دور سے دیکھا تو بے ساختہ فرمایا اوئے مولوی! کان پکڑ لے۔ میں نے بیگ نیچے رکھا اور مرغا بن گیا۔ آپؒ اٹھ کر آئے اور کہا ارے میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ نہیں کہا تھا تو اور کیا کہا تھا؟ فرمایا اللہ کے بندے! میں دو گھنٹے پریشان رہا تمہیں ڈھونڈتا رہا تم نہیں ملے تو میں واپس آگیا۔ میں نے معذرت

کی کہ مجھے راستے کا علم نہیں تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ سچی بات ہے حضرت قاری صاحبؒ کو وہاں پڑھاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی کہ میرے استاذِ محترم ہیں اور مدینہ منورہ میں بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد نبویؐ کے برآمدے میں بیٹھ کر طلبہ کی منزلیں سنا کرتے تھے اور میں قریب کسی ستون کی اوٹ میں کھڑا دیکھتا اور خوش ہوتا رہتا کہ کیا خوش نصیبی ہے کہ مسجد نبویؐ کے برآمدے میں بیٹھے شاگردوں کی منزلیں سن رہے ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی تھی اور بڑا رشک آتا تھا۔ میں اپنا اعزاز سمجھتا کہ میرے استاذِ محترم ہیں اور یہاں بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔

میرا ایک یا دو سال میں وہاں چکر لگ ہی جاتا ہے۔ میں ان کے پاس جاتا کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرتا، کوئی ساتھی ملتا تو میں اسے تعارف کرواتا کہ یہ میرے استاد محترم ہیں۔ ایک دن کہنے لگے اس طرح نہ کہا کرو۔ میں نے کہا کیوں؟ فرمایا مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے بے تکلفی میں کہا مجھے شرم نہیں آتی تو آپ کو کیوں آتی ہے۔ میں تو ایسے ہی کہوں گا، کیا آپ مجھے ڈنڈے نہیں مارتے رہے؟ ان کی ڈاڑھی دیر سے سفید ہوئی، ایک دور وہ بھی گزرا کہ میری ڈاڑھی آدھی سفید تھی اور ان کی کالی تھی۔ میں یہ کہتا کہ یہ میرے استاذ ہیں تو لوگ حیران ہوتے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میرا جب بھی مدینہ منورہ جانا ہوتا تو ان کا اصرار ہوتا تھا کہ میرے پاس ٹھہرو۔ ہمارا ان کے ساتھ محبت و عقیدت کا گہرا تعلق تھا، اور ان کا بھی صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہمارے پورے خاندان کے ساتھ شفقت کا تعلق تھا۔ ہمارے خاندان کا کوئی آدمی عمرے یا حج پر جاتا تو قاری صاحبؒ کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ بہت خوش ہوتے کہ مولوی صاحبؒ (حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ) کے بچے آئے ہیں، بیٹے آئے ہیں، بھانجے آئے ہیں اور بڑی خدمت اور بڑا اعزاز فرماتے تھے۔ ایک دفعہ میں گیا لیکن انہیں بتایا نہیں اور قاری ریاض انصاری صاحب کے بیٹے حافظ محمد یحییٰ ابوبکر فاضل نصرۃ العلوم کے پاس ٹھہر گیا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان مسجد نبویؐ میں حضرت قاری صاحبؒ کی چھتری متعیّن ہوتی تھی۔ پہلی صف کی دوسری چھتری کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ قاری صاحبؒ سے جا کر ملا۔ انہوں نے پوچھا کب آئے ہو؟ میں نے بتایا کل آیا تھا۔ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا ابوبکر کے پاس۔ فرمایا سامان اٹھا کر گھر آجاؤ۔ ابوبکر سے کہا چلو جاؤ، مولوی کا سامان اٹھا کر ابھی یہاں لے آؤ۔ اس شفقت اور عنایت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

ہمارے ہاں الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ میں ایک دفعہ تشریف لائے، آخر عمر میں بیمار ہو گئے تھے۔ میں نے پروگرام بنایا کہ ان کے اس علاقے میں بہت سے شاگرد ہیں تو قاری صاحبؒ کے جو شاگرد میرے علم میں تھے ان کو یہاں اکٹھا کیا۔ ایک نشست کا اہتمام کیا اور قاری صاحبؒ کو دعوت دی۔ قاری صاحبؒ

تشریف لائے اور بہت زیادہ خوش ہوئے کہ یہ تو تم نے بڑا کام کر دیا، میں کس کس کے پاس جاتا اور کس کس سے ملتا، تم نے اکثر شاگردوں سے اکٹھے ملاقات کروادی۔

پچھلے سال سعودی حکومت کی دعوت پر میرا حج پر جانا ہوا، وہ پروٹوکول کا حج تھا۔ مدینہ منورہ میں ہم تین چار دن ٹھہرے تھے۔ شام کو میں حسبِ معمول ملنے کے لیے گیا تو قاری صاحبؒ مسجد میں نہیں آرہے تھے، معذور تھے۔ ان کے گھر گیا اور ملاقات کی، تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا۔ دوسرے دن ان کے فرزند برادرم محمد اشفاق کا فون آگیا کہ ابو جی آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں، کہتے ہیں کہ مولوی کو ملنے ہوٹل جانا ہے۔ میں نے کہا وہ کیوں آئیں، میں خود حاضر خدمت ہوں گا۔ شام کو پھر میں آپؒ کے گھر گیا اور ملاقات کی۔ قاری صاحبؒ بڑی محبت بڑی عزت کرتے تھے بڑی شفقت سے نوازتے تھے۔

حضرت قاری محمد انور صاحبؒ کافی عرصہ سے سعودی عرب میں رہ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک الجھن پیدا ہوگئی کہ سعودیہ نے کچھ ایسے قوانین نافذ کیے کہ لگتا تھا کہ شاید انہیں واپس آنا پڑے گا کہ وہاں کی شہریت نہیں تھی۔ سعودیہ والے شہریت نہیں دیتے۔ میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے کہ سعودیہ والے اب شاید نکال دیں گے، میں تو یہاں دفن ہونے کی نیت سے آیا ہوں۔ دعا کرو میرے لیے۔ میں نے کہا اللہ پاک مہربانی فرمائیں گے، نیتوں کو اور نیتوں کے خلوص کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ اس سال میں وہاں نہیں جاسکا۔ استاذِ محترمؒ حج کے موقع پر ساتھیوں سے پوچھتے رہے کہ مولوی نہیں آیا، کیوں نہیں آیا؟ مجھے بھی حسرت رہی کہ پچھلے سال ہی ملاقات ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی موقع مل جائے اور ملاقات کا کوئی وسیلہ بن جائے۔ سچی بات ہے کہ میں تو ان کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ میرا دعاؤں کا خزانہ مسجد نبویؐ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب کبھی روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دیتے تو میری طرف سے سلام کہتے اور بے شمار دعائیں دیتے تھے۔

پچھلے دنوں ہمارے لیے دو تین صدمے اکٹھے ہی آگئے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ کا انتقال ہوا، ابھی ان کا جنازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مدینہ منورہ سے فون آگیا کہ حضرت قاری صاحبؒ فوت ہوگئے ہی۔ ابھی اسی صدمے میں تھے کہ تیسری خبر آگئی کہ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکیؒ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ یہ دو دن میں تین ایسی خبریں سن کر میری عجیب کیفیت تھی کہ یا اللہ کیا کریں۔ بہت صدمہ تھا اپنے بزرگوں کی جدائی کا۔ سچی بات ہے کہ باپ ہی کی طرح تھے، باپ ہی کی جگہ تھے۔ بہرحال اللہ پاک ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں ان کے صدقہ جاریہ کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب

العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔مارچ ۲۰۱۷ء)

بگھار شریف اور گولڑہ شریف کے بزرگ

عید الاضحیٰ سے قبل چھٹیوں کے دو دن اسلام آباد میں گزرے۔ ۲۸ اگست کو مولانا سمیع الحق کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں حاضری کا وعدہ تھا، جامعہ نصرۃ العلوم میں اسباق پڑھا کر ظہر تک جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن ھمک اسلام آباد پہنچا اور نماز ظہر کے بعد مسجد میں قربانی کی اہمیت کے حوالہ سے ایک نشست میں گفتگو کی۔ پھر مولانا حافظ سید علی محی الدین کے ہمراہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوا جس کی مختصر رپورٹ گزشتہ کالم میں ذکر کر چکا ہوں۔ رات جامعہ رحمانیہ میں بسر کی، فجر کی نماز کے بعد ماڈل ٹاؤن کی جامع مسجد الیاس میں درس دیا اور مولانا ثناء اللہ غالب کے ساتھ مختلف امور پر تبادلہ خیالات ہوا۔ مولانا محمد رمضان علوی بھی تھوڑی دیر بعد آگئے اور ہم نے بحریہ ٹاؤن میں بگھار شریف کی نقشبندی خانقاہ کے سجادہ نشین صاحبزادہ ساجد الرحمان سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔

کہوٹہ کے قریب یہ خانقاہ موسیٰ زئی شریف کے معروف بزرگ حضرت خواجہ محمد عثمان دامانیؒ کے خلیفہ مجاز حضرت خواجہ محمد ہاشمؒ نے قائم کی تھی، ان کے بعد حضرت خواجہ عبد الرحمانؒ اور حضرت خواجہ محمد یعقوبؒ نے اس سلسلہ کو پھیلایا، علاقہ بھر میں اس خانقاہ کے روحانی اور اصلاحی اثرات وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ صاحبزادہ ساجد الرحمان اس وقت خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں، ملک کے ممتاز ارباب علم و دانش میں شمار ہوتے ہیں اور اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں مختلف اہم مناصب پر فائز چلے آرہے ہیں۔ مجھے گزشتہ سال حافظ سید علی محی الدین کے ہمراہ بگھار شریف جانے کا موقع ملا تھا جہاں سادگی کے ساتھ تعلیمی و اصلاحی ماحول کے تسلسل نے بہت متاثر کیا اور موسیٰ زئی شریف کے بزرگوں کے لیے دلی عقیدت میں اضافہ ہوا کہ ان کا فیض کہاں کہاں اپنا کام کر رہا ہے۔ خود میرا روحانی تعلق بھی والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ کے ذریعہ خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے ہے۔ اس لیے موسیٰ زئی شریف کی نسبت جہاں اور جس رنگ میں ملے انس و الفت کے احساس میں اضافہ ہوتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب محترم نے بھی اسی الفت و محبت سے نوازا، اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھیں، آمین۔

اس کے بعد پاکستان شریعت کونسل اسلام آباد کے امیر مولانا مفتی سیف الدین کے ہاں حاضری ہوئی

اور ان کے ہمراہ گولڑہ شریف جانے کا پروگرام بن گیا۔ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء میں سے تھے اور حدیث میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے شاگرد تھے، جبکہ چشتی سلسلہ کے بڑے بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ قادیانیت کے خلاف جن بڑے بزرگوں نے علمی ودینی جدوجہد کا باقاعدہ اہتمام کیا ان میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ صف اول کے بزرگوں میں سے ہیں۔ جبکہ گولڑہ شریف کی خانقاہ کا شمار ان چند بڑے روحانی مراکز میں ہوتا ہے جو مسلکی تفریق میں فریق بنے بغیر اعتدال کے ساتھ تمام مسلمانوں کی اصلاح اور راہنمائی کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد رمضان علوی، مولانا مفتی محمد سیف الدین، حافظ سید علی محی الدین اور ان کے ایک عزیز مولانا صاحب کے ہمراہ خانقاہ میں حاضری ہوئی جہاں حضرت پیر صاحبؒ اور دیگر بزرگوں کی قبور پر فاتحہ خوانی اور دعا کی سعادت حاصل ہوئی۔ موجودہ سجادہ نشین بزرگ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے، خاندان کے ایک فاضل نوجوان جناب پیر سید نجم الدین سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ واپسی پر اسلام آباد میں جناب جعفر بھٹی سے ان کے بھائی کی وفات پر تعزیت کی۔ جعفر بھٹی ہمارے باذوق ساتھیوں میں سے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے گہری عقیدت اور ان کی کتابوں کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں، ایک عرصہ سے لندن میں رہائش پذیر ہیں، ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسی منصوری کے رفقاء میں سے ہیں اور فورم کے سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ انہوں نے اسلام آباد میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نسبت سے ایک علمی ادارہ قائم کررکھا ہے اور لائبریری میں کتب جمع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ان کا ارادہ حضرت ندویؒ کے نام سے ایک علمی وفکری مرکز قائم کرنے کا ہے جس کی مشاورت میں راقم الحروف اور مولانا محمد رمضان علوی بھی شریک ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان سے تعزیت کرتے ہوئے ہم نے مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کی، اللہ تعالٰی اسے جنت الفردوس میں اعلٰی مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ انصاف، لاہور ـ ۸ ستمبر ۲۰۱۷ء)

حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ

دارالعلوم (وقف) دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی علالت کے بارے میں کئی روز سے تشویشناک خبریں آرہی تھیں جبکہ گزشتہ روز کی خبروں نے اس تشویش میں مزید اضافہ کر دیا۔ اسی دوران خواب میں ان کی زیارت ہوئی، عمومی سی ملاقات تھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! دو چار روز کے لیے

دیوبند میں حاضری کو جی چاہ رہا ہے مگر ویزے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی، میری طرف غور سے دیکھا اور فرمایا اچھا کچھ کرتے ہیں۔ خواب بس اتنا ہی ہے، اب خدا جانے پردۂ غیب میں کیا ہے، مگر یہ اطمینان ہے کہ خاندان قاسمی کی نسبت سے جو بھی ہو گا خیر کا باعث ہی ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ خاندان قاسمی کے چشم وچراغ اور اس عظیم خانوادہ کے ماتھے کا جھومر تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کے فرزند و جانشینؒ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کے پوتے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پڑپوتے تھے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے ساتھ میری نیاز مندی اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے وسیلہ سے تھی کہ ان بزرگوں کا باہمی قرب و تعلق مثالی تھا۔ حضرت قاری صاحبؒ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو شیرانوالہ لاہور میں کوئی نہ کوئی مجلس ضرور جمتی اور میرا شمار اس دور میں شیرانوالہ کے حاضر باش شرکاء میں ہوا کرتا تھا، اس لیے متعدّد بار ان برکات سے فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت قاری صاحبؒ کے بعد حضرت مولانا قاری محمد سالم قاسمیؒ کے ساتھ بھی اسی تسلسل میں نیاز مندی کا تعلق رہا اور جب دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کے ساتھ میں بھی شریک تھا، ہم تینوں کا قیام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے مکان میں رہا اور چند روز تک ہم ان کی میزبانی کا حظ اٹھاتے رہے۔ ہمارے ساتھ گوجرانوالہ کے چند اور دوست مولانا مفتی محمد نعیم اللہ، قاری محمد یوسف عثمانی، جناب امان اللہ قادری، عبد المتین چوہان مرحوم اور دیگر حضرات کے علاوہ بزرگ اہل حدیث عالم دین مولانا حکیم محمودؒ بھی اسی مکان میں ہمارے ساتھ قیام پذیر تھے۔ اس دورے میں حضرت قاری صاحبؒ کی رہائش گاہ کا قیام اور حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی دعوتیں اور مجالس میری زندگی کے یادگار لمحات میں سے ہیں۔

مولانا محمد سالم قاسمیؒ جب پاکستان تشریف لاتے تو میری کوشش ہوتی کہ کسی جگہ ان کی زیارت و ملاقات کی کوئی صورت بن جائے جس میں اکثر کامیاب ہو جاتا۔ ایک بار گوجرانوالہ تشریف لائے تو میرے گھر کو بھی رونق بخشی اور جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں میری رہائش گاہ پر ناشتہ کے لیے قدم رنجہ فرمایا۔ لاہور، راولپنڈی اور دیگر مقامات کی بعض ملاقاتیں ابھی تک ذہن کی اسکرین پر جھلملا رہی ہیں مگر ایک ملاقات بہت یادگار رہی۔ میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ساتھ بنگلہ دیش کے سفر پر تھا، سلہٹ میں ایک پرانے اور معروف بزرگ حضرت شاہ جلالؒ کا مزار ہے جو لوگوں کی عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز ہے، میں اسے سلہٹ کا داتا دربار کہا کرتا ہوں، ہم وہاں اپنے پروگرام کے تحت گئے تو معلوم

ہوا کہ دربار کے ساتھ جو دینی درسگاہ ہے وہ ہمارے ہم مسلک دوستوں کے زیر انتظام ہے اور وہاں حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے تاکہ زیارت و ملاقات کی سعادت حاصل ہو جائے۔ میزبانوں کو ایک پاکستانی مولوی کی کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر ان سے ملاقات کرانے میں تردد تھا اور اس تردد کی وجہ بھی سمجھ آ رہی تھی۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود ایک صاحب کو اپنا نام لکھ کر دیا کہ حضرت کو صرف یہ نام بتادیں اگر وہ اجازت دیں تو ملاقات کرادیں۔ حضرت مولانا مرحوم نے نام پڑھا تو بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ یہ ادھر کہاں آگئے ہیں؟ بہرحال اذن باریابی مل گیا اور کچھ دیر محفل رہی۔ ایک بار جدہ کے سفر میں دوستوں نے بتایا کہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اور قریب ہی ایک دوست کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ حاضری پر خوشی کا اظہار فرمایا، مختلف مسائل پر باہمی گفتگو ہوئی اور دعاؤں سے نوازا۔ اسی طرح اور بھی بعض مقامات پر ملاقات و گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت مرحوم کے والد گرامی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ اپنے دور کے بڑے خطباء میں شمار ہوتے تھے اور انہیں بجا طور پر خطیب اسلام کہا جاتا تھا۔ بلکہ میں نے ان کی پہلی زیارت اپنے طالب علمی کے دور میں ایک جلسہ میں ہی کی تھی جب لاہور کے انارکلی بازار میں بہت بڑا جلسہ تھا، والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ حضرت قاری صاحبؒ کی تقریر سننے کے لیے گوجرانوالہ سے لاہور تشریف لے گئے تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میرا شاید کافیہ کا سال تھا اور میں نوعمر لڑکا ہی تھا مگر اس سفر کی بہت سی باتیں اور جلسہ کا منظر ابھی تک نگاہوں کے سامنے ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کی باتیں تو یاد نہیں مگر ان کا سراپا اب بھی نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی خطابت اپنے والد گرامیؒ کی خطابت کا رنگ رکھتی تھی اور انہیں خطیب الاسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا مگر میرا طالب علمانہ ذوق حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کے لیے خطیب کی بجائے ''متکلّم اسلام'' کے تعارف کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ متکلّم کا اپنا دائرہ ہوتا ہے اور محدثین، فقہاء، مناظرین اور مفسرین کی طرح متکلّمین بھی مستقل تعارف رکھتے ہیں۔ متکلّم کا کام اپنے دور کی عقلیات کے دائرے اور ماحول میں اسلامی عقائد اور ان کی تعبیرات کی تشریح و توضیح کرنا ہوتا ہے اور ہر دور میں جلیل القدر متکلّمین امت مسلمہ کی راہنمائی کرتے رہے ہیں۔ جب دیوبندی مکتب فکر کی ان دائروں میں تقسیم کی بات ہوتی ہے تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے سب سے بڑے متکلّم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، ان کے بعد شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس محاذ کو سنبھالا اور پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ ان دونوں کے ترجمان بن گئے۔ مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی خطابت و تدریس میں بھی اس کی بھرپور جھلک پائی جاتی تھی اور بسا اوقات

ان کی گفتگو سنتے ہوئے ہم آنکھیں بند کر کے حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی زیارت کا حظ اٹھا لیا کرتے تھے۔

دیوبندی متکلّمین کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ایک اور نام کا اضافہ کیے بغیر میری تسلی نہیں ہوتی اور وہ بزرگ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ ہیں جو اپنے دور میں پنجابی زبان کے سب سے بڑے متکلّم اسلام تھے اور عقائد کی مشکل سے مشکل تعبیر کو آسان مثالوں اور سادہ اسلوب میں عام آدمی کو سمجھا دینے کا کمال رکھتے تھے۔ مجھ سے ایک بار پوچھا گیا کہ حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ اور حضرت مولانا لال حسین اخترؒ میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت قاضی صاحب چوٹی کے خطیب تھے، حضرت جالندھریؒ کمال کے متکلّم تھے اور حضرت لال حسین اخترؒ میدان مناظرہ کے شاہسوار تھے۔ تینوں کا مشن ایک ہی تھا مگر دائرہ کار اور اسلوب الگ الگ تھا اور یہ تینوں اسلوب کسی بھی دینی تحریک کی لازمی ضروریات میں شمار ہوتے ہیں۔

بہرحال حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خانوادہ کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب و ذوق کے بھی ایک اور نمائندہ بزرگ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے تمام متعلقین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۶ اپریل ۲۰۱۸ء)

حضرت حاجی عبد الوہابؒ

حضرت حاجی عبد الوہابؒ کی وفات کا صدمہ دنیا بھر میں محسوس کیا گیا اور اصحاب خیر و برکت میں سے ایک اور بزرگ ہم سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حاجی صاحب محترم دعوت و تبلیغ کی محنت کے سینئر ترین بزرگ تھے جنہوں نے حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ، حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ جیسے بزرگوں کی معیت و رفاقت کی سعادت حاصل کی اور زندگی بھر اسی کام میں مصروف رہے۔ وہ حقیقی معنوں میں فنافی التبلیغ تھے اور دعوت و تبلیغ کے تقاضوں، نزاکتوں اور اتار چڑھاؤ کو نہ صرف بخوبی سمجھتے تھے بلکہ کئی مشکل مراحل میں ان کی راہنمائی اور دعائیں مشکلات کے حل میں بروقت کام آجاتی تھیں۔ دین یا دنیا کا کوئی کام اس قدر وسعت اور قبولیت حاصل کر لے تو اسی حساب سے مشکلات اور الجھنوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے

جو کہ فطری بات ہے، البتہ حضرت حاجی صاحبؒ کی موجودگی ہمارے جیسے کارکنوں کے لیے اطمینان کا باعث ہوتی تھی کہ بات ایک حد سے آگے نہیں بڑھ پائے گی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بار حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے پوچھا تھا کہ امت میں رونما ہونے والے اجتماعی فتنوں کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہو تو ہمیں بھی بتاؤ۔ حضرت حذیفہؓ نے بے ساختہ جواب دیا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ایسے کسی فتنہ کا ہمیں ڈر نہیں ہے۔ مجھے آج کے حالات کے تناظر میں حضرت عمرؓ کے خلوص و دبدبہ کے اس پہلو کی ایک جھلک حضرت حاجی عبد الوہابؒ میں دکھائی دیتی تھی اس لیے جب حاجی صاحبؒ کی وفات کی خبر سنی تو جو دعائیں زبان پر جاری ہوئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بڑوں کے فوت ہو جانے پر جماعتوں، حلقوں اور اداروں میں جو مسائل کھڑے ہو جایا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ دعوت و تبلیغ کے اس عالمگیر عمل و محنت کو ان سے محفوظ رکھیں، آمین یارب العالمین۔

میری ایک عرصہ سے حاجی صاحبؒ سے نیاز مندی تھی اور ہمیشہ ان کی شفقتوں اور دعاؤں سے مستفید ہوتا تھا، اس کی ایک وجہ تو والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت تھی جس کا مختلف مواقع پر عملی اظہار میں نے دیکھا ہے، ان کی وجہ سے مجھے بھی محبت سے نوازتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے مخدوم حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کا شمار بھی جماعت کے بزرگوں میں ہوتا تھا اور مجھے ایک عشرہ سے زیادہ عرصہ تک مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ان کی خدمت کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ حاجی صاحب محترم کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے تھے اور ان کے درمیان تعلق و محبت کے کئی مراحل کا میں شاہد ہوں۔

میرا ایک عرصہ سے تبلیغی جماعت کے ساتھ سال کے دوران ایک سہ روزہ لگانے کا معمول ہے اور یاد پڑتا ہے کہ شاید پہلا سہ روزہ میں نے ۱۹۶۳ء کے دوران گکھڑ کے قریب گاؤں کوٹ نورا میں لگایا تھا۔ ایک مرتبہ سہ روزہ کی تشکیل کے لیے رائے ونڈ حاضری ہوئی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے ملاقات پر بے حد خوشی کا اظہار فرمایا اور جماعتی ساتھیوں سے کہا کہ اسے سہ روزہ کے لیے مرکز میں رکھو چنانچہ میں نے وہ دو تین روز مرکز میں ہی گزارے۔ کچھ عرصہ قبل گوجرانوالہ کے تبلیغی مرکز کی مسجد کے سنگ بنیاد کے لیے تشریف لائے تو میں بھی حاضر تھا، بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔ حاجی صاحب محترمؒ خود تو دعوت و تبلیغ ہی کے لیے وقف تھے اور ان کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے گزرتا تھا مگر ملک کی عمومی دینی صورتحال پر ان کی گہری نظر ہوتی تھی، وہ حالات کے اتار چڑھاؤ اور دینی جدوجہد کی ضروریات سے آگاہ رہتے تھے اور مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ دینی مدارس کی حوصلہ افزائی اور علماء کرام کی قدردانی کا خاص ذوق رکھتے

تھے اور وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں ساتھیوں کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور حکمت کا ایک پہلو ہے کہ جس روز رائے ونڈ میں حضرت حاجی عبدالوہابؒ کے جنازہ اور تدفین کی تیاری ہو رہی تھی اسی روز ہمارے ایک ساتھی مولانا عبدالوہاب کا واہنڈو میں نکاح تھا۔ ان کے والد محترم بتاتے ہیں کہ وہ اپنی شادی سے قبل ہی تبلیغ سے وابستہ ہو گئے تھے جس کی برکت سے نہ صرف ان کا خاندان بلکہ رشتہ داروں کا پورا ماحول دینی اعمال کے دائرہ میں آگیا۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ کے نام پر اور دوسرے بیٹے کا نام حاجی عبدالوہابؒ کے نام پر رکھا، جبکہ آٹھ بیٹوں کو دین کی تعلیم دلائی۔ مولوی عبدالوہاب جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل اور الشریعہ اکادمی میں درس نظامی کے استاذ ہیں، ان کا نکاح واہنڈو میں والد گرامیؒ کے ایک مرید خاص بھائی سردار صاحب کی بیٹی سے ہوا اور برادر عزیز مولانا عبدالحق خان بشیر نے نکاح پڑھایا۔ میں آج اس عجیب اتفاق کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ حضرت حاجی عبدالوہابؒ تو رات ہم سے رخصت ہو گئے مگر ان کے نام پر جس بچے کا نام رکھا گیا اور انہی کی دعوت و تلقین کے باعث جسے عالم دین بنایا گیا وہ عبدالوہاب آج نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور دعوت و تبلیغ کی عالمی محنت کو ان کے خلوص اور راہنمائی کے دائرے میں مسلسل ترقیات و ثمرات عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۱ نومبر ۲۰۱۸ء)

حضرت مولانا حمد اللہؒ

استاذ العلماء حضرت مولانا حمد اللہ صاحب آف ڈاگئی کی وفات حسرت آیات کی خبر مجھے کراچی کے سفر کے دوران ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ہمارے ان پرانے بزرگوں میں ایک اہم شخصیت تھے جنہیں عوام کے ساتھ ساتھ اہل علم میں بھی مرجع اور راہنما کی حیثیت حاصل تھی اور بہت سے مشکل معاملات و مسائل میں ان سے رجوع کر کے اطمینان ہو جاتا تھا کہ متعلقہ مسئلہ و معاملہ کا صحیح رخ کیا ہے۔ مجھے ان کی خدمت میں ڈاگئی حاضری کی سعادت ہوئی اور مختلف علمی و دینی محافل میں ان کے ساتھ استفادہ اور دعاؤں کا تعلق رہا۔

ایک موقع پر جب جمعیت علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمان گروپ میں تقسیم تھی، حضرت مرحوم کے ساتھ درخواستی گروپ کے ایک وفد میں بلوچستان کے چند روزہ دورے کی رفاقت کا شرف بھی

حاصل ہوا۔ اسی موقع کی بات ہے کہ چمن میں سینکڑوں علماء کرام کے ایک اجتماع میں اسلامی معاشیات کے حوالہ سے ان کی وقیع علمی گفتگو سن کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے بعد وہ پہلی شخصیت ہیں جن سے اسلامی معاشیات کے موضوع پر اس قدر جاندار علمی گفتگو سننے کو ملی ہے۔ میں نے حضرتؒ سے اس کا تذکرہ بھی کیا کہ آپ کا عمومی تعارف تو اس سے مختلف مسائل کے حوالہ سے ہے مگر آپ تو ہماری لائن کے بزرگ ہیں اور ہمیں ایسے سرپرستوں کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے مسکرا کر اپنے ایک معاصر بزرگ کا نام لیا اور فرمایا کہ ان کی وجہ سے مجھے بعض مسائل میں الجھنا پڑا ورنہ میرا ذوق بھی یہی ہے۔

حضرت مولانا حمد اللہؒ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی اور زندگی بھر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ صوابی کے علاقہ میں پنج پیر، ڈاگئی اور شاہ منصور کے تین علمی مراکز دورۂ تفسیر قرآن کریم کے عنوان سے قرآن کریم کے علم و معارف کی تدریس و فروغ کے باب میں عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا حمد اللہ جانؒ کے اس علمی مرکز میں ہزاروں علماء کرام نے ان سے فیض حاصل کیا جو اب دنیا کے مختلف حصوں میں دینی خدمات میں مصروف ہیں اور حضرتؒ کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت مرحوم کے درجات جنت میں بلند فرمائیں اور تمام تلامذہ، متعلقین اور اہل خاندان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور – ۱۵ جنوری ۲۰۱۹ء)

حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستیؒ

حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی کم و بیش پچاسی برس اس جہان رنگ و بو میں گزار کر اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میں جامعہ نصرۃ العلوم میں شش ماہی امتحانات کی وجہ سے ان دنوں مسلسل اسفار میں ہوں، ۳۰ دسمبر پیر کو مردان کے قریب حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ کے گاؤں سواڑیان میں ''شیخ الہند کانفرنس'' کے عنوان سے ایک پروگرام تھا، ظہر کے بعد اس میں شرکت ہوئی، میرے ساتھ وزیرآباد سے پروفیسر حافظ منیر احمد، جناب شیخ محمد بلال، حافظ محمد عمر فاروق اور حافظ شاہد میر شریک سفر ہیں۔ مغرب کے بعد باجہ صوابی میں ''ختم نبوت کانفرنس'' میں گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اور رات دس بجے ہم جامعہ ابوہریرہؓ نوشہرہ میں مولانا عبد القیوم حقانی کے پاس بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوئے جن کا گزشتہ دنوں دل کا آپریشن ہوا ہے۔

واپسی پر اگلے روز دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے ہوتے ہوئے اسلام آباد میں پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی سے ملاقات کے بعد گوجرانوالہ روانگی کا پروگرام تھا، حضرت سے رات سونے سے قبل رابطہ ہوا تو فرمایا کہ کل ظہر آپ میرے ساتھ پڑھیں گے اور پھر کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ پروگرام طے کر کے ہم سو گئے مگر صبح اذان فجر سے قبل آنکھ کھلی تو موبائل نے صدمہ و رنج سے بھرپور اس خبر کے ساتھ ہمارے دن کا آغاز کیا کہ حضرت مولانا فداء الرحمان درخواستی کا رات اسلام آباد میں انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خانپور مولانا فضل الرحمان درخواستی سے رابطہ ہوا تو انہوں نے تصدیق کر دی، ہم نے نماز فجر پڑھتے ہی اسلام آباد کی طرف روانگی کی اور راستہ اسی حوالہ سے ملک بھر رابطوں میں طے ہوا۔

ابھی دو روز قبل اسلام آباد میں پاکستان شریعت کونسل کا مشاورتی اجلاس تھا جو جامع مسجد محمدی شہزاد ٹاؤن میں ہوا۔ حضرت درخواستی بحریہ ٹاؤن میں اپنے عزیزوں کے ہاں قیام پذیر تھے اور اجلاس کے لیے ہی رکے ہوئے تھے۔ مگر طبیعت زیادہ خراب ہونے کے بعد اجلاس میں تشریف نہ لا سکے اور پاکستان شریعت کونسل کے نائب امیر اول مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس کے بعد ہم کچھ ساتھی بحریہ ٹاؤن میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ دیر محفل رہی۔ حضرت کا مزاج و ذوق تھا کہ محفل کوئی بھی ہو وہ تلاوت، نعت اور کوئی حدیث مبارکہ سننے یا سنانے کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا، قاری محمد عثمان رمضان نے تلاوت کی، پروفیسر حافظ منیر احمد نے نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی اور میں نے ایک حدیث مبارکہ سنائی جس کے بعد دعا پر مجلس اختتام پذیر ہو گئی۔

یہاں دو عجیب سے اتفاق ہوئے، ایک یہ کہ قاری محمد عثمان رمضان نے تلاوت میں سورۃ الفجر کی آخری آیات پڑھیں جن میں "یا ایتھا النفس المطمئنۃ" کے ساتھ موت کے وقت مرد مومن کے لیے فرشتوں کے خیر مقدمی ماحول کا ذکر کیا گیا ہے۔ تلاوت شروع ہوئی تو میں نے چونک کر قاری صاحب کی طرف دیکھا، اسی کے ساتھ ہی مولانا فداء الرحمان درخواستی کی زبان سے یہ کلمات سنے کہ ”آیت تو موقع کے مطابق پڑھی ہے“۔ جبکہ دوسرا اتفاق یہ تھا کہ جب رخصت ہوتے وقت میں نے مولانا درخواستی کے چہرے پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں شاید ان کے والد حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی رحمہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ پھر اسی مجلس میں انہوں نے یہ بات بھی کہہ دی کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو، مگر میں نے کہا کہ نہیں حضرت! میں ۵ جنوری کو دو چار دن کے لیے جامعہ انوار

القرآن کراچی آ رہا ہوں وہاں ملاقات ہو گی، ان شاء اللہ تعالی۔ اس کے بعد ہم واپس روانہ ہو گئے۔

مولانا فداء الرحمان کے ساتھ میری جماعتی رفاقت نصف صدی سے زیادہ عرصہ کو محیط ہے اور ہم نے مختلف دینی تحریکات و مہمات میں اکٹھے کام کیا ہے۔ ان کے مزاج میں دوستوں کے ساتھ مشاورت کے ساتھ چلنا بطور خاص شامل تھا اور ان کی ساری زندگی اسی ذوق کے تسلسل سے عبارت ہے۔ دوستوں کی بات سننا، انہیں احترام دینا، ان کے مشورہ کو قبول کرنا اور اعتماد میں رکھنا ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ دینی مدارس کے قیام اور ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی انہیں اپنے والد گرامی حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی قدس اللہ سرہ العزیز سے ورثہ میں ملی تھی، اور ان کی نگرانی میں جامعہ انوار القرآن کراچی، مرکز حافظ الحدیث حسن ابدال اور مدرسہ تعلیم القرآن پتھورو سندھ کے مرکزی مدارس سمیت بیسیوں مدارس خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

دینی جماعتوں کی سرپرستی کرنا اور حسب موقع ان کی تائید و حمایت کرنا بھی حضرت درخواستی ہی کی روایت تھی جو ان کے جانشین کے طور پر مولانا فداء الرحمان درخواستی نے قائم رکھی اور دینی تحریکات کی سرپرستی کرتے رہے۔ وہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ ہمیں کسی بھی دینی جدوجہد کے لیے اپنے اکابر اور بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، وہ کہتے تھے کہ اس میں برکت اور کامیابی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تلاوت کلام پاک، احادیث نبویہ کا مسلسل تذکرہ اور اللہ اللہ کی تلقین بھی ان کے معمولات کا حصہ تھی۔ اور وہ اسی طرز زندگی کے ساتھ اب اللہ رب العزت کے بلاوے پر لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بحریہ انکلیو شہزاد ٹاؤن اسلام آباد میں ادا کی گئی جس میں اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام کی بڑی تعداد شریک ہوئی جبکہ نماز جنازہ کی امامت کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ کل بدھ کو صبح گیارہ بجے خانپور میں حضرت کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد دین پور شریف کے تاریخی قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں لائی جائے گی، اللہ تعالی ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - یکم جنوری ۲۰۲۰ء)

علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ کی وفات کی خبر نے نہ صرف ان کے تلامذہ اور معتقدین بلکہ ان کی علمی جدوجہد اور اثاثہ سے باخبر عامۃ المسلمین کو بھی غم واندوہ کے ایسے اندھیرے سے دوچار کر دیا ہے

جس میں دور دور تک روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علامہ صاحبؒ کی علالت کی خبریں چند دنوں سے آ رہی تھیں اور بستر سے اٹھتے ہوئے گر کر زخمی ہونے کی خبر نے پریشانی میں اضافہ کر رکھا تھا۔ مگر موت نے اپنے وقت پر آنا تھا، وہ آئی اور علامہ صاحبؒ ہزاروں بلکہ لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور تمام متعلقین، پسماندگان اور سوگواروں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

میرا ان کے ساتھ تعلق طالب علمی کے دور سے چلا آ رہا تھا جب وہ مختلف تعلیمی و دینی نشستوں کے لیے گوجرانوالہ بالخصوص جامعہ نصرۃ العلوم میں وقتاً فوقتاً تشریف لایا کرتے تھے اور ہمیں ان کے علمی نکات اور حاضر جوابی سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا اور ابھی رمضان المبارک سے قبل امامیہ کالونی لاہور میں حضرت علامہ صاحبؒ کے قائم کردہ جامعہ ملیہ کی سالانہ تقریب میں شرکت کے موقع پر ان کی مجلس اور گفتگو سے شاد کام ہونے کا موقع ملا۔

علامہ صاحبؒ نے نفاذ شریعت اور تحفظ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ کرامؓ کے ناموس اور عقائد اہل سنت کے تحفظ و دفاع میں بھرپور اور متحرک زندگی گزاری ہے اور عمر بھر ان دائروں میں مسلسل سرگرم عمل رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کے نفاذ کے موقع پر جمعیت علماء اسلام پاکستان کے دستور کے حوالے سے کچھ تحفظات تھے جن کے اظہار کے لیے مولانا مفتی محمودؒ، علامہ شمس الحق افغانیؒ، شیخ حسام الدینؒ اور علامہ خالد محمودؒ پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس نے ”تنقیدات و ترامیم“ کے عنوان سے رپورٹ مرتب کر کے شائع کی، وہ میری معلومات کے مطابق جماعتی زندگی کے حوالہ سے حضرت علامہ صاحبؒ کا پہلا تعارف تھا جو تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

عقائد اہل سنت اور ناموس صحابہ کرامؓ و اہل بیت عظامؓ کے تحفظ و دفاع میں سردار احمد خان پتافیؒ، علامہ عبد الستار تونسویؒ، علامہ قائم الدین عباسیؒ، مولانا عبد الحئی جام پوریؒ، علامہ دوست محمد قریشیؒ، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ اور دیگر سرکردہ علماء کرام پر مشتمل جس گروہ نے ”تنظیم اہل سنت“ کے عنوان سے ملک کے طول و عرض بالخصوص جنوبی پنجاب میں صبر آزما جدوجہد کی وہ ہماری دینی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ حضرت علامہ خالد محمودؒ نہ صرف اس گروہ کے رکن رکین تھے بلکہ علمی ترجمان بھی تھے جن کی نکتہ رسی اور حاضر جوابی نے علمی مباحث کا میدان ایک عرصہ تک گرم رکھا اور بے شمار لوگوں کی علمی و فکری تسکین اور اعتقادی پختگی کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ وہ تنظیم اہل سنت کے جریدہ ”دعوت“ کے مدیر تھے اور ان

کے سوالات وجوابات کا سلسلہ اس علمی وفکری جدوجہد کا قیمتی اثاثہ ہے جن کا بہت سا حصہ ''عبقات'' کے نام سے مرتب ہو کر علماء وطلبہ کے استفادہ کا باعث ہے۔

قادیانیت کے محاذ پر وہ حضرت مولانا محمد حیاتؒ اور حضرت مولانا لال حسین اخترؒ کے ساتھ صف اول کے کامیاب مناظر شمار ہوتے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے مسلمہ اجماعی عقائد کے بارے میں قادیانی دجل وفریب کے تار و پود کو ہر دائرے میں اور ہر سطح پر بکھیر کر رکھ دیا۔ انہوں نے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور حضرت مولانا عبدالحفیظ مکیؒ کے ساتھ مل کر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے عالمی سطح پر جو محاذ قائم کیا وہ ان کا صدقہ جاریہ ہے اور مسلمانوں کے عقائد کے تحفظ کا ایک مضبوط مورچہ ہے۔ حجیت حدیث اور دفاع سنت نبویؐ کے محاذ پر بھی ان کی خدمات کا دائرہ اپنے اندر بے شمار وسعت وتنوع رکھتا ہے جو علماء و طلبہ کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔

علامہ صاحبؒ کو دیوبندی مسلک کا علمی ترجمان سمجھا جاتا تھا اور بہت سے مواقع پر اس بات کا میں عینی شاہد ہوں کہ کسی اہم مسئلہ پر دیوبندی موقف کی وضاحت کے لیے اہل علم کے حلقوں میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور ترجمان اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے ساتھ حضرت علامہ خالد محمودؒ کا نام سامنے آتا تھا اور ان سے رجوع کیا جاتا تھا۔ جبکہ سکولوں، کالجوں اور دینی مدارس کے طلبہ پر مشتمل مشترکہ طالب علم تنظیم ''جمعیت طلباء اسلام پاکستان'' کی تشکیل اور طلبہ کی ذہن سازی میں بھی ان کا اساسی کردار رہا ہے۔

علامہ صاحبؒ نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں لاہور کی ایک سیٹ پر جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا مگر اس کے بعد برطانیہ منتقل ہو گئے، البتہ سال کا کچھ حصہ پاکستان میں گزارنے کا معمول آخر تک رہا۔ مجھے ان کے ہاں جامعہ ملیہ لاہور اور مانچسٹر (برطانیہ) میں ان کی قائم کردہ اسلامک اکیڈمی میں بیسیوں مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور ان کے ساتھ دینی محافل میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ علامہ صاحبؒ اور حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کی رفاقت میں مجھے ۱۹۸۵ء میں پہلے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل ہوا، جبکہ افغانستان سے روسی فوج کے انخلا کے بعد آزاد افغان حکومت کے سربراہ حضرت پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ کی دعوت پر سرکردہ علماء کرام کے جس وفد نے کابل کا دورہ کیا ہم اس میں بھی اکٹھے شریک تھے۔

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ آج ہم میں نہیں رہے مگر ان کے قائم کردہ جامعہ ملیہ لاہور اور اسلامک اکیڈمی مانچسٹر، ان کی درجنوں تصانیف اور سینکڑوں بیانات وخطابات، جو محفوظ حالت میں موجود ہیں، ان کا

ایسا صدقہ جاریہ ہیں جن سے اہل علم ایک عرصہ تک مستفید ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور ان کے پسماندگان و متعلقین کو ان کی حسنات کا سلسلہ تا دیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور-۱۶ مئی ۲۰۲۰ء)

حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحبؒ کی وفات کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ حسب معمول نیند سے بیدار ہوکر موبائل فون کھولا تو کراچی کے ڈاکٹر ثناء اللہ محمود کے اکاؤنٹ پر حضرت مفتی صاحبؒ کے فرزند مولانا قاسم احمد پالنپوری کا میسج رنج وغم کا ایک نیا طوفان لیے نگاہوں کے سامنے موجود تھا کہ "انتہائی رنج وغم کے ساتھ یہ خبر صاعقہ اثر لکھی جارہی ہے کہ ہمارے والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند آج بتاریخ ۱۹ مئی مطابق ۲۵ رمضان المبارک بروز منگل بوقت چاشت اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"۔ مفتی صاحبؒ کی علالت کی خبریں کئی روز سے آرہی تھی مگر گزشتہ روز ایک میسج نے تشویش میں اضافہ کر دیا تھا جو آج حقیقت میں بدل گئی اور عالم اسلام کی یہ عظیم علمی شخصیت، محدث، فقیہ، متکلّم اور ہزاروں علماء کرام کے شفیق استاذ اپنا سفر زندگی مکمل کر کے دار باقی کی طرف روانہ ہوگئے۔

مولانا پالنپوریؒ کے تعارف کے لیے اس کے بعد مزید کسی بات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے اور انہوں نے سالہا سال تک اس مرکز علم میں ہزاروں تشنگان علوم کو مسلسل فیضیاب کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ منصب ہمیشہ اپنے دور کی ممتاز ترین علمی شخصیات کے ساتھ مخصوص رہا ہے جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطین علم وفضل کے نام آتے ہیں، اور ان کے ساتھ کسی فہرست میں نام کا شمار ہونا بجائے خود کسی بڑے سے بڑے علمی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ مگر حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ ہر صاحب علم وفضل کی طرح اپنے کچھ امتیازات اور خصوصیات بھی رکھتے تھے جن کے باعث وہ اپنے معاصرین میں ایک الگ شان کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتے تھے اور ان کی آرا و افکار کو اہل علم کے حلقوں میں رہنمائی اور استفادہ کے لیے مرجع کی

حیثیت حاصل تھی۔

مجھے متعدّد بار ان کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے قیام کے بعد اپنے عہد کی جن ممتاز علمی و فکری شخصیات نے اس کے علمی پروگراموں کو رونق بخشی، ان میں حضرت پالنپوریؒ بھی شامل ہیں۔ لندن کے مرکز ختم نبوت اسٹاک ویل گرین میں ورلڈ اسلامک فورم کی ایک فکری نشست میں وہ تشریف لائے اور عصر حاضر میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے عنوان سے انہوں نے بلیغ خطاب فرمایا۔ دور حاضر کے فکری و نظریاتی فتنوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کو اپنے مخصوص انداز میں ان سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ یہ خطاب بھی ان کے اسی ذوق کا آئینہ دار تھا، پھر ایک بار نیویارک میں ''شریعۃ بورڈ'' کے مولانا مفتی نعمان احمد کے ہاں ان کی زیارت ہوئی اور کچھ دیر ان کی مجلس و گفتگو سے شاد کام ہونے کا موقع ملا۔ ان دنوں والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا تھا اس لیے زیادہ دیر انہیں کی باتیں ہوتی رہیں بلکہ گوجرانوالہ کے ایک لوکل اخبار نے حضرت والد محترم کے حوالے سے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا تھا جس کی ایک کاپی حضرت پالنپوریؒ کی خدمت میں پیش کی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے تبصرہ فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض ممتاز اہل علم کے کچھ علمی و فقہی تفردات بھی زیر بحث آئے جن کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ تفردات اور انفرادی آرا کو اگر باقاعدہ موقف بنا کر سامنے نہ لایا جائے تو بہت سی الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے۔ خود میرا ذوق بھی ان معاملات میں یہی ہے اس لیے یہ گفتگو کافی دلچسپ رہی۔

میں نے ایک موقع پر کسی مجلس میں عرض کیا کہ ہم درس نظامی کے نصاب میں علم کلام کے موضوع پر بنیادی کتاب "شرح العقائد" پڑھاتے ہیں جو یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتقادی و کلامی مباحث کے حوالے سے ہے اور اہل سنت کے عقائد کے بنیادی ڈھانچے سے آگاہی کے لیے وہ از حد ضروری ہے، مگر آج کے دور میں ہمیں جن عقائد و افکار کا سامنا ہے ان کا بیشتر حصہ مغربی فلسفہ و ثقافت کا پیدا کردہ ہے، اس لیے جدید مغربی فکر و فلسفہ نے جو مسائل کھڑے کیے ہیں ان کے بارے میں شرح العقائد کی دوسری جلد لکھنے کی ضرورت ہے جسے اس کے ساتھ ہی درسی طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ بعض دوستوں نے اسی مجلس میں سوال کیا کہ یہ لکھے گا کون؟ میں نے عرض کیا کہ میری نظر میں اس وقت تین بزرگ ہیں جو اس کام کو صحیح اور بہتر طور پر کر سکتے ہیں (۱) حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم (۲) حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ اور (۳) حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ۔ ان میں سے دو تو ہم سے رخصت ہو گئے ہیں جبکہ حضرت مولانا مفتی محمد

تقی عثمانی کے لیے بلامبالغہ جسم کا رواں رواں دعاگو رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ کا امت کے اصحاب علم پر ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کی معرکۃ الآرا تصنیف ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کی اردو وعربی دونوں زبانوں میں شرح لکھ کر علماء اور طلباء کی رسائی اس عظیم علمی ذخیرہ تک آسان کردی ہے جو یقیناً ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور ان کے خاندان، تلامذہ اور مستفیدین کو ان کی حسنات سلسلہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۲۰ مئی ۲۰۲۰ء)

اہلیہ عمِ مکرم حضرت صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ

گزشتہ روز عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ کی اہلیہ محترمہ اور ہمارے خاندان کی مشفقہ ماں دار فانی سے رحلت کر گئی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نماز جنازہ رات گیارہ بجے جامعہ نصرۃ العلوم میں ان کے فرزند مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی کی اقتدا میں ادا کی گئی اور اس کے بعد انہیں قبرستان میں حضرت صوفی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے قریب ہی سپرد خاک کر دیا گیا۔ وہ ہمارے خاندان کی دعاگو اور سرپرست بزرگ خاتون تھیں اور ان کا وجود ہمارے لیے باعث رحمت وبرکت تھا۔ آخری روز تک عبادات اور دعاؤں کا معمول جاری رہا اور اس سال رمضان المبارک میں روزے بھی بیماری کے باوجود مکمل رکھے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور- ۸ جون ۲۰۲۰ء)

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہم سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کچھ عرصہ قبل کراچی حاضری کے دوران ان کی بیمار پرسی کا موقع ملا تو والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا آخری دور یاد آ گیا، انہوں نے بھی ضعف وعلالت کا خاصا عرصہ بستر علالت پر گزارا تھا اور میں ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ "من بعد قوة ضعفا و شيبة" کا اظہار ہے کہ جس بزرگ کے ساتھ ان کی

جوانی کے دور میں پیدل چلنا بھی ہمارے لیے مشکل ہوتا تھا، آج وہ اپنے ہاتھ سے منہ میں لقمہ ڈالنے کی سکت نہیں رکھتے ”رہے نام اللہ کا“۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھ کر ماضی کے بہت سے مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے اور تھوڑی دیر ان کے سامنے کھڑے رہ کر حسرت کے ساتھ وہاں سے نکل آیا، اب وہ اس مرحلہ سے بھی گزر گئے ہیں، اللہ تعالی ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند فرمائیں اور ان کے سب متعلقین کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ اپنے والد گرامی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند و جانشین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی، دینی اور سیاسی روایات کے امین و پاسدار بھی تھے۔ اور ان کی مختلف النوع سرگرمیاں دیکھ کر حضرت مفتی اعظمؒ کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔ بڑے مفتی صاحبؒ کی تو صرف زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، یا والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ سے وقتاً فوقتاً ان کا تذکرہ سنتے رہتے تھے جو ان دونوں کے استاذ محترم تھے اور علمی و فقہی مسائل میں ان کا مرجع بھی تھے کہ کسی بھی ضرورت کے وقت وہ راہنمائی اور فتوی کے لیے ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔

البتہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانیؒ دامت فیوضہم کے ساتھ نیاز مندی کا تعلق عرصہ سے چلا آرہا ہے، دونوں بزرگوں کی شفقتوں اور محبتوں سے فیضیاب ہوتا آرہا ہوں، بلکہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ اندرون ملک بہت سی مجالس میں شرکت کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کے بعض اسفار میں بھی رفاقت رہی ہے جو میری زندگی کے بہترین ایام میں سے ہے۔

مفتی صاحب مرحوم کے ذوق کا یہ پہلو میرے لیے ہمیشہ باعث توجہ رہا ہے کہ وہ علمی و دینی مجالس میں روایتی خطاب کی بجائے عوام اور علماء دونوں کے لیے راہنمائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور اجاگر کرتے تھے جن میں سے بعض باتوں کا میں اپنے مختلف کالموں میں ذکر کر چکا ہوں۔ موقع و محل کے مطابق ضرورت کے امور کو محسوس کرنا اور اس کے مطابق راہنمائی کرنا ان کا خاص ذوق تھا جو یقیناً علماء کرام کے لیے مشعل راہ ہے۔ وہ تربیت و اصلاح کی طرف بطور خاص توجہ دیتے تھے اور جہاں اس حوالہ سے کوئی کمی یا کوتاہی دیکھتے اسے نظر انداز کرنے کی بجائے اس کی نشاندہی کر کے اصلاح کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

مفتی صاحبؒ متعلقہ امور میں مشورہ کرتے تھے اور مشورہ قبول بھی کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کا معاملہ کرتے تھے۔ میں نے امریکہ کے ایک سفر میں ان سے گزارش کی کہ ہمیں اپنے فضلاء اور منتہی طلبہ کو

موجودہ عالمی فکری و تہذیبی ماحول سے روشناس کرانے اور آج کے علمی، فکری اور ثقافتی مسائل پر ان کی تیاری کرانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ بالخصوص بین الاقوامی قوانین و معاہدات اور ان کے عملی و تہذیبی اثرات سے انہیں آگاہ کرنا چاہیے جو ہمارے ہاں عام طور پر نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری اس گزارش سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ مجھے دو تین بار اس بات کا موقع فراہم کیا کہ جامعہ دارالعلوم کراچی میں تخصص فی الدعوۃ والارشاد کے شرکاء کے سامنے مختلف نشستوں میں اپنے ذوق کے مطابق عالم اسلام اور مغرب کی فکری و تہذیبی کشمکش کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر تفصیل کے ساتھ بیان کر سکوں۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ صاحب علم اور صاحب عمل تو تھے ہی، صاحب نسبت اور صاحب کردار بھی تھے۔ نئی نسل بالخصوص نوجوان علماء کرام کی ایسی جامع الاوصاف شخصیات سے شعوری ماحول میں وابستگی ہمارے دور کی اہم دینی ضروریات میں سے ہے، اور اس حوالے سے میری گزارش عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ بڑی شخصیات کے افکار و فیوض کو تحریری صورت میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ملاقاتوں اور مجالس کے ذریعے ان سے استفادہ زیادہ مؤثر اور نفع بخش ہوتا ہے اور نوجوان علماء کرام کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ گوجرانوالہ میں ایک بار تشریف آوری کے موقع پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ جامعہ نصرۃ العلوم اور الشریعہ اکادمی میں بھی رونق افروز ہوئے اور آج کی فکری اور تعلیمی ضروریات پر اکادمی کی نشست میں بہت پر مغز گفتگو کی جو ہمارے لیے راہنمائی اور حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔

حضرت مفتی صاحبؒ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن ان کی یادیں ان کی کمی کا احساس دلاتی رہیں گی۔ البتہ دل کو یہ تسلی ہے کہ ان کے بھائی اور ہم سب کے مخدوم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم ہمارے درمیان موجود ہیں جو نہ صرف اپنے ملک کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کے لیے رہبر و راہنما ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں پاکستان کی علمی پہچان اور اہل حق کی آبرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حضرت مفتی محمد رفیع صاحبؒ کے فرزند مولانا محمد زبیر اشرف عثمانی اپنے والد گرامی کی تعلیمی اور اصلاحی جدوجہد کا تسلسل قائم رکھے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی قیادت میں جامعہ دارالعلوم کراچی کو اپنے علمی، فکری اور دینی سفر میں مسلسل پیشرفت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۲ نومبر ۲۰۲۲ء)